Franz Kafka
کافکا کہانیاں
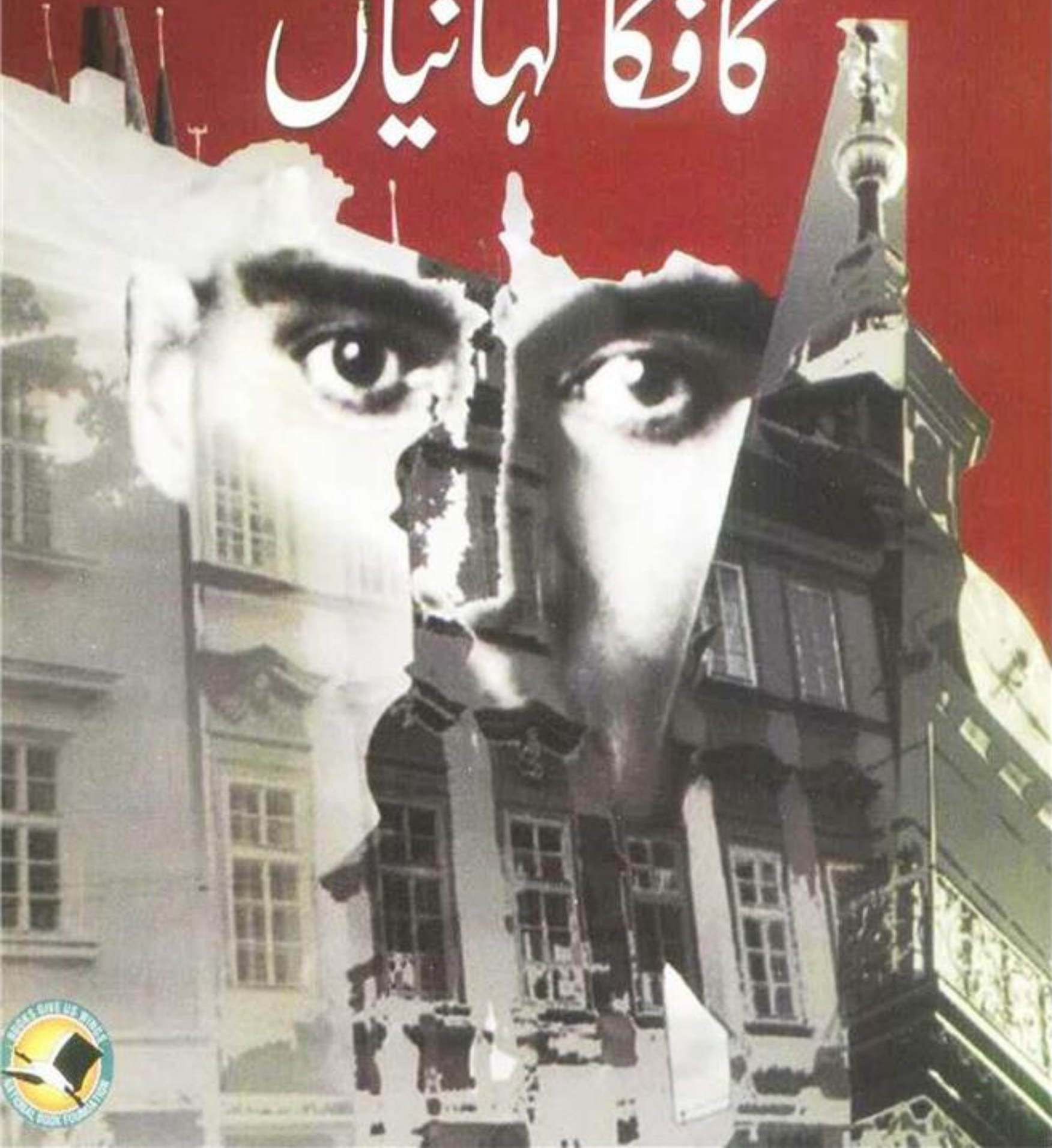
کافکا کہانیاں

فرانز کافکا

ترجمہ: محمد عاصم بٹ

فہرست

ایک دیہاتی معالج

فاقہ کش فن کار

مشاہدات

دنیاہائے خواب

قحبہ خانے والی گلی

ہجوم کا خواب

میں نے گدھے کا خواب دیکھا

رقاصہ ایڈورڈوا

گھروں کی ایک طویل قطار میں سفر

اس نے ایک لڑکی کی آبروریزی کی

ایک سینی ٹوریم کا خواب

باپ کے ساتھ ایک سفر

ڈھلوانی راستے کا سفر

تھیٹر کا خواب

جنگ کا خواب

ناٹک

مقبرے کا محافظ

چند حرف

کافکا کہانیاں کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ لکھتے ہوئے میری خوشی دہری ہے، آج دس بارہ سال بعد بھی اس کتاب کی ضرورت محسوس ہونا، آپ کو اپنی تحریر کی افادیت کا یقین دلاتی ہے۔لیکن اپنی پرانی محبتوں کی طرف لوٹنے میں بھی ایک اسرار بھری راحت ہے۔کافکا کے جہان کی سیر میں نے ایک بار پھر سے اس کتاب میں ترمیم و اضافے کے دوران کی۔ ہمیشہ کی طرح یہ دل اور دماغ پر گہرے نقش چھوڑ دینے والا تجربہ تھا۔

کافکا کو ادب میں پیغمبرانہ پیشین گوئیاں کرنے والے ادیب کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔اس کی وفات کے بعد چیکوسلوواکیہ میں روسی فوجوں کی مداخلت سے جو صورت حال پیدا ہوئی، اس کی مکمل ترجمانی کافکا پہلے ہی اپنے ادب میں کر چکا تھا جسے آج 'کافکائی صورت حال' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس مخصوص صورت حال میں جرم اور سزا کے درمیان تعلق باقی نہیں رہتا، بلکہ ملزم ہی پر یہ بوجھ بھی لادا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان جواز کا جوڑ لگائے۔وہ خود پر لگائے گئے الزام کی نفی کرتے کرتے اسے ثابت کرنے کے پراسرار عمل میں گرفتار ہو جاتا اور 'مقدمہ' کے K کی طرح بے موت مارا جاتا ہے۔

زبان اور ترجمے کی صحت کے حوالے سے کتاب کے متن میں متعدد جگہوں پر معمولی تبدیلیاں کی گئ

ہیں جن کے لیے میں ان قارئین سے، جو اسے پچھلی صورت میں پڑھ چکے ہیں، معذرت خواہ ہوں کہ انھیں پھر سے اس کی قرات کے عمل سے گزرنا ہوگا۔ کہانیوں کے علاوہ چند ایک تحریریں جو پچھلے ایڈیشن میں شامل تھیں، اب خارج کردی گئی ہیں۔ کافکا کی مزید دو کہانیاں کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔ یوں اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں کافکا کی سبھی نمائندہ کہانیاں شامل ہیں۔

محمد عاصم بٹ

حالات زندگی

کافکا چیک (Czech) زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ایک چھوٹے کوے کے ہیں۔ کافکا کے باپ کا نام ہرمین کافکا اور والدہ کا نام جولیا لووی تھا۔ اس جوڑے کا پہلا بچہ ''فرانز'' کافکا 3 جولائی 1983 کو پیدا ہوا۔ فرانز کا نام اس کی والدہ کے نانا کے نام پر رکھا گیا تھا جو بہت پارسا اور عالم شخص تھا۔ کافکا نے اپنی ڈائری میں اس حوالے سے جو معلومات درج کی ہیں، ان کے مطابق وہ ایک راسخ العقیدہ شخص تھا۔ اپنی اسی مذہبی وابستگی کی وجہ سے وہ روزانہ صبح دریائے ''ایبی'' میں جا کر نہاتا تھا حتیٰ کہ سردیوں میں بھی وہ برف میں سوراخ کرتا اور پانی میں اُتر جاتا۔

کافکا اپنی ڈائری میں لکھتا ہے، ''میری والدہ اپنے نانا سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ان کی وفات پر وہ دھاڑیں مار کر روتی اور ان کی لاش سے چمٹ جاتی تھیں۔ میری نانی اپنے شباب میں ہی دنیا سے کوچ کر گئیں۔ ان کی وفات کا ان کی والدہ یعنی میری پرنانی کو اس قدر قلق ہوا کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھیں اور تمام علائق دنیا سے منہ موڑ لیا۔ وہ تارک الدنیا ہو کر گوشہ تنہائی میں جا بیٹھیں۔''

ایک روز وہ اپنے گھر سے باہر گئیں تو پھر دوبارہ کبھی واپس نہیں آئیں۔ بعد ازاں ان کی لاش دریائے ''ایبی'' میں بہتی ہوئی ملی۔

فرانز کی والدہ کے پرنانا اپنے بیٹے یعنی فرانز کی والدہ کے نانا سے بھی کہیں زیادہ بڑے عالم تھے۔ انھیں مسیحی اور صیہونی دونوں مذہبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی انتہائی پارسائی کے سبب ایک معجزہ یوں ہوا کہ ایک مرتبہ علاقہ میں آگ بھڑک اٹھنے سے تمام مکان جل کر خاکستر

ہو گئے لیکن ان کا گھر حیرت انگیز طور پر بالکل محفوظ رہا۔ ان کے چار بیٹے تھے جن میں سے ایک نے بعد میں عیسائیت قبول کر لی۔ ایک ڈاکٹر بن گیا اور ایک خبطی اور پاگل تھا جسے سب انکل ناتھن کہتے تھے۔ چوتھے بیٹے میری والدہ کے نانا تھے جن کے علاوہ باقی تینوں بیٹے جوانی ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

فرانز کی والدہ ایک کم گو سمجھ دار اور انتہائی ذہین عورت تھی۔ وہ اپنے شوہر کے تقریباً ہر معاملے میں اس کی شراکت دار تھی۔ اس کے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ حتیٰ کہ دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے بھی وہ اس کے پاس ہی بیٹھتی۔ وہ کافکا خاندان کی رجعت پسندی، کھردرے پن اور جارحانہ مزاج کی معترف تھی۔ اس کے برعکس اس کے اپنے خاندان کے افراد غیر عملی، شائستہ، شرمیلے اور تخیل پرست واقع ہوئے تھے۔ اس کا خاندان گوشہ نشینوں، داخلیت پسندوں اور راسخ العقیدہ لوگوں کی مثالوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس خاندان کی تقریباً ہر نسل نے ایک مخبوط الحواس انسان ضرور پیدا کیا۔ اس کے برعکس کافکا پر اعتماد، باہمت اور دنیادار انسان تھے۔ فرانز کافکا کو ان دونوں خاندانوں کی متضاد خصوصیات ملیں۔ جیسا وہ خود ایک جگہ اعتراف کرتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر لووی ہے لیکن اس میں کافکا خاندان کی بنیادی خصوصیات بھی موجود ہیں۔

ہرمین کافکا ایک راسخ العقیدہ یہودی تھا۔ وہ مقدس دنوں میں باقاعدگی سے عبادت گاہ میں جاتا۔ عید فصح کی مذہبی رسومات ادا کرتا۔ مختلف مذہبی تہواروں پر روزے رکھتا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا ہر معاملے میں اس کی پیروی کرے۔ لیکن نوجوان کافکا کو صیہونیت کی تمام سطحی رسومات مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھیں۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے ''خوف سے دبے ہوئے ایک بچے کو یہ ثابت کرنا ممکن نہیں ہے کہ آپ صیہونیت کے نام پر جو چند غیر اہم رسومات ادا کرتے ہیں، وہ اپنے داخلی کھوکھلے پن کے باوجود کسی اعلیٰ مفہوم کی حامل ہو سکتی ہیں۔ وہ ان سے احتراز کرتا تو اسے ایک احساس گناہ کا تجربہ ہوتا جو آہستہ آہستہ اس کی شخصیت کا جزو لازم بن گیا۔''

کافکا کا بچپن تنہائی اور اکیلے پن میں بسر ہوا۔ اس کی ماں اور باپ دونوں کاروبار میں مصروف رہتے۔ اس کے دو بھائی چھوٹی عمر میں فوت ہو گئے۔ ایک بھائی ہنرچ دو سال کی عمر میں فوت ہوا اور دوسرا چھ مہینے زندہ رہ کر چل بسا۔ جب وہ چھ سال کا ہوا تو اس کی پہلی بہن پیدا ہوئی۔ کافکا کی کل تین بہنیں تھیں۔ اپنی بہنوں سے عمر کے اس واضح اختلاف کے باعث کافکا کے ان کے ساتھ کبھی خوشگوار مراسم قائم

نہ ہوئے۔ اس کی پرورش کی تقریباً تمام ذمہ داری آیاؤں پر تھی جو محض اس کی خادمائیں تھیں اور کسی بھی صورت میں اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی کمی کو پورا نہیں کر سکتی تھیں۔ یوں وہ ایک ویران تنہائی کے ساتھ بچپن کی عمر سے گزرا۔

اس کی ذات میں آزردگی اور خوف دو بنیادی موسموں کی طرح ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے۔ وہ آہستہ آہستہ مردم بیزار ہو گیا۔ وہ ایک جگہ خود اپنے بارے میں لکھتا ہے ''میں بہت کمزور بچہ تھا'' اس پر اس کے باپ کے تند اور جارحانہ رویئے نے اس میں احساس گناہ پیدا کیا۔ وہ عدم تحفظ اور خوف کا شکار ہوا اور یوں بہت بچپن میں ہی اس کی ایک مخصوص شخصیت کی صورت نمایاں ہوئی۔ اس کی والدہ اگرچہ ایک مہربان عورت تھی لیکن وہ اپنے شوہر کے ساتھ حد درجہ مخلص اور وفادار تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو تحفظ دے سکتی تھی لیکن وہ کبھی واضح طور پر ایسا نہیں کر سکی۔ وہ ہمیشہ ہر معاملے میں اپنے شوہر سے متفق ہو جاتی۔ یوں کافکا کے لیے اس کی ماں اور باپ دونوں ایک مضبوط اکائی کی صورت اختیار کر گئے یعنی وہ دیوار جس کے سائے میں اسے چلنا تھا، وہ اس کے راستے میں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

کافکا کی تین بہنیں تھیں۔ سب سے بڑی بہن اس سے چھ برس چھوٹی تھی۔ ان کے نام اوٹلا، ایلی اور ویلی تھے۔ کافکا ان کا اکلوتا بھائی تھا۔ لیکن دونوں دھڑوں میں کبھی قریبی تعلقات پیدا نہیں ہوئے۔ عموماً ان کے درمیان معمولی اختلاف پیدا ہو جاتا جو بعد ازاں سنگین صورت اختیار کر لیتا۔ چند برسوں تک کافکا اپنے والدین کی سالگرہ کے موقع پر اپنی بہنوں کو ڈرامہ لکھ کر دیتا رہا جسے وہ اہل خانہ کے سامنے میز پر چڑھ کر پیش کرتی تھیں۔ یوں چند سال بہن بھائیوں کے درمیان قریب رہنے کا موقع بنا رہا۔ وہ ڈرامہ لکھ کر اس کے لیے ہدایت کاری کی خدمات بھی انجام دیتا لیکن کبھی خود کسی ڈرامہ میں حصہ نہیں لیا۔ چند سال بعد اس نے اپنی بہنوں کو مشورہ دیا کہ وہ فرنچ کے ڈرامے کھیلا کریں۔ یوں ان کے درمیان یہ مختصر خوشگوار تعلق بھی منقطع ہو گیا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد کافکا کو ''اولڈ ٹاؤن سکوائر'' میں ''جرمن گرائمر سکول'' میں داخل کروایا گیا۔ یہ مدرسہ پراگ میں اپنے سخت نظم وضبط اور اعلیٰ معیار تعلیم کے باعث شہرت رکھتا تھا۔ یہاں طلبا، کی تعداد بہت محدود ہوتی۔ یوں اساتذہ کا طلباء سے ہمیشہ ایک براہ راست تعلق رہتا۔ کافکا ایک ذہین طالب علم تھا۔ لیکن وہ ریاضی میں بہت کمزور تھا مثلاً ایک امتحان میں وہ ریاضی کے پرچے میں صرف اس لیے پاس

ہوا کیوں کہ وہ پرچہ دیتے ہوئے زاروقطار رونے لگا تھا۔ وہ ایک پڑھا کو بچہ تھا، ایک نحیف، شائستہ اور شرمیلا بچہ۔ عموماً خاموش اور سنجیدہ رہتا۔ وہ کھیل کود کا دلدادہ نہیں تھا۔ زیادہ وقت اپنے کمرے میں یا تنہا گھومنے پھرنے میں گزارتا۔ وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ وہ کافکا خاندان کے لوگوں کی طرح عملی، دنیادار، طاقتور اور متحرک نہیں تھا۔

سکول میں داخل ہونے کے بعد کافکا کی سماجی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہاں اس کی مختلف لڑکوں سے دوستی ہوئی جو اس کی بعد کی زندگی میں اس کے لیے بہت اہم ثابت ہوئی۔ اس کے بعض دوست ہمیشہ اس کے ساتھ رہے۔ مثلاً ایک لڑکا ''ہیوگ برگ مین'' تھا جو بعد میں جرمنی کا مشہور فلسفی اور یروشلم کی عبرانی یونیورسٹی میں پروفیسر ہوا۔ انھی دوستوں میں جرمنی کی مشہور شخصیات ''پاؤل کش''، ''آسکر پولاک'' اور ''ایمل یوٹز'' شامل ہیں۔

کافکا اپنے سوانحی خاکے ''اپنے باپ کے نام ایک خط'' میں لکھتا ہے کہ گھر اور سکول میں اس کے تجربات بنیادی طور پر اس کی انفرادیت کو مجروح کرنے پر مائل تھے۔ پھر وہ ان تمام عوامل کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے اس کی شخصیت کو مختلف حوالوں سے تباہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہمیشہ ان کے خلاف برسرِ پیکار رہا۔ لیکن ہر عمومی اصول سے اس کا انحراف اس کے ضمیر پر ایک بوجھ کی صورت میں ظاہر ہوا جو رفتہ رفتہ اس کی ذات میں ایک ایسے احساس گناہ کی پیدائش کا موجب بنا جو اس کی شخصیت پر حاوی ہوگیا۔

کافکا نے نوجوانی میں لکھنا شروع کیا یا غالباً اس سے بھی چھوٹی عمر میں۔ لیکن وہ اپنی تحریروں کو چھپا کر رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے بہت عرصے تک انھیں اپنے دوستوں کو بھی نہیں دکھایا۔ ۱۹۰۳ء میں وہ اپنے دوست آسکر پولاک کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ وہ اسے اپنی تمام تحریروں کا پلندہ بھیجے گا جس میں اس کے بچپن میں لکھی گئی تحریریں شامل نہیں ہوں گی کیوں کہ انھیں غیر اہم قرار دے کر اس نے ضائع کردیا تھا۔ بعد ازاں اس نے اپنی نوجوانی کی بھی کافی تحریروں کو تلف کیا۔

۱۹۰۲ء میں کافکا پراگ میں جرمن یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ یہیں اس کی ملاقات میکس براڈ سے ہوئی اور یہیں سے ان دونوں کی ایسی دوستی کا آغاز ہوا جو اس کی موت کے آخری لمحوں تک قائم رہی۔ یہاں اس نے پہلے پندرہ روز کیمیا کا مطالعہ کیا۔ پھر ایک سمسٹر تک جرمن لسانیات پڑھتا رہا۔ لیکن آخرکار اس نے اپنے مستقبل کے پیشے کے لیے قانون کا انتخاب کیا۔ وہ اپنے اس انتخاب کے بارے میں ''اپنے

باپ کے نام خط'' میں لکھتا ہے۔ ''درحقیقت میں اپنے پیشے کے انتخاب میں کبھی آزاد نہیں تھا۔ میں اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ میرے بنیادی شغل یعنی تحریر و تالیف کے مقابلے میں میرے لیے دنیا کا ہر پیشہ یا مضمون اسی طور غیر موافق ہے جیسے سیکنڈری سکول میں تمام مضامین مجھے غیر ضروری معلوم ہوتے تھے۔ میرے لیے مسئلہ یہ تھا کہ ایک ایسا پیشہ منتخب کیا جائے جو مجھے انتہائی مستعدی سے اس غیر موافقت کو برقرار رکھنے کی اجازت دے''۔

۱۸ جولائی ۱۹۰۶ء میں کافکا نے قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی پھر وہ سال بھر ایک عدالت میں بلامعاوضہ ہی قانونی ریاضت کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ایسے نوجوان کام کر رہے تھے جنھوں نے قانون کو اپنا مستقل پیشہ بنانا تھا اور بار ایٹ لاء وغیرہ کرنا تھا لیکن اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ محض اس لیے ایک سال تک بیگار کا بوجھ ڈھوتا رہا کیوں کہ وہ امتحانات کی اعصاب کو مفلوج کر دینے والی تھکن سے چھٹکارہ چاہتا تھا۔ پھر وہ ایک اطالوی بیمہ کمپنی میں ملازم ہو گیا۔

وہ یہی سوچتا تھا کہ اب شاید وقت گزر چکا تھا۔ وہ مستقل طور پر تنہا اور خاموش رہتا۔ وہ اپنے باپ سے کسی قسم کی کوئی مدد نہیں لیتا تھا۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں اسے ایک نیم سرکاری ادارے ''ورکرز ایکسیڈنٹ انشورنس انسٹی ٹیوٹ'' میں اپنی پسند کی نوکری مل گئی۔ وہ اپنی ملازمت سے مطمئن تھا۔ وہ ایک ہردل عزیز افسر تھا۔ اس کی مستعدی اور کام کا معیار ہمیشہ مثالی ہوتے۔ وہ عام زندگی میں جیسا ست الوجود تھا، اپنے کام کو اتنی ہی مہارت اور عمدگی سے کرتا۔ چوں کہ وہ کم آمیز اور کم گو تھا، دفتر میں اس کا کوئی حریف نہیں بنا۔ تاہم وہ مزدوروں کی حالت زار پر کڑھتا۔ ایک بار وہ نہایت دکھ کے ساتھ میکس براڈ سے بولا ''یہ مزدور کس قدر معصوم ہیں۔ یہ اپنی اذیتوں کی داستانیں ہمیں سنانے آتے ہیں۔ یہ ان ناقص عمارتوں اور ناکافی حفاظتی تدابیر کو نیست و نابود کرنے کی بجائے اپنی درخواستیں لے کر ہم سے انصاف اور رحم کی بھیک مانگتے ہیں۔'' اس نے قانون کی تعلیم حاصل کی لیکن ملازمت بیمہ کمپنی میں کی اور آخری وقت تک یہی کام کرتا رہا۔

اسے نہ قانون کا پیشہ پسند تھا اور نہ بیمہ کمپنی۔ وہ اپنے دوست میکس براڈ سے اکثر کہا کرتا تھا کہ بیمہ کا کاروبار قدیم اقوام کے ان مذاہب کی طرح ہے جن میں یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ انسان کی تمام مشکلات کا حل اس کے مادی حالات میں تبدیلی سے ممکن ہے۔'' ۱۳ اگست ۱۹۱۲ء کو کافکا اپنی پہلی کتاب

''مشاہدات'' کا مسودہ لے کر میکس براڈ کے گھر گیا تو اس کی ملاقات برلن سے آئی ہوئی ایک ادب شناس، خوبصورت دوشیزہ ''فراؤلین ایف بی'' سے ہوئی جس سے اسے پہلی نظر ہی میں محبت ہوگئی۔ یہ کافکا کی پہلی محبت تھی۔ وہ اس واقعہ کو اپنی ڈائری میں یوں لکھتا ہے۔ ''تیرہ اگست کو جب میں براڈ سے ملنے گیا تو وہ میز کے برابر بیٹھی تھی۔ تب اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے میں نے پہلی مرتبہ اسے غور سے دیکھا اور مکمل طور پر بیٹھنے سے پہلے پہلے میں اس کے بارے میں ایک حتمی رائے قائم کر چکا تھا''۔ اگلی صبح وہ میکس کے نام ایک رقعے میں لکھتا ہے ''عزیزم میکس صبح بخیر۔ کل اپنی تحریروں کو سمیٹتے ہوئے میں مکمل طور پر اس لڑکی کے سحر میں رہا''۔

جلد ہی دونوں میں خط و کتابت شروع ہوئی۔ کافکا نے فیلس بائر کو پانچ سو خطوط لکھے۔ عام طور پر وہ اسے یومیہ ایک خط لکھتا تھا۔ دونوں کا باہمی تعلق پانچ برس تک مختلف نشیب و فراز سے گزر کر بالآخر اپنے حتمی انجام کو پہنچا لیکن اس خوشگور تجربہ نے کافکا کی شخصیت پر انمٹ نقوش ثبت کئے۔ فراؤلین بائر سے قلبی تعلق کے نتیجے میں اس کی تخلیقی سرگرمی میں تیزی اور نکھار پیدا ہوا۔ اس نے فراؤلین سے اپنی پہلی ملاقات کے فوراً بعد اپنی نمائندہ کہانی ''فیصلہ'' لکھی جو اس کی معدودے چند ایسی تحریروں میں سے ایک ہے جو اسے خود بھی پسند تھیں اور جنھیں اس نے اپنی خواہش سے میکس براڈ کو اشاعت کے لیے دیا۔ اس کہانی کا انتساب بھی فراؤلین ایف بی کے نام کیا۔ اسی اثناء میں اس نے ایک کہانی ''بھٹی جھونکنے والا'' لکھی جو ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو مکمل ہوئی اور مئی ۱۹۱۳ء میں پراگ کے ایک بڑے ادبی جریدے میں شائع ہوئی۔ ۱۹۱۵ء میں اس کہانی کو ''فاؤنٹین پرائز'' ملا۔ بعدازاں یہ کہانی اس کے ناول ''امریکہ'' کا پہلا باب بنی۔

۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء کو کافکا نے دوستوں کو اپنی شہرہ آفاق اور لازوال کہانی ''کایا کلپ'' سنائی۔ غرض کہ یہ اس کی زندگی کا ایسا دور تھا جو اس نے انتہائی خوشگوار مزاج اور تخلیقی فعلیت کے ساتھ گزارا۔

۱۹۱۳ء کے موسم بہار میں وہ اعصابی سکون کے لیے ویانا میں ایک پُرسکون سینی ٹوریم میں داخل ہو گیا۔ اس نے وقتی طور پر باغبانی کا مشغلہ اپنا لیا۔ اس عرصے تک فراؤلین ایف بی سے اس کے تعلقات مختلف نشیب و فراز سے گزر چکے تھے۔ وہ ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء کو اپنی ڈائری میں لکھتا ہے ''شاید یہ معاملہ اب ختم ہوگیا ہے۔ میں نے کل ہی فراؤلین کو ایک خط لکھا ہے جو غالباً میرا آخری خط ہوگا۔ شاید یہی درست

تھا۔ جو میرا کرب ہے اور جو اس کا کرب ہے، ان کے مقابلے میں وہ کرب نا قابل بیان ہوگا جو ان کے ملاپ سے پیدا ہوگا'' اگلے روز وہ اپنی ڈائری میں مزید لکھتا ہے۔ ''مجھے اس کے تین خط موصول ہوئے۔ میں اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کر سکتا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔''

۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۳ء کے موسم سرما تک اس نے اپنا ناول ''امریکہ'' لکھا۔ نومبر ۱۹۱۳ء میں فراؤلین نے اپنی ایک دوست کو کافکا کے پاس بھیجا تا کہ وہ اس معاملے کو کوئی رخ دے۔ چناں چہ ۱۹۱۴ء کے موسم بہار میں کافکا خود برلن گیا اور فراؤلین سے باقاعدہ منگنی کی۔ لیکن اسی برس جولائی میں اس نے چند وجوہات کی بناء پر اپنا ارادہ تبدیل کیا اور یہ منگنی توڑ دی۔ اس نے ڈنمارک سے اپنے والدین کو خط لکھا کہ وہ خود کو مکمل طور پر اپنے تخلیقی مشغلے کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی نوکری سے استعفیٰ دے رہا ہے۔ اس کے بنک اکاؤنٹ میں اتنی رقم تھی کہ وہ کچھ عرصہ آرام سے مالی آسودگی کے ساتھ گزار سکتا تھا۔ وہ ایک قصبے میں رہائش پذیر ہو گیا اور مستقل طور پر لکھنے لگا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اس کے تمام منصوبے درہم برہم ہو گئے۔

اسے پراگ میں بیمہ کمپنی کی اکتا دینے والی پرانی نوکری پر واپس آنا پڑا۔ اس نے اپنے ناول ''مقدمہ'' پر کام شروع کیا۔ اس نے دفتر سے چھٹیاں لے لی تھیں اور تندہی سے اپنے ناول کو مکمل کرنے میں جٹ گیا۔ فروری ۱۹۱۵ء میں وہ اپنے باپ کے گھر سے نکل آیا اور بلیک سٹریٹ میں ایک خاموش کمرے میں رہنے لگا۔ وہ اب شور کو کسی طور برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ جولائی ۱۹۱۶ء میں کافکا نے فراؤلین سے ایک مرتبہ پھر منگنی کی لیکن جلد ہی مختلف روحانی اور معاشی تاویلات دے کر اسے توڑ دیا۔ پانچ سال تک وہ اس معاملے میں الجھا رہا اور یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ اسے شادی کرنی چاہیے یا نہیں۔ اس کے لیے شادی ان مسائل میں سے ایک تھی جو نا قابل حل تھے۔ اسی ماہ یعنی ۲۱ جولائی ۱۹۱۶ء کو وہ اپنی ڈائری میں شادی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتا ہے ''میری شادی کی حمایت اور مخالفت میں تاویلات کا تجزیہ:

۱۔ میں تنہا زندگی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ زندگی کا یہ کرب، وقت اور عمر کی جارحیت، تخلیق کی اذیت اور مسرت، مخبوط الحواسی کا قرب، میں ان سب کو تنہا برداشت نہیں کر سکتا لیکن اگر میں فراؤلین سے شادی کر لوں تو اس سے مجھے قوت مدافعت حاصل ہوگی۔

۲۔ یہ سب باتیں مجھے سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔مزاحیہ رسائل میں لکھے ہوئے چٹکلے،فلابی پرڈاور گول پاوزر کی یادداشتیں،اپنے والدین کے بستر پر بکھرا ہوارات کالمس،میکس کی شادی۔ کل ''این'' نے مجھ سے کہا''میرے تمام شادی شدہ دوست خوش وخرم ہیں۔ مجھے یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسا کیوں ہے۔اس کی اس بات سے میں دوبارہ سوچ میں پڑ جاتا اور پھر سے خوفزدہ ہوجاتا ہوں۔

۳۔ مجھے زیادہ سے زیادہ تنہا رہنا چاہیے۔میں نے زندگی میں جو کچھ بھی پایا ہے،وہ اس تنہائی کے سوا اور کیا ہے؟

۴۔ ہر وہ شے جس کا تعلق ادب سے نہیں ہے،میرے لیے قابل نفرت ہے۔مثلاً یہ بحثیں جو چاہے کسی ادبی موضوع سے متعلق ہوں،مجھے بیزار کر دیتی ہیں۔ملاقاتی مجھے اذیت دیتے ہیں ۔میرے خاندان کی مسرتیں اور دکھ میرے لیے ناقابل برداشت ہیں۔یہ سب عمومی بحثیں، ان باتوں کی اہمیت اور سچائی کو نیست و نابود کر دیتی ہیں جن کے بارے میں میں سوچتا ہوں۔

۵۔ شادی دو افراد کا اشتراک ہے جس میں ہر فرد اپنی انفرادیت کھو بیٹھتا ہے۔مجھے یہ خوف ہے کہ تب میرے لیے مزید تنہا رہنا ممکن نہیں ہوگا۔

٦۔ ماضی میں بالخصوص اپنی بہنوں سے میرا رویہ میرے اس رویئے سے بالکل مختلف رہا ہے جو دوسرے لوگوں کے ساتھ تھا۔میں اس وقت کے علاوہ جب میں لکھتا ہوں،کبھی کبھار نڈر، طاقتور اور بے باک حیران کن ہوتا ہوں اگر میں شادی کے بعد مستقلاً ایسا ہوجاتا ہوں تو میری تحریریں کیا ختم نہیں ہوجائیں گی؟

۷۔ اگر میں تنہا رہوں تو شاید کسی روز اپنے کام سے دست بردار ہو پاؤں۔لیکن شادی کے بعد میرے لیے ایسا ممکن نہیں رہے گا۔

یہ وہ دور تھا جب کافکا نے بے تحاشا اور بلا تکان مطالعہ کیا۔اس نے دنیا کے کلاسیکی ادب کو پڑھا۔ وہ گوئٹے کا دلدادہ تھا اور عموماً اس کے فقروں اور مصرعوں کا حوالہ دیا کرتا۔اگست ۱۹۱٦ء میں اسے پہلی بار خون کی کھانسی آئی۔وہ فوری طور پر ڈاکٹر سے رجوع کرنے پر آمادہ نہیں ہوا۔لیکن اسی برس ستمبر میں اس نے اپنا طبی معائنہ کروایا تو اسے تپ دق کا خدشہ ظاہر کیا گیا۔دسمبر میں فیلس اس سے ملنے پرا گ آئی۔یہ

ان کی آخری ملاقات تھی۔ وہ کرسمس کی چھٹیاں منانے آئی تھی۔ وہ برلن میں ایک بہت بڑی فرم کی منیجر تھی۔ وہ کافکا سے اپنے معاملے کو حتمی شکل دینا چاہتی تھی۔ اس المیہ ناٹک کا، جو گذشتہ پانچ برس سے کھیلا جا رہا تھا، اختتام ہوا۔ میکس براڈ کافکا کی سوانح عمری میں لکھتا ہے "فیلس کو سٹیشن پر الوداع کر کے کافکا سیدھے میرے دفتر میں آیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ میں نے اسے دلاسہ دیا تو وہ یکبارگی زار و قطار رونے لگا۔" اس واقعہ کے پندرہ ماہ بعد اطلاع ملی کہ برلن میں فراؤلین کی شادی ہو گئی۔ اس طور یہ معاملہ اپنے حتمی انجام کو پہنچا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ کافکا فراؤلین کی یاد کو کبھی اپنے دل سے محو نہیں کر سکا۔ وہ اس کے لیے ایک مثالی عورت اور اس کی پہلی محبت تھی۔

۱۹۱۸ء کے موسم گرما میں اس نے اپنی زندگی کے معمولات کو ایک نئے سرے سے ترتیب دیا۔ وہ صبح دفتر جاتا۔ سہ پہر کو باغبانی کرتا۔ شام عبرانی زبان سیکھنے اور تلمود کا مطالعہ کرنے میں بسر کرتا۔ اسی اثناء میں اس نے اپنی کتاب "ایک دیہاتی معالج" کو مرتب کرنا شروع کیا جس میں کل چودہ کہانیاں شامل ہیں۔ لیکن زندگی کی یہ باقاعدگی زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہی۔ وہ اپنی گرتی ہوئی صحت سے مجبور ہو کر سینی ٹوریم میں منتقل ہو گیا۔ اس کی گزراوقات کا واحد معاشی وسیلہ اس کی پنشن تھی۔

۱۹۱۹ء میں وہ لیبوخ کے نزدیک ایک جگہ رہائش پذیر تھا۔ اس کی ایک لڑکی سے منگنی ہوئی جو کچھ عرصے بعد ٹوٹ گئی۔ اسی برس نومبر میں اس نے ایک مختصر ناولٹ "اپنے باپ کے نام ایک خط" لکھا جو سہل ممتنع کے عمدہ ترین مثال ہے اور اس کا سوانحی خاکہ بھی۔ ۱۹۲۰ء میں اس کی ملاقات ملینا سے ہوئی۔ وہ ان دنوں اس کی جرمن تحریروں کو چیک زبان میں ترجمہ کر رہی تھی۔ وہ اس سے پراگ میں ملا۔ چند ہی ملاقاتوں کے بعد دونوں میں گہرا جذباتی تعلق استوار ہوا جو محبت کی صورت میں منتج ہوا۔ کافکا نے اپنے روز ناموں اور خطوط میں ملینا کو ہمیشہ (M) کے انگریزی حرف سے مخاطب کیا ہے۔

ملینا شادی شدہ لڑکی تھی لیکن اس کی ازدواجی زندگی غیر آسودہ تھی۔ وہ کافکا کی معترف تھی اور اس سے ملاقات سے پہلے ہی اسے پسند کرتی تھی۔ دوسری جانب کافکا فیلس سے جدائی کے گہرے صدمے کے کرب سے گزر رہا تھا۔ چناں چہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنجر زمین پر ابرنیساں کی پہلی پھوار اور اپنے غموں کا مداوا ثابت ہوئے۔ اس دوران میں وہ مسلسل خون تھوکتا اور ملینا سے شادی کے وعدے کو ٹالتا رہا۔ وہ اسے دن میں کم از کم دو خط لکھتا۔ ۱۹۲۲ء میں اس کی چار کہانیاں 'فاقہ کش فن کار' کے عنوان

سے ایک رسالے میں شائع ہوئیں۔ یہ اس کے چھپنے والی آخری تحریریں تھیں۔ اسی برس وہ خاموشی سے پراگ چلا گیا اور اپنے ناول ''قلعہ'' پر کام شروع کیا۔ ۱۹۲۳ء کا سرما اس کی زندگی کا آخری سرما تھا۔

وہ ۱۹۱۵ء میں اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے۔ ''حقیقتاً'' ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو مجھے سمجھتا ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص آپ کے متعلق ایسا فہم رکھتا ہے مثلاً کوئی عورت، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ ہر جانب اعتماد سے قدم بڑھا سکتے ہیں یعنی اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کو خدا مل گیا۔'' کافکا نے اپنے خیر خواہوں اور مداحوں کے انبوہ کثیر میں خود کو ہمیشہ تنہا محسوس کیا۔ یہ تنہائی اس کی ذات کی شناخت تھی۔ اسی تنہائی کے بطن سے اس کی ہر تخلیق پھوٹی جیسے وہ اس کی ذات کی ایک آزمائش ہو یا ایک عکس ہو۔

۱۹۲۳ء کے موسم گرما میں کافکا کی زندگی میں ایک انقلابی واقعہ رونما ہوا۔ وہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر اپنی بہن اور اس کے بچوں کے ساتھ بالٹک کے ساحلی علاقے میورز میں ٹھہرا ہوا تھا، جہاں وہ ''برلن جیوش پیپلز ہوم'' میں گیا۔ وہ اس ادارے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس آبادکاری کی بناء ڈاکٹر ''لی مین'' (Lehmann) نے رکھی تھی۔ جن دنوں ڈاکٹر صاحب اپنی ابتدائی تیاریوں میں مصروف تھے، کافکا نے برلن میں اپنی منگیتر فیلس سے تاکید کی تھی کہ وہ اس نیک کام میں ان کا عملاً ہاتھ بٹائے۔ اب وہ کئی سال بعد اس ''ہوم'' میں گیا تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ یہاں اساتذہ سے ملا اور ان کے ساتھ مختلف سماجی تقریبات میں شریک ہوا۔ ایک مرتبہ وہ اسی ہوم میں گیا تو اس نے باورچی خانے میں ایک نوخیز دوشیزہ کو کام کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ مچھلی کاٹ رہی تھی۔ وہ معاً بے اختیار بولا ''ایسے نازک ہاتھ اور ایسا سخت کام'' وہ لڑکی شرما گئی۔ یہ کافکا کی اپنی شریک حیات ڈورا ڈائمنڈ سے پہلی ملاقات تھی۔

ڈورا ڈائمنڈ انیس بیس برس کی دوشیزہ تھی۔ وہ پولینڈ کے ایک راسخ العقیدہ خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ وہ اپنے باپ کی تنگ نظری اور بے جا پابندیوں کے خلاف گھر سے بھاگ آئی تھی۔ پہلے وہ بریسولا میں کام کرتی رہی پھر برلن چلی آئی اور اس کے بعد مختلف جگہوں پر کام کرتے ہوئے آخر اسی ہوم میں ملازم ہوگئی۔ وہ عبرانی زبان کی طالبہ تھی اور یہی وہ دور تھا جب کافکا پورے خضوع و خشوع کے ساتھ عبرانی زبان سیکھ رہا تھا۔

کافکا گرمیوں کی تعطیلات کے بعد گھر لوٹا تو بہت پُر اُمید اور پُر جوش تھا۔ اس نے تمام بندشوں کو

توڑ کر ڈورا کے ساتھ برلن میں زندگی گزرانے کا حتمی فیصلہ کیا۔ جولائی کے اختتام پر وہ اپنے خاندن کی تمام مخالفتوں کے باوجود پراگ سے روانہ ہوا۔ برلن سے اس نے اپنے دوست میکس براڈ کو لکھا کہ 'وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی خوشی محسوس کر رہا ہے'۔ وہ ڈورا کے ساتھ سٹیگلٹز کے قصبے میں مقیم ہوا۔ وہیں اس نے ایک خوشگوار کہانی ''چھوٹی عورت'' لکھی۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسی عورت ہے جو تمام عمر اپنی ہی انا کے ساتھ، جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھی، مستقل برسرِ پیکار رہی۔ درحقیقت یہ عورت کافکا کی مالک مکان تھی جو اس جوڑے کے لیے مسلسل مشکلات پیدا کرتی۔ چھ ہفتے اس قصبے میں قیام کے بعد یہ جوڑا ایک خاتون معالج ریتھبرگ کے ساتھ اس کے گھر ٹھہر گیا جو کافکا کی مداح تھی۔ یہی وہ دور تھا جب کافکا نے پہلی بار خود مختاری حاصل کی جو اس کا دیرینہ خواب تھی اور اپنے باپ کی آمریت سے فرار کا واحد راستہ بھی۔

کافکا نے ڈائمنڈ کے ساتھ اپنا الگ گھر بنایا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ کافکا اور کرکیگارڈ کی زندگیوں کی مماثلت محض اسی قدر ہے کہ دونوں ایک شدید احساسِ گناہ کے تحت شادی شدہ زندگی سے دور رہے لیکن ایسی زندگی کافکا کی آئیڈیل نہیں تھی۔ وہ اپنے روزنامچوں اور خطوط میں ہمیشہ اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اپنا الگ گھر اور خاندان بنانا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اس خواہش کے لیے اپنی زندگی کے اصولوں سے کوئی سمجھوتا گوارا نہیں کرتا۔

۱۹۲۳ء میں میکس براڈ نے کافکا کو ایک اشاعتی ادارے Die Schmiege کے مہتمم سے متعارف کرایا تو وہ خلافِ دستور کسی حیل وحجت کے بغیر اپنی کتاب 'فاقہ کش فن کار' چھپوانے پر رضامند ہو گیا۔ اسی دوران میں اس نے اپنی بہن ویلی کو ایک طویل خط لکھا۔ یہ ایک خوشحال اور آسودہ انسان کی تحریر تھی۔ پھر ۱۹۲۳ء کے موسم سرما کا آغاز ہوا جو حقیقتاً کافکا کی موت کو اس کے مزید قریب لے آیا۔ یہ اس کا آخری موسم سرما بھی تھا۔ اسی دوران میں ڈورا ڈائمنڈ نے کافکا کے دوست میکس براڈ کو بتایا ''ہر مرتبہ جب کافکا اس پرسکون قصبہ سے برلن جاتا ہے تو وہاں سے ایسے لوٹتا ہے جیسے وہ میدانِ جنگ سے آ رہا ہو۔ اس نے ایسے کرب اور اذیت کے ساتھ زندگی گزاری ہے کہ وہ اپنی ایک زندگی میں ہزاروں بار مرا ہو گا'' کافکا مالی طور پر کبھی آسودہ نہیں رہا۔ اس کا واحد معاشی وسیلہ اس کی پنشن تھی۔ صرف انتہائی مجبوری میں ہی وہ خاندان کی طرف سے کسی مالی امداد کو قبول کرتا۔ وہ اپنی کمزور معاشی خود مختاری کو کسی طور

گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ چناں چہ وہ زندگی کی آخری سانسوں تک جنگ لڑتا رہا۔ اسے اشاعتی ادارے سے جونہی کچھ رقم ملی تو اس نے فوری طور پر پہلا کام یہ کیا کہ اپنے قرض چکائے۔

۱۹۲۳ء کی کرسمس کی چھٹیوں میں وہ پھر سے شدید بخار میں مبتلا ہوا۔ وہ مہنگائی سے بہت بدحواس تھا۔ ڈاکٹر کی فیس، دواؤں اور اشیائے خوردنی کی ارزانی نے اسے دق کر دیا تھا۔ لیکن وہ کسی سے مدد نہیں مانگتا تھا۔ بلکہ جو کوئی اس کی زبوں حالی پر اظہار ہمدردی کرتا تو وہ اپنی مالی ناآسودگیوں کو ایک مزاحیہ انداز میں بیان کرنے لگتا۔ مثلاً ایک مرتبہ اس نے اپنے دوست میکس براڈ سے مل کر ایک چھوٹا سا ہوٹل چلانے کا منصوبہ بنایا جس میں اس کی شریک حیات ڈورا کھانا پکائے گی اور وہ خود وہاں بیرہ گیری کرے گا۔ سردیوں کے اختتام تک اس کی صحت بدترین ہوگئی۔ ۱۷ مارچ ۱۹۲۴ء کو اسے پراگ میں اس کے والدین کے گھر لایا گیا اور اس کا باقاعدہ علاج شروع ہوا۔ اب وہ اپنے عارضہ سے زیادہ موثر انداز میں لڑسکتا تھا۔ اس کے علاج معالجہ کا خرچ اب اس کے والدین برداشت کر رہے تھے۔ لیکن اس حقیقت کو وہ بہت واضح انداز میں جان چکا تھا کہ وہ خود مختار ہونے کی جنگ مکمل طور پر ہار چکا تھا۔

اسے سینی ٹوریم میں داخل کروایا گیا۔ بعدازاں اسے ویانا کے کلینک میں لے جایا گیا جہاں اس کے مرض کی باقاعدہ تشخیص ہوئی اور وہ تپ دق ثابت ہوا۔ کلینک میں اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ یہاں سے اسے ایک بہتر سینی ٹوریم میں منتقل کیا گیا جہاں ایک خوبصورت اور رنگ دار پھولوں سے سجے ہوئے کمرے میں کافکا نے زندگی کے آخری ایام گزارے۔ وہ اپنے مرض کی سنگینی سے آگاہ تھا لیکن وہ حیرت انگیز طور پر اپنے بارے میں بہت پُر اُمید تھا۔ اسے وقفے وقفے سے خون آلود کھانسی کے دورے پڑتے جس سے اس کے پھیپھڑوں میں شدید درد اٹھتا اور وہ بے بسی کے ساتھ تڑپتا۔ ڈاکٹر آسکر بیک اور پروفیسر نیومین کو بطور خاص اس کے علاج کے لیے بلایا گیا تھا لیکن انھوں نے واضح الفاظ میں ڈورا کو بتایا کہ کافکا اب چند ماہ کا مہمان ہے۔ اس کے پھیپھڑے قابل علاج نہیں رہے تھے۔

آخری چند ہفتوں میں اسے کم بولنے کی ہدایت کی گئی۔ وہ اپنے دوستوں سے کاغذ پر لکھ کر گفتگو کرتا۔ مثلاً ایک دفعہ اس نے لکھا ''کہانی کا عنوان بدل رہا ہے۔ یہ اب یوں ہوگا۔۔۔۔۔۔ ''گلوکارہ جوزیفائن اور چوہوں کی قوم''۔ کافکا پر کم بولنے کی پابندی اس کی موت تک جاری رہی۔

اس دوران میں اس کی طبیعت رفتہ رفتہ بحال ہونے لگی۔ وہ ڈورا سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے

ڈورا کے باپ کو ایک خط لکھا اور وضاحت کی کہ اگرچہ وہ ایک راسخ العقیدہ یہودی نہیں تھا لیکن وہ اپنی مذہبی غفلت پر نادم تھا اور اپنے آپ میں تبدیلی لانا چاہتا تھا۔ پھر اس نے درخواست کی کہ کیا وہ اُمید رکھے کہ وہ اس جیسے پارسا انسان کے خاندان کا فرد بن سکتا ہے۔ ڈورا کے باپ نے اس خط کو ساتھ لیا اور مشورے کے لیے اپنے قابلِ احترام مذہبی باپ سے رجوع کیا۔ اس نے خط پڑھا اور اسے ایک جانب رکھ کر خاموش ہو گیا۔ اسے مزید انتظار کرنے کو کہا۔

تاہم کافکا کی فوری موت نے اس کی خاموشی کی وضاحت پیش کر دی۔ کافکا اپنے مرض کی پیچیدگی اور سنگین نوعیت سے لاعلم نہیں تھا۔ لیکن وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک شریک حیات کو پایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایک بھرپور اور خوشگوار زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ وہ اپنا گھر بنانا اور خودمختار ہونا چاہتا تھا جس کی اس نے ہمیشہ آرزو کی۔ وہ حیرت انگیز احتیاط اور پابندی سے ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرتا جسے دیکھ کر اس کے قریبی دوست جو اس کی بے نیازی اور آزاد منشی سے شناسا تھے، حیران ہوتے۔ لیکن وہ کسی طور اپنی موت کو روک نہیں سکا۔

میکس براڈ اپنی کتاب ''کافکا کی سوانح حیات'' میں اس جوڑے کے متعلق لکھتا ہے ''یہ دونوں حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے کے لیے موافق تھے۔ ڈورا کی مذہبی سوجھ بوجھ کافکا کو ہمیشہ ورطہ حیرت میں ڈالتی اور ڈورا کے لیے کافکا ایسا استاد تھا جس کی اس نے ہمیشہ خواہش کی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بچوں کی طرح مذاق کرتے اور ہنستے کھیلتے۔ مثلاً کبھی کبھار وہ دونوں باورچی خانے میں پانی کے بیسن میں اپنے ہاتھ ڈبو کر کہتے کہ ''پورا خاندان غسل کر رہا ہے۔''

کافکا کو ڈورا کی صورت میں ایک عورت، ایک ماں اور ایک دوست ملی تھی۔ ایک مرد زندگی میں ایسی ہی عورت کی خواہش کرتا ہے جو بیک وقت یہ تینوں کردار ادا کرے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کافکا بار بار ڈورا کو اپنے گلے سے لگا لیتا اور کہتا میں نے کبھی اس بے وفا زندگی کی اتنی خواہش نہیں کی جتنی آج مجھے ہے۔

۲ جون ۱۹۲۴ء کو کافکا کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ اس کے تمام دوست اس کے بستر کے گرد جمع ہو گئے۔ اس کے درد میں افاقے کے لیے اسے مارفیا کے ٹیکے لگائے گئے۔ اپنی موت سے چند لمحے پیشتر اس نے نرس کو نہایت کٹھور لہجہ میں کمرے سے نکل جانے کو کہا اور برف کی تھیلی کو نوچ کر فرش پر پھینک دیا

اور چلا کر کہا ''مجھے مزید اذیت مت دو۔ آخر تم مجھے ایک ہی بار کیوں نہیں مار دیتے۔''

کافکا نزع کے عالم میں تھا۔ اس کا دوست کلوپسٹک کسی غرض سے اٹھ کر ایک طرف جانے لگا تو کافکا نے کہا ''مجھے چھوڑ کر مت جاؤ'' دوست نے جواب دیا ''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں''

کافکا نے گہری آواز میں کہا ''لیکن میں تمھیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''

یہ کافکا کے آخری الفاظ تھے۔ وہ ۳ جون ۱۹۲۴ء بروز منگل اس سرائے فانی سے ایک پُر اذیت اور تنہا زندگی گزار کر کوچ کر گیا۔ اس کی لاش کو ایک چوبی تابوت میں پراگ لایا گیا۔ ۱۱ جون کو سہ پہر ۴ بجے اسے یہودیوں کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔

اسی برس کافکا کے مسودات کو کھنگالتے ہوئے اس کے دوست میکس براڈ کو کافکا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو رقعے ملے۔ ایک سیاہی سے لکھا گیا تھا اور ۱۹۲۱ء کے بعد کی تحریر تھی۔ جب کہ دوسرا رقعہ کچھ پرانا تھا۔ اسے پنسل سے لکھا گیا تھا۔ اس کی تحریر بہت شکستہ تھی اور عبارت کچھ یوں تھی ''یہ میری آخری خواہش ہے کہ میرے تمام مسودوں کو بغیر کسی استثناء کے بغیر پڑھے جتنی جلدی ممکن ہو، جلا دیا جائے'' اپنی موت سے کچھ عرصہ پیشتر کافکا نے اپنے گہرے دوست میکس براڈ کو ایک خط لکھا جس میں اپنی ایسی ہی ایک خواہش کا اظہار کیا تھا۔

وہ لکھتا ہے ''عزیزم میکس! میری تم سے آخری استدعا ہے کہ میری الماریوں میں، درازوں میں، میرے کمروں میں، دفتر میں یا جہاں بھی میری کوئی تحریر، روزنامچوں، مسودوں، خطوط یا کسی بھی اور صورت میں تمھیں ملے، چاہے وہ مکمل ہو یا ادھوری، چاہے وہ تمھارے پاس ہو یا دوسروں سے تمھیں حاصل ہو، اسے بغیر پڑھے جلا دو۔ جو لوگ میرے خطوط واپس کرنے سے انکار کریں ان سے انھیں جلد از جلد لینے کا وعدہ لو۔۔۔۔۔۔۔۔تمھارا فرانز۔'' میکس براڈ نے دنیائے ادب کو اپنا زیر بار احسان کرتے ہوئے نہایت احترام کے ساتھ اپنے دوست کی آخری خواہش کو پورا نہیں کیا اور اسے کسی بھی صورت میں کافکا کی جو تحریر ملی، وہ اس نے چھپوا دی۔

محمد عاصم بٹ

مقتل

''یہ ایک غیر معمولی آلہ ہے۔'' افسر نے مہم جو سے کہا اور آلے کا بنظر تحسین معائنہ کرنے لگا جو اس کے لئے غیر مانوس ہر گز نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تھا مہم جو نے اپنی منشاء کے خلاف محض لحاظ داری میں ایک سپاہی کی سزائے موت کا منظر دیکھنے کی دعوت قبول کی تھی جسے اپنے افسر کی نافرمانی اور اس سے اہانت آمیز رویہ روا رکھنے کے جرم میں اس انجام کو پہنچایا جا رہا تھا۔

بستی کے دیگر باسیوں نے بھی اس واقعہ میں زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ اس مختصر ریتلی وادی میں، جو تمام اطراف سے ننگے ٹیلوں میں گھرا ہوا ایک گہرا گڑھا معلوم ہوتی تھی، ایک افسر، مہم جو، ایک مجرم جو شکل سے احمق دکھائی دینے والا چوڑے دھانے اور پریشان حال بالوں والا انسان تھا اور ایک سپاہی کے علاوہ جو مجرم کے ٹخنوں، کلائیوں اور گردن سے بندھی زنجیروں کو تھامے ہوئے تھا، اور کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ یہ زنجیریں مجرم اور سپاہی کے درمیان مواصلاتی رابطے کا کام بھی کرتی تھیں۔ مجرم ایک تسلیم خو کتے کی مانند معلوم ہوتا تھا جسے دیکھ کر گماں ہوتا کہ اسے اردگرد پہاڑیوں میں چھوڑ دیا جائے گا اور ایسا محض سیٹی بجنے کے فوراً بعد ہوگا جو سزا کے شروع ہونے کا اشارہ ہوگی۔

مہم جو نے آلے میں چنداں دلچسپی ظاہر نہ کی اور واضح بے نیازی کے ساتھ مجرم کے عقب میں آگے پیچھے چکر کاٹنے لگا۔ افسر انتظامات کو حتمی صورت دینے لگا۔ کبھی آلے کو نیچے سے دیکھتا جو زمین میں اندر تک گڑا ہوا تھا۔ کبھی سیڑھی پر چڑھ کر بالائی پرزوں کا جائزہ لیتا۔ اصولی طور پر یہ ایک مستری کے

کرنے کے کام تھے۔ تاہم وہ خود ہی جوش وخروش سے ان میں جتا ہوا تھا۔ غالباً اس لئے کہ وہ اس آلے سے گہری واقفیت رکھتا تھا یا کسی دوسری وجہ سے وہ کسی دوسرے پر اعتماد کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

''بالکل تیار ہے۔'' آخر کار اس نے پکار کر کہا اور سڑھی سے نیچے کودا۔ وہ غیر معمولی طور پر لنگڑا رہا اور پورا منہ کھولے ہانپ رہا تھا۔ اس نے دو عمدہ نسوانی رومال اپنی وردی کے کالر کے تلے دبا کر رکھے۔

''یہ وردیاں منطقہ حارہ کے علاقوں کے لیے موزوں نہیں ہیں۔'' مہم جو نے آلے سے متعلق کچھ تفتیش کرنے کے بجائے جیسا کہ افسر توقع کر رہا تھا' اس سے کہا۔

''بے شک۔'' افسر نے چکنے تیل آلودہ ہاتھوں کو پانی سے بھری بالٹی میں دھوتے ہوئے کہا ''لیکن یہ وردیاں ہمیں اپنے گھروں کی یاد دلاتی ہیں۔ ہم اپنے گھروں کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ اس آلے پر ایک نظر ڈالئے۔'' اس نے تولئے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے مشین کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے ہر شے کو ہاتھ سے درست کرنا پڑا ہے۔ لیکن یہ مشین اپنے آپ کام کرے گی۔'' مہم جو نے سر ہلایا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ افسر نے خود ہی ممکنہ اختلافات کا قیاس کر کے اپنی صفائی میں کہا۔ ''بعض اوقات اس میں گڑبڑ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے آج یہ ایسا کچھ نہیں کرے گی۔ تاہم ممکنات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اس مشین کو اگلے بارہ گھنٹوں تک بغیر رکے چلنا چاہئے۔ اگر کچھ نقص پیدا ہوا بھی تو وہ زیادہ بڑا نہیں ہوگا۔ اس کا فوراً ہی سدباب کیا جا سکتا ہے۔ آپ بیٹھیں گے نہیں؟'' افسر نے بید کی کرسیوں کے انبار میں سے ایک مہم جو کے لئے گھسیٹ کر نکالی اور اسے پیش کی۔ وہ اس پیشکش کو رد نہیں کر سکا۔

اس کے برابر ہی ایک گڑھا تھا جس میں اس نے ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ وہ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ گڑھے میں ایک طرف کھدی ہوئی مٹی کو پشتے کی صورت میں ڈھیر کیا گیا تھا۔ دوسری جانب مشین ایستادہ تھی۔

''میں نہیں جانتا کہ افسران بالا نے اس آلے کے متعلق آپ کو کچھ وضاحت کی ہے یا نہیں۔'' افسر نے کہا۔ مہم جو نے مبہم انداز میں ہاتھ ہلایا جس کا مطلب تھا کہ اسے ہی یہ کام کرنا ہوگا۔

''یہ آلہ۔'' افسر نے اس پر جھکتے ہوئے کہا ''ہمارے سابقہ افسر بالا نے ایجاد کیا تھا۔ میں نے ابتدائی آزمائشوں میں بھی ان کی معاونت کی۔ پھر تکمیل تک سارے عمل میں ان کے ساتھ رہا۔ لیکن اس ایجاد کا سہرا انہی کے سر بندھتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی ان کا تذکرہ سنا ہے؟''

''نہیں۔''

''اگر میں کہوں کہ یہ ساری منصوبہ بندی انھی کا کارنامہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہم جوان کے دوست ہیں، ہمیں ان کی وفات سے بہت پہلے اس حقیقت کا مکمل شعور تھا کہ ان کی منصوبہ بندی مکمل ترین ہے ۔اور یہ کہ ان کے جانشین اپنے ذہنوں میں بھرے ہزاروں نئے منصوبوں کے باوجود کم از کم آئندہ کئی سالوں تک اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں بنا پائیں گے۔ ہماری یہ پیشین گوئی بالکل درست ثابت ہوئی۔ نئے افسران اعلی کو اس سچائی کو ماننے بغیر چارہ نہیں ہے۔افسوس کہ آپ سابقہ افسر اعلی سے نہیں مل پائے۔ لیکن۔'' افسر نے کچھ توقف کیا پھر بولا'' شاید میں غیر ضروری بات کر رہا ہوں۔ یہ مشین ہمارے سامنے موجود ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔اس کے تین حصے ہیں جنہیں مختلف نام دیئے گئے ہیں۔زیریں حصے کو بستر کہتے ہیں۔ اوپر والے حصے کو ڈیزائنر اور درمیانی حصے کو' جو اوپر نیچے گھومتا ہے' کھانچے دار سیراون کہتے ہیں۔''

''سیراون۔'' مہم جو نے لفظ دہرایا۔ وہ افسر کی گفتگو انہماک سے نہیں سن رہا تھا۔اس بے سایہ وادی میں سورج کی چمک تیز تھی اور ذہن میں خیالات کو مجتمع کرنا دشوار ہو رہا تھا۔کندھوں پر لگی متعدد جھالروں اور چھاتی پر لگی بہت سی جیبوں والی اپنی چست وردی اور کوٹ میں ملبوس افسر خضوع وخشوع کے ساتھ اپنے مدعا کی وضاحت کر رہا تھا۔ساتھ ساتھ وہ پیچ کش سے یہاں وہاں پیچ بھی کستا جاتا۔

فوجی کی حالت مہم جو سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔اس نے قیدی کی زنجیر کو اپنی کلائیوں میں لپیٹ لیا تھا۔وہ اپنی رائفل کی ٹیک لیے بیٹھا تھا اور سر جھکائے بے نیاز معلوم ہوتا تھا۔مہم جو کے لئے اس کی لاتعلقی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔افسر فرانسیسی میں گفتگو کر رہا تھا جبکہ فوجی اور قیدی دونوں اس زبان سے نابلد تھے ۔تاہم یہ بات غیر معمولی تھی کہ قیدی اس کے باوجود افسر کی گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔وہ افسر کی گھومتی ہوئی انگلی کی سمت میں دیکھتا اور جب مہم جو سوال کرتا تو افسر کی طرح وہ بھی اپنے اردگرد تکنے لگتا۔

''ہاں دندانے دار سیراون۔'' افسر نے کہا'' یہ اس کے لئے موزوں نام ہے۔اس میں سیراون کے دانتوں کی طرح سوئیاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ مشین ایک سیراون کی مانند کام کرتی ہے۔تاہم اسے سنبھالنے کے لیے اعلی مہارت کی ضرورت ہے۔خیر آپ جلد ہی سمجھ لیں گے۔ یہاں بستر پر مجرم کو لٹا دیا جاتا ہے۔اصل میں میں چاہتا ہوں کہ مشین چلانے سے پہلے اس کے بارے میں آپ کو وضاحت سے

بتاؤں۔ یوں آپ آئندہ ہونے والی کارروائی کو بہتر انداز میں سمجھ پائیں گے۔ ڈیزائنر میں ایک دندانے دار پہیا کچھ خراب ہے۔ چلتے ہوئے چرچراتا ہے۔ اتنا شور کرتا ہے کہ آپ کو اپنی آواز بھی سنائی نہیں دیتی ۔ بدقسمتی سے یہاں فالتو پرزوں کی دستیابی ایک مسئلہ ہے۔ خیر جیسا میں نے آپ کو بتایا ہے' مجرم کو بستر پر لیٹا دیتے ہیں۔ بستر روئی کی تہہ سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس کے مصرف کے بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ یہاں مجرم کو اوندھے منہ لٹایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے بالکل برہنہ۔ اس کے ہاتھ پیروں اور گردن کو کس کر باندھنے کے لئے پٹیاں موجود ہیں ۔ بستر کے سرہانے' جہاں اوندھے لیٹے ہوئے مجرم کا سر ہوتا ہے' کپڑے کا ایک پارچہ ایسے لگایا گیا ہے کہ آسانی سے مجرم کے منہ میں گھس جائے۔ یہ انتظام اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ اس کی چیخوں اور اسے اپنی زبان کو کاٹنے سے روکا جا سکے۔ ظاہر ہے مجرم کو مجبور کرنا پڑتا ہے کہ وہ اسے منہ میں ڈالے۔''

''کیا یہ اون ہے؟'' مہم جو نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' افسر نے مسکرا کر جواب دیا'' آپ خود ہی دیکھ لیجئے۔'' اس نے مہم جو کا ہاتھ تھاما اور اسے بستر کی طرف لے چلا۔'' یہ خاص طور پر تیار کی گئی اون ہے۔ اسی لئے یہ اتنی مختلف دکھائی دیتی ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ کس لئے ہے۔''

مشین میں مہم جو کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔ اس نے آنکھوں کو سورج کی تیز روشنی سے بچاتے ہوئے مشین کو بغور دیکھا۔ یہ ایک عظیم الجثہ شے تھی۔ بستر اور ڈیزائنر ایک ہی حجم کے تھے اور دو تاریک چوبی الماریاں معلوم ہوتے تھے۔ ڈیزائنر بستر سے قریب دو میٹر اوپر ٹنگا ہوا تھا۔ ہر حصہ کناروں پر پیتل کی چار سلاخوں سے جڑا ہوا تھا جو سورج کی شعاعوں کو منعکس کر رہی تھیں۔ ان الماریوں کے بیچ سیر اون سٹیل کی تار سے بندھا ہوا تھا۔ افسر خاموش ہو گیا تاکہ مہم جو کسی مداخلت کے بغیر آلے کا مشاہدہ کر سکے۔

''مجرم یہاں لیٹ جاتا ہے؟'' مہم جو نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' افسر نے اپنی ٹوپی پیچھے کھسکائی اور ہاتھ کو گرم چہرے پر پھیرا۔'' ذرا غور سے سنئے۔ بستر اور ڈیزائنر دونوں میں برقی بیٹریاں لگی ہوئی ہیں جن کی مدد سے یہ اپنے آپ ہی کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جونہی مجرم کو پٹیوں سے باندھا جاتا ہے' مشین تھرتھرانے لگتی ہے۔ آپ نے ہسپتالوں میں ایسی

مشینیں دیکھی ہوں گی۔ اس مشین کے بستر پر تمام حرکات پہلے سے واضح طور پر طے شدہ ہوتی ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسے سیراون کی حرکات کی مناسبت سے چلنا ہوتا ہے۔ سیراون سزا کو حقیقی صورت دینے والا آلہ ہے۔''

''سزا کس طرح دی جاتی ہے؟'' مہم جو نے پوچھا۔

''کیا آپ یہ بھی نہیں جانتے؟'' افسر نے حیرت سے پوچھا اور ہونٹ کاٹنے لگا۔ ''اگر میری توضیحات ناکافی رہی ہیں تو میں معذرت خواہ ہوں۔ میں واقعی آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل افسر اعلیٰ ہی پہلے یہ فریضہ انجام دیتے تھے۔ اب نیا افسر اس فرض سے کنی کتراتا ہے۔'' مہم جو نے ہاتھ باندھ کر افسر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ تاہم اس نے بااصرار اپنا بیان جاری رکھا ''اسی لئے تو آپ جیسے اہم مہمان کو بھی سزا دینے کے ہمارے اس نئے نظام کی وضاحت نہیں کی گئی۔'' قریب تھا کہ افسر برانگیختہ ہو کر الم غلم بکنے لگے۔ تاہم پھر اس نے خود کو سنبھالا اور کہا ''مجھے اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے۔ خیر ہمارے طریقہ کار کی وضاحت کے لئے یہاں میں ہی بہترین آدمی ہوں۔ میرے پاس'' اس نے کوٹ کی سامنے کی جیب کو تھپتھپایا ''ہمارے سابقہ افسران بالا کے تیار کردہ نقشے موجود ہیں ۔''

''افسر بالا کے اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے خاکے'' مہم جو نے پوچھا۔ ''کیا انہوں نے ہر شے خود جوڑی تھی؟ کیا وہ سپاہی تھے یا منصف یا کاریگر یا ادویات ساز یا نقشہ نویس؟''

''بے شک ایسا ہی تھا۔'' افسر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس پر ایک بے حس اور بجھی ہوئی نگاہ ڈالی۔ پھر اپنے ہاتھوں کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ وہ اتنے صاف نہیں تھے کہ ان سے کاغذات کو چھوا جائے۔ وہ بالٹی تک گیا اور انہیں نئے سرے سے دھویا۔ پھر ایک مختصر چرمی تھیلا نکالا اور کہا ''یہ سزا سنگین نہیں ہوتی۔ مجرم نے جس فرمان کی خلاف ورزی کی ہوتی ہے' اسے سیراون کے ذریعے اس کے جسم پر گودہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شخص۔'' افسر نے مجرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اس کے جسم پر لکھا جائے گا' اپنے افسران بالا کی تکریم کرو۔'' مہم جو نے مجرم کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا اور جیسے غور سے سب کچھ سن رہا تھا تاکہ جان سکے کہ کیا کہا جا رہا تھا۔ تاہم اس کے آپس میں بھنچے ہوئے ہونٹوں کی جنبش سے مترشح تھا کہ کچھ بھی اس کے پلے نہیں پڑا تھا۔

کئی سوال مہم جو کے ذہن میں تھے۔ تاہم اس نے مجرم کو دیکھتے ہوئے محض یہ پوچھا ''کیا اسے اپنی سزا کا علم ہے؟''

''نہیں۔'' افسر نے کہا۔ وہ اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہتا تھا۔

مہم جو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''کیا واقعی اسے علم نہیں ہے کہ اسے کیسی سزا دی جا رہی ہے؟''

''نہیں۔'' افسر نے پھر سے کہا۔ پھر کچھ توقف کیا تاکہ مہم جو اپنے سوال کی مزید وضاحت کرے اور کہا ''اس کو یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سزا اس کے جسم پر لکھی جائے گی۔'' تاہم اسے قیدی کی نگاہیں اپنی جانب مڑتی محسوس ہوئیں، جیسے وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا اس کے خیال میں یہ سب کچھ درست ہو رہا تھا؟

مہم جو نے پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ''وہ یہ بھی نہیں جانتا ہوگا کہ اپنے دفاع میں اسے کیا کرنا چاہئے۔''

''اسے اپنے دفاع کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔'' افسر نے کہا اور اپنی نگاہوں کو پرے ہٹا لیا جیسے مہم جو کی طرف نہ دیکھ کر اسے اس خفت سے بچانا چاہتا ہو جو اس کے خیال میں ایسی بین باتوں کے بارے میں سوال پوچھ کر وہ محسوس کر رہا ہوگا۔

''لیکن اسے اپنے دفاع کا موقع تو ملنا ہی چاہئے۔'' مہم جو نے کہا اور اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا

۔

افسر نے محسوس کیا کہ مشین کے متعلق اسے زیادہ وضاحت سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ مہم جو کے پاس گیا۔ اسے بازو سے پکڑا اور ہاتھ کے اشارے سے مجرم کو پرے ہٹنے کو کہا جو بالکل سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ سپاہی نے آگے بڑھ کر زبردستی اسے پرے ہٹایا۔ افسر بولا ''میں بتاتا ہوں اصل بات کیا ہے۔ میں اس مقتل کا نامزد جج ہوں۔ میں سابقہ افسر اعلیٰ کا تمام تعزیری معاملات میں معاون رہا ۔ میں اس مشین کو کسی بھی دوسرے شخص سے بہتر سمجھتا ہوں۔ میرا اصول یہ ہے کہ جرم پر کبھی شک نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری عدالتیں اس اصول کو نہیں اپنا سکتیں۔ کیونکہ ان کے فیصلے کا انحصار مختلف آراء پر ہوتا ہے۔ ان کے فیصلے کی پرکھ کے لئے اعلیٰ عدالتیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ یہاں ایسا معاملہ نہیں ہے۔ کم از کم سابقہ افسر

اعلیٰ کے دور میں یہ مسئلہ نہیں تھا۔ نئے افسر نے میرے فیصلوں پر جرح کا وطیرہ اپنا رکھا ہے۔ اب تک میں اسے پسپا کرتا رہا ہوں اور آئندہ بھی ایسا ہوگا۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں یہ سارا قصہ آپ کے گوش گزار کروں۔ یہ دیگر معاملات کی طرح بہت سادہ ہے۔ ایک کپتان نے آج صبح مجھ سے شکایت کی کہ یہ آدمی' جسے اس کا ملازم متعین کیا گیا تھا اور جو روز اس کے دروازے کے باہر سوتا ہے' اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں سو رہا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ اس کا فرض ہے کہ گھڑی میں گھنٹہ بجنے پر اٹھے اور کپتان کے دروازے کو سلیوٹ کرے۔ یہ اس کا جبری فرض نہیں ہے۔ اسے ایک ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پہرے دار سنتری کا فرض بھی بجالانا ہے۔ اس لئے اسے ہر دو مواقع پر تیار رہنا چاہئے۔ گزشتہ رات کپتان نے فیصلہ کیا کہ دیکھے یہ شخص اپنا فرض دلجمعی سے پورا کرتا ہے یا نہیں۔ دو کا گھنٹہ بجا تو اس نے دروازہ کھولا۔ یہ شخص نیند میں مدہوش تھا۔ اس نے اپنا سواری کا چابک لہرایا اور زور سے اس کے چہرے پر مارا۔ تب اپنی غلطی کی معافی مانگنے کے بجائے یہ شخص اپنے مالک کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اسے جھنجھوڑا اور چیخا' یہ چابک پھینک دو۔ ورنہ میں تمہیں زندہ کھا جاؤں گا۔'' بس اتنا معاملہ ہے۔ گھنٹہ بھر پہلے کپتان میرے پاس آیا۔ میں نے اس کا بیان لکھا اور سزا سنائی۔ میں نے اس شخص کو زنجیروں میں جکڑ لیا۔ یہ سادہ سی کارروائی تھی۔ اگر میں پہلے اس شخص کو بلاتا اور تفتیش کرتا تو معاملہ الجھ بھی سکتا تھا۔ تب یہ مجھ سے جھوٹ بولتا۔ جونہی میں اس کے جھوٹ کا بھانڈا پھوڑتا' یہ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے مزید جھوٹ بولتا۔ یوں یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ خیر میں نے اسے گرفتار کرلیا ہے اور اب اسے جانے نہیں دوں گا۔ لیکن شاید ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ سزا کو زیادہ موخر نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے تو ابھی آپ کو اس مشین کے عمل کی بھی وضاحت نہیں کی ہے۔''

اس نے مہم جو کو پھر سے کرسی کی طرف دھکیلا۔ پھر مشین کے اوپر گیا اور بولا'' آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کھانچے دار سراون کی ساخت بالکل انسانی جسم جیسی ہے۔ یہ سراون مجرم کے دھڑ کے لئے ہے اور یہ ٹانگوں کے لئے۔ سر کے لئے یہ مختصر نوکدار سلاخ ہے۔ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔'' وہ متانت سے مہم جو کی جانب جھکا۔ وہ اسے ممکنہ حد تک قابل فہم وضاحت پیش کرنا چاہتا تھا۔

سیراون کو دیکھ کر مہم جو کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ قانونی کارروائی کی تشریح اسے مطمئن نہیں کر پائی تھی۔ تاہم یہ بات قابل غور تھی کہ یہ ایک مقتل تھا۔ یہاں غیر معمولی اقدامات کی ضرورت ہوتی

ہے۔ پھر نظم وضبط قائم رکھنا بھی اہم ہے۔ اس نے سوچا نئی انتظامیہ سے البتہ اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں جو اس عمل کو ایک نئی طرز کے نظام سے بدلنا چاہتی تھی اور جسے افسر کا تنگ ذہن سمجھنے کے اہل نہیں تھا۔ خیالات کے اس بہاؤ نے اسے اگلا سوال پوچھنے کی ترغیب دی ''کیا تعزیری کارروائی میں افسر اعلیٰ بھی آئیں گے؟''

''کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔'' افسر نے کہا۔ اس براہ راست سوال سے وہ کچھ ناخوش معلوم ہوتا تھا۔ اس کے انداز میں دوستانہ رویہ دھندلا گیا تھا۔ ''اسی لئے ہمیں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ اچھا تو نہیں لگتا لیکن مجبوری ہے کہ مجھے یہاں بات ختم کرنا پڑے گی۔ ابھی مشین کو صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں نقص ہے کہ یہ جلدی میلی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہی میں تمام تفصیلات سرسری انداز میں دہرا سکوں گا۔ فی الوقت صرف بنیادی باتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ مجرم بستر پر لیٹتا ہے تو یہ تھر تھرانے لگتا ہے۔ سیراون اس کے جسم پر جھک جاتا ہے۔ یہ خودکار طریقے پر کام کرتا ہے۔ اس کی سوئیاں جلد کو چھوتی ہیں۔ سب سے پہلے لوہے کا پٹہ مجرم کے گرد کسا جاتا ہے۔ اس کے بعد کارروائی شروع ہوتی ہے۔ ایک عام ناظر کو مختلف طرح کی سزاؤں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔ سیراون ہموار انداز میں ایک ہی طرح سے کام کرتا معلوم ہوتا ہے۔ جونہی یہ تھر تھراتا ہے، اس کی میخیں مجرم کی جلد میں گھسنے لگتی ہیں جو خود بھی بستر کی تھرتھراہٹ سے کانپ رہا ہوتا ہے۔ سیراون کو کانچ سے بنایا گیا ہے تاکہ سزا کے عمل کا مشاہدہ کیا جاسکے۔ کانچ میں سوئیاں پیوست کرنا ایک تکنیکی نوعیت کا مسئلہ تھا۔ لیکن مشین کو مختلف آزمائشوں سے گزارنے کے بعد ہم نے آخر اس کا حل تلاش کر لیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کوئی مسئلہ اتنا بڑا نہیں ہوتا کہ حل نہ کیا جاسکے۔ اب ہر کوئی کانچ کے پردے میں سے دیکھ سکتا ہے کہ کیسے جسم پر تحریر گودی جاتی ہے۔ کیا آپ کچھ اور نزدیک نہیں آجائیں گے تاکہ سوئیوں کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔''

مہم جو آہستگی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر سیراون پر جھک گیا۔

''یہ دیکھئے۔'' افسر نے کہا ''یہاں بہت سے سانچوں میں دو طرح کی سوئیاں لگائی گئی ہیں۔ ہر لمبی سوئی کے ساتھ ایک چھوٹی سوئی بھی ہے۔ یہ سوئیاں گودنے کا کام کرتی ہیں۔ چھوٹی سوئیاں پانی کی دھار پھینکتی ہیں تاکہ خون دھل جائے اور تحریر صاف رہے۔ خون اور پانی ان چھوٹی نالیوں سے بڑی نالیوں میں آتا ہے اور پھر ایک نلی کے ذریعے نیچے گڑھے میں گر جاتا ہے۔'' اپنی انگلی سے افسر نے پانی اور خون

کے بہنے کا صحیح راستہ بنایا۔ اس تصویر کو زیادہ مکمل کرنے کے لئے اس نے دونوں ہاتھ نلی کے سرے کے نیچے رکھے جیسے نیچے آنے والے مواد کو گرنے سے روک رہا ہو۔

مہم جو نے اپنا سر پیچھے جھٹکا۔ وہ بیٹھنے کے لئے پیچھے ایک ہاتھ سے کرسی ٹٹول رہا تھا۔ خوف کی اس کیفیت میں اس نے دیکھا کہ مجرم بھی افسر کی پیشکش کے ردعمل کے طور پر آگے جھک کر سیراون کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوئے ہوئے سپاہی کو زنجیر سے آگے جھٹکا اور کانچ کے آلے پر جھک گیا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کی مضطرب نگاہیں یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھیں کہ دونوں معزز افراد وہاں کیا دیکھ رہے تھے؟ لیکن چونکہ وہ افسر کے وضاحتی بیان کو نہ سمجھ سکا تھا' یہ ساری بات خاک بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ خالی دماغ کے ساتھ ادھر ادھر جھانک رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کانچ پر سرگرداں تھیں۔ مہم جو نے اسے پیچھے ہٹانا چاہا تو افسر نے ایک ہاتھ سے مہم جو کو روکا۔ دوسرے ہاتھ سے مٹی کا ڈھیلا اٹھایا اور سپاہی کو دے مارا۔ سپاہی نے جھٹکے سے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور مجرم کی گستاخی ملاحظہ کی۔ اپنی بندوق نیچے گرائی' ایڑیاں زمین میں گاڑتے ہوئے مجرم کو اپنی طرف کھینچا جس سے وہ لڑکھڑایا اور نیچے گر گیا۔

''اسے اپنے پیروں پر کھڑا کرو۔'' افسر چیخا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مجرم نے مہم جو کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی تھی۔ مہم جو ہنوز سیراون پر جھکا ہوا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ مجرم کے ساتھ ہونے والے سلوک کو ملاحظہ بھی کر رہا تھا۔ ''اس پر نگاہ رکھو۔'' افسر نے دوبارہ چلا کر کہا۔ پھر خود بھی مشین کے گرد گھوم کر آیا۔ مجرم کو کندھوں کے نیچے سے پکڑا اور سپاہی کی مدد سے اسے اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ وہ اس کے بازوؤں میں کانپ رہا تھا۔

''میں معاملے کو سمجھ گیا ہوں۔'' افسر کو اپنی جانب مڑتے ہوئے دیکھ کر مہم جو نے کہا۔

''سب سے اہم بات یہ ہے۔'' افسر نے مہم جو کا بازو پکڑتے اور اوپر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈیزائنر میں دھرے لگے ہیں جو سیراون کی حرکات کی نگرانی کرتے ہیں۔ یہ مشین سزا کی تحریر کی مناسبت سے کام کرتی ہے۔ میں ابھی تک سابقہ افسر اعلیٰ کی منصوبہ بندی سے استفادہ کر رہا ہوں۔ منصوبہ یہ ہے۔'' اس نے چرمی تھیلے میں سے چند کاغذات نکالے۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں انھیں آپ کو نہیں دے سکتا۔ یہ میرا گراں مایہ اثاثہ ہیں۔ آپ بیٹھ جائیں۔ میں انھیں آپ کے سامنے اس طرح کھولوں گا کہ آپ سب کچھ اچھی طرح دیکھ سکیں گے۔'' اس نے پہلا صفحہ پھیلایا۔ مہم جو کوئی توصیفی جملہ کہنا

چاہتا تھا لیکن اسے وہاں جو کچھ دکھائی دیا' وہ ٹیڑھی میڑھی سطروں کی بھول بھلیاں کے سوا کچھ نہیں تھا جو ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں۔ یہ کاغذ پر ہر طرف اس طرح پھیلی ہوئی تھیں کہ ان کے درمیان خلا بالکل مفقود تھا۔

''اسے پڑھیے۔'' افسر نے کہا۔

''میں اسے نہیں پڑھ سکتا۔'' مہم جو نے کہا۔

''یہ بالکل صاف لکھا ہے۔'' افسر نے کہا۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔'' مہم جو نے ٹال مٹول کے انداز میں کہا'' تاہم میں اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''ہاں۔'' افسر نے قہقہہ لگایا اور کاغذ کو پرے لے گیا۔ ''یہ سکول کے بچوں کی لکھی تحریر نہیں ہے۔ اسے بغور پڑھنے کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اسے ضرور سمجھ لیں گے۔ بیشک یہ مسودہ سہل الفہم نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مجرم کو ایک دم سے مار دیا جائے گا بلکہ ایک خاص وقفہ کے بعد' جو اوسطاً بارہ گھنٹوں پر محیط ہوتا ہے' یہ سب کچھ رونما ہو گا۔ قریب چھ گھنٹے کے بعد صورت حال میں اہم تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اسی لئے اصل مسودے کے گرد بے شمار دائرے اور خط ہیں۔ اصل تحریر جسم پر ایک تنگ حلقے کی صورت میں لکھی جاتی ہے۔ جسم کے باقی حصے پر تزئین و آرائش کا کام ہوتا ہے۔ کیا سیر اون اور مشین کے دوسرے حصوں کا کام آپ کو پسند آیا؟ آپ ذرا دیکھئے تو۔'' وہ سیڑھی پر چڑھ گیا۔ ایک چرخی کو گھمایا اور نیچے دیکھتے ہوئے بولا'' ادھر دیکھئے۔ ادھر ایک طرف ہی رہئے۔''

جبھی مشین چلنے لگی۔ اگر چرخی میں کھڑکھڑاہٹ نہ ہوتی تو یہ واقعی معرکے کی چیز تھی۔ افسر نے چرخی کے شور سے برانگیختہ ہوتے ہوئے اس پر گھونسا مارا۔ پھر معذرت خواہانہ انداز میں بازو مہم جو کی جانب پھیلائے نیچے اتر آیا تا کہ نیچے سے مشین کو کام کرتے ہوئے دیکھے۔ کوئی ایسا پرزہ تھا جو اسے ہی دکھائی دیا کہ ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔ سو وہ دوبارہ اوپر چڑھا۔ دونوں ہاتھوں سے ڈیزائنر کے اندر کوئی پرزہ درست کیا۔ پھر سیڑھی استعمال کرنے کے بجائے سلاخ سے ہی چمٹ کر نیچے اترا تا کہ کم سے کم وقت صرف ہو۔ پھیپھڑوں میں ہوا بھر کر پوری طاقت سے پکارتے ہوئے مہم جو کے کان میں چیخا'' کیا آپ اسے دیکھ رہے ہیں؟ سیر اون نیچے آ رہا ہے۔ جب یہ مجرم کی پشت پر تحریر کا پہلا حصہ گود لے گا تو اون کی تہہ خود کو لپیٹے

گی اور جسم کو پلٹا دے گی تا کہ سیر اون کو گودنے کے لئے نئی صاف جگہ مل سکے۔ اس دوران میں جسم کا گودا ہوا حصہ اون کی تہہ سے چپکا رہے گا جسے خاص طور پر اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ یہ خون کے اخراج کو روک دیتی اور جسم کو نئے سرے سے گودنے کے لئے تیار کرتی ہے۔ سیر اون کے کناروں پر لگی دانت نما میخیں' جوں جوں جسم گھومتا ہے' زخموں پر سے روئی کو نوچ کو ایک برتن میں پھینکتی جاتی ہیں۔ لیکن سیر اون کا کام اس سے بڑھ کر ہے۔ بارہ گھنٹے یہ اسی تحریر کو جسم پر زیادہ سے زیادہ گہرائی میں گودتا ہے۔ پہلے چھ گھنٹے تو مجرم کو درد محسوس ہوتا ہے۔ مزید دو گھنٹے بعد اس کے منہ سے نمدے کا ٹکڑا نکال لیا جاتا ہے کیونکہ تب اس میں چیخنے کی سکت بھی باقی نہیں رہتی۔ بستر کے سرہانے برقی رو سے گرم ہونے والے پیالے میں کچھ گرم پتلی کھچڑی ڈالی جاتی ہے جس سے مجرم اگر ضرورت محسوس کرے تو جس قدر زبان سے چاٹ سکے' وہ اسے نگل سکتا ہے۔ کسی مجرم نے کبھی اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ میں اپنے وسیع تجربے کی بنیاد پر جانتا ہوں کہ تقریباً اولین چند گھنٹوں میں ہی انسان کھانے کی اشتہا کھو دیتا ہے۔ تب میں یہاں گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ جاتا ہوں اور یہ سارا تماشا دیکھتا ہوں۔ مجرم اپنے آخری نوالے کو نگل نہیں پاتا۔ کچھ دیر اسے منہ میں الٹتا پلٹتا ہے۔ پھر گڑھے میں اگل دیتا ہے۔ میں تیزی سے پرے ہٹ جاتا ہوں۔ ورنہ سب کچھ میرے منہ پر آ گرے۔ چھٹے گھنٹے میں وہ بالکل خاموش ہو جاتا ہے۔ انتہائی بودے اور خشک شخص کے چہرے پر بھی نور سا چھانے لگتا ہے۔ شروعات آنکھوں سے ہوتی ہے۔ یہ ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ دیکھنے والے کا سیر اون کے نیچے لیٹ جانے کو جی کرتا ہے۔ جبھی مجرم بھی تحریر کو سمجھنے لگتا ہے۔ وہ چہرے کو بھینچ لیتا ہے جیسے وہ کچھ سن رہا ہو۔ آپ نے دیکھا کہ اس مسودے کو پڑھنا کتنا مشکل ہے۔ ہمارے کارندے اسے مجرم کے زخموں سے پڑھتے ہیں۔ بے شک یہ ایک کٹھن کام ہے۔ اس کے مکمل ہونے میں چند گھنٹے لگتے ہیں۔ تب تک سیر اون اس کے جسم کو چھید ڈالتا اور اسے گڑھے میں پھینک دیتا ہے جہاں وہ نیچے خون' پانی اور اون پر جا گرتا ہے۔ سزا پوری ہو جاتی ہے اور ہم یعنی یہ سپاہی اور میں مل کر اسے دفنا دیتے ہیں۔''

مہم جو کا دھیان بظاہر تو افسر کی باتوں میں تھا لیکن اصل میں وہ اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مشین کو چلتے دیکھ رہا تھا۔ مجرم بھی مشین کو دیکھ رہا تھا لیکن بے سمجھی کے ساتھ۔ پھر وہ متحرک میخوں کو چھونے کے ارادے سے آگے جھکا۔ سپاہی نے افسر سے خاص اشارہ پا کر چاقو سے عقب سے اس کی قمیص اور پتلون کو چیر ڈالا حتیٰ کہ دونوں نیچے گر گئے۔ وہ اپنی برہنگی چھپانے کے لئے لباس کو اٹھانے کی

کوشش کرنے لگا۔ سپاہی نے کپڑوں کو ہوا میں بلند کیا اور لباس کی باقیات کو بھی اس کے جسم سے نوچ ڈالا۔ افسر نے مشین بند کی۔ فوری طور پر پیدا ہونے والی خاموش فضا میں مجرم کو سیراون کے نیچے لٹایا گیا۔ زنجیریں کھول کر اسے پٹیوں میں کسا گیا۔ مجرم اکہرے جسم کا مالک تھا۔ جونہی سوئیوں کی نوکیں اس کے جسم کو چھوئیں' اس کی جلد میں تھرتھراہٹ دوڑ گئی۔ جب سپاہی اس کے بائیں ہاتھ کو پٹوں میں جکڑ رہا تھا' اس نے تیزی سے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا۔ اس کا ہاتھ اس طرف اٹھا جدھر مہم جو کھڑا تھا۔ افسر ایک طرف کھڑا مہم جو کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس تعزیری کارروائی پر' جس کی تفصیل اس پر واضح کر دی گئی تھی' اس کا ردعمل جاننا چاہتا تھا۔ مشین کا پٹہ ٹوٹ گیا۔ شاید سپاہی نے اسے زیادہ کس کر باندھا تھا۔ افسر ہی کو مداخلت کرنا پڑی۔ سپاہی نے اسے دکھانے کے لئے پٹے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو اٹھایا۔

افسر اس کے قریب آیا اور بولا جبکہ اس کا چہرہ ابھی تک مہم جو کی طرف مڑا ہوا تھا ''یہ ایک پیچیدہ مشین ہے۔ پرزوں کے ٹوٹنے اور ڈھیلا ہو کر کھل جانے کو روکا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان معمولی وقوعات سے اپنی عمومی رائے تبدیل کر لی جائے۔ اسی پٹے کو آسانی سے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ ایک زنجیر کو استعمال کرنا ہوگا۔'' زنجیروں کو کستے ہوئے وہ دوبارہ بولا ''مشین کا انتظام سنبھالنے کے لئے وسائل محدود کر دیئے گئے ہیں۔ سابقہ افسر اعلیٰ کے دور میں اس مقصد کے لئے مختص رقم کو میں باآسانی استعمال کر سکتا تھا اس کا ایک گودام بھی تھا جہاں ہر طرح کی مرمت کے لئے فاضل پرزہ جات موجود تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں فضول خرچ ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ ماضی میں تھا لیکن اب نہیں ہوں۔ نیا افسر اعلیٰ ہمارے پرانے طریقہ کار کو ہدف تنقید بنانے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ اس نے مشین کے لئے مختص رقم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اگر میں نیا پٹہ منگواؤں تو وہ ثبوت کے طور پر پرانے پٹے کا تقاضہ کرے گا۔ پھر نیا پٹہ دس سے کم دنوں میں نہیں ملے گا اور وہ بھی خام مواد سے بنا ہوا جو ناقص ہوتا ہے۔ آپ ہی بتائیے ایک پٹے کے بغیر میں اس مشین کو کیسے چلاؤں؟ اس بارے میں کوئی نہیں سوچتا۔''

مہم جو نے اپنے طور پر سوچا ''دوسروں کے معاملات میں حتمی طور پر دخل درمعقولات کرنا ایک پیچیدہ بات ہے۔ وہ نہ تو اس قتل گاہ کا رکن تھا' نہ اس ریاست کا باشندہ جس کی یہ مقتل ملکیت ہے۔ اگر وہ اس کارروائی کی مذمت کرے یا واقعتاً اسے رکوانے کی کوشش کرے تو وہ اسے کہیں گے کہ وہ اجنبی ہے اور

اسے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ وہ اس بات کا کوئی جواب نہیں دے پائے گا تا آنکہ وہ یہ تسلیم کرلے کہ اسے دخل اندازی کرنے کے رویے پر ندامت ہے۔ وہ محض ایک مبصر کے طور پر سفر کرتا ہے۔ دوسروں کے عدل سے متعلق رویوں کو بدلنے کی منشاء کے بغیر۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس معاملے سے اس کا کوئی مفاد وابستہ ہے۔ مجرم اس کے لئے مطلق اجنبی تھا۔ نہ اس کا ہم وطن تھا حتی کہ نہ ہی اسے اس سے کوئی ہمدردی تھی۔ اسے اعلیٰ حکام کی تجویز پر یہاں بھیجا گیا تھا۔ اعزاز کے ساتھ اس کا استقبال ہوا تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اسے سزا کے مشاہدے کے لئے بطور خاص مدعو کیا گیا تھا' اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی رائے کو خاص اہمیت دی جائے گی۔ یہ بات اس لیے بھی درست مانی جا سکتی ہے کہ افسر بالا جیسا کہ اسے معلوم تھا' اس کارروائی کو مزید جاری رکھنے کے حق میں نہیں تھا اور نہ اس کا افسر کے ساتھ رویہ ہی ہمدردانہ تھا۔''

مہم جو نے افسر کو غصے میں چیختے ہوئے سنا۔ اس نے بروقت نمدے کو مجرم کے منہ میں نہیں ٹھونسا تھا۔ متلی کی شدت سے اس نے آنکھیں بھینچ لیں اور قے کر دی۔ افسر نے بسرعت نمدے کو اس کے منہ سے نکالا اور اس کا سر گڑھے کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ تاہم دیر ہو چکی تھی۔ قے کا مواد مشین میں پھیل گیا۔

''ساری غلطی افسر اعلیٰ کی تھی۔'' افسر نے بے خیالی میں سامنے پیتل کی سلاخ کو ہلاتے ہوئے چلا کر کہا ''مشین ایک خنزیر خانے کی طرح گندی اور بدبودار ہے۔'' کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے مہم جو پر اصل صورت حال واضح کرنے کی کوشش کی۔ ''نئے لوگ بہت نازک مزاج ہیں۔ میں گھنٹوں افسر اعلیٰ سے مغز ماری کرتا رہا کہ مجرم کو سزا دینے سے پہلے پورا دن بھوکا رکھا جائے؟ انتظامیہ کی خواتین نے مجرم کو یہاں بھیجنے سے پہلے میٹھی گولیاں کھلائیں۔ یہ ساری عمر بدبودار مچھلی پر گزر اوقات کرتا رہا اور اب اسے میٹھی گولیاں کھلائی جا رہی ہیں۔ میں اس کی مخالفت میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ آخر انتظامیہ مجھے نیا نمدا کیوں نہیں لے کر دیتی جس کے لئے میں پچھلے تین مہینوں سے التجا کر رہا ہوں۔ ایسا نمدہ جسے پہلے ہی سینکڑوں افراد اپنے منہ میں لے اور اپنے آخر لمحوں میں چبا چکے ہوں' اسے منہ میں لیتے ہوئے کیا جی نہیں متلائے گا؟''

مجرم نے سر پیچھے گرا لیا۔ اب وہ پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ سپاہی مجرم کی قمیص سے مشین کو صاف

کرر ہا تھا۔ افسر مہم جو کی طرف مڑا جو کسی مبہم احساس کے تحت ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ افسر نے اسے ہاتھ سے پکڑا اور ایک طرف لے چلا۔

''میں تخلیے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں'' اس نے کہا ''کیا آپ چلیں گے؟''

''بیشک۔'' مہم جو نے کہا اور جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''اس وقت تعزیری طریقہ کار اور کارروائی کا اس بستی میں کوئی حامی موجود نہیں ہے۔ میں اس کا واحد حامی ہوں اور سابقہ اعلیٰ افسر کی روایت کا واحد امین بھی۔ میں اس طریقہ کار میں مزید اضافے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ میں نے اس کو اسی حالت میں قائم رکھنے کے لیے اپنی ساری توانائی صرف کر دی ہے۔ سابقہ اعلیٰ افسر کی زندگی میں یہ قصبہ اس کے طرف داروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے ارادے کی مضبوطی بہت معمولی حد تک میرے اندر آئی ہیں۔ لیکن اصل میں اس کی طاقت کا ایک ایٹم بھی مجھے نہیں ملا۔ اب صورت یہ ہے کہ اس کے تمام طرف دار منظر سے غائب ہو چکے ہیں۔ اب بھی ان میں سے بہت سے باقی ہوں گے۔ لیکن وہ سامنے آنے پر تیار نہیں ہیں۔ اگر آپ کا آج کافی ہاؤس جانا ہو تو سنیے گا عوامی رائے کیا ہے؟ آپ کو شائد مبہم آراء ہی سننے کو ملیں گی۔ لیکن موجودہ افسر بالا اور اس کی خواتین کے لیے یہ سب کچھ بے کار ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ افسر اعلیٰ اور اس عورت کے باعث' جس سے وہ از حد متاثر ہے' کیا یہ شاہکار' یہ زندگی بھر کی کاوش (اس نے مشین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) رائیگاں نہیں جا رہی ہے؟ کیا یہ سب کچھ ہونے دینا چاہیے؟ لیکن اب یہ سب باتیں بے کار ہیں۔ محض ایک اعلان ہو گا ور منصف کے طور پر میری حیثیت ختم ہو جائے گی۔ افسر اعلیٰ کے دفتر میں اجلاس ہو رہے ہیں اور مجھے ان میں مدعو نہیں کیا جاتا۔ آپ کے آج یہاں آنے میں بھی مجھے ان کی کوئی چال معلوم ہوتی ہے۔ وہ بزدل ہیں اور ایک اجنبی کو آڑ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

ماضی میں تعزیری کارروائی کتنے مختلف انداز میں ہوتی تھی۔ تقریب سے ایک روز پہلے ہی وادی لوگوں سے کھچا کھچ بھر جاتی۔ وہ دور دور سے یہ تماشہ دیکھنے آتے۔ صبح سویرے افسر اعلیٰ اپنی عورتوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا۔ شہنائیاں سارے میں گونج اٹھتیں۔ میں اطلاع دیتا کہ تیاری مکمل ہے۔ افسران کا اجتماع' جس میں غیر حاضر ہونے کی کبھی کسی کو جرات نہیں ہوئی' مشین کے گرد اکٹھا ہو جاتا۔ بید کی کرسیوں کا ڈھیر اس انبوہ کی نہایت مختصر باقیات میں سے ایک ہے۔ مشین بھی نئی، صاف اور چمکدار تھی۔ ہر سزا کے

موقع پر مجھے فالتو پرزے فراہم کئے جاتے۔ سینکڑوں تماشائیوں کے سامنے، جو اپنے پنجوں کے بل ممکنہ حد تک اونچا ہونے کی کوشش کرتے، افسرِ اعلیٰ بذاتِ خود مجرم کو سیر اون کے نیچے لٹاتا۔ آج جو کام ایک سپاہی انجام دیتا ہے تب وہ میرے ذمہ تھا۔ ایک امیرِ مجلس کا کام۔ اور یہ میرے لئے اعزاز تھا۔ پھر سزا شروع ہوتی۔ کوئی غیر موافق آواز مشین کے کام میں مخل نہ ہوتی۔ کچھ تو اسے دیکھنے کی بھی پرواہ نہ کرتے اور آنکھیں بند کر کے ریت پر لیٹ جاتے۔ انھیں یقین ہوتا کہ اب عدل ہوگا۔ گہرے سکوت میں مجرم کی آہوں کے سوا جو منہ میں ٹھنسے ڈھاٹے کے سبب بڑبڑاہٹ آمیز ہوتیں، اور کچھ سنائی نہ دیتا۔ اب اس مشین میں اتنا زور نہیں رہا کہ کسی مجرم کو اتنا اونچا کراہنے پر مجبور کرے کہ منہ میں ٹھنسے نمدے کے باوجود اس میں سے بڑبڑاہٹ بلند ہو۔ ان دنوں لکھنے والی سوئیوں سے خاص طرح کا تیزابی محلول رستا تھا جس کے استعمال کی اب ہمیں ممانعت ہے۔ خیر چھٹا گھنٹہ شروع ہوتا۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی کی اس منظر کو قریب سے مشاہدہ کرنے کی درخواست قبول کی جائے۔ افسرِ اعلیٰ خاص حکمت کے تحت یہ فرمان جاری کرتا کہ بچوں کو ترجیح دی جائے۔ مجھے اپنے منصب کی رعایت سے اسے دیکھنے کی سہولت حاصل تھی۔ اکثر اوقات کسی چھوٹے بچے کو بازو میں اٹھا کر میں آگے ہو جاتا۔ کیسے ہم مجرم کے چہرے پر تبدیلی ہیئت کے منظر میں محو ہوتے۔ کیسے ہمارے رخسار اس عدل کی افشانی سے بھیگ جاتے جس کا مظاہرہ وہاں ہوتا تھا۔ کیا خوب زمانے تھے!''

فرطِ جذبات میں وہ قطعی فراموش کر چکا تھا کہ کسی سے مخاطب ہے۔ اس نے مہم جو کو اپنی آغوش میں لیا اور سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ مہم جو شدید گھبراہٹ کے ساتھ مضطربانہ افسر کے سر سے پرے دیکھ رہا تھا۔ سپاہی صفائی کا کام مکمل کر چکا اور تسلے میں ایک ڈھونگے سے چاول کی پتلی کھچڑی انڈیل رہا تھا۔ مجرم جو بھوک سے بے حال تھا، نے سپاہی کو کھچڑی انڈیلتے دیکھا تو اپنی زبان چاول تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔ سپاہی نے اسے واپس دھکیلا۔ کیونکہ کھچڑی اگلے ایک گھنٹے تک کی خوراک تھی۔ لیکن یہ بات نہایت غیر مناسب تھی کہ دوسرے تک پہنچنے سے پہلے سپاہی اپنے میلے ہاتھ تسلے میں ڈالے خود ہی کھچڑی کھا رہا تھا۔ افسر نے اپنے حواس مجتمع کئے۔

''میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا'' افسر بولا ''میں جانتا ہوں کہ گزرے ہوئے دنوں کو اب معتبر ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ خیر مشین کام کر رہی ہے اور اپنے طور پر تا حال موثر ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ

اس وادی میں تنہا کھڑی رہتی ہے' یہ موثر ہے۔اب بھی لاش آخر میں خود بخود نیچے گڑھے میں جا گرتی ہے ۔ حالانکہ اس کے گرد حسب سابق مکھیوں کی طرح سینکڑوں لوگ جمع نہیں ہوتے۔ ان دنوں ہمیں گڑھے کے گرد مضبوط جنگلہ لگانا پڑتا تھا۔اب تو اسے اکھاڑے گئے بھی بہت عرصہ بیت گیا ہے۔''

مہم جو چہرے کو افسر کی طرف سے موڑے بلا مقصد ہی ادھر ادھر دیکھنے لگا۔افسر کو گمان ہوا شاید وہ وادی کی وسعت کا جائزہ لے رہا ہے۔اس نے اسے ہاتھوں سے پکڑا اور موڑ کر اپنے سامنے لایا اور پوچھا ''کیا آپ کو اس صورتحال پر ندامت محسوس ہو رہی ہے؟''

مہم جو نے کوئی جواب نہیں دیا۔افسر نے کچھ دیر اسے خاموشی سے تکا۔ٹانگوں کو پھیلائے' ہاتھوں کو کولھوں پر رکھے' وہ ساکت کھڑا زمین کو گھور رہا تھا۔پھر پر اعتماد مسکراہٹ کے ساتھ مہم جو کو دیکھا اور کہا'' جب افسر اعلیٰ نے آپ کو یہاں مدعو کیا تو میں آپ کے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ میں نے اسے آپ کو دعوت دیتے ہوئے سنا تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چاہتا تھا؟ وہ اتنا با اختیار ہے کہ میرے خلاف کچھ بھی کر سکتا ہے۔لیکن اس میں اتنی جرات نہیں ہے۔ وہ آپ کی رائے کو میرے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے۔ایک گراں قدر اجنبی کی رائے۔اس نے بڑی احتیاط سے یہ سارا منصوبہ بنایا ہے۔اس خطے پر یہ آپ کا دوسرا دن ہے۔آپ سابقہ افسر اعلیٰ اور ان کے کام کے طریقہ کار سے واقف نہیں ہیں۔آپ یورپی انداز فکر سے خوگر ہیں۔شاید آپ اصولی طور پر سزائے موت ہی کے خلاف ہوں اور خصوصی طور پر موت دینے والے ان میکانکی آلات کے۔آپ خود دیکھیں گے کہ اس تعزیری کارروائی کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ یہ محض ایک ادنیٰ تقریب ہے جو ایک پرانی اور گھسی ہوئی مشین کی ہمراہی میں منعقد ہو رہی ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے (جیسا خود اعلیٰ افسر بھی چاہتا ہے) کہ آپ میرے طریقہ کار کو یکسر رد کر دیں گے۔ بالفرض اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو آپ پھر بھی حقیقت کو نہیں چھپائیں گے۔ میں افسر اعلیٰ کے نقطہ نظر سے بات کر رہا ہوں۔ آپ اپنے خوب گتھے ہوئے نتائج پر اعتماد کرنے والے شخص ہیں۔ بالکل درست۔آپ نے بہت سے لوگوں کے عجیب رویوں کو دیکھا اور انہیں سمجھنا سیکھا ہے۔سو امید ہے آپ ہمارے طریقہ کار کے خلاف کوئی سخت رائے قائم نہیں کریں گے جیسا آپ خود اپنے ملک میں ایسے کسی اقدام کے بارے میں سوچتے ہوں گے۔افسر اعلیٰ کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔اس کے لیے ایک رسمی حتیٰ کہ ایک غیر محتاط رائے بھی

کافی ہوگی۔ اسے حقیقی خیالات کی نمائندگی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بس اس حد تک ہی وہ آپ کو سنے گا جس سے اس کا مقصد پورا ہو جائے۔ وہ آپ کو کائیاں سوالات سے مشتعل کرنے کی کوشش کرے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کی عورتیں آپ کے گرد بیٹھ جائیں گی اور آپ کو کچھ ایسی بات کہیں گی جیسے یہ کہ ہمارے ملک میں تعزیری کارروائی مختلف انداز میں ہوتی ہے یا ہمارے ملک میں قیدی کو سزا دینے سے پہلے تفتیش کی جاتی ہے یا قرون وسطیٰ کے بعد سے ہم نے تشدد کی روایت ختم کر دی ہے' وغیرہ وغیرہ۔ یہ بیانات اتنے بے ضرر ہیں کہ میرے طریقہ کار پر کوئی رائے ظاہر نہیں کرتے۔ افسر اعلیٰ بھلا ان بیانات پر کیا ردعمل ظاہر کرے گا؟ میں اسے تصور کر سکتا ہوں۔ ہمارے محترم افسر اعلیٰ دفعتاً اپنی کرسی پرے سرکائیں گے اور بالکنی کی طرف بڑھیں گے۔ لیکن میں دیکھ سکتا ہوں کہ اس کی عورتیں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہوں گی۔ میں اس کی آواز سن سکتا ہوں۔ عورتیں اسے طوفانی آواز کہتی ہیں۔ وہ کچھ یوں کہے گا کہ ایک معروف مغربی سراغ رساں' جنہیں دنیا کے تمام ملکوں میں تعزیری کارروائی کا مشاہدہ کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے' نے عدل قائم کرنے کی ہماری قدیم روایت کو غیر انسانی قرار دیا ہے۔ ایسی اہم شخصیت سے یہ رائے ملنے کے بعد میرے لئے ممکن نہیں رہتا کہ اس کارروائی کو مزید جاری رکھنے کی اجازت دوں۔ سو آج سے میں فیصلہ کرتا ہوں کہ۔۔۔۔ یا یہ ایسی ہی کوئی بات ہوگی۔ ہوسکتا ہے آپ دخل اندازی کریں کہ آپ نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور یہ کہ آپ نے میرے طریقہ کار کو غیر انسانی قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس کے برعکس اپنے عمیق تجربے سے آپ نے سیکھا ہے کہ یہ انتہائی نفیس اور انسانی وقار کے عین مطابق ہے۔ اور یہ بھی کہ آپ اس مشین کے معترف ہیں۔ لیکن تب بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ آپ بالکنی پر ہی نہیں پہنچ پائیں گے۔ وہاں عورتوں کا جم غفیر ہوگا جو آپ کی توجہ اپنی جانب منعطف کرنے کی کوشش کرے گا۔ آپ چلانا چاہیں گے۔ لیکن ایک عورت کا ہاتھ آپ کے ہونٹوں پر آجائے گا اور میری اور سابقہ افسر اعلیٰ کی ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔''

مہم جو نے اپنی مسکراہٹ کو دبایا۔ اس نے نرمی سے کہا'' آپ نے میری حیثیت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ افسر اعلیٰ نے میرے سفارشی خطوط پڑھے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ میں تعزیری کارروائی کے تجزیئے کا ماہر نہیں ہوں۔ بالفرض اگر مجھ سے رائے مانگی گئی تو یہ بالکل ایک عمومی رائے ہوگی جو ایک عام شخص کی رائے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ کم از کم افسر اعلیٰ کی رائے سے کم ہی موثر ہوگی جو، جیسا کہ میں سمجھ پایا

ہوں، اس قتل گاہ میں اعلیٰ اور وسیع اختیارات رکھتا ہے۔ اگر آپ کے طریقہ کار سے متعلق اس کی رائے اچھی نہیں ہے جیسا کہ آپ کو یقین ہے تو مجھے خدشہ ہے کہ آپ کی روایت کا اختتام یقینی ہے اور اس مقصد کے لئے اسے میری کسی ہمدردانہ رائے کی ضرورت نہیں ہے۔''

کیا واقعی یہ بات افسر کے پلے پڑی تھی؟ نہیں وہ کچھ بھی نہیں سمجھا تھا۔ اس نے پر جوش انداز میں سر ہلایا۔ سرسری طور پر ایک طرف کھڑے مجرم اور سپاہی کو دیکھا۔ وہ دونوں چاولوں کی کھچڑی پر ٹوٹے پڑے تھے۔ پھر مہم جو کے قریب آیا اور اس کے چہرے کو دیکھے بغیر اس کے کوٹ پر کسی جگہ اپنی نگاہ جما کر مدہم آواز میں بولا'' آپ افسر اعلیٰ کو نہیں جانتے۔ لیکن میرا یقین کیجئے۔ میں نے یہاں آپ کے اثر ونفوذ کا غلط اندازہ نہیں لگایا۔ جب میں نے سنا کہ آپ بہ نفس نفیس اس کارروائی کو دیکھنے تشریف لا رہے ہیں تو مجھے بہت مسرت ہوئی۔ افسر اعلیٰ نے یہ سارا اہتمام مجھے زد پہنچانے کے لئے کیا ہے۔ لیکن میں صورتحال کو اپنے حق میں بدل دوں گا۔ آپ اس کارروائی کا نظارہ کرنے والوں کی سرگوشیوں اور مشتبہ نگاہوں سے پریشان ہونے کے بجائے، جن سے احتراز ممکن نہیں ہے، یہاں میری معروضات سن رہے اور اطمینان سے سارے عمل کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یقیناً آپ اپنی رائے قائم کر چکے ہوں گے۔ بالفرض اگر آپ کے ذہن میں کچھ قابل وضاحت سوالات موجود ہیں تو اس کارروائی کو دیکھنے بعد وہ باقی نہ رہیں گے۔ آپ سے استدعا ہے کہ افسر اعلیٰ کے خلاف میری مدد فرمائیں۔''

مہم جو نے اسے ٹوک دیا اور کہا'' میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں؟ ناممکن ہے۔ میں نہ آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں، نہ آپ کو کوئی گزند پہنچا سکتا ہوں۔''

''ہاں آپ ایسا کر سکتے ہیں۔'' افسر نے کہا۔ مہم جو نے واضح طور پر دیکھا کہ افسر نے اپنی مٹھیاں بھینچ لی تھیں'' ہاں آپ کر سکتے ہیں۔'' افسر نے زیادہ اصرار کے ساتھ کہا'' میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے جو ضرور کامیاب ہوگا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی حیثیت کمزور ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ بالفرض یہ مان لیا جائے کہ وہی سچ ہے جو آپ سوچتے ہیں تو پھر بھی روایت کو محفوظ رکھنے کی خاطر یہ ضروری نہیں رہتا کہ آپ کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ غور سے میرا منصوبہ سنئے۔ پہلی بات جو بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آپ اس کارروائی سے متعلق اپنی رائے دینے سے ممکنہ حد تک احتراز کریں۔ جب تک براہ راست آپ سے نہ پوچھا جائے، آپ خاموشی اختیار کریں، یا اگر کچھ کہیں بھی تو کوئی

مختصر اور رسمی بات کریں۔ مثلاً یہ رائے دیں کہ آپ اس معاملے پر گفتگو نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اس طرح آپ تحمل کا دامن چھوڑ بیٹھیں گے یا یہ کہ اگر آپ نے کچھ کہا تو وہ ضرور تلخ ہوگا۔

میں نے آپ سے یہ نہیں کہا کہ آپ جھوٹ بولیں۔ آپ مختصر جوابات دیں۔ جیسے یہ کہ 'ہاں میں نے تعزیری کارروائی دیکھی ہے یا ہاں مجھے اس بارے میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ بس ایسی ہی کچھ باتیں۔ اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ اس طرح آپ خود کو کسی دباؤ کے زیر اثر آنے سے بچا لیں گے۔ وہ آپ کے الفاظ سے اپنی منشا کے مطابق غلط مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کرے گا۔ انتظامیہ کے دفتر میں تمام افسران کا ایک بڑا اجلاس ہوگا۔ افسر اعلیٰ خود صدارت کرے گا۔ اسے یہ کمال حاصل ہے کہ وہ ایسے اجلاسوں کو عوامی تقریبات میں بدل دیتا ہے۔ اس نے غلام گردش تعمیر کی ہے جو ہمیشہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھری رہتی ہے۔ مجھے چاروناچار ان اجلاسوں میں شرکت کرنا پڑتی ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو، آپ کو اجلاس میں مدعو کیا جائے گا۔ اگر آپ میرے مشورے کے مطابق عمل کریں تو دعوت نامہ فوری التماس میں بدل جائے گا۔ بالفرض اگر چند پراسرار وجوہات کی بناء پر آپ کو مدعو نہیں کیا جاتا تو آپ خود اس کا تقاضا کریں۔ آپ کو وہاں بلا لیا جائے گا۔ کل آپ افسر اعلیٰ کے دفتر میں اس کی خواتین کے ساتھ براجمان ہوں گے۔ آپ کی موجودگی کا یقین کرنے کے بعد وہ اوپر دیکھتا رہے گا۔ وہاں ہونے والے متعدد سطحی اور مضحکہ خیز وقوعات کے بعد، جنہیں صرف حاضرین کو متاثر کرنے کے لئے رونما کیا جاتا ہے، محض سرسری انداز میں ہمارے تعزیری طریقہ کار کو موضوع بحث بنایا جائے گا۔ اگر افسر اعلیٰ خود یہ معاملہ نہیں چھیڑتا یا ایسا کرنے میں سستی برتتا ہے تو میں خود ہی کوئی ایسا اشارہ دوں گا۔ میں کھڑا ہو جاؤں گا اور انہیں اطلاع دوں گا کہ سزا دی جا چکی ہے۔

یہ ایک مختصر سا بیان ہوگا۔ ایسا بیان گو غیر اہم ہے لیکن میں ایسا ہی کروں گا۔ افسر اعلیٰ ہمیشہ کی طرح میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ میرا شکریہ ادا کرے گا۔ پھر وہ خود کو روک نہیں پائے گا۔ وہ اس موقع کو استعمال کرے گا۔ 'اطلاع مل چکی ہے' وہ کچھ یوں کہے گا۔ یا اس سے ملتے جلتے الفاظ ہوں گے کہ 'آج سزا دی گئی ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ ایک معروف مہم جو نے سزا کا مشاہدہ کیا ہے جن کی یہاں آمد ہمارے قصبے کے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔ اس اجلاس میں ان کی موجودگی اس موقع کی اہمیت کو دوچند کرتی ہے۔ کیا ہمیں ان سے درخواست نہیں کرنی چاہیے کہ وہ سزا کے ہمارے روایتی قواعد اور ان پر عمل درآمد کے

طریقہ کار پر اپنی رائے کا اظہار کریں؟' قدرتی طور پر عوام اس بات سے اتفاق کے اظہار کے طور پر پُرجوش انداز میں تالیاں پیٹیں گے۔

افسر اعلیٰ آپ کے سامنے جھکے گا اور کہے گا ''یہاں موجود افراد کی طرف سے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔'' آپ اٹھ کر سامنے آجائیں گے۔ اپنے ہاتھ ایسی جگہ رکھیئے گا جہاں سبھی دیکھ سکیں۔ بصورت دیگر خواتین اسے پکڑلیں گی اور آپ کی انگلیاں دبائیں گی۔ آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں میں کیسے اس لمحے کے انتظار کا کرب سہہ پاؤں گا۔ اپنے خطاب کے دوران خود کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد رکھنے کی کوشش کریں اور باآواز بلند سچ بیان کیجئے۔ نشست کے آگے جھک کر چلایئے...... ہاں بے شک چلا کر حتمی اور غیر متزلزل رائے دیجئے۔ شاید آپ ایسا نہیں کرنا چاہیں گے۔ یہ آپ کے مزاج کے موافق نہیں ہے۔ آپ کے ملک میں لوگ شاید ایسے موقعوں پر مختلف رویہ ظاہر کرتے ہوں گے۔ خیر یہی ٹھیک ہے۔ یوں بھی ہمارا مقصد پورا ہوسکتا ہے۔

آپ کھڑے بھی مت ہوں۔ بس چند الفاظ کہیں۔ چاہے سرگوشی میں، لیکن جسے نیچے کھڑے افسران سن سکیں۔ اتنا کہنا ہی کافی ہوگا۔ آپ کو یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ عوام میں اس سزا کی طرفداری کا رجحان کم ہے۔ یا چیختے پہیے، شکستہ پٹے اور غلیظ نمدے کے ڈھاٹے کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب خود سنبھال لوں گا۔ آپ یقین کیجئے اگر میری الزام تراشی سے وہ کانفرنس ہال سے بھاگ نہ گیا تو ضرور میں اسے اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردوں گا۔' سابقہ افسر اعلیٰ میں آپ کا عاجز خادم ہوں۔' یہ ہے میرا منصوبہ۔ کیا اسے کامیاب بنانے میں آپ میرا ساتھ دیں گے۔ بے شک آپ میرا ساتھ دیں گے۔ اس سے بڑھ کر آپ کیا چاہیں گے؟''

افسر نے مہم جو کو دونوں بازوؤں سے پکڑا اور گہرے سانس لیتے ہوئے اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں جمادیں۔ اس نے آخری جملہ بلند آواز میں چیخ کر کہا کہ سپاہی اور مجرم دونوں تھرا گئے۔ انہیں کوئی ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ انہوں نے کھانا موقوف کردیا اور منہ میں موجود نوالے کو چباتے ہوئے مہم جو کو دیکھنے لگے۔ آغاز گفتگو ہی سے مہم جو نے بین طور پر طے کرلیا تھا کہ اسے کیا جواب دینا ہے۔ اسے زندگی میں متعدد بار ایسے حالات کا تجربہ ہوا تھا۔ وہ کسی ابہام کا شکار نہیں تھا۔ وہ ایک معزز اور نڈر انسان تھا۔ سپاہی اور مجرم کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اسے کچھ ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔

بس ایک لحظہ ٹھہر کر اس نے وہی کچھ کہا جو وہ کہنا چاہتا تھا ''نہیں۔'' افسر نے کئی مرتبہ اپنی آنکھیں جھپکائیں۔ ''کیا آپ چاہیں گے کہ میں اپنی بات کی وضاحت کروں۔'' مہم جو نے کہا۔ افسر نے کوئی لفظ کہے بغیر اثبات میں سر ہلایا۔

''میں اس تعزیری کارروائی کی حمایت نہیں کرتا'' مہم جو نے کہا ''آپ کے مجھے اعتماد میں لینے سے بھی پہلے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہاں دخل در معقولات کرنا میرا فرض ہے اور کیا میری مداخلت سے صورت حال میں تبدیلی کا کوئی معمولی امکان موجود ہے۔ تب مجھے سمجھ میں آیا کہ مجھے کس سے رجوع کرنا چاہئے' بلاشبہ افسر اعلیٰ سے۔ آپ نے میری اس فیصلے تک پہنچنے میں مدد کی ہے۔ میں آپ کی اس روایت سے مخلصانہ وابستگی سے متاثر ہوا ہوں۔ گو یہ بات میری رائے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی ہے۔''

افسر خاموش کھڑا رہا۔ پھر مشین کی طرف مڑا۔ پیتل کی ایک سلاخ اٹھائی اور کچھ پیچھے جھکتے ہوئے ڈیزائنر کا بغور جائزہ لیا۔ جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ یہ درست حالت میں ہے۔ معلوم ہوتا تھا سپاہی اور مجرم دونوں اصل معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔ مجرم سپاہی کو کچھ اشارے کر رہا تھا لیکن کسے ہوئے پٹوں میں اسے ہر حرکت دشوار معلوم ہو رہی تھی۔ سپاہی اس پر جھکا ہوا تھا۔ مجرم نے اس کے کان میں کچھ سرگوشی کی۔ سپاہی نے اثبات میں سر ہلایا۔

مہم جو افسر تک گیا اور بولا ''آپ نہیں سمجھ سکے کہ میرا مطلب کیا تھا۔ میں افسر اعلیٰ سے اس تعزیری عمل سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کروں گا لیکن عوامی اجتماع میں نہیں بلکہ تخلیئے میں۔ نہ ہی میرے پاس اتنا وقت ہے کہ میں کسی اجلاس میں شرکت کر سکوں۔ میں کل علی الصبح یہاں سے چلا جاؤں گا یا کم ازکم اپنے جہاز میں سوار ہو چکا ہوں گا۔''

معلوم ہوتا تھا' افسر نے اس کی کوئی بات نہیں سنی ''تو آپ کو یہ طریقہ کار معقول نہیں لگا۔'' اس نے جیسے اپنے آپ ہی سے سوال کیا اور مسکرایا جیسے پختہ کار انسان کسی طفلانہ غیر معقولیت پر مسکراتا اور اپنے تفکر کو مسکراہٹ کی آڑ میں چھپالیتا ہے۔

''تو پھر وقت آ گیا ہے۔'' آخر اس نے کہا اور معاً چمکتی ہوئی آنکھوں سے مہم جو کو دیکھا جس میں پختہ ارادے کی جھلک موجود تھی۔

''کیسا وقت؟'' مہم جو نے بے چینی سے پوچھا۔ افسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم آزاد ہو۔'' افسر نے مجرم سے مقامی زبان میں کہا۔ فوری طور پر اس شخص کو یقین نہ آیا ''ہاں تمہیں آزاد کیا جاتا ہے۔'' افسر نے اپنی بات دہرائی۔ پہلی بار مجرم کے چہرے پر حقیقی جذبے کی چمک ابھری۔ کیا واقعی یہ سچ ہے؟ کیا یہ محض افسر کی متلون مزاجی کا ایک رنگ تو نہیں ہے جو ابھی بدل جائے گا؟ کیا اجنبی مہم جو نے اس سے درخواست کی تھی؟ یہ سب کیا تھا؟ اس کے چہرے سے یہ سارے سوالات پڑھے جا سکتے تھے۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ یہ جو کچھ بھی ہو، اگر واقعی ایسا ہے تو اسے آزاد ہو جانا چاہیئے۔ اس نے سیر اون میں خود کو آزاد کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارے۔

''تم ان پٹیوں کو توڑ دو گے۔'' افسر چلایا۔ ''خاموش لیٹے رہو۔ ہم ابھی کھولتے ہیں۔'' پھر سپاہی کو مدد کا اشارہ کر کے وہ اسے کھولنے لگا۔ مجرم بغیر بولے آپ ہی آپ ہنسا۔ کبھی چہرہ بائیں جانب افسر کی طرف موڑ لیتا۔ کبھی دائیں جانب سپاہی کی طرف اور کبھی مہم جو کی طرف۔

''اسے باہر نکالو۔'' افسر نے حکم دیا۔ سیر اون کی وجہ سے اس عمل میں احتیاط ضروری تھی۔ مجرم اپنے اتاولے پن کی وجہ سے اپنی کمر زخمی کر چکا تھا۔ اس کے بعد افسر نے اسے قریب قریب فراموش کر دیا۔ وہ مہم جو کے پاس واپس گیا۔ اپنا وہی مختصر چرمی تھیلا نکالا۔ اس میں کاغذوں کو کھنگالا اور ایک کاغذ باہر نکالتے ہوئے مہم جو کو دکھایا اور کہا ''اسے پڑھیئے۔'' وہ بولا۔

''میں نہیں پڑھ سکتا۔'' مہم جو نے جواب دیا۔ ''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھ سے یہ تحریر نہیں پڑھی جا سکی۔''

''اسے غور سے دیکھیئے۔'' افسر نے کہا اور مہم جو کے قریب آ گیا تاکہ اسے پڑھنے میں دقت نہ ہو۔ وہ پھر بھی کچھ نہ پڑھ سکا تو اسے پڑھنے میں سہولت دینے کے لئے اپنی چھوٹی انگشت کو کاغذ کی سطح سے کچھ فاصلے پر رکھتے ہوئے، جیسے چھونے سے تحریر شکستہ ہونے کا خدشہ تھا' ایک خاص لفظ پر ٹھہرا لیا۔ مہم جو نے افسر کی خوشنودی کی خاطر پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ سمجھ پایا۔ افسر نے حروف تہجی الگ الگ کر کے ادا کئے اور پھر تمام الفاظ پڑھے۔ ''عدل کرو۔ یہی لکھا ہے۔ اب آپ اس کو پڑھ سکیں گے۔'' مہم جو مزید آگے جھک گیا جس سے افسر کو خدشہ محسوس ہوا کہ وہ تحریر کو چھو لے گا۔ اس نے کاغذ مزید پرے ہٹا لیا۔ مہم جو خاموش رہا۔ واضح تھا کہ وہ ہنوز کچھ نہیں پڑھ سکا تھا۔

''عدل کرو! یہی لکھا ہے۔'' افسر نے پھر سے کہا۔

''شاید یہی لکھا ہو۔'' مہم جو نے کہا ''مجھے آپ پر اعتماد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' افسر نے کسی حد تک مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ وہ کاغذ کے ٹکڑے کو ساتھ لیے زینے پر چڑھ گیا۔ بہت احتیاط کے ساتھ اس نے اسے ڈیزائنر کے اندر رکھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ تمام کھانچے دار پہیوں کی ترکیب بدل رہا تھا۔ یہ ایک دقت طلب کام تھا۔ وہاں بہت چھوٹے پہیے بھی تھے۔ کبھی کبھار افسر کا سر مکمل طور پر ڈیزائنر کے اندر غائب ہو جاتا۔ مہم جو نیچے کھڑا مخل ہوئے بغیر اس کارروائی کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کی گردن اکڑ گئی اور آنکھیں آسمان پر چمکتے سورج کی شعاعوں سے بھنچ گئی تھیں۔

مجرم اور سپاہی اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ سپاہی نے گڑھے سے مجرم کی قمیص اور پاجامے کو سنگین کی نوک سے باہر نکالا۔ قمیص کراہت انگیز حد تک غلاظت میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اسے بالٹی میں پانی سے دھویا۔ مجرم نے قمیص اور پاجامہ پہن لیا تو سپاہی اور وہ دونوں قہقہہ مار کر ہنسے۔ لباس پشت سے چاک تھا۔ جیسے یہ فرض کرتے ہوئے کہ وہ سپاہی کو محظوظ کرے، مجرم اس کے سامنے کٹے پھٹے لباس میں اپنے قدموں پر پھرکی کی طرح گھومنے لگا۔ سپاہی ہنستے ہوئے زمین پر گھٹنے مار کر لوٹنے لگا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ دو معزز افراد کی موجودگی کے پیش نظر اپنی ہنسی کو دبانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔

خود ہی سارا کام کرنے کے بعد افسر نے مسکراتے ہوئے مشین کے پرزوں کا ایک بار پھر تفصیلی جائزہ لیا۔ ڈیزائنر کا ڈھکنا بند کیا جو اب تک کھلا ہوا تھا۔ پھر وہ نیچے کودا۔ پہلے گڑھے اور پھر مجرم کو دیکھا۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ کپڑے گڑھے میں سے نکال لئے گئے تھے' وہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی کی بالٹی تک گیا۔ اسے غلاظت سے بھرا ہوا دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں ابھریں۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو ریت میں گھسیڑ دیا۔ ہاتھ صاف کرنے کا یہ متبادل طریقہ اسے پسند نہیں تھا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی سرکاری جیکٹ کے بٹن کھولنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے دونوں نسوانی رومال' جنہیں اس نے کالر کے نیچے جما رکھا تھا' اس کے ہاتھوں میں آن گرے۔

''یہ تمہارے ہیں۔'' اس نے کہا اور رومال مجرم کے طرف اچھال دی۔ پھر مہم جو کو وضاحت کرتے ہوئے کہا ''یہ خواتین نے اسے تحفتاً دیئے تھے۔'' پھر محبت کے ساتھ انگلیوں کو جیکٹ پر لگی جھالر پر پھیرا اور پھندے کو چھوا۔ لیکن یہ اہتمام اور لگاؤ تب بناوٹی معلوم ہوا کہ اس نے کپڑے اتارتے ہی انہیں جھٹکے

سے گڑھے میں پھینک دیا۔ وردی کا آخری حصہ اس کی مختصر تلوار اور پیٹی تھی۔ اس نے نیام سے تلوار نکالی۔ اسے توڑا۔ پھر ٹکڑوں کو اکٹھا کیا۔ پیٹی اور نیام کو اٹھایا اور یوں نفرت کے ساتھ انھیں گڑھے میں پھینکا کہ ان کے زمین سے ٹکرانے کی آواز پیدا ہوئی۔

اب وہ بالکل برہنہ تھا۔ مہم جو اپنے ہونٹ کاٹ کر رہا تھا۔ وہ خاموش تھا اور جانتا تھا کہ کیا ہو رہا تھا؟ لیکن وہ افسر کو کسی کام سے روکنے کا مجاز نہیں تھا۔ اگر یہ تعزیری طریقہ کار، جو افسر کو بہت مرغوب تھا، اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا تو یہ ممکنہ طور پر خود اسی کی دخل اندازی کے باعث ہو رہا تھا۔ افسر جو کچھ کر رہا تھا، درست ہی تھا۔ ایسی صورتحال میں مہم جو اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سپاہی اور مجرم ابتداً نہیں سمجھ پائے کہ کیا ہو رہا تھا۔ بلکہ شروع میں تو انھوں نے اس طرف دیکھا بھی نہیں۔ مجرم رومال واپس ملنے پر شاداں تھا۔ تاہم اس کی خوشی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ سپاہی نے فوری اور غیر متوقع جھٹکے سے انہیں اس سے چھین لیا۔ مجرم انہیں پیٹی کے نیچے سے کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں سپاہی نے انہیں اڑس رکھا تھا۔ سپاہی مزاحم تھا۔ وہ آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔

افسر کے مکمل برہنہ ہو جانے پر وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ خاص طور پر مجرم اس خیال سے ششدر معلوم ہوتا تھا کہ کچھ بڑی تبدیلی ہونے والی ہے۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہونے جا رہا تھا وہ اب افسر کے ساتھ ہوگا۔ شائد یہی اختتام ہے۔ ظاہر ہے اجنبی مہم جو نے ہی اس تبدیلی کا فرمان جاری کیا تھا۔ یہ ایک انتقامی کارروائی تھی۔ ایک کشادہ اور خاموش مسکراہٹ اس کے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔

افسر مشین کی طرف مڑا۔ یہ بات پہلے سے تسلیم شدہ تھی کہ وہ مشین کو بہتر طور پر جانتا ہے۔ لیکن اب یہ بات بجائے خود ایک معمہ تھی کہ وہ کیسے اسے چلائے گا۔ اس نے محض سیر اون کو چھوا تو وہ پہلے بلند ہوئی اور پھر کئی ایک مرتبہ نیچے آ گئی۔ حتیٰ کہ اس کے موافق بلندی پر آ کر ٹھہر گئی۔ اس نے بستر کو چھوا اور وہ مرتعش ہو گیا۔ ڈھاٹا اس کے منہ تک آ گیا۔ یوں لگا جیسے افسر اسے منہ میں لینے سے ہچکچا رہا ہو۔ لیکن ایسا دو ایک لمحے کے لئے ہی تھا۔ فوراً ہی اس نے اسے قبول کر لیا۔ ہر شے تیار تھی۔ صرف پٹے اطراف میں نیچے لٹک رہے تھے۔ تاہم ان کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ افسر کو باندھنا ضروری نہیں تھا۔ مجرم نے کھلے پٹوں کی طرف دیکھا پھر اس خیال سے کہ انہیں باندھے بغیر تعزیری عمل پورا نہیں ہوگا، اس نے پر جوش انداز میں سپاہی کو دیکھا۔ وہ دونوں افسر کو پٹوں سے باندھنے کے لئے آگے بڑھے۔

افسر نے ڈیزائنر کو چلانے والے بیرم کو دبانے کے لئے اپنا ایک پیر باہر لٹکا لیا تھا۔ دونوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پیر اندر کھینچ لیا اور بندھے جانے کے لئے تیار لیٹ گیا۔ اب وہ بیرم کو دبا نہیں سکتا تھا ۔ نہ ہی مجرم اور سپاہی کے لئے ممکن تھا کہ وہ اسے تلاش کریں جبکہ مہم جو کسی بھی کام میں دخل نہ دینے کے ارادے پر اٹل تھا۔ لیکن یہ ضروری بھی نہیں تھا کیونکہ جونہی اسے پٹوں سے باندھا گیا' مشین خود بخود چلنے لگی۔ بستر تھرتھرایا اور سوئیاں جلد پر سانپ کی طرح حرکت کرنے لگیں۔ سیر اون اوپر نیچے چلتا ہوا کام کرنے لگا۔ اس کارروائی کو بغور دیکھتے ہوئے' اچانک مہم جو کو خیال آیا کہ کچھ دیر پہلے تک ڈیزائنر کا ایک پہیہ بہت چرچرا رہا تھا۔ لیکن اب ہر شے خاموش تھی۔ معمولی سی کھڑکھڑاہٹ بھی مشین میں سے سنائی نہیں دیتی تھی۔

مشین خاموشی سے کام کر رہی تھی۔ سبھی نے اس میں دلچسپی کھو دی۔ مہم جو نے سپاہی اور مجرم کو بغور دیکھا۔ مجرم پہلے سے زیادہ پرجوش معلوم ہوتا تھا۔ مشین کے ہر پرزے میں اسے دلچسپی تھی۔ کبھی وہ آگے جھک جاتا اور کبھی پنجوں کے بل کھڑا ہو جاتا۔ اس بیچ میں وہ اپنی تنی ہوئی انگشت کے اشارے سے دونوں کو مختلف تفصیلات سے آگاہ کرتا۔ اس بات نے مہم جو کو برہم کیا۔ وہ اس کارروائی کے اختتام تک وہاں ٹھہرنے کا خواہاں تھا۔ لیکن دونوں کا رویہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

''اپنے گھروں کو جاؤ'' اس نے کہا۔ سپاہی واپس جانے پر آمادہ تھا لیکن مجرم کو یہ فرمان بھی ایک سزا معلوم ہوا۔ ہاتھ باندھ کر اس نے وہاں ٹھہرنے کی اجازت طلب کی۔ مہم جو نے سر نفی میں ہلایا اور اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ مجرم گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گیا۔ مہم جو سمجھ گیا کہ محض حکم دینا کافی نہیں ہوگا۔ وہ انہیں پکڑنے اور دھکے مار کر دور بھگانے کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اسے ڈیزائنر میں کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ کیا کھانچے دار پہیہ خراب ہو گیا تھا؟ لیکن یہ تو اور ہی معاملہ تھا۔

آہستگی سے ڈیزائنر کا ڈھکنا اوپر اٹھا اور پورا کھل گیا۔ پہیئے کے دندانے ظاہر ہوئے اور بلند ہونے لگے۔ جلد ہی پورا پہیہ اوپر اٹھ آیا جیسے کوئی انجانی قوت ڈیزائنر کو بھینچ رہی تھی اور پہیے کے لئے اس میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ ڈیزائنر کے آخری سرے تک پہیہ اوپر اٹھتا چلا گیا اور پھر سیدھا لیٹ گیا۔ فوراً بعد دوسرا پہیہ ظاہر ہوا جس کے پیچھے کئی دوسرے بھی تھے۔ لگتا تھا ڈیزائنر اندر سے بالکل خالی ہو رہا تھا۔ پہیوں کا ایک جمگھٹا منظر پر ابھرتا' پھر گرتا اور ریت پر ٹھیلتا ہوا لیٹ جاتا۔ اس منظر نے مجرم کے ذہن سے

مہم جو کا فرمان بالکل محو کر دیا۔ وہ دندانے دار پہیوں کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ سپاہی کو بھی مدد کے لئے بلاتا۔ لیکن جلد ہی کسی خوف سے ہاتھ کھینچ لیتا۔ ایک دوسرا پہیہ لڑھکتا ہوا اس کی طرف بڑھتا اور اسے خوفزدہ کر دیتا۔

مہم جو سخت ذہنی اذیت میں تھا۔ مشین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ اس نے افسر کے قریب جانے کے بارے میں سوچا جو اب اس کی طرف دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ لیکن اس کی توجہ کو لڑھکتے ہوئے دندانے دار پہیوں نے اپنی جانب منعطف کر لیا تھا۔ ڈیزائنر سے آخری پہیہ بھی نکل گیا۔ وہ سیر اون پر جھکا۔ اسے یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ سیر اون گو دنہیں رہی تھی۔ بلکہ سوئیاں جسم میں اندر تک کھبی ہوئی تھیں۔ بستر جسم کو الٹ پلٹ نہیں رہا تھا بلکہ سوئیوں کے سامنے تھرتھراتے ہوئے اسے اوپر کی طرف اٹھا دیتا۔ مہم جو نے مشین کو بند کر دینے کے بارے میں سوچا۔ یہ سزا نہیں تھی بلکہ صریحاً ایک قتل تھا۔ اس نے ہاتھوں کو پھیلایا۔ اسی لمحے سیر اون بلند ہوئی اور ایک طرف گر گئی جیسا عموماً بارہویں گھنٹے میں ہوتا تھا۔ خون سینکڑوں سوراخوں سے بہہ رہا تھا۔ پانی کی پھوار اسے صاف نہیں کر رہی تھی کیونکہ ٹونٹیوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کارروائی کا آخری عمل بھی ممکن نہیں ہو سکا۔ جسم لمبی سوئیوں سے چھوٹ کر گرنے کے بجائے گڑھے کے اوپر ان کے ساتھ ٹنگا رہا۔ سیر اون نے پہلے والی حالت میں مڑنے کی کوشش کی لیکن وہ جسم کے بوجھ سے ہل نہیں سکتی تھی۔ سو وہ اسی جگہ گڑھے کے اوپر رہی۔

''ادھر آؤ۔ میری مدد کرو۔'' مہم جو نے ان دونوں سے کہا اور پھر خود ہی افسر کے پاؤں پکڑے۔ دونوں نے دوسری طرف سے افسر کا سر تھام لیا۔ اس طرح اسے سوئیوں سے نجات دلائی جا سکتی تھی۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے۔ مہم جو کو خود ان کے پاس جانا اور انہیں افسر کے سر کی طرف دھکیلنا پڑا۔ تب غیر ارادی طور پر اس کی نگاہ لاش کے چہرے پر پڑی۔ یہ ایک زندہ انسان کا چہرہ تھا۔ اس پر گزشتہ سزا کا شائبہ تک نہ تھا۔ جو اذیت اس مشین سے دوسروں کو ملتی تھی' افسر اس سے بالکل محفوظ رہا تھا۔ ہونٹ مضبوطی سے باہم پیوست تھے۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور نگاہ ویسے ہی پرسکون اور ہموار تھی جیسے زندہ انسان کی ہوتی ہے۔

جونہی مہم جو' سپاہی اور پیچھے پیچھے آتے ہوئے مجرم کے ساتھ آبادی کے ابتدائی گھروں تک پہنچا' سپاہی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''وہاں چائے خانہ ہے۔''

یہ گھر کی نچلی منزل میں واقع تھا۔اس کی چھتیں اور دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو چکی تھیں۔یہ چائے خانہ لمبائی کے رخ پر سڑک پر کھلتا تھا۔یہ گھر آبادی کے دوسرے گھروں سے‘جو انتظامیہ کے عالیشان ہیڈ کوارٹر تک پھیلے ہوئے اور انتہائی شکستگی کا منظر پیش کر رہے تھے‘ مختلف نہیں تھا۔مہم جو کو اس میں تاریخی قدامت کا احساس ہوا۔اسے گزرے ہوئے دن یاد آئے۔وہ اپنے ساتھیوں کے پیچھے چلتا ہوا اس کے قریب گیا۔اس نے سرد اور بھاری ہوا کو محسوس کیا جو اندر کہیں سے آ رہی تھی۔خالی میزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سپاہی نے کہا ”وہ بوڑھا یہاں دفن ہے۔پادری نے اسے گرجا گھر کے صحن میں دفن کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔تب کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے کہاں دفن کیا جائے۔آخر یہاں قبر بنائی گئی۔افسر نے آپ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا ہوگا۔یہ واقعی ایسی بات ہے جس پر شرمندگی ہوتی ہے۔اس نے کئی بار رات کو چھپ کر بوڑھے کو کھود نکالنے کی کوشش کی لیکن ہر بار پکڑا گیا۔“

”قبر کہاں ہے؟“ مہم جو نے پوچھا۔اسے سپاہی کی کسی بات پر یقین نہیں تھا۔فوراً ہی سپاہی اور مجرم دونوں بازو پھیلائے ایک طرف بھاگے۔وہ مہم جو کو عقبی دیوار کی طرف لے گئے جہاں چند گاہک میزوں کے گرد بیٹھے تھے۔وہ سب گودی کے مزدور اور مختصر چمکتی ہوئی بھاری داڑھیوں والے مضبوط انسان تھے۔کسی نے جیکٹ نہیں پہنی ہوئی تھی۔ان کی قمیصیں پھٹی ہوئی تھیں۔وہ غریب اور عاجز لوگ تھے۔جونہی مہم جو قریب گیا‘ان میں سے چند ایک کھڑے ہو گئے اور دیوار سے لگ کر اسے تکنے لگے۔

ایک سرگوشی سی اس کے گرد پھیلی۔”یہ قبر دیکھنا چاہتا ہے۔“ انھوں نے چند میزوں کو ایک طرف ہٹایا۔وہاں نیچے ایک کتبہ موجود تھا۔یہ اتنا چھوٹا تھا کہ میز کے نیچے چھپ گیا۔اس پر باریک الفاظ میں کچھ لکھا تھا۔مہم جو کو اسے پڑھنے کے لئے گھٹنوں کے بل جھکنا پڑا۔لکھا تھا ”یہاں سابقہ افسر اعلیٰ آسودہ خاک ہے۔اس کے طرفداروں نے‘ جو اب بے نام ہو چکے ہوں گے‘ یہ قبر بنائی اور کتبہ لگایا۔یہ پیشین گوئی کی جاتی ہے کہ ایک مخصوص عرصہ بعد افسر اعلیٰ پھر سے جی اٹھے گا اور کالونی کی بہبود کے لئے اس گھر سے اپنے طرف داروں کی رہنمائی کرے گا۔یقین پختہ رکھو اور انتظار کرو۔“

یہ تحریر پڑھ کر افسر اٹھ کھڑا ہوا۔اس نے دیکھا وہاں موجود لوگ مسکرا رہے تھے جیسے انہوں نے بھی یہ تحریر پڑھ لی تھی۔انہیں یہ سب کچھ مضحکہ خیز لگتا تھا۔وہ اس سے توقع کر رہے تھے کہ وہ بھی ان سے اتفاق کرے اور کتبے کی تحریر کا ٹھٹھہ اڑائے۔مہم جو نے انہیں نظر انداز کیا۔چند سکے ان میں تقسیم کئے۔

میزوں کے دوبارہ قبر کے اوپر رکھے جانے تک وہیں کھڑا رہا۔ پھر چائے خانہ سے نکل کر بندرگاہ کی طرف چل پڑا۔

سپاہی اور مجرم کو چائے خانہ میں چند واقف کار مل گئے جنہوں نے انہیں روک لیا۔ لیکن جلد ہی وہ ان سے اپنی پنڈ چھڑا کر بھاگے۔ انہوں نے مہم جو کو جالیا جو لمبے لمبے قدم اٹھاتا کشتیوں تک جاتی طویل سیڑھی کے نصف میں پہنچا تھا۔ شاید وہ اسے آخری لمحے تک مجبور کرنا چاہتے تھے کہ انہیں ساتھ لے چلے۔ وہ دخانی جہاز تک پہنچنے کے لئے ایک کشتی بان سے معاملہ طے کر رہا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھے۔ لیکن جب تک وہ سیڑھیوں سے نیچے اترتے مہم جو کشتی میں سوار ہو چکا تھا۔ کشتی بان کشتی کو دھکیلتا ہوا ساحل سے دور لے گیا۔ وہ کشتی میں کود سکتے تھے لیکن مہم جو نے کشتی کے فرش سے ایک موٹی گانٹھ دار لٹھ اٹھائی، اور اسے لہراتے ہوئے انہیں دھمکایا اور کشتی میں چھلانگ لگانے سے باز رکھا۔

فیصلہ

یہ بہار کے انتہائی خوب صورت موسم کی ایک اتوار کی صبح تھی۔ ایک نوجوان تاجر جارج بینڈمان دریا کے کنارے کنارے بنے چھوٹے اور خستہ حال گھروں، جو اپنی بلندی اور رنگ سے ایک دوسرے سے مختلف معلوم نہیں ہوتے ہیں، کی طویل قطار میں سے ایک گھر کی پہلی منزل میں اپنے ذاتی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ابھی اپنے ایک دیرینہ دوست کو، جو اب دیارِ غیر میں رہتا تھا، خط لکھ کر فارغ ہوا تھا اور پھر خط کو سستی کے ساتھ سوچوں میں کھوئے ہوئے انداز میں لفافے میں ڈالا اور اب لکھنے کی میز پر کہنیاں ٹکائے کھڑکی سے باہر دریا، پُل اور پرلے کنارے پر آنکھوں کو بھلی معلوم ہونے والی ہریالی والی پہاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔

وہ اپنے دوست کے بارے میں سوچ رہا تھا جو حقیقت میں چند سال پہلے روس بھاگ گیا تھا اور وہ یہاں اپنے حالات سے غیر مطمئن تھا۔ اب وہ سینٹ پیٹرز برگ میں اپنا کاروبار چلا رہا تھا جو شروع میں تو خوب چمکا لیکن اب طویل عرصے سے بری حالت میں تھا اور جس کی شکایت اس کا دوست اپنے مسلسل بے قاعدہ ہو جانے والے یہاں کے دوروں کے دوران کیا کرتا تھا۔ وہ دیارِ غیر میں بے کار ہی خود کو تھکا رہا

تھا۔ اس کی بڑی داڑھی اس چہرے کو پوری طرح نہیں چھپا پاتی تھی جسے جارج بچپن سے جانتا تھا اور اس کی جلد کی رنگت اتنی زرد ہو چکی تھی کہ اُس کے جسم میں پلنے والی کسی بیماری کا پتہ دیتی۔ جیسا کہ اس نے خود بتایا اس کا وہاں بسے ہوئے اپنے ہم وطنوں سے کوئی باقاعدہ رابطہ نہیں تھا، نہ ہی مقامی روسی کنبوں سے ہی اس کے تعلقات کچھ اچھے تھے اور یوں اس نے مستقل کنوارپنے پر قناعت کر رکھی تھی۔

ایسے شخص کو آخر کیا لکھا جا سکتا ہے جو خود بدحالی کا شکار ہو۔ جس کی حالت پر افسوس تو کیا جا سکتا تھا لیکن اس کی مدد کرنا ممکن نہیں تھا۔ کیا اسے یہ نصیحت کی جانی چاہئے کہ وہ واپس آ جائے، یہاں اپنی زندگی کی شروعات کرے، تمام پرانے دوستانہ تعلقات کی تجدید کرے، یہاں اس کے لیے رکاوٹ بھی کوئی نہیں ہوگی۔ اور پھر عمومی طور پر اپنے دوستوں کی اعانت پر بھروسہ رکھے۔ لیکن یہ تو اس سے یہ کہنے کے مترادف ہوگا اور یہ کہ یہ بات جتنی نرمی سے کہی جائے اتنی ہی تکلیف دہ ہو سکتی تھی، کہ اس کی سبھی کوششیں بے کار گئی تھیں، یہ کہ اسے اب یہ سب کچھ چھوڑ دینا، اپنے ملک لوٹ آنا اور لوگوں کی نظروں کا سامنا کرنا چاہئے جو اسے سب کچھ لٹا کر آنے والے کے طور پر دیکھیں گی۔ اور یہ کہ اصل سمجھ بوجھ تو اس کے دوستوں ہی کو حاصل ہے جب کہ وہ خود ایک بڑا بچہ ہی ہے جسے وہی کچھ کرنا چاہئے جو اس کے کامیاب اور گھر بار والے دوست اس کے لیے تجویز کریں۔ پھر بھی کیا یقینی تھا کہ جس مقصد کے لیے اسے یہ اذیت پہنچائی جائے گی، وہ بھی پورا ہوگا۔ شاید یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے واپس وطن لایا جائے۔ اس نے خود سے کہا کہ اپنے ملک کے تجارتی معاملات سے اب اس کا کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ یوں وہ اس اجنبی سرزمین پر دوستوں کے صلاح مشورے سے عاجز اور ان سے علیحدہ رہ کر ایک اجنبی کی زندگی گزارے گا۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ وہ دوستوں کا مشورہ بھی قبول کرے اور پھر یہاں جم کر کوئی کام بھی نہ کر پائے، کسی کی دشمنی کی وجہ سے نہیں بلکہ حالات ہی اسے اس نہج پر لے آئیں تو دوستوں کے ساتھ یا ان کے بغیر وہ نہیں چل پائے گا، ہتک محسوس کرے گا اور یہ کہنے جوگا بھی نہیں رہے گا کہ اس کے کچھ دوست ہیں اور اس کا اپنا بھی کوئی وطن ہے۔ تو کیا یہی بہتر نہیں ہے کہ جیسے بھی حالات میں وہ غیر ملک میں پڑا ہے، ویسے ہی رہے۔ اس سب کچھ کے پیش نظر کوئی بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہاں آنے کے بعد وہ ایک کامیاب زندگی گزارنے لگے گا۔

ان وجوہات کے تحت اگر کوئی اس سے خط و کتابت جاری رکھنا چاہے تو اسے ایسی خبریں نہیں بتائی جاتیں جو دور دراز رہنے والے دوستوں کو بے تکلفانہ بھیجی جاتی ہیں۔ پچھلی بار وہ تین سال پہلے یہاں آیا

تھا اور اس کے لیے اس نے یہ عذر پیش کیا تھا کہ روس کے سیاسی حالات دگرگوں تھے جس کی وجہ سے اس جیسے معمولی تاجر کو بھی تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی ملک سے باہر جانے کی مہلت حاصل نہیں تھی، جب کہ حقیقتاً اس دوران میں لاکھوں روسی سہولت کے ساتھ دوسرے ملکوں میں گھوم پھر رہے تھے۔

ان تین برسوں میں جارج کی اپنی زندگی بہت سی تبدیلیوں کی زد میں آئی تھی۔ دو سال پہلے اس کی ماں فوت ہو گئی۔ اس کے بعد سے وہ اپنے باپ کے ساتھ مل کر گھرداری کی ذمہ داریاں پوری کر رہا تھا۔ اس کے دوست کو بھی بلاشبہ اس سانحے کے اطلاع دی گئی تھی لیکن اس نے جواب میں ایسے روکھے انداز میں اظہار ہمدردی کیا تھا جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ اس سانحے سے پیدا ہونے والا دکھ دور دراز کسی ملک میں محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سانحے کے بعد سے جارج زیادہ پختہ ارادے کے ساتھ اپنے کاروباری معاملات اور دیگر امور میں پہلے سے زیادہ مصروف ہو گیا تھا۔

ماں زندہ تھی تو کاروباری معاملات میں وہ شاید اس لیے زیادہ ذوق وشوق سے کام نہیں کر سکا کہ اس کا باپ اپنی من مانی کرنے کا شائق تھا۔ شاید اپنی بیوی کی وفات کے بعد اس کے باپ کا مزاج کم جارحانہ ہو گیا تھا۔ حالاں کہ وہ کاروباری معاملات میں اب بھی دخیل تھا۔ یا شاید ایسا قسمت کے اتفاقات کا ہی نتیجہ تھا جو بلاشبہ اغلب ہوتے ہیں، لیکن پچھلے دو سالوں میں کسی بھی طرح سے ان کا کاروبار انتہائی غیر معمولی انداز میں چمکا تھا۔ عملے کی تعداد دگنی ہوئی، آمدنی پانچ گنا بڑھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ترقی کا عمل ہنوز جاری تھا۔

لیکن اس تبدیلی کے بارے میں وہ اپنے دوست کو کچھ نہیں بتا پایا تھا۔ شروع کے سالوں میں، شاید آخری بار اپنے تعزیتی خط میں، اس نے جارج سے اصرار کیا تھا کہ وہ روس ہجرت کرے اور اس نے وہاں جارج کی کاروباری شاخ کی کامیابی کے امکانات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا۔ اس حوالے سے جو اعداد و شمار پیش کیے گئے، وہ جارج کی موجودہ کاروباری سرگرمیوں کے موازنے میں بہت کم تھے۔ وہ دوست کو اپنی موجودہ کاروباری کامیابی کے بارے میں بتانے سے ہچکچاہٹ محسوس کرتا رہا تھا۔ نہ ہی یہ بہتر لگتا تھا کہ اب سارے قصے کو نئے سرے سے بتایا جائے۔

اسی لیے جارج اپنے دوست کو خط میں ادھر اُدھر کی غیر اہم باتیں لکھتا رہتا تھا جیسی باتیں ایسے ہی کسی پرسکون اتوار کو ستاتے ہوئے آدمی کے ذہن میں آ سکتی تھیں۔ وہ تو بس یہی چاہتا تھا کہ اتنے لمبے

عرصے میں اس کے دوست نے اپنے ذہنی سکون کے لیے اس ملک سے متعلق اپنے ذہن میں جو تصور قائم کر رکھا ہے، وہ برقرار رہے۔ اسی لیے ایسا ہوا کہ جارج نے طویل وقفوں سے لکھے گئے تین بالکل مختلف خطوں میں ایک غیر اہم شخص کی ایک ویسی ہی غیر اہم لڑکی سے منگنی ہو جانے کے واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا حتی کہ اس کی توقع کے برعکس اس کا دوست اس واقعے میں واقعی دلچسپی ظاہر کرنے لگا۔

جارج نے یہ تسلیم کرنے کے بجائے کہ مہینہ بھر پہلے اس کی فراؤلین فریڈا بریندڑن فلڈ سے، جو اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی، منگنی ہوئی تھی، دوست کو یہ ایسی غیر اہم باتیں بتانے کو ترجیح دی تھی۔ منگیتر سے اپنی گفتگو میں وہ اپنے دوست اور اس کے ساتھ اپنے عجیب تعلق کے بارے میں اکثر گفتگو کرتا جو اس خط و کتابت کے دوران پیدا ہوا تھا۔

''تو کیا وہ ہماری شادی میں نہیں آئے گا۔ مجھے تمھارے دوستوں کے بارے میں جاننے کا حق ہے۔'' اس کی منگیتر نے کہا۔

''میں اسے کسی پریشانی میں گرفتار نہیں کرنا چاہتا۔'' جارج نے جواب دیا، ''مجھے غلط مت سمجھو۔ شاید وہ آئے گا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے۔ لیکن وہ محسوس کرے گا جیسے اس کا حق مارا گیا ہے۔ اسے ٹھیس پہنچے گی۔ شاید وہ مجھ سے حسد کرے اور یقیناً وہ مزید آزردہ ہو جائے۔ اور اپنی مایوسی کا سامنا کرنے کی اہلیت کے بغیر وہ پھر سے اکیلا ہی کہیں نکل جائے گا۔ پھر سے اکیلا ۔ ۔ ۔ کیا تم سمجھ سکتی ہو، اس کا کیا مطلب ہے؟''

''کیا تمھارے خیال میں اسے کسی طرح سے ہماری شادی کی خبر نہیں ہو جائے گی؟''

''میں اس بات کو ہونے سے روک تو نہیں سکتا لیکن ایسا ممکن نہیں ہے، اس کا طرز زندگی ہی ایسا ہے۔''

''جارج، تمھارے دوست اس قسم کے ہیں تو بہتر تھا تم منگنی ہی نہ کرتے۔''

''اس کام میں تو ہم دونوں شامل ہیں۔ جو ہو گیا ہے، اسے بدلا نہیں جا سکتا۔''

تب اس کے طویل بوسوں کے دوران تیز تیز سانس لیتے ہوئے وہ کسی طرح کہہ پائی، ''بہر حال مجھے گھبراہٹ محسوس ہو رہی ہے۔''

تب اس نے سوچا اگر وہ اپنے دوست کو اس واقعے کے بارے میں اطلاع دے تو ممکن ہے کہ

یوں وہ کسی اور پریشانی سے خود کو بچا سکے۔

''میں ایسا ہی ہوں اور اسے مجھے ایسے ہی قبول کرنا ہوگا۔ میں خود کو اس کے موافق بنانے کے لیے بدل نہیں سکتا۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اور اصل میں اس نے اپنے طویل خط میں جو وہ اتوار کی صبح لکھتا رہا تھا، اس نے اپنے دوست کو اپنی منگنی کے بارے میں ان الفاظ میں اطلاع دی تھی، ''اختتام کے لیے میں نے سب سے بہترین خبر بچا کر رکھی ہے۔ میں نے شہر کے ایک متمول گھرانے کی لڑکی فراؤلین بریڈن فلڈ سے منگنی کر لی ہے۔ وہ لوگ تمھارے جانے کے کافی عرصہ بعد یہاں آباد ہوئے۔ اس لیے تم اس سے واقف نہیں ہو گے۔ اس بارے میں آئندہ بھی تفصیل سے لکھوں گا۔ لیکن آج کے لیے اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میں بہت خوش ہوں۔ تمہارے اور میرے تعلق میں بس اتنا ہی فرق آیا ہے کہ اب تم مجھے ملو گے تو تمھیں مجھ جیسے عام دوست میں میں ایک آسودہ دوست ملے گا۔ تم میری منگیتر کے بارے میں مزید بھی جانو گے، وہ تمھیں سلام کہہ رہی ہے اور جلد ہی خود بھی تمھیں خط لکھے گی، عورتوں میں ایک سچی دوست کی طرح، جو ایک غیر شادی شدہ شخص کے لیے بہرحال ایک خاص بات ہے۔ مجھے علم ہے کہ بہت سی وجوہات ہیں کہ تم ہم سے کیوں ملنے نہیں آتے۔ لیکن میری شادی کیا ایسا اہم موقع نہیں ہے جس کے لیے تم ان رکاوٹوں کو پس پشت ڈال دو اور ملنے چلے آؤ۔ لیکن خیر جیسا بھی ہو، وہی کرو جو تمھیں، میری خواہش سے قطع نظر، اپنے مطابق بہتر لگے۔''

اس خط کو ہاتھ میں لیے دیر سے جارج اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف کیے لکھنے کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دیکھ ہی نہ پایا کہ گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی واقف کار نے اسے ہاتھ ہلا کر ایک غائب مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا تھا۔

پھر اس نے خط جیب میں رکھا اور کمرے سے نکل کر مختصر برآمدے سے ہوتا ہوا اپنے باپ کے کمرے میں گیا جہاں اس کا مہینوں سے جانا نہیں ہوا تھا۔ وہاں جانے کی اسے ضرورت ہی نہیں تھی۔ کاروبار کے سلسلے میں روز ہی وہ ملتے تھے اور کھانے کے وقفوں میں وہ دوپہر کا کھانا بھی اکٹھے ہی کھاتے تھے۔ یہ سچ تھا کہ شام کو دونوں اپنی مرضی سے وقت گزارنے میں آزاد تھے، لیکن پھر بھی جارج زیادہ تر دوستوں کے ساتھ باہر چلا جاتا یا جیسا کہ حال ہی میں ہونے لگا تھا کہ اپنی منگیتر سے ملنے چلا جاتا، ورنہ وہ دونوں کچھ وقت ساتھ گزارتے اور اپنی مشترکہ بیٹھک میں بیٹھ کر اخبار پڑھتے۔

جارج کو حیرت ہوئی کہ ایسے روشن دن میں بھی اس کے باپ کا کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ کمرہ تنگ صحن کی دوسری جانب اونچی دیوار کے سائے میں واقع ہونے کی وجہ سے سورج کی براہ راست روشنی سے محروم تھا۔ اس کا باپ کھڑکی کے نزدیک ایک کونے میں بیٹھا تھا جہاں اس کی مرحوم والدہ کی کئی تصویریں اور مختلف نشانیاں ٹنگی ہوئی تھیں اور اخبار کو پڑھتے ہوئے اپنی آنکھوں کے سامنے یوں ایک طرف کیے ہوئے تھا کہ بصارت کے نقص پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میز پر اس کے ناشتے کا، جس کا صاف معلوم ہوتا تھا کہ کم ہی حصہ کھایا گیا، کا باقی ماندہ حصہ پڑا تھا۔

'اوہ جارج'' اس کے باپ نے اپنی جگہ فوراً کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ چلنے سے اس کا بھاری بھرکم شب خوابی کا لباس کھل گیا اور پلو اس کے جسم کے گرد پھڑ پھڑانے لگے۔

'میرا باپ ابھی تک ایک جسیم انسان ہے۔'' جارج نے خود سے کہا۔

وہ بولا'' یہاں نا قابل برداشت اندھیرا ہے۔''

''ہاں، یہاں کافی اندھیرا ہے۔'' اس کے باپ نے جواب دیا۔

''آپ نے کھڑکیاں بھی بند کی ہوئی ہیں؟''

''مجھے ایسا ہی اچھا لگتا ہے۔''

''خیر باہر کافی گرمی ہے۔'' جارج نے کہا جیسے وہ اپنی پچھلی بات ہی کا تسلسل برقرار رکھے ہوئے ہو۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ اس کے باپ نے ناشتے کے برتن صاف کیے اور انھیں ایک الماری میں رکھ دیا۔

''میں صرف آپ یہ اطلاع دینا چاہتا تھا کہ'' جارج اپنے باپ کی حرکات کا مشاہدہ کرتے ہوئے بولتا رہا، ''میں سینٹ پیٹرز برگ خط لکھ کر اپنی منگنی کی خبر بھیج رہا ہوں۔'' اس نے اپنی جیب میں سے خط کچھ باہر نکالا لیکن پھر سے اسے اندر گھسیڑ لیا۔

''سینٹ پیٹرز برگ؟'' اس کے باپ نے پوچھا۔

''میرے دوست کو'' جارج نے اپنے باپ کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاروباری معاملات میں یہ کتنا مختلف ہوتا ہے۔ کیسے مضبوطی سے اپنے بازوں کو باندھے بیٹھتا ہے۔

''اوہ ہاں، اپنے دوست کو۔'' اس کے باپ نے عجیب انداز میں زور دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا، ابوجان آپ تو جانتے ہیں کہ پہلے میں اسے اپنی منگنی کے بارے میں بتانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ بس اسی کا سوچ کر اور اس کی کوئی دوسری وجہ نہیں تھی۔ آپ خود جانتے ہیں کہ وہ ایک مشکل انسان ہے۔ میں نے خود سے سوچا کہ اسے ضرور کسی نہ کسی ذریعے سے میری منگنی کے بارے میں پتہ چل جائے گا، حالاں کہ اس کی خلوت گزینی کی زندگی میں اس بات کا امکان بہت زیادہ نہیں ہے۔ اور اسے میں روک بھی نہیں سکتا۔ لیکن میں اسے یہ خبر دینے پر تیار نہیں تھا۔''

''اور اب تم نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔'' اس کے باپ نے پوچھا، اپنا بڑا اخبار کھڑکی کی دہلیز پر پھیلاتے ہوئے جب کہ اس کے اوپر اس کا چشمہ تھا جسے اس نے ایک ہاتھ سے ڈھانپا ہوا تھا۔

''ہاں، اس بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ میں نے خود سے کہا کہ اگر وہ میرا اچھا دوست ہے تو اس منگنی میں میری خوشی سے اسے بھی خوشی ہوگی۔ اسی لیے اب مجھے اس کو اس بارے میں بتانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ لیکن خط بھیجنے سے پہلے میں نے سوچا کہ آپ سے بھی بات کروں۔''

''جارج'' اس کے باپ نے اپنا بغیر دانتوں کا منہ پورا کھولتے ہوئے کہا، ''میری بات سنو۔ تم اس معاملے پر مجھ سے بات کرنے آئے ہو۔ بلاشبہ یہ تمھاری سعادت مندی ہے۔ لیکن اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ بلکہ یہ کچھ نہ ہونے سے بھی بدتر ہوتا اگر تم مجھے پورا سچ نہ بتاتے۔ میں ان باتوں کو نہیں چھیڑنا چاہتا جو اس موقع سے مناسبت نہیں رکھتی ہیں۔ تمھاری ماں کی وفات کے بعد سے یہاں کچھ خاص قابل اعتراض باتیں ہو رہی ہیں۔ شاید ان پر بات کرنے کا وقت آئے گا اور شاید اس سے بھی جلد جتنا ہمارا اندازہ ہے۔ کاروبار میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا مجھے علم نہیں ہو پاتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مجھ سے چھپائی نہ جاتی ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ انھیں جان بوجھ کر مجھ سے چھپایا جاتا ہے۔ میں پہلے جیسا صحت مند نہیں رہا۔ میری یادداشت کمزور ہو رہی ہے۔ میں اب مزید بہت سی باتوں پر ایک ساتھ نظر نہیں رکھ سکتا۔ ایک تو یہ سب کچھ قدرتی عمل کا حصہ ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ تمھاری ماں کی وفات تمھاری نسبت میرے لیے کہیں زیادہ بڑا دھچکا تھی۔ لیکن چوں کہ ابھی ہم اس خط پر بات کر رہے ہیں، جارج میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے دھوکہ مت دو۔ یہ تو بہت معمولی بات ہے۔ اتنی بھی اہم نہیں ہے کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ اس لیے مجھے دھوکہ مت دو۔ کیا واقعی سینٹ پیٹرز برگ میں تمھارا کوئی دوست ہے؟''

جارج پریشانی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میرے دوستوں کی بات کو چھوڑ دیجیے۔ ہزاروں دوست بھی

میرے لیے باپ کا متبادل نہیں ہو سکتے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کیا سوچتا ہوں؟ آپ اچھے طریقے سے اپنا خیال نہیں رکھ رہے۔ بڑھاپے میں زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاروبار میں آپ کا ہونا میرے لیے ناگزیر ہے۔ آپ بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن اگر کاروبار آپ کی صحت کے لیے مضر ثابت ہو تو میں اسے کل ہی ہمیشہ کے لیے بند کرنے پر تیار ہوں۔ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں آپ کے طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔ ایک بڑی تبدیلی۔ آپ یہاں تاریکی میں بیٹھتے ہیں جب کہ بیٹھک میں اچھی خاصی روشنی ہے۔ اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے بجائے آپ بہت کم ناشتہ کرتے ہیں۔ آپ بند کھڑکی کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر ہوا آتی رہے تو اس سے آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔ نہیں ابو جان، میں کسی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں اور ہم اس کی ہدایات پر عمل کریں گے۔ ہم یہ کمرہ ہی بدل لیں گے۔ آپ سامنے کمرے میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ میں یہاں آجاؤں گا۔ آپ کو اس تبدیلی کا معمولی سا ہی احساس ہوتا۔ ہر چیز آپ کے ساتھ ہی وہاں منتقل ہو جائے گی۔ لیکن یہ سب کچھ بعد میں ہوگا، پہلے تو میں آپ کو کچھ دیر کے لیے بستر میں لٹا دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ میں کپڑے اتارنے میں آپ کی مدد کروں گا۔ آپ دیکھئے گا کہ میں ایسا کرلوں گا۔ یا اگر آپ فوراً ہی سامنے کمرے میں منتقل ہونا چاہیں تو آپ فی الحال میرے بستر میں جا کر لیٹ سکتے ہیں۔ یہی سب سے بہتر رہے گا۔''

جارج اپنے باپ کے قریب کھڑا تھا جس کا الجھے ہوئے سفید بالوں والا سر اس کی چھاتی سے جا لگا تھا۔

''جارج'' اس کے باپ نے بغیر ہلے مدھم آواز میں کہا۔

جارج فوراً ہی اپنے باپ کے ساتھ نیچے جھک گیا۔ اس نے اپنے باپ کے تھکے ہوئے چہرے پر پھیلی ہوئی پتلیاں دیکھیں جو آنکھوں کے کناروں سے اسی پر جمی ہوئی تھیں۔

''سینٹ پیٹرز برگ میں تمھارا کوئی دوست نہیں ہے۔ تم ہمیشہ سے ایسے ہی فریبی ہو اور مجھ سے فریب کرنے سے بھی باز نہیں آئے۔ وہاں تمھارا کوئی دوست ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ مجھے یقین نہیں آتا۔''

''ابو جان ذرا یاد کرنے کی کوشش کیجئے۔'' جارج اپنے باپ کو آرام کرسی سے بلند کرتے ہوئے بولا اور جونہی وہ نقاہت سے کھڑا ہوا تو اس کا شب خوابی کا لباس اتار لیا۔ ''تھوڑے ہی عرصے میں اس بات کو تین سال ہو جائیں گے جب میرا دوست آخری مرتبہ یہاں آیا تھا۔ مجھے یاد ہے آپ کو خاص طور پر وہ

پسند نہیں تھا۔ کم از کم دو بار میں نے آپ کو اس سے ملنے سے روکا حالاں کہ تب وہ میرے ہی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس سے آپ کی نفرت کو اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہوں۔ میرا دوست بھی بہت عجیب ہے۔ لیکن پھر بعد میں آپ کی اس سے گاڑھی چھننے لگی۔ تب مجھے اس بات پر فخر محسوس ہوتا کہ آپ نے اسے سنا، ہاں میں سر ہلایا اور اس سے سوال پوچھے۔ دماغ پر زور دیں تو ضرور آپ کو یاد آ جائے گا۔ وہ ہمیں روسی انقلاب کے بارے میں بہت سی غیر معمولی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر جب وہ کیوو کے دورے پر تھا اور ایک بلوے سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ اور اس نے ایک پادری کو بالکونی میں دیکھا تھا جس نے اپنے ہاتھ میں خون میں لتھڑی ہوئی صلیب کا زخم بنایا تھا اور ہاتھ بلند کیے ہجوم سے درخواست کر رہا تھا۔ آپ نے اس واقعہ کا خود بھی ایک سے زائد بار ذکر کیا۔"

اس اثنا میں جارج اپنے باپ کو پھر سے وہاں بٹھانے اور احتیاط سے اس کا سوتی پاجامہ اتارنے میں کامیاب ہو گیا جو اس نے اپنے لینن کے بنے ہوئے زیر جامہ اور جرابوں کے اوپر پہنا ہوا تھا۔ زیر جامہ کی غلاظت کو دیکھ کر اس نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ وہ اپنے باپ کو نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ یہ واقعتاً اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ خیال رکھے کہ اس کے باپ نے زیر جامہ بدلا ہے یا نہیں۔ اس نے ابھی تک واضح انداز میں اپنی منگیتر سے بھی اس بارے میں بات نہیں کی تھی کہ وہ مستقبل میں اپنے باپ سے متعلق کیا انتظامات کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ انھوں نے اپنے طور پر یہ فرض کر لیا تھا کہ شادی کے بعد اس کا باپ یونہی اس پرانے اپارٹمنٹ میں رہتا رہے گا۔ لیکن اب اس نے فوراً ہی یہ پکا ارادہ کیا کہ وہ اپنے باپ کو نئے گھر میں ساتھ لے جائے گا۔ ذرا غور سے دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا تھا کہ جو دیکھ ریکھ وہ اپنے باپ کی کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے دیر ہو چکی تھی۔

وہ اپنے باپ کو بازوؤں میں اٹھا کر بستر تک لے گیا۔ وہ چند قدم ہی بستر کی طرف بڑھا ہو گا کہ یہ دیکھ کر کہ اس کا باپ اس کے سینے میں بندھی گھڑی کی زنجیر سے کھیل رہا تھا، اسے دہشت کا احساس ہوا۔ وہ اپنے باپ کو بستر پر نہیں لٹا سکا کیوں کہ زنجیر پر اس کی گرفت بہت مضبوط لگتی تھی۔

لیکن جونہی وہ بستر پر لیٹا، سب کچھ ٹھیک صورت میں آ گیا۔ اس نے خود کو کمبل میں اچھی طرح ڈھانپ لیا بلکہ اسے اپنی عادت کے برعکس کافی اوپر اپنے کندھوں تک کھینچ لیا۔ وہ جارج کو ایک غیر دوستانہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔

''آپ کو میرا دوست یاد آنے لگا ہوگا، کیا نہیں؟'' جارج نے حوصلہ افزا انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا میں اچھی طرح سے ڈھک گیا ہوں۔'' اس کے باپ نے پوچھا جیسے وہ اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ اس کے پیر صحیح طور پر کمبل سے ڈھکے ہوئے تھے یا نہیں۔

''تو آپ بستر میں آرام محسوس کر رہے ہیں۔'' جارج بولا اور باپ کے گرد بستر کو ہموار کر دیا۔

''کیا میں اچھی طرح سے ڈھک گیا ہوں'' اس کے باپ نے ایک بار پھر پوچھا اور لگتا تھا جیسے اسے جواب سننے میں دلچسپی تھی۔

''پریشان نہ ہوں۔ آپ اچھی طرح سے ڈھک گئے ہیں۔''

''نہیں'' جارج کی بات کاٹتے ہوئے اس کا باپ چیخ کر بولا۔ اس نے پوری قوت سے کمبل پرے پھینکے کہ وہ فوراً ہی اڑ کر پرے جا گرے، اور بستر پر تن کر کھڑا ہو گیا۔ صرف ایک ہاتھ سہارے کے لیے معمولی سا چھت کو چھو رہا تھا۔

''تم مجھے ڈھک دینا چاہتے ہو۔ میں جانتا ہوں میرے چھوٹے بچے۔ لیکن میں آسانی سے ڈھکنے والا نہیں ہوں۔ اور اگر یہ میرے جسم کا آخری زور ہے تو بھی تمھیں سنبھالنے کے لیے کافی ہے۔ بلکہ تم سے زیادہ ہی ہے۔ ہاں، میں تمھارے دوست کو جانتا ہوں۔ وہ میرا دل عزیز بیٹا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام برسوں میں تم مجھ سے دھوکہ کرتے رہے۔ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ کیا تمھارے خیال میں مجھے اس کا دکھ نہیں ہے؟ اسی لیے تو تم خود کو اپنے دفتر میں بند کر لیتے تھے۔ کہ چیف مصروف ہے، اسے پریشان نہ کیا جائے۔ صرف اس لیے کہ تم روس میں جھوٹ کے پلندے خط لکھ سکو۔ لیکن خوش قسمتی سے کوئی کسی باپ کو یہ نہیں سکھا سکتا کہ وہ کیسے اپنے بیٹے کے اندر جھانکے۔ اور اب جب کہ تمھارا خیال ہے کہ تم اسے مات دے چکے ہو اور اتنا نیچے گرا چکے ہو کہ اس پر سوار ہو سکو اور اس پر بیٹھ جاؤ اور وہ ذرا سی چوں بھی نہ کر سکے، تو اب میرا چالاک بیٹا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ شادی کر لے۔''

جارج اپنے باپ کے اس خوف زدہ کرنے والے روپ کو مبہوت ہو کر دیکھتا رہ گیا۔ سینٹ پیٹرز برگ میں اس کے دوست نے، جسے اس کا باپ اچانک اتنے اچھے طریقے سے جانتا تھا، اس کے حواس کو یوں اپنی گرفت میں لیا کہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے روس کی وسعت میں گم دکھائی دیا۔ اسے ایک

رنڈوے کی تشفی کے لیے اور بچا ہی کیا ہے۔ مجھے بتاؤ۔ اور جواب دیتے ہوئے یہ مت بھولنا کہ تم ابھی تک میرے اکلوتے بیٹے ہو۔۔ میرے ہی بچا ہی کیا ہے، میرے پچھلے کمرے میں، بے ایمان نوکروں کے ہاتھوں تنگ، اپنی ہڈیوں کے گودے تک بوڑھا؟ اور میرا بیٹا ساری دنیا میں خوشی سے گھومتا پھرتا تھا، کاروباری معاملات نمٹاتا ہوا جنھیں میں نے ہی اس کے لیے تیار کیا ہوتا ہے، فاتحانہ خوشی سے پھولے نہیں سماتا اور اپنے باپ کے سامنے سے ایک معزز کاروباری انسان جیسے بھنچے ہوئے ہونٹوں والے چہرے کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ کیا تم سوچتے ہو کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے، مجھے، جس سے تم پیدا ہوئے۔''

''اب یہ آگے جھکے گا'' جارج نے سوچا۔ ''کہیں یہ خود کو گرا نہ لے، اور ٹوٹ پھوٹ جائے۔'' یہ الفاظ اس کے دماغ میں سے سرسراتے ہوئے گزرے۔

اس کا باپ آگے جھکا لیکن گرا نہیں۔ جب جارج قریب نہیں آیا جیسا کہ اسے توقع تھی، تو اس نے پھر سے خود کو سیدھا کھڑا کیا۔

''وہیں ٹھہرو جہاں ہو۔ مجھے تمھاری ضرورت نہیں ہے۔ تمھیں غلط فہمی ہے کہ تم میں اتنی طاقت ہے کہ یہاں تک آسکو اور یہ کہ تم اپنی مرضی سے خود کو وہاں روکے ہوئے ہو۔ کسی بھول میں مت رہنا۔ مجھ میں اب بھی تم سے زیادہ ہی طاقت ہے۔ صرف خود پر بھروسہ کرتا تو شاید گر چکا ہوتا لیکن تمھاری ماں نے اپنی طاقت میں سے اتنا حصہ حصہ مجھے دیا کہ میں نے تمھارے دوست کے ساتھ شان دار تعلق قائم کیا اور تمھارے سارے گاہک بھی میری جیب میں ہیں۔''

''اس کی قمیض میں جیبیں بھی ہیں۔'' جارج نے خود سے کہا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس بات سے وہ اسے دنیا بھر کے لیے ایک مشکل آدمی کے طور پر پیش کر دے گا۔ یہ خیال بس لمحہ بھر کے لیے اس کے ذہن میں آیا اس لیے کہ وہ مستقل طور پر ہر بات بھولتا جا رہا تھا۔

''ذرا اپنی منگیتر کو اپنے بانہوں میں لے کر میرے سامنے سے گزر کر تو دیکھو، میں اسے تمھارے پہلو میں سے اچک لوں گا۔ تم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ کیسے؟''

جارج نے ایسے منہ بنایا جیسے اسے باپ کی بات پر اعتماد نہ ہو۔ اس کے باپ نے جارج کی طرف دیکھ کر سر ہلایا جیسے اپنی بات کی سچائی پر اصرار کر رہا ہو۔

اور اس لیے سمجھ لو، ''میں تمھیں ڈوب کر مر جانے کی سزا سناتا ہوں۔''

جارج نے محسوس کیا کہ اسے کمرے سے باہر دھکیل دیا گیا ہو۔ جس دھماکہ خیز آواز کے ساتھ اس کا باپ پیچھے کمرے میں اپنے بستر پر گرا تھا، وہ باہر نکلتے ہوئے اس کی کانوں میں گونج رہی تھی۔ زینے میں وہ بھاگتا ہوا نیچے اترا جیسے یہ کوئی نشیب ہو، وہاں اس کی مڈبھیڑ صفائی کرنے والی عورت سے ہوئی جو پچھلی رات کے بعد سے اب اس کے کمرے کی صفائی کرنے آئی تھی۔

''خدایا'' وہ چیخی اور اپنا چہرہ ایپرن میں چھپا لیا۔ لیکن وہ تیزی سے آگے نکل گیا۔ صدر دروازے سے نکل کر وہ بھاگا، سڑک پر دریا کی طرف بڑھتے ہوئے۔ وہ جنگلے کو یوں زور سے پکڑے ہوئے تھا جیسے کوئی بھوکا آدمی خوراک کو مٹھی میں دبائے ہو۔ وہ جنگلے کو پھلانگا، جمناسٹک کے ایک غیر معمولی ماہر کی طرح جیسا کہ وہ اپنی نوجوانی میں تھا، اپنے والدین کا افتخار۔ کمزور ہوتی ہوئی گرفت کے ساتھ وہ ابھی تک جنگلے کو پکڑے ہوئے تھا، جب اس نے جنگلوں کے درمیان میں سے ایک بس کو آتے دیکھا جو آسانی سے اس کے گرنے کے شور کو دبا لے گی۔ وہ خاموشی سے بولا ''عزیز والدین، میں نے ہمیشہ آپ سے محبت کی ہے، اس سب کچھ کے باوجود۔'' اور پھر اس نے خود کو گرا لیا۔

اس لمحے پُل پر سے ٹریفک کا غیر مختتم سیلاب گزر رہا تھا۔

اور خاص طور پر میرے لیے اپنا سب کچھ تج دیا۔ نتیجتاً میں نے ایک اعلیٰ اور خوش حال زندگی گزاری۔ مجھے یہ آزادی حاصل رہی کہ جو سیکھنا چاہوں، وہ سیکھوں، اور مادی پریشانیاں میرے قریب سے بھی نہیں پھٹکیں، جن سے مراد ہر قسم کی پریشانیاں تھی۔ آپ نے ہم سے کسی شکرگزاری کی کبھی توقع نہیں کی کیوں کہ آپ جانتے تھے کہ بچوں کی شکرگزاری کیسی ہوتی ہے۔ لیکن ہم سے کم از کم کچھ احسان مندی، کسی طرح کی ہمدردی کی توقع ضرور کی۔

اس کے برعکس میں ہمیشہ آپ کو چکمہ دے کر اپنی کتابوں، اپنے احمق دوستوں اور اپنے فضول خیالات کے ساتھ اپنے کمرے میں چھپا رہتا۔ میں نے کبھی آپ سے دوستانہ لہجہ میں بات نہیں کی۔ میں کبھی آپ کے ساتھ عبادت گاہ نہیں گیا۔ کبھی آپ سے ''فرانزنس بیڈ'' ملنے نہیں آیا اور کبھی آپ سے خاندان سے جڑے جذبات کا اظہار کیا۔ کبھی آپ کے کاروبار اور دیگر مشاغل میں بھی دلچسپی نہیں لی۔ میں نے آپ کو فیکٹری کے کام میں جوتے رکھا، اور خود اس سے دور رہا۔ ''اوٹلا'' کی خودسری کو شہ دی اور کبھی آپ کا ساتھ نہیں دیا (کبھی آپ کو تھیٹر کا ٹکٹ بھی لا کر نہیں دیا۔) جب کہ اپنے دوستوں کے کام کرنے میں لگا رہتا ہوں۔ آپ اگر میرے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کریں تو یقیناً یہی ہوگی کہ آپ نے اگرچہ شادی کے میرے حالیہ فیصلے کے علاوہ کبھی کسی بات پر مجھے لعن طعن نہیں کی، لیکن ہمیشہ مجھے سردمہری، بے مروتی اور بےگانگی کا طعنہ ضرور دیا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر، آپ نے یہ الزام مجھ پر اس انداز میں لگایا کہ ایسا لگے کہ سارا قصور میرا ہی ہے۔ یعنی ایسا لگے کہ جیسے سیٹرنگ وہیل کو معمولی حرکت دینے سے گاڑی کی سمت تبدیل کی جاسکتی ہے ایسے ہی میں چاہتا تو یہ صورت حال ایسی نہ ہوتی، جب کہ اس میں آپ کی غلطی معمولی سی بھی نہیں تھی، یعنی اگر میرے ساتھ اچھائی کرنے کو برائی تسلیم نہ کیا جائے تو۔

آپ اس معاملے کو عام طور پر یوں پیش کرتے ہیں کہ میں اسے درست سمجھتا ہوں صرف اس حد تک کہ میں ہماری قطع تعلقی کے معاملے میں آپ کے مکمل بےقصور ہونے پر یقین رکھتا ہوں۔ لیکن میں بھی اتنا ہی بےقصور ہوں۔ اگر میں آپ سے یہ بات منوا لیتا ہوں تو کیا ہوگا کہ میرے خیال میں ایک نئی زندگی کی شروعات نہیں ہوگی، کہ ہم دونوں ہی عمر کی اس منزل سے گزر چکے ہیں، بلکہ ایک طرح کا سکون حاصل ہوگا، آپ کی مسلسل لعن طعن کا خاتمہ تو نہیں لیکن اس میں کچھ کمی۔

عجیب بات ہے لیکن کسی حد تک آپ بھی میری اس بات کو سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر تھوڑا ہی

جو اپنی قوت، صحت، اشتہا، لہجہ کی بلند آہنگی، سادگی، تسکین ذات، دنیاوی جاہ وحشمت، بردباری، ذہنی اپچ، انسانی فطرت کے فہم اور ہر کام کو اعلیٰ سطح پر ایک خاص انداز میں کرنے کی عادت کے حوالے سے ایک مثالی ''کافکا'' ہیں۔ لیکن بلاشبہ آپ میں وہ تمام عیوب اور کمزوریاں بھی ہیں جو ان خصوصیات کے ساتھ نتھی ہوتی ہیں اور جو کبھی کبھار آپ کے مزاج اور اکثر آپ کی گرم مزاجی سے عیاں ہوتی ہیں۔ میں آپ کا انکل فلپ، لڈوگ اور ہمرچ کے ساتھ موازنہ کروں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید آپ اپنی ظاہری شخصیت میں مکمل 'کافکا' بھی نہیں ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے اور یہاں مجھے وجوہات بھی واضح دکھائی نہیں دیتی ہیں۔ بہرکیف وہ آپ سے بڑھ کر ہنس مکھ، خوش اخلاق، زیادہ بے تکلف، زیادہ آسان، اور کم تلخ ہیں۔ (اس حوالے سے میں نے آپ سے بہت کچھ وارثت میں پایا ہے اور آپ ہی کی طرح اپنی فطرت پر کوئی بندش لگائے بغیر اس ورثہ کی اچھے انداز میں حفاظت بھی کی ہے۔) بے شک آپ بھی اپنے مزاج کے حوالے سے مختلف مراحل سے گزرے ہیں۔ شاید کبھی آپ بھی خوش مزاج تھے، اپنے بچوں سے اور خاص طور پر مجھ سے مایوس ہونے سے پہلے، اور یوں گھر میں آپ مایوس رہتے۔ (جب ہمارے گھر مہمان آتے تو آپ کا رویہ مختلف ہو جاتا) غالباً آپ اب پہلے کی نسبت زیادہ ہنس مکھ ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ آپ کے نواسے، نواسیوں اور داماد نے آپ کو وہی محبت اور گرم جوش عقیدت دی ہے جو سوائے ''ویلی'' (Vill) کے آپ کا کوئی بچہ نہیں دے سکا۔ اس اعتبار سے ہم دونوں اس قدر مختلف ہیں اور اپنے اس اختلاف میں ایک دوسرے کے لیے اس قدر مہلک کہ اگر کوئی اس صورت حال کا پہلے سے اندازہ لگانے کی کوشش کرتا تو دیکھتا کہ مجھ جیسا سست روی سے بڑھتا ہوا بچہ اور آپ جیسا مکمل جوان انسان کچھ اس انداز میں ایک دوسرے سے برتاؤ کرتے کہ آپ مجھے اپنے پیروں تلے مسل دیتے حتیٰ کہ میرا کچھ بھی باقی نہ بچتا۔ ایسی صورت حال کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ زندگی کے بارے میں آپ اندازے نہیں لگا سکتے۔ بلکہ اس سے زیادہ بدترین صورت حال پیدا ہوئی۔ اور ایسا کہتے ہوئے میں آپ سے یہی التجا کروں گا کہ آپ کبھی یہ مت بھولیں کہ میں نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کو کسی بھی حوالے سے قصوروار نہیں سمجھا ہے۔ آپ کی شخصیت کا مجھ پر جو اثر ہوا ہے، اس میں آپ کی کسی منشاء کا دخل نہیں تھا۔ نہ ہی آپ یہ سوچیں کہ میرا یہ کہنا کہ میں آج بھی اسی اثر تلے ہوں، آپ سے میری کسی عداوت کو ظاہر کرتا ہے۔

میں ایک ڈرپوک بچہ تھا۔ اسی باعث مجھے یقین ہے کہ میں ضدی بھی تھا جیسا اکثر بچے ہوتے

یہ نہیں کہتا ہوں کہ آپ نے غلط کیا۔ شاید تب رات کو خاموشی اور امن قائم رکھنے کا شاید اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ لیکن میں نے اسے یہاں فقط بچوں کی پرورش سے متعلق آپ کے مخصوص رویے اور اس کے میری ذات پر اثر کو واضح کرنے کے لیے پیش کیا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تب اس کے بعد میں نہایت فرماں بردار ہو گیا۔ لیکن اس واقعے نے مجھے اندر سے نقصان پہنچایا۔ میرے لیے یہ معاملہ یوں تھا کہ ایک طرف میرا پانی کا بے معنی مطالبہ تھا اور دوسری طرف باہر اندھیرے میں کھڑا کیے جانے کا غیر معمولی خوف۔ یہ دو مختلف چیزیں تھیں جنھیں میں، اپنی مخصوص فطرت کے باعث کبھی کسی معقول انداز میں باہم یکجا نہیں کر سکا۔ حتیٰ کہ بعد کے برسوں میں بھی اس اذیت دہ خوف میں مبتلا رہا کہ ایک عظیم الجثہ انسان، میرا باپ جو مختار اعلیٰ بھی ہے بغیر کسی وجہ کے مجھ تک آئے گا اور رات کے وقت مجھے بستر سے باہر گھسیٹ لے گا اور باہر 'پیولاچ' میں لے جا کر یوں کھڑا کر دے گا جیسے اس کے لیے میری کچھ بھی حیثیت نہیں۔

یہ ایک معمولی آغاز تھا لیکن کم مائیگی کا یہ احساس جو اکثر مجھ پر غالب آتا ہے، (ایک احساس جو دوسرے حوالے سے بلاشبہ ایک نفیس اور فائدہ مند احساس ہے) آپ ہی کے اثر سے میرا حصہ بنا۔ مجھے تب جس چیز کی ضرورت تھی وہ محض آپ کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی، تھوڑی سی دوستی، اور میرے راستے کو تھوڑا سا کھلا رکھنے کی تھی جسے آپ نے اس کے بالکل برعکس میرے لیے مسدود کر دیا، بلاشبہ اس نیک ارادے سے مجھے ایک دوسرا راستہ اختیار کرنے پر آمادہ کریں۔ لیکن میں اس رویۓ کا متحمل نہیں تھا۔

مثال کے طور پر مجھے یاد ہے آپ نے میری حوصلہ افزائی کی جب میں نے نہایت مہارت سے فوجی سلام اور قواعد کیے۔ لیکن میں کوئی مستقبل کا فوجی نہیں تھا۔ یا آپ نے تب میری کمر تھپکی جب میں خود اپنے ہاتھ سے کھانے یا اپنے کھانے کے ساتھ بیئر پینے لگا یا جب میں گانوں کو یاد رکھ کر انھیں خود گانے کے قابل ہوا جن کو گانے سے متعلق مجھے کچھ فہم نہیں تھا، یا آپ کے پسندیدہ تاثرات کو استعمال کرتے ہوئے آپ کی نقل اتارنے کا میرے مستقبل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور یہ وہ خاص بات ہے کہ آپ آج بھی صرف ان باتوں پر شاباش دیتے ہیں جن میں آپ کو خود دلچسپی ہوتی ہے، یعنی جب جو کچھ بھی پیش نظر ہوتا ہے، وہ آپ کی عزت نفس ہوتی ہے، جسے میں نے مجروح کیا (مثال کے طور پر میری متوقع شادی کے معاملے میں) یا جو خود مجھ میں ہی مجروح ہوئی (مثال کے طور پر جب پیپا میرے ساتھ برا سلوک

ایک رائے پر مستقل قائم رہنے کی بھی ضرورت نہیں تھی اور پھر بھی آپ ہمیشہ درست ہوتے۔
کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بھلے ہی آپ کسی معاملے سے متعلق کوئی رائے نہ رکھتے ہوں اور نتیجتاً اس معاملے سے متعلق ہر ممکنہ رائے لازمی طور پر بلا استثنا غلط قرار پاتی۔ مثال کے طور پر آپ چیک (Czechs) نسل کو کمتر ثابت کرنے کے اہل تھے، اور پھر جرمن نسل کو، اور پھر یہودیوں کو، سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی خاص حوالے سے نہیں بلکہ ہر حوالے سے، اور آخرکار آپ کے سوا کوئی باقی نہ بچتا۔ میرے لیے آپ کی شخصیت ایک معمہ تھی جیسے مطلق العنان حکمران ہوتے ہیں، جن کے حقوق ان کی ذات پر مبنی ہوتے ہیں، نہ کہ کسی منطق پر۔ کم از کم مجھے تو یہ سب ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔
جہاں میری ذات کا معاملہ ہوتا، تو حقیقتاً حیران کن حد تک آپ اکثر درست ہوتے۔ یہ بات گفتگو میں تو حیران کن نہ ہوتی کہ ہمارے درمیان شاذ ہی کبھی گفتگو ہو پاتی، لیکن حقیقت میں ایسی ہی ہوتی۔ تاہم یہ بات اتنی اچنبھے کی بھی نہیں تھی۔ میری تمام تر سوچ بہر طور آپ کی شخصیت کے زیر اثر تھی۔ حتیٰ کہ میری شخصیت کے ان پہلوؤں میں اور خاص طور پر انھی پہلوؤں میں جو آپ سے موافق نہیں تھے۔ وہ تمام تر سوچ جو بظاہر آپ کے اثر سے آزاد تھی، ہمیشہ اسے کم تر ثابت کرنے والی آپ کی آراء تلے دبی رہی۔ یہ تقریباً ناممکن تھا کہ اس صورت حال کو برداشت کیا جائے اور کوئی ایسی سوچ پیدا کی جائے جو کسی بھی اعتبار سے مکمل اور پائیدار ہو۔ میں کسی قسم کے اعلیٰ ترین خیالات کی بات نہیں کر رہا ہوں، بس بچپن کی غیر معقول سوچیں۔ بس اتنا کافی ہوتا کہ آپ کسی شے سے خوش ہوں، اس کے بارے میں سوچنے میں محو ہوں، آپ گھر آئیں اور اس کے بارے میں بات کریں، تو اس کا جواب ہوتا، ایک تضحیک آمیز سرد آہ، سر کی جنبش، میز پر انگلی کی ضرب:

''کیا تم بس ایسی ہی باتیں سوچتے ہو؟''

یا ''میری خواہش ہے مجھے بھی ایسی سوچوں سے واسطہ پڑے۔''

یا ''افسوس ہے کہ لوگوں کے پاس ایسی فضول باتوں کو سوچنے کا وقت ہوتا ہے''

یا ''آخر تمھیں ایسی سوچوں سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟''

یا ''اس بے معنی نغمے یا رقص کا کیا فائدہ؟''

بے شک آپ سے ہر طرح کی بچگانہ تخیل آرائی کے حق میں ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی، خاص

پالنے کی خاص اہلیت رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے ہی جیسے کسی انسان کے لیے اپنے طریقہ کار کے ساتھ نہایت سود مند ثابت ہو سکتے تھے۔ ایسا شخص آپ کی کہی ہوئی باتوں میں سے معقولیت تلاش کر لیتا، اسے کسی بات پر پریشانی کا سامنا نہ ہوتا اور خاموشی سے ویسے ہی زندگی گزارتا جیسا آپ اسے بتاتے۔ لیکن مجھ بچے کے لیے آپ چلا چلا کر جو احکام صادر فرماتے تھے، وہ الہامی فرامین کا درجہ رکھتے تھے جنھیں میں کبھی نہیں بھلا سکا، جو میرے لیے دنیا کے بارے میں کوئی رائے بنانے کا سب سے اہم ذریعہ تھے، اور یہیں آپ کو ناکامی کا سامنا ہوا۔

بچپن میں خاص طور پر کھانے کے دوران میں آپ کے ساتھ ہوتا۔ تب آپ کی تربیت زیادہ تر کھانے کی آداب سے متعلق ہوتی۔ جو کچھ کھانے کے لیے میز پر لایا جائے، اسے کھا لیا جائے، اس کے معیار کی بحث میں نہ پڑا جائے۔ لیکن آپ خود بسا اوقات غذا کو کھانے کے لائق نہ پاتے۔ اسے ''گندا شوربہ'' کا خطاب دیتے اور کہتے کہ اس 'گائے' (باورچی) نے اسے تباہ کر دیا۔ چوں کہ اپنی شدید اشتہا اور رغبت کے باعث آپ ہر شے کو تیزی سے، گرم حالت اور بڑے بڑے نوالوں میں کھاتے تھے، بچوں کو آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیزی دکھانا پڑتی۔ کھانے کی میز پر چھائی اداس خاموشی آپ کی فہمائشوں سے مجروح ہوتی۔ جیسے ''پہلے کھا لو، پھر باتیں کرنا''

''تیز، تیز اور تیز کھاؤ''

''تم نے ابھی اتنا ہی کھایا ہے اور میں کب کا ختم کر چکا۔''

ہڈیوں کو دانتوں سے نہیں توڑنا چاہیے لیکن آپ کو اس کی اجازت تھی۔ سر کہ بغیر آواز کے چسکیوں کے ساتھ پیا جائے لیکن یہ پابندی بھی آپ کے لیے نہیں تھی۔ سب سے اہم ہدایت یہ تھی کہ ڈبل روٹی کو سیدھا کاٹا جائے لیکن یہ تب کوئی مسئلہ نہیں تھا جب آپ یخنی میں تر چاقو سے ایسا کرتے۔ احتیاط برتی جانے چاہیے کہ فرش پر کھانے کے ذرے نہ گریں حالاں کہ کھانے کے اختتام پر ہمیشہ آپ کی کرسی کے نیچے سب سے زیادہ ذرے ہوتے۔ کھانے کی میز پر کسی کو کھانے کے علاوہ کوئی اور کام کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن آپ وہاں اپنے ناخن کاٹتے اور صاف کرتے، پنسل تراشتے، دانتوں کے خلال سے کان صاف کرتے تھے۔

خدارا ابو آپ مجھے صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ بظاہر معمولی اور غیر اہم تفصیلات ہیں لیکن

تھا۔آپ اسکے لیے محض ایک پسندیدہ تجسس تھے جس میں سے اسے جو بات پسند آتی وہ لے سکتا تھا۔لیکن میرے لیے آپ کسی بھی طور ایک تجسس نہیں تھے،نہ مجھے انتخاب کا حق حاصل تھا، مجھے تو آپ سے ہر شے لینا تھی۔

اور ایسا اس میں سے کسی کے بھی خلاف کوئی اعتراض پیش کرنے کی اہلیت کے بغیر ہونا تھا کیوں کہ آپ کے لیے کسی ایسے موضوع پر پرسکون انداز میں گفتگو کرنا یکسر ناممکن تھا جس کی آپ نے اجازت نہ دی ہو یا جو آپ نے خود تجویز نہ کیا ہو۔آپ کے ترش رویئے میں اتنی گنجائش ہی نہیں تھی۔ حالیہ برسوں میں آپ نے دل کی اعصابی زبوں کیفیت کو اس رویے کی وجہ قرار دیا۔لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا ہے کہ آپ نے کبھی اس سے مختلف رویہ ظاہر کیا ہو۔ بلکہ دل کی کمزور اعصابی حالت ایک وسیلہ تھی جس کے ذریعے آپ نے اپنی حاکمیت کو زیادہ شدت سے نافذ کیا کیوں کہ اس ضعف کا احساس دوسروں میں آپ کی ہر ممکن مخالفت کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا۔میں ہرگز لعنت ملامت نہیں کر رہا، بس حقیقت بیان کر رہا ہوں۔

جیسا کہ اوٹلا کے معاملے میں آپ نے کہا ''کہ آپ اس سے کوئی بات نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ مکھیوں کی طرح سیدھے منہ کو آ کر پڑتی ہے۔'' حقیقت میں وہ فوراً ہی کسی پر نہیں چڑھ دوڑتی۔آپ نے محض ایک مفروضے کی بناء پر اپنی بیٹی کو غلط سمجھا۔اصل میں تو زیر بحث معاملہ ہی وہ مکھیاں ہے جو آپ پر چڑھ دوڑتا اور آپ فوراً ہی اس کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتے ہیں اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر۔پھر جو کچھ بھی اس کے بعد ہوتا ہے، وہ آپ کو مزید ناگوار معلوم ہوتا ہے، کبھی آپ کو قائل نہ کر پاتا۔یوں آپ سے جو پیغام لیا جا سکتا تھا، وہ کچھ یوں تھا'' جیسا تمھارا جی چاہے، ویسا کرو۔میری طرف سے تم بالکل آزد ہو۔تم بڑے ہو چکے ہو لہٰذا تمھیں دینے کے لیے میرے پاس کوئی نصیحت نہیں ہے۔'' اور یہ سب آپ خوفناک کھردرے، غصیلے لہجے اور واضح مذمت کے انداز میں کہتے جس سے میں آج کی نسبت بچپن میں کہیں زیادہ خوفزدہ ہوتا ہوں کیوں کہ بچے کا تمام تر احساس جرم ایک حد تک آپ کی اور میری ذاتی مایوسی کے احساس سے بدل گیا۔

آپ سے پرسکون گفتگو نہ ہو سکنے کا ایک اور نتیجہ نکلا جو حقیقتاً بالکل فطری تھا۔ میں بولنے کی اہلیت کھو بیٹھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں کوئی فصیح البیان شخص ہوتا، لیکن بہرحال مجھے اپنی زبان کو روانی کے ساتھ

مجھے کوئی ایسا موقع یاد نہیں ہے جب آپ نے براہ راست مجھے واضح فہمائشی فقرے کہے ہوں۔ یہ ضروری بھی نہیں تھا۔آپ کے پاس اس کے علاوہ بے شمار کارآمد ہتھکنڈے تھے۔ گھر میں اور خاص طور پر دکان میں گفتگو کرتے ہوئے آپ مخصوص فہمائشی القابات کی مجھ پر اس طرح بوچھاڑ کرتے کہ گمان ہوتا جیسے وہ دوسروں کے لیے ہوں۔ کہ ایک چھوٹے بچے کی حیثیت سے بعض اوقات میں گڑبڑا جاتا اور نہ سمجھ پاتا کہ کیوں میں انھیں اپنے لیے نہ سمجھوں، کیوں کہ جن لوگوں کو آپ ملامت کر رہے ہوتے، وہ مجھ سے زیادہ برے نہ ہوتے اور آپ ان سے اس سے زیادہ ناخوش نہ ہوتے جتنے آپ مجھ سے ہوتے تھے۔ یہاں پھر سے آپ کی معماتی معصومیت اور تقدس مآبی قابل ذکر ہے۔آپ بغیر کسی معمولی عذر کے کسی کی بھی عزت کو خاک میں ملا دینے میں طاق تھے۔لیکن آپ دوسروں میں ملامتی اور توہین آمیز رویے برا بھلا کہتے۔

آپ دھمکیوں سے اپنے لعنت ملامت کو تقویت دیتے اور اسے مجھ پر آزماتے۔ مثلاً میرے لیے یہ دھمکی کتنی ہیبت ناک ہے ''میں تمھیں مچھلی کی طرح پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا'' بے شک میں جانتا تھا کہ ایسا کچھ بھی برا نہیں ہوگا (لیکن حقیقت یہ ہے کہ تب بچپن میں میں یہ نہیں جانتا تھا۔) لیکن تب آپ کی شخصیت کا جو خاکہ میرے ذہن میں تھا، اس کے مطابق یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آپ ایسا کر سکتے تھے۔ یہ صورت حال بھی انتہائی ہولناک تھی کہ آپ چلاتے ہوئے میرے پیچھے میز کے گرد بھاگتے ہوئے مجھے پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے۔تب یقیناً آپ ایسا نہیں چاہتے ہوں گے لیکن ظاہر ایسا ہی کرتے۔ ماں (آخر کار) مجھے بچا لیتی، کم از کم ایسا محسوس ہوتا تھا۔تب ایک بچے کو محسوس ہوتا کہ ایک بار پھر آپ کے رحم و کرم سے میں زندہ بچ گیا اور مجھ میں یہ احساس اپنی جڑیں گہری کرتا چلا گیا کہ میرا زندہ رہنا دراصل آپ کی عنایت و مہربانی کا نتیجہ تھا، جس کا میں حق دار نہیں تھا۔

یہی وہ مناسب موقع ہے کہ ان دھمکیوں کا تذکرہ کیا جائے جو آپ مجھے میری نافرمانیوں پر دیا کرتے تھے جب میں کوئی ایسا کام کرنے لگتا تھا جو آپ کی پسند کے خلاف ہوتا اور آپ مجھے اس میں ناکامی کی دھمکی دیتے، جب کہ میرے لیے آپ کی رائے اس قدر معتبر تھی کہ یہ ناکامی ناگزیر بن جاتی۔ گو یہ شاید کچھ عرصہ بعد ہی رونما ہوتی۔

مجھے اپنی سرگرمیوں پر اعتماد نہ رہا۔ میں ہر کام میں بے یقینی، شک کا شکار ہوتا گیا۔ میں جوں جوں

ایسی باتیں کی جاتیں تو مجھے حاسدانہ سرور اور حریفانہ حظ ملتا۔ تقریباً ہر کھانے کے دوران اس کا اہتمام کیا جاتا:

''اسے میز سے دس فٹ دور بیٹھنا پڑتا ہے، بڑا موٹا تودہ۔'' جب کبھی آپ رکھائی کے ساتھ اپنی کرسی پر بیٹھے ہوتے، مزاج میں خوش گواریت یا حس مزاح کی معمولی رمق کے بغیر، ایک کھردرے دشمن کی طرح، تو آپ اس کے بیٹھنے کی، جو آپ کو یکسر کراہت انگیز لگتا تھا، ایک مبالغہ آمیز نقل اتارتے۔ یہ باتیں بار بار ہوتی تھیں اور ان سے آپ نے حقیقتاً کچھ بھی نہ پایا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نفرت اور غصے کی شدت کا زیر بحث موضوع سے کوئی مناسب تعلق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس بارے میں کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس غصے کی وجہ محض یہ ہے کہ کوئی میز سے دور کیوں بیٹھتا ہے؟ بلکہ یہ سب کچھ پہلے سے ہی تیار تھا کہ اسے شروع کیا جا سکے، تو اتفاقیہ طور پر اس معاملے میں یہ سارا نزلہ گرا۔ اگرچہ یہ تو سب کو معلوم ہوتا تھا کہ اس معاملے کا پس منظر بھی تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن کوئی اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا اور ان مسلسل دھمکیوں سے انسان کے جذبات پژمردگی کی طرف مائل ہو جاتے۔ اسی طرح انسان کو بتدریج یہ بھی یقین ہو جاتا تھا کہ اس کے بعد زدوکوب نہیں کیا جائے گا۔ یوں وہ ایک اداس، بے پراوہ، اور نافرمانبردار بچہ بن جاتا، ہمیشہ ہر کام سے فرار کا خواہاں، زیادہ تر اپنی ہی ذات میں فرار۔ یوں آپ خود ذہنی اذیت کا شکار ہوئے، اور ہم نے بھی اس اذیت کو سہا۔ آپ کے اپنے خیال میں تب آپ سو فیصد درست تھے جب آپ دانتوں کو مضبوطی سے بھینچے ہوئے غرا کر ہنستے جس سے بچے کے ذہن میں جہنم کی ابتدائی تصویر بنتی۔ آپ تلخی سے کہتے، (جیسا آپ نے حال ہی میں قسطنطنیہ سے آئے ہوئے ایک خط کے حوالے سے کیا) کہ ''کیسا عمدہ مجمع ہے۔''

بچوں سے آپ کے رویئے میں جو بات انتہائی غیر مناسب تھی اور جو اکثر و بیشتر ہوتی تھی، کہ آپ سب کے سامنے اپنی بدبختیوں کا رونا رونے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ بچپن میں (اگرچہ کچھ عرصہ بعد میں بھی) میں اس معاملے میں یکسر بے حسی کا شکار تھا اور مجھے کبھی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ دوسروں سے اپنے لیے کیسے کسی قسم کی ہمدری کی توقع کر سکتے تھے؟ آپ ہر حوالے سے ایک عظیم شخصیت تھے۔ آپ کے لیے ہماری مدد یا ہمدردی کی کیا وقعت ہو سکتی تھی؟ آپ آسانی سے ہماری مدد کو دھتکار سکتے تھے جیسے آپ اکثر ہمیں دھتکارتے۔ میں آپ کی شکایات کو ان کی ظاہری حالت میں

نہیں لیتا بلکہ ان کے پسِ پشت کارفرما محرکات کو جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ بات میں بہت بعد میں سمجھا کہ اپنے بچوں کی وجہ سے واقعتاً آپ سخت اذیت کا شکار تھے۔ لیکن اس وقت جب اس شکوہ سرائی کے جواب میں ہوسکتا ہے کہ مختلف حالات میں آپ کو کسی طرح کی بچگانہ، مخلصانہ ہمدردی بھی حاصل ہوجاتی کہ بچے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ممکنہ حد تک مدد کرنے پر آمادہ ہوجاتے، تو میرے نزدیک یہ مجھے منظم کرنے اور میرا تمسخر اڑانے کا ایک بے جا طریقہ تھا، جو اپنے طور پر چاہے اتنا شدید نہ ہولیکن ان اپنے مضر اثرات کے ساتھ، کہ بچہ ان باتوں کو بھی سنجیدگی سے لینے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا، جنھیں سنجیدگی سے لینا ضروری تھا۔

خوش قسمتی سے ان حالات میں استثنائی صورت پیدا ہوجاتی تھی بالخصوص جب آپ خاموش ہو جاتے اور اس خاموشی سے چھلکتی شفقت اور مہربانی اپنی قوت سے تمام رکاوٹوں کو دور کر دیتی تو میں فوراً اس سے متاثر ہوتا۔ گو ایسا بہت کم ہوتا لیکن یہ ایک خوب صورت واقعہ ہوتا۔ مثال کے طور پر بچپن میں گرمیوں کے موسم میں آپ دوپہر کے کھانے کے بعد تھکے ہوئے اپنے دفتر میں میز پر کہنی جمائے اونگھتے یا جب گرمیوں کی چھٹیوں میں یا کسی اتوار کو آپ ہمارے ساتھ کسی دیہات میں جاتے تو دفتری مصروفیات کی تھکن آپ کے چہرے سے چھلکتی تھی یا جب والدہ شدید بیمار ہوئی تو آپ کتابوں کی الماری سے ٹیک لگائے سسکیاں لیے کانپ رہے تھے یا جب پچھلی مرتبہ میری شدید بے ماری کے دوران آپ پنجوں کے بل چلتے ہوئے اوٹلا کے کمرے میں مجھے دیکھنے آئے اور دروازے میں کھڑے ہوکر اپنی گردن آگے بڑھا کر مجھے دیکھا اور پدرانہ جذبے کے تحت میرے لیے ہاتھ ہلایا۔ ان لمحات کو یاد کر کے میں اپنے کمرے میں لیٹ کر مسرت سے پہروں رویا کرتا اور آج جب کہ میں انھیں لکھ رہا ہوں، میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔

آپ مخصوص خوبصورتی سے، انوکھی انداز کی خاموشی کے ساتھ، طمانیت سے اور خوش دلی کے ساتھ مسکرا سکتے ہیں، مسکراہٹ کا ایسا انداز جو اس شخص کو، جس کے لیے یہ مسکراہٹ ہو، حقیقتاً مسرور کر سکتی ہے۔ میری بچپن کی یادداشتوں میں میرے لیے ایسی مسکراہٹ بہر طور نایاب ہے۔ میں آپ سے فقط یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایسا بکثرت ہوسکتا تھا، آپ نے اس وقت مجھے اس مسکراہٹ سے محروم کیوں رکھا، جب میں آپ کی نظر میں بے قصور تھا اور آپ کی بڑی اُمید بھی تھا؟ آنے والے دنوں میں آپ کے ایسے دوستانہ رویوں نے بھی اس کے کوئی اور تبدیلی پیدا نہیں کی کہ میرے احساس جرم کو شدید کیا اور اس دنیا کو میرے

لیے مزید ناقابل فہم بنا دیا۔

میں خود کو عملی اور مستقل پہلوؤں تک ہی محدود رکھوں گا۔ آپ سے اپنے تعلق میں اپنی ذات کے معمولی اثبات کے لیے اور کچھ انتقامی جذبے کے تحت، میں نے جلد ہی آپ کی چھوٹی چھوٹی مضحکہ خیز عادتوں کا مشاہدہ شروع کیا تاکہ انھیں یاد رکھ سکوں اور پھر مبالغے سے بیان کروں۔ مثال کے طور پر آپ ان لوگوں سے بھی فوراً متاثر ہو جاتے جو آپ سے کچھ ہی بہتر ہوتے۔ آپ ان کے بارے میں باتیں کرتے نہیں تھکتے تھے جیسے کوئی شاہی مشیر یا ایسے ہی دوسرے لوگ (جب کہ مجھے آپ کے اس وطیرے سے اذیت پہنچتی تھی کہ جب میں اپنے باپ کو دیکھتا اور یہ جانتا کہ اسے اپنی ہی وقعت کو ثابت کرنے کے لیے ایسی شہادتوں اور ان کے بارے میں شیخی بگھارنے کی ضرورت ہے۔) یا میں ناشائستہ باتوں کا آپ کا ذوق ملاحظہ کرتا جنھیں آپ ممکنہ حد تک بلند آواز میں کہتے، ان پر یوں ہنستے جیسے آپ نے کوئی بڑی بات کی ہو۔ حالاں کہ آپ کی وہ باتیں معمولی مغلظات کے سوا کچھ نہ ہوتیں۔ (جب کہ میرے لیے یہ پھر سے آپ کی قوت کے شرم ناک مظاہرے ہوتے۔) ایسی خامیوں کی کمی نہیں تھی۔ مجھے ان سے خوشی تھی۔ ان سے مجھے سرگوشی کرنے اور ٹھٹھہ اڑانے کا موقع ملتا۔ کبھی آپ میرے اس رویئے کو محسوس کرتے اور اس پر ناراض ہوتے، اور اسے میرے داخلی بُغض اور بزرگوں سے بے ادبی پر محمول کرتے لیکن یقین مانئے میرا یہ رویہ کچھ بھی نہیں تھا سوائے اپنی ذات کے تحفظ کی ایک کوشش، ایک بے کار کوشش سے بڑھ کر۔ یہ ایسا معصوم مذاق تھا جو ہر جگہ خداؤں اور بادشاہوں سے متعلق کیا جاتا ہے جو نہ صرف گہری عقیدت سے موافق نہیں ہوتا بلکہ جو درحقیقت اس عقیدت مندی کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے بھی تب اپنی اُسی حیثیت کے پیش نظر جس سے میرا تعلق تھا، ایسا ہی ایک دفاعی طریقہ کار اختیار کیا۔ آپ عموماً مبالغے کے ساتھ مجھے حاصل آسائشات کا ذکر کرتے تھے اور اس بات کا بھی کہ کیسا عمدہ سلوک مجھ سے اس گھر میں کیا گیا۔ یہ بات درست ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ میں تب جن حالات سے دوچار تھا، ان میں یہ بات کسی بھی اعتبار سے میرے لیے سودمند تھی۔ یہ سچ ہے کہ والدہ کا رویہ مجھ سے انتہائی بہتر تھا لیکن جہاں تک آپ کا اور میرا تعلق تھا، ہمارے درمیان کبھی خوشگوار حالات پیدا نہیں ہوئے۔ والدہ اس شکاری مہم میں غیر شعوری طور پر ہانکا کرنے والے کا کردار ادا کرتی تھی۔ میری پرورش کے لیے آپ کا طریقہ کار ہو سکتا تھا کہ کسی طور مجھ میں نافرنبرداری، ناپسندیدگی اور

نفرت کا جذبہ پیدا کر کے مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے مدد دیتا لیکن والدہ اپنے مہربان رویئے اور مجھ سے اپنے خوشگوار تعلق کے باعث اور والد سے میری جان بخشی کی درخواست کر کے میری اس داخلی تبدیلی کو فرو کر دیتی تھی۔ (وہ بچپن کے الجھاؤ میں میرے لیے نیک نیتی اور معقولیت کی ایک مثال تھیں) اور میں ایک بار پھر آپ کے دائرہ اثر میں آ جاتا جسے ہوسکتا تھا کہ بصورت دیگر میں آپ کے اور میرے دونوں کے مفاد میں توڑ چکا ہوتا۔ یا پھر یہ ہوا کہ مصالحت کی کوئی صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی کہ والدہ خفیہ طور پر مجھے آپ سے بچاتی رہیں۔ پوشیدہ طور پر مجھے کچھ نہ کچھ دیتی یا کسی کام کی اجازت دیتی۔ لیکن جہاں تک آپ کا تعلق تھا تو میں پھر سے وہی چھپ کر کام کرنے والا، ایک دھوکے باز، احساس جرم کا شکار تھا جو ان چیزوں کو پانے کے لیے بھی، جن پر واقعی اس کا حق تھا، اپنی ادنیٰ سوچ کے باعث چور راستہ استعمال کرتا۔ بے شک میں ان اشیاء کے حصول کے لیے بھی یہی طریقہ کار اپنانے لگا جن کے بارے میں میرا اپنا بھی خیال تھا کہ ان پر میرا کوئی حق نہیں تھا۔ اس کا پھر سے یہی مطلب تھا کہ میرے احساس جرم میں اضافہ۔

یہ بھی درست ہے کہ آپ نے شاید ہی کبھی مجھے پیٹا ہو۔ لیکن آپ کا بلند آواز میں چلانا، غصے میں آپ کے چہرے کا سرخ ہونا اور تیزی سے گیلس کو کھولنا اور انھیں کرسی کی پشت پر ٹانگ دینا، یہ سب میرے لیے بدترین صورت حال تھی کہ جیسے کسی کو پھانسی کی سزا دی جانے والی ہو۔ اگر اسے واقعی پھانسی پر لٹکا دیا جائے تو وہ مر جائے گا اور اس کا قصہ تمام ہو جائے گا۔ لیکن اگر اسے پھانسی پر لٹکائے جانے کے تمام ابتدائی مراحل سے گزار جائے پھر جب پھندا اس کے چہرے کے سامنے جھول رہا ہو، اسے بتایا جائے کہ اس کی سزا ملتوی کر دی گئی ہے تو وہ اس سزا میں تمام عمر مبتلا رہے گا۔ علاوہ ازیں کئی موقعوں پر جب آپ کی واضح رائے میں میں زدوکوب کیے جانے کا حق دار تھا لیکن آپ نے کمال عنایت سے آخری لمحات میں مجھے معاف کر دیا تو اس سے میرا احساس گناہ شدید تر ہی ہوا، کیوں کہ ہر طرف سے مجھے ہی قصوروار قرار دیا جانا تھا اور میں آپ کے احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔

آپ نے مجھے ہمیشہ اس باپ پر لعن طعن کی (کبھی اکیلے میں اور کبھی سب کے سامنے کہ آپ کے لیے دوسرے کی تذلیل کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی اور ہمیشہ آپ کے بچوں کے معاملات سب پر عیاں ہوتے) کہ ہم ایک پرامن اور خاموش، پرحدت اور فراواں زندگی گزارتے رہے جس میں کسی شے کی کمی نہیں تھی، جو آپ کی محنت شاقہ کی وجہ سے تھی۔

مجھے آپ کے وہ مخصوص جملے یاد ہیں جو میرے دماغ میں مستقل چھید کرتے۔

جیسے ''جب میں صرف سات برس کا تھا تو میں ٹھیلے پر سامان لاد کر ایک قصبے سے دوسرے قصبے میں جایا کرتا تھا''۔۔۔۔۔۔

''ہم سب اہل خانہ ایک ہی کمرے میں سویا کرتے تھے''۔۔۔۔۔۔۔۔

''جب کبھی ہمیں کھانے کو آلو مل جاتے تو ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہیں ہوتا تھا''

''بچپن میں بہت سے سال میری ٹانگوں میں کھلے زخم رہے کیوں کہ میرے پاس پہننے کو کپڑے نہیں تھے''

''میں ابھی بہت چھوٹا تھا جب مجھے ''بالسنگ'' میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔''

''مجھے گھر سے کبھی پیسے نہیں ملے۔ حتیٰ کہ جب میں فوج میں بھرتی ہوا تب بھی نہیں۔ میں ہی گھر پیسے بھیجا کرتا تھا''

''ان سب باتوں کے باوجود۔۔۔ ان سب باتوں کے باوجود میرا باپ، میرے لیے میرا باپ تھا۔ لیکن افسوس، آج کوئی نہیں جانتا کہ تب باپ سے کیا مراد تھی؟ یہ آج کے چھوکرے بھلا ان باتوں کو کیا سمجھیں گے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی آزمائشوں سے نہیں گزرا۔ آج کوئی بچہ ان باتوں کو سمجھ سکتا ہے۔''

اگر حالات مختلف ہوتے تو یہ کہانیاں بچے کی شخصیت کو ایک الگ انداز میں ڈھال سکتی تھیں۔ ایک لحاظ سے یہ ان کی حوصلہ افزائی کا کام کرتیں اور ان میں محرومیوں اور کٹھنائیوں کو برداشت کرنے کی طاقت بھی پیدا ہوتی جن سے ان کے والدین گزرے۔ لیکن شاید آپ کی منشا یہ ہرگز نہیں تھی۔ صورت حال آپ کی کوششوں کے نتیجے میں یکسر مختلف ہوگئی تھی اور کوئی ایسی صورت نہیں تھی کہ جو کچھ آپ نے کیا تھا، اس میں کوئی خود کو نمایاں کر سکے۔ ایسی صورت سب سے پہلے تو تشدد اور بغاوت کی مدد سے پیدا کی جاتی، جس کا مطلب یہ ہوتا کہ گھر سے کٹ جایا جائے (یہ فرض کرتے ہوئے کہ کسی میں ایسا کرنے کا حوصلہ اور قوت موجود تھی اور یہ کہ ماں بھی اپنے طور پر دوسرے ذرائع سے اس کی مخالفت نہ کرتی۔) لیکن آپ ایسا بالکل نہیں چاہتے تھے۔ آپ نے میرے رویئے کو احسان فراموشی، سرکشی، نافرمانی، بیوفائی اور دیوانگی پر محمول کیا۔

ایک طرف آپ نے ان مثالوں، اور میری بے قیری سے مجھے اس رویئے کی ترغیب دی اور

دوسری طرف انتہائی ترش روی سے اس کی ممانعت بھی کردی۔ وگرنہ مثال کے طور پر آپ کو دیگر متعلقہ حالات سے قطع نظر اوٹلا کے 'زراؤ' فرار ہو جانے پر مسرور ہونا چاہیے تھا۔ وہ اس جگہ لوٹنا چاہتی تھی جہاں سے آپ آئے تھے۔ وہ آپ ہی کی طرح کام کرنا اور محنت کرنا چاہتی تھی۔ وہ آپ کی محنت کے ثمرات کے بل پر زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی، بالکل جیسے آپ نے اپنے باپ سے کبھی کچھ نہیں لیا۔ کیا اسکے ارادے واقعی بہت خوفناک تھے؟ کیا یہ سوچ آپ کی اپنی مثال اور نقطہ نظر سے بہت مختلف تھی؟ اگرچہ عملی طور پر اوٹلا اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ اس نے خاصے غیر معقول انداز میں اور بہت زیادہ انتشار کے ساتھ ان پر عمل درآمد کیا اور نہ ہی اس دوران میں اس نے اپنے والدین کی بھی کچھ پرواہ کی۔ لیکن کیا یہ صرف اس کی نااہلی تھی اور اس میں اس کے حالات کا دخل نہیں تھا، اور سب سے بڑھ کر، کیا اس کی ایک وجہ یہ بھی نہیں تھی کہ آپنے اس سے قطعاً بیگانگی اختیار کر لی تھی۔ کیا اس نے کاروبار میں آپ سے اس سے کم بے اعتنائی برتی تھی (جیسا کہ آپ نے خود کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی)، جتنی بعد ازاں 'زراؤ' میں برتی۔ لیکن کیا واقعی آپ میں اتنی طاقت نہیں تھی (یہ فرض کرتے ہوئے کہ آپ خود کو ایسا کرنے پر تیار کر سکتے تھے) کہ آپ اس کے فرار کو اپنی حوصلہ افزائی، مشاورت اور سرپرستی اور غالباً محض بردباری سے اس کے لیے بہتر نتائج کا حامل بنا دیتے؟ آپ یہ سب کچھ کر سکتے تھے۔

ایسے تجربات کے بارے میں آپ اکثر تلخ مذاق سے یہ کہا کرتے کہ ہم لوگ بہت آسودہ حال زندگی گزار رہے تھے۔ حالاں کہ یہ مذاق ایک اعتبار سے محض ایک مذاق نہیں تھا۔ زندگی میں جس چیز کے لیے آپ کو سخت محنت کرنا پڑی، اسے ہم نے آسانی سے پالیا لیکن خارجی زندگی کی جنگ، ایسی جنگ جسے آپ مستقل طور پر لڑتے رہے اور جس میں ہم بہت عمر تک شامل نہیں ہوئے، اب ہمیں بعد کی عمر میں، پختہ عمر میں مگر بچگانہ قوت کے ساتھ لڑنی پڑ رہی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے حالات سے اس لحاظ سے ناگزیر طور پر آپ کے حالات سے کم سازگار تھے لیکن اسکے برعکس ہمارے حالات غالباً نہ بہتر تھے، نہ بدتر (اگرچہ یہاں ہمارے میلان طبع کے اختلاف کا ذکر بے محل ہے۔) البتہ ہم اس اعتبار سے گھاٹے میں رہے کہ شیخی مارنے اور پھر اس بناء پر دوسرے کی تذلیل کرنے کے لیے، جیسا آپ نے ہمارے ساتھ کیا، ہمیں کوئی معاشی بدبختی میسر نہیں آئی۔ میں اس سے بھی انکار نہیں کرتا کہ میرے لیے ایسا ممکن تھا کہ میں آپ کی بھرپور اور کامیاب زندگی سے

فیض یاب ہوتا اور آپ کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے آپ کی پسند کے مطابق ان کے موافق زندگی گزارتا۔ یہاں پھر سے ہمارے درمیان جو شے رکاوٹ بنی، وہ ہمارے درمیان موجود بیگانگی تھی۔ آپ نے جو کچھ دیا، میں اس سے لطف اندوز ہو سکتا تھا، لیکن صرف ذلت، تھکاوٹ، کمزوری اور شدید احساس گناہ کے ساتھ۔ اگر ایسا ہوتا تو میں آپ کی ہر عنایت کے لیے آپ کا ایسے ہی شکر گزار ہوتا جیسے کوئی بھکاری، اور خود سے کچھ ٹھیک کام کر کے اس شکر گزاری کو ظاہر کرنے کی کوشش نہ کر پاتا۔

آپ کی مخصوص تربیت کا ایک اور خارجی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ میں ہر اس شے سے بیزار ہو گیا جس کا آپ سے کچھ بھی تعلق تھا۔ سب سے پہلے تو کاروبار سے۔ اپنے طور پر، خاص کر بچپن میں، جب تک کہ یہ کاروبار ایک دوکان تک محدود رہا، میں اس کا بہت شائق رہا۔ وہ دکان زندگی سے معمور ہوتی۔ ہر شام کو اسے روشنیوں سے بھر دیا جاتا۔ وہاں طرح طرح کے منظر دیکھنے اور سننے کو ملتے۔ وہاں ایسا موقع ملتا تھا کہ گاہے بگاہے آپ کی معاونت کی جائے، اپنی موجودگی کا احساس دلایا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کے شاندار تجارتی جوہر، آپ کا اشیا بیچنے اور گاہکوں سے معاملہ کرنے کے انداز، آپ کے بات بے بات ہنسی مذاق کرنے کو سراہا جائے۔ جس معاملے میں شک ہو، وہاں فوری درست فیصلے کرنا۔ حتیٰ کہ آپ کا اشیاء کو پارسل میں باندھنے اور سامان کی پیٹیاں کھولنے کا منظر بھی قابل دید تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ دکان ایک بچے کے لیے ایک سکول سے کسی طرح کم نہیں تھی لیکن چوں کہ آپ نے اپنے رویئے سے مجھے ہر طرف سے خوفزدہ کرنا شروع کیا تو آپ کا کاروبار اور آپکی شخصیت دونوں میرے لیے ایک ہی حقیقت بن گئیں۔ کاروبار بھی مجھ میں بے زاریت پیدا کرتا۔ جو باتیں پہلے میرے لیے وہاں ناگزیر تھیں، وہ باعث اذیت اور باعث ندامت بن گئیں، خاص طور پر آپ کا اپنے عملے سے سلوک۔ تب میں نہیں جانتا کہ ایسا شاید دوسرے تجارتی اداروں میں بھی ہوتا تھا (مثلاً Assicurazioni Generali میں میرے دور میں یہ سب ایسا ہی تھا اور ڈائریکٹر کو اپنا استعفیٰ دیتے ہوئے میں نے جو وضاحت پیش کی، وہ اگرچہ سچ کی صحیح تصویر نہیں تھی لیکن وہ جھوٹ بھی نہیں تھی۔ کہ میں انتظامیہ کی لعنت ملامت اور تضحیک کو برداشت نہیں کر سکتا تھا جو اگرچہ حقیقتاً میرے لیے نہیں ہوتی تھی۔ یہ ایسی بات تھی کہ اپنے گھریلو حالات کے سبب میں اتنا حساس ہو گیا تھا۔) لیکن بچپن میں مجھے کسی اور کاروبار کے متعلق کچھ علم نہیں تھا۔ میں نے آپ کو اپنے عملے پر چلاتے، انھیں لعنت ملامت کرتے

اوران پر دھاڑتے ہوئے سنا تھا، ایسے انداز میں کہ میرے خیال میں اس وقت دنیا کے کسی بھی گوشے میں ایسا نہیں ہوتا ہوگا۔ آپ نہ صرف ان کی تذلیل کرتے بلکہ ان پر کئی دوسرے آمرانہ حربے بھی آزماتے۔ مثال کے طور پر آپ ان چیزوں کو سختی سے کاؤنٹر سے پرے اچھال دیتے جنھیں آپ کے خیال میں کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔ صرف اس عمر کی بے فکری ہی اس رویے کا معمولی جواز ہو سکتی تھی۔ اور پھر جیسے آپ کا معاون انھیں سمیٹتا۔ یا آپ کا اپنے ٹی بی کے مریض ایک معاون کے بارے میں مسلسل کچھ ایسا کہنا، ''جتنا جلدی یہ خارش زدہ کتا مرے، اتنا ہی اچھا ہے۔''

آپ ملازمین کو اپنے ''تنخواہ دار دشمن'' پکارتے۔ درحقیقت وہ ایسے ہی تھے لیکن ان کے ایسا بننے سے پہلے، مجھے آپ خود ان کے ''تنخواہ دار دشمن'' معلوم ہوتے تھے۔ وہاں بھی میں نے یہ سبق سیکھا کہ آپ بے انصافی بھی کر سکتے تھے۔ میرے اپنے معاملے میں میں اسے اتنا جلد محسوس نہ کرتا، کیوں کہ میرے اندر اتنا زیادہ احساس جرم اکٹھا ہو چکا تھا کہ میں ہمیشہ یہ اعتراف کرنے پر آمادہ رہتا کہ آپ درست تھے۔ لیکن دکان میں، میرے بچگانہ خیال میں، جو بعد میں کسی حد تک تبدیل ہوا گو بہت زیادہ نہیں، وہ عملہ ہمارے لیے اجنبی تھا، ہمارے لیے کام کرتا تھا اور اسی وجہ سے وہ مستقل طور پر آپ کے خوف تلے دبا رہتا۔ بے شک میں اس بات میں کچھ مبالغہ کر سکتا ہوں کیوں کہ میں فرض کر سکتا تھا کہ آپ ان کے لیے بھی ویسے ہی ہولناک تھے جتنے میرے لیے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ کسی طور زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ بہرطور وہ بچے نہیں تھے۔ ان میں سے زیادہ تر مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ وہ بلا دقت آپ کی لعنت ملامت کو ذہن سے یوں جھٹک دیتے تھے کہ اس تذلیل کا ان کے بجائے، الٹا آپ پر ہی منفی اثر مرتب ہوا۔ لیکن اسی ایک بات نے کاروبار کو میرے لیے ناقابل برداشت بنا دیا کیوں کہ یہ مجھے آپ سے اپنے تعلق کی عجیب نوعیت کی یاد دلاتا۔ بطور مالک آپ کی تاجرانہ مفاد پرستی اور بطور کاروباری شخص آپ کے برتری پانے کے خبط سے قطع نظر آپ ان سب لوگوں سے، جو آپ سے کاروباری داؤ پیچ سیکھنے آتے، اتنے بہتر تھے کہ وہ جو کچھ بھی کرتے، آپ کو مطمئن نہیں کر سکتے تھے، اور جیسا کہ میں تصور کر سکتا ہوں کہ بالکل اسی انداز میں آپ مجھ سے بھی غیر مطمئن ہوں گے۔ اس باعث میں عملے کی طرف داری سے خود کو روک نہیں پایا۔ میں نے یہ اس لیے بھی کیا کہ شدید گھبراہٹ میں یہ نہ سمجھ پاتا کہ کیسے کوئی شخص کسی اجنبی کے ساتھ اس قدر بدزبانی کر سکتا تھا، اور اسی لیے اپنے داخلی اضطراب کے باعث اور صرف خود

اپنے تحفظ کی خاطر میں ملازمین کی دل جوئی کی کوشش کرتا جو میرے خیال میں آپ کے اور آپ کے خاندان کے خلاف غصے کی بدترین کیفیت میں مبتلا ہوں گے۔ ایسے موقع پر عملے سے عمومی خوش اخلاقی کا یا محض انکساری کا برتاؤ کافی نہیں تھا۔ یہی نہیں، مجھے ان سے نہایت نرم خوئی سے ملنا پڑتا۔ میں نہ صرف ہر صبح اور شام کو انھیں سلام کرنے میں پہل کرتا بلکہ اگر ممکن ہوتا تو میں کوشش کرتا کہ وہ جواب دینے کے بوجھ سے آزاد رہیں۔ لیکن اگر میں، ایک غیر اہم مخلوق، جیسا کہ میں ہوں، نیچے گر جاؤں اور ان کے تلوے چاٹوں، تب بھی آپ نے مطلق العنان آجر کی حیثیت سے ان سے جو زیادتیاں اور استحصال کیا تھا، اس کا ازالہ ممکن نہیں تھا۔

ان ملازمین سے استوار ہونے والا میرا تعلق کاروبار تک محدود نہیں تھا بلکہ مستقبل تک پھیلا (کچھ ایسا ہی مگر اس سے کم مہلک اور گہرا مثال کے طور پر اوٹلا کا غریب لوگوں سے ملنے جلنے اور اپنی خادماؤں کے ساتھ مل بیٹھنے کا رویہ تھا جو آپ کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔) آخر کار میں کاروبار سے تقریباً خوفزدہ ہو گیا اور حتیٰ کہ ''جمنیز یم'' میں آنے سے پہلے ہی میرا اس سے ہر تعلق ختم ہو گیا اور جمنیز یم میں آنے سے میں اس سے مزید دور ہو گیا۔

علاوہ ازیں مجھے یہ کاروبار اپنی صلاحیتوں اور اہلیتوں ہی سے ماورا معلوم ہوتا۔ جیسا کہ آپ خود کہتے تھے کہ یہ آپ کو تھکا دیتا تھا۔ تب آپ نے (آج یہ بات مجھے شرم ناک اور پریشان کن معلوم ہوتی ہے) کاروبار یعنی آپ کی دنیا سے میری ناپسندیدگی سے ہی اپنے لیے لطف کا سامان پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میری ناپسندیدگی جو آپ کے لیے نہایت پریشان کن تھی، اور آپ کہتے کہ مجھے قطعاً کاروباری سمجھ بوجھ نہیں ہے، میرے دماغ میں ہر وقت بے ہودہ خیالات گھومتے رہتے ہیں اور اسی طرح کی دوسری باتیں۔ ماں بلاشبہ اس وضاحت سے خوش ہوتی تھی کہ آپ خود ہی اپنے لیے مزاح کا سامان کر رہے ہوتے تھے۔ میں بھی اپنے احساس کم مائیگی اور بے توقیری کے سبب خود کو آپ کی حس مذاح سے متاثر ہونے دیتا۔ لیکن اگر کاروبار سے (جس سے میں اب اور واقعتاً صرف ابھی حقیقی طور پر اور پوری ایمان داری کے ساتھ نفرت کرنے لگا) میری بیزاری کی واحد یا بنیادی وجہ فقط میرے احمقانہ خیالات ہوتے تو وہ یقیناً خود کو ایک مختلف انداز میں ظاہر کرتے، بجائے اس کے کہ تیزی اور بودے پن سے سکول کی تعلیم اور پھر قانون کی تعلیم مکمل کرتا اور پھر آخر کار کلرک کی میز تک پہنچتا۔

اگر میں آپ سے فرار ہونا چاہتا تو مجھے اپنے خاندان اور حتیٰ کہ اپنی ماں سے بھی فرار ہونا پڑتا۔ یہ سچ ہے کہ میں جب چاہتا ماں سے اپنے لیے تحفظ حاصل کر لیتا لیکن صرف آپ کے حوالے سے۔ وہ آپ سے اتنی زیادہ محبت کرتی تھی اور آپ سے اتنی زیادہ مخلص اور وفادار تھی کہ وہ بچے کی جدوجہد کے لیے ایک خودمختار روحانی قوت نہیں بن پائی۔ اتفاقیہ طور پر یہ بے کی حقیقی جبلت ہے کیوں کہ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ والدہ کی آپ سے وابستگی شدید ہوگئی۔ لیکن جہاں تک اس کی ذات کا تعلق تھا، اس نے ہمیشہ اپنی خودمختاری کو محدود ترین حدود میں شائستگی اور خوبصورتی سے آپ کو دکھ دیئے بغیر باقی رکھا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ وہ بچوں کے بارے میں آپ کے فیصلوں اور فہمائشوں سے کسی پرکھ کے بغیر ذہنی طور پر نہیں بلکہ محض جذباتی طور پر، بنا دیکھے بھالے متفق ہوگئیں، خاص طور پر ایک سنگین معاملے، اوٹلا کے معاملے میں۔

تاہم یہ بات بھی ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ خاندان بھر میں والدہ کی حیثیت کتنی اذیت ناک اور دشوار تھی۔ وہ کاروبار اور گھر میں سخت جان مارتی تھی اور تمام خاندان کی کمزوریوں کو دوہرا برداشت کرتی۔ لیکن اس ساری اذیت کا نقطہ عروج وہ اذیت تھی جو وہ ہمارے اور آپ کے درمیان رہ کر محسوس کرتی۔ آپ ہمیشہ اس سے محبت اور احترام سے پیش آتے تھے لیکن اس معاملے میں آپ بھی اسے بالکل ویسے ہی نظر انداز کرتے جیسے ہم سب کرتے۔ ہم بے رحمانہ انداز میں اس سے دور رہتے۔ آپ اپنے طور پر اور ہم اپنے طور پر۔ اس جنگ کے پیش نظر، جو آپ ہمارے اور ہم آپ کے خلاف لڑ رہے تھے، یہ انحراف تھا جس میں کوئی کسی کو ایذ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اس جنگ میں ماں ایک ایسی فریق تھی جو ہم سب کی وحشتوں کا شکار ہوتی تھی۔

نہ ہی ہماری تربیت کے حوالے سے یہ بات کسی طور پر بہتر تھی کہ جس انداز میں آپ خود کو معمولی سا بھی قصوروار قرار دیئے بغیر سارا غصہ ماں پر نکالتے۔ اس سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ماں کے ساتھ ہمارے غیر مناسب رویئے کا معقول جواز تلاش کیا جا رہا ہو۔ ماں آپ کی وجہ سے ہماری اور ہماری وجہ سے آپ کی شدید برہمی کو سہتی تھی۔ یہاں ان معاملات کا شمار نہیں کیا جا رہا جن میں آپ راستی پر ہوتے تھے، کیوں کہ وہ ہمیں گم راہ کر رہی ہوتی تھیں۔ اگرچہ 'گم راہی' بعض اوقات آپ کے نظام کے خلاف ایک خاموش، غیر شعوری احتجاجی مظاہرہ ہوسکتا ہے۔ اگر اس میں ہماری محبت اور اس محبت سے حاصل ہونے

والی خوشی کی طاقت نہ ہوتی تو یقیناً اس کے لیے بھی یہ سب کچھ برداشت کرنا ممکن نہ ہوتا۔

میری بہنیں ایک حد تک میری طرف داری کرتی تھیں۔ ایک بہن، جس کے ساتھ آپ کے مراسم نہایت کوشگوار تھے، ویلی تھی۔ ماں کے قریب ترین ہونے کے سبب وہ بھی اسی انداز میں، کسی دقت کے بغیر اور کسی ذہنی اذیت سے گزرے بغیر عین آپ کی خواہشات کے مطابق عمل کرتی۔ چوں کہ اس میں والدہ کی شباہت موجود تھی، آپ نے اسے زیادہ دوستانہ انداز میں قبول کیا، حالاں کہ اس میں بھی کافکا خاندان کی بہت کم خاصیت موجود تھی۔ غالباً آپ کی منشاء بھی یہی تھی۔ جس میں کافکا نسل کی کوئی خاصیت نہ ہوتو اس سے آپ کی توقعات بھی کچھ نہیں ہوتی تھیں نہ ہی آپ ایسا محسوس کرتے تھے جیسا آپ ہمارے بارے میں محسوس کرتے تھے، کہ کچھ ایسی شے ختم ہو رہی تھی، جسے جبری طور پر بچانے کی کوشش کی جانی چاہئے تھی۔ یا شاید یہ بات یوں تھی کہ آپ خاص طور پر عورتوں میں کافکا خاندان کی کسی خوبی کی موجودگی کے آرزومند نہیں تھے۔

ویلی کے ساتھ آپ کے تعلقات مزید خوشگوار ہوتے، اگر ہم درمیان میں کوئی رخنہ نہ ڈالتے۔ البتہ ایلی ہمارے خاندان میں آپ کے دائرہ اثر کو کامیابی سے توڑ کر بھاگنے والوں کی واحد مثال تھی۔ جب وہ صرف بچی تھی تو وہ آخری فرد ہو سکتی تھی جس سے میں کسی بغاوت کی توقع کرتا۔ کیوں کہ وہ ایسی پھوہڑ، تھکی ہوئی، بودی، بدمزاج، احساس جرم کی ماری ہوئی، منکسر المزاج، طمع خور، کاہل، لالچی اور قابل رحم بچی تھی کہ میں بمشکل ہی اس کا سامنا کر پاتا۔ اس سے بات کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔ وہ مجھے میرا اپنا آپ یاد دلاتی۔ اور بالکل ایک جیسے انداز میں وہ اس طریقہ تربیت کے سحر میں مبتلا تھی۔ اس کی مظلومیت میرے لیے نا قابل نفرت تھی کیوں کہ مجھ میں یہ مظلومیت کہیں زیادہ شدت سے موجود تھی۔ بے کسی گہری ناخوشی کے انتہائی معتبر اشاروں میں مانی جاتی ہے۔ میں ہر شے کے بارے میں اتنی بے یقینی کا شکار تھا کہ درحقیقت میرے نزدیک صرف وہی شے میری ہوتی جو میرے ہاتھ میں ہوتی یا میرے منہ میں یا کم از کم میرے سامنے ہوتی، اور اصل میں یہی وہ شے تھی جسے وہ، جو کہ میری جیسی ہی صورت حال میں مبتلا تھی، مجھ سے چھین کر خوشی محسوس کرتی۔

لیکن تب سب کچھ بدل گیا جب بہت چھوٹی عمر میں، اور یہ بہت اہم واقعہ تھا کہ اس کی شادی ہو گئی۔ وہ گھر سے چلی گئی، پھر اس کے بچے ہو گئے اور وہ زیادہ مسرور، بے پرواہ، نڈر، فیاض، بے غرض

اور امید پرست ہوگئی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ نے کبھی اس تبدیلی پر توجہ نہیں دی یا کبھی اس پر جائز طور پر غور نہیں کیا۔ جیسا کہ آپ ہیں آپ ہمیشہ ایلی سے عناد میں اندھے رہے اور بنیادی طور پر آج بھی ہیں۔ اب یہ عناد اپنی حیثیت کھو چکا ہے کیوں کہ ایلی اب مزید ہمارے ساتھ نہیں رہتی اور مزید یہ کہ آپ کی فیلکس سے محبت اور کارل سے لگاؤ نے ایلی کو آپ کے لیے یکسر غیر اہم بنا دیا۔ البتہ گریٹی بدستور آپ کے اس رویئے کا شکار رہتی ہے۔

میں نے اوٹلا کے بارے میں لکھنے کی جرات کم ہی کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا کرنے سے وہ تمام اثر زائل بھی ہوسکتا ہے جس کی مجھے اس خط سے امید ہے۔ عام حالات میں جب تک کہ اسے کوئی خاص ضرورت پیش نہ آئے یا وہ کسی خطرے میں مبتلا نہ ہو، آپ کے دل میں اس کے لیے سوائے نفرت کے اور کچھ نہیں۔ آپ نے میرے سامنے یہ اعتراف کیا تھا کہ آپ کے خیال میں وہ جان بوجھ کر آپ کو ہمیشہ اذیت دیتی اور آپ کو بے زار کرتی ہے اور یہ کہ جتنا آپ اس کے رویئے سے کرب محسوس کرتے، اتنا ہی وہ مسرور اور مطمئن ہوتی۔ بالفاظ دیگر ایک بدطینت عورت۔ کیسی شدید بے گانگی، اس سے بھی کہیں بڑھ کر جو میرے اور آپ کے درمیان موجود ہے، آپ کے اور اس کے درمیان ہونی چاہئے تھی، وہاں ایسی شدید غلط فہمی بھی ممکن ہوتی۔ وہ آپ سے اس قدر مختلف تھی کہ آپ اسے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کے بجائے آپ اس جگہ کے بارے میں فرض کرتے تھے جہاں آپ کے خیال میں وہ ہوتی تھی۔ میں مانتا ہوں کہ آپ نے اس کے ساتھ خاص طور پر مشکل وقت گزارا۔ میں اس پیچیدہ معاملے کی گہرائی میں نہیں جاتا لیکن بہر طور اس معاملے میں بھی ایک لوؤی موجود تھا، کافکا خاندان کے بہترین ہتھیاروں سے لیس۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی حقیقی کشمکش نہیں تھی۔ میں نے جلد ہی شکست مان لی اور پھر جو کچھ باقی بچا وہ محض تلخی، فرار، یاس اور داخلی اضطراب تھا۔ لیکن آپ دونوں ہمیشہ باہم متصادم ہی رہے، ہمیشہ تازہ دم اور ہمیشہ پر جوش۔ یہ منظر جہاں بہت شاندار تھا، وہاں بہت مایوس کن بھی۔ مجھے یقین ہے کہ شروع میں آپ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے کیوں کہ آج بھی اوٹلا ہم چاروں میں سے آپ اور والدہ کی شادی اور مشترک ہوجانے والی قوتوں کی خالص ترین نمائندہ ہے۔ میں نہیں جانتا ہوں کہ آخر کس باعث آپ باپ اور بچے کے درمیان ہم آہنگی کی مسرت سے محروم رہے لیکن میں اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس معاملے میں پیش رفت بالکل ویسی تھی جیسی میرے اور آپ کے معاملے میں تھی۔ آپ کی

فطرت میں آمریت تھی جب کہ دوسری طرف اُس میں لوڈی خاندان کی خودسری، احتیاط پسندی، انصاف پسندی، داخلی بے چینی تھی جسے کافکا خاندان کے روایتی جوش وجذبہ کی پشت پناہی حاصل تھی۔

بے شک میں نے بھی اسے متاثر کیا لیکن شاید ہی ایسا جان بوجھ کر کیا ہو۔ بس میرے ہونے سے اس پر اثر ہوا۔ چوں کہ وہ سب سے آخر میں ہم میں شامل ہوئی تھی، اس نے خود کو ایسی صورت حال میں پایا جہاں طاقت کا توازن قائم ہو چکا تھا اور وہ اپنی تحویل میں موجود فراواں مواد سے متعلق اپنے طور پر فیصلے کرنے کے اہل تھی۔ میں یہ بھی تصور کر سکتا ہوں کہ ہوسکتا ہے وہ داخلی طور پر کسی لمحہ اس دبدھے کا شکار ہوئی ہو کہ وہ خود کو آپ کے بازوؤں میں پھینک دے یا اس کے برعکس دشمنوں کی کھچار میں۔ اور یہ واضح ہے کہ ایسے موقع پر آپ نے ہمیشہ اپنے اپنا کردار بہت غلط انداز میں ادا کیا۔ آپ نے اسے دھتکارا۔ اگر تب نہ ہوتا تو آپ دونوں ایک شان دار ہم آہنگ جوڑا ثابت ہوتے۔ یوں میں اپنا ایک ساتھی کھو دیتا۔ لیکن آپ دونوں کو دیکھ کر میں اپنی محرومی میں کچھ ازالہ محسوس کرتا۔ علاوہ ازیں کم ازکم ایک بچے میں مکمل طمانیت کو پا کر حاصل ہونے والی غیر معمولی خوشی آپ کو میرے حق میں تبدیل کر دیتی۔ یہ سب کچھ آج صرف ایک خواب ہے۔ اوٹلا کا اپنے باپ سے کوئی رابطہ نہیں اور میری طرح وہ مکمل طور پر ایک تنہا زندگی گزار رہی ہے اور اس کے اعتماد کی سطح، خود اعتمادی، صحت اور سخت گیری نے، جس میں وہ مجھ پر فوقیت رکھتی ہے، اسے آپ کی نظروں میں مجھ سے کہیں زیادہ مکار اور غدار بنا دیا۔ میں اسے سمجھتا ہوں۔ آپ کی نظر میں وہ مختلف نہیں۔ بلاشبہ وہ اس قابل ہے کہ آپ کی نظروں سے خود کو دیکھ سکے، آپ کی اذیت کو محسوس کر سکے اور مایوس ہونے کے بجائے (کہ یہ میرا میدان ہے) اداس ہو جائے۔ آپ اکثر ہمیں ساتھ ساتھ بیٹھے، سرگوشیاں کرتے اور ہنستے دیکھتے اور کبھی آپ ہمیں آپ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بھی سنتے۔ آپ یہ تاثر لیتے کہ ہم گستاخ سازشی ہیں۔ عجیب سازشی۔ میں مانتا ہوں کہ آپ ہماری گفتگو کا بنیادی موضوع ہوتے جیسے ہماری سوچوں کا بھی، یعنی جب سے ہمیں یاد آتا ہے، لیکن ہم اس لیے نہیں بیٹھتے تھے آپ کے خلاف سازش کریں، بلکہ بات کرنے کے لیے، اپنی تمام طاقت اور اصرار کے ساتھ، سنجیدگی اور ہنسی مذاق سے، محبت، بے ادبی، غصے، نفرت، اطاعت، احساس گناہ اور اپنے دل ودماغ کی تمام طاقتوں کے ساتھ، اس اذیت دہ مقدمہ کے بارے میں جو ہمارے اور آپ کے درمیان بغیر کسی نتیجے کے التوا میں پڑا تھا، اس کی تفصیلات کا تجزیہ کرنے کے لیے، ہر پہلو، ہر ظاہری یا باطنی زاویے سے۔

ایک ایسا مقدمہ جس میں آپ خود ہی منصف ہونے کا دعویٰ کرتے جب کہ بنیادی طور پر (یہاں میں ان تمام غلطیوں کے لیے گنجائش چھوڑتا ہوں جو مجھ سے قدرتی طور پر سرزد ہوسکتی ہیں۔) آپ بھی اس میں ایک فریق تھے، اتنے ہی کمزور اور متزلزل، جتنے کہ ہم تھے۔

میری پرورش کے لیے آپ نے جو انداز تربیت اختیار کیا، اس کے اثرات کو میں ایک مثال سے واضح کرنا چاہوں گا۔ یہ مثال اس تمام صورت حال کے تناظر میں ارما کے حوالے سے بہت معلوماتی ہے۔ ایک طرف وہ بہر حال ہمارے لیے اجنبی تھی۔ آپ کی دوکان میں ملازم ہونے سے پہلے ہی بچپن کی حدود پھلانک چکی تھی، اور آپ کے ساتھ اس کا تعلق ایک آجر اور اجیر کا تھا۔ یوں اس پر آپ کے اثرات جزوی تھے اور وہ بھی ایسی عمر میں جب اس میں مزاحمت کی قوتیں پیدا ہو چکی تھیں۔

دوسری طرف آپ کا اس سے خونی رشتہ بھی تھا۔ وہ اپنے باپ کے بھائی کی حیثیت سے آپ کا احترام کرتی تھی۔ یوں آپ کی شخصیت کا اس پر ایک آجر کی حیثیت کے علاوہ بھی بہت اثر تھا۔ اس سب کچھ کے باوجود وہ اپنے کمزور جسم کے ساتھ بہت مستعد، ذہین، محنتی، شائستہ، قابل اعتماد، بے غرض اور وفادار تھی۔ آپ کی اپنے آجر کی حیثیت سے عزت اور چچا کی حیثیت سے محبت کرتی تھی۔ اس نے سابقہ اور آئندہ کے عہدوں میں خود کو ثابت کیا تھا، لیکن وہ آپ کے لیے ایک عمدہ کلرک نہیں تھی۔ اس کا آپ سے تعلق در حقیقت آپ کے بچوں میں سے کسی ایک جیسا تھا اور اسے قدرتی طور پر ہم نے ہی اس کردار میں دھکیلا اور اس کے معاملے میں بھی دوسروں کو اپنا مطیع بنانے کی آپ کی شخصی قوت اتنی شدید تھی (حقیقت یہ ہے کہ صرف آپ سے تعلق کے حوالے سے ہی، یہ امید کی جاسکتی تھی کہ ایک بچے کی گہری اذیت کے بغیر) کہ اس میں نسیان، لاپرواہی، ایک عجیب حس مزاح اور شاید کسی حد تک گستاخی بھی پیدا ہوگئی تھی، یعنی اس حد تک کہ جس قدر وہ اس کے اہل تھی۔

میں یہاں اس امر پر بحث نہیں کرنا چاہتا کہ وہ بیمار اور دیگر حوالوں سے بھی کوئی آسودہ لڑکی نہیں تھی۔ اس کی گھریلو زندگی بے کیف تھی۔ آپ کے اس سے تعلق میں جو بات میرے لیے بہت روشن تھی، اسے آپ نے خود ہی ایک فقرے میں بیان کیا جس کی ہمارے لیے ایک مقولے کی حیثیت بن گئی جو اگرچہ تقریباً ایک ملحدانہ فقرہ ہے لیکن جو لوگوں سے آپ کے مخصوص عجیب رویئے کا ایک غیر معمولی ثبوت بھی ہے "مرحوم نے میرے لیے یہ لغتی غلاظت چھوڑ دی۔"

میں آپ کے اثرات کے مزید دائروں اور ان اثرات کے خلاف جدوجہد کو بیان کرسکتا ہوں لیکن اس صورت میں میں غیر یقینی دائرے میں داخل ہوجاؤں گا اور مجھے باتیں اختراع کرنی پڑیں گی۔ پھر اس سب کچھ سے قطع نظر، آپ اپنے کاروبار اور خاندان سے جتنے دور جاتے، آپ کی طبیعت میں بشاشت اور چونچالی بھر آتی، معاملات میں زیادہ آسان ہوجاتے، زیادہ خوش اطوار، زیادہ مشفق اور زیادہ ہمدرد (میری مراد ہے کہ ظاہری طور پر بھی) بالکل ویسے ہی جیسے مثال کے طور پر ایک مطلق العنان آمر جب کسی طور اپنی سلطنت کی سرحدوں سے باہر نکل آئے، اپنی آمریت کو برقرار رکھنے کی اس کے پاس کوئی وجہ باقی نہ رہے اور اس قابل ہوجائے کہ کم ترین لوگوں سے بھی عمدہ مذاق سے بات کرسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ فرانزنز بیڈ میں اتاری گئی گروپ تصویروں میں آپ دوسرے کم ترین لوگوں کے درمیان قد آور شخصیت کے حامل اور پُر مزاح دکھائی دیتے، جیسے کوئی بادشاہ اپنے سفر کے دوران ہو۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ ایسی بات ہے جس سے آپ کے بچے بھی استفادہ کرسکتے تھے، اگر وہ ننھے بچوں کی حیثیت سے اس بات کو سمجھنے کے اہل ہوتے، جو کہ ناممکن تھا، اور اگر میں مستقل طور پر آپ کے اثرات کے گھیرے، سخت گیر اور حبس زدہ دائرے میں مسلسل نہ رہتا، جیسا کہ میں رہا۔

جیسا کہ آپ نے کہا، نہ صرف میں خاندانی لگاؤ سے محروم ہوگیا، بلکہ اس کے برعکس مجھ میں خاندان کے لیے احساس موجود تھا، زیادہ تر منفی نوعیت کا، آپ سے قطع تعلقی سے متعلق، (جسے کبھی مکمل کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔) آپ کے اثر کے نتیجہ میں خاندان سے باہر مختلف افراد سے میرے تعلقات کہیں زیادہ متاثر ہوئے۔ اگر آپ یہ مانتے تھے تو مکمل غلطی پر تھے کہ میں دوسروں کے لیے خلوص دل اور وفاداری کے تحت سب کچھ کرتا تھا اور آپ کے لیے اور گھر کے لیے کچھ نہیں، سردمہری اور بے وفائی کی وجہ سے۔ میں یہ بات دسویں مرتبہ دہرا رہا ہوں کہ کسی بھی اور طرح کے حالات میں شاید میں ایک شرمیلا اور مضطرب انسان ہوتا لیکن وہاں سے اس مقام تک، جہاں میں تھا، تمام راستہ تاریک تھا۔ (اب تک اس موضوع پر میں نے اس خط میں ارادۃً خاموشی اختیار کی ہے لیکن اب اور آئندہ بھی میں کچھ ایسی باتوں کے بارے میں خاموشی اختیار کروں گا جن سے متعلق اپنے سامنے اور آپ کے سامنے اعتراف کرنا ابھی تک مشکل ہے۔ میں یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر تصویر یہاں وہاں سے مبہم ہے تو اس سے آپ کو یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ایسا کسی ثبوت کی کمی کی وجہ سے ہے بلکہ اس کے برعکس یہ اس لیے ہے کہ ایسا ثبوت موجود ہے جو اس تصویر کو ناقابل برداشت حد تک چمکیلا بنا سکتا ہے۔ درمیانی راستہ تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔)

یہاں آپ کو ابتدائی برسوں کی یاد دلانا کافی ہوگا۔ میں آپ کے حوالے سے تمام تر خود اعتمادی کھو چکا تھا اور اس کی جگہ مجھ میں لاانتہا احساس گناہ پیدا ہو چکا تھا۔ (اس بے بسی کو یاد کرتے ہوئے ایک مرتبہ میں نے کسی کو لکھا تھا ''اس کو یہ خوف ہے کہ وہ ندامت کے باعث طویل العمر ہوجائے گا۔'') میں دوسرے لوگوں سے ملتے ہوئے کسی کایا کلپ کے عمل سے نہیں گزر سکتا تھا۔ بلکہ لوگوں کی موجودگی میرے

احساس گناہ کی شدت میں اضافہ کرتی کیوں کہ جیسا میں نے پہلے کہا کہ آپ نے ان لوگوں اور اپنے کاروبار میں جس کسی کے ساتھ بھی زیادتیاں کی تھیں، میں ان میں خود کو برابر کا ذمہ دار محسوس کرتا۔ مجھے اس کی تلافی کرنا پڑتی تھی۔ نیز آپ ہر اس شخص پر بے تکلفانہ یا مخفی طور پر کوئی اعتراض کرتے تھے جس سے میرا کچھ تعلق ہوتا۔ اس حوالے سے بھی مجھے اس دوسرے فرد کے سامنے اپنا آپ قصوروار محسوس ہوتا۔ گھر اور کاروبار میں بیشتر لوگوں کے حوالے سے جو بے اعتباری آپ نے مجھ میں پیدا کرنے کی کوشش کی، (مجھے کوئی ایک ایسا شخص بتا دیجئے جو میرے لیے کسی حوالے سے اہم رہا ہو اور جس کی آپ نے کم از کم ایک بار اپنی تلخ اور کھردری تنقید کی بوچھاڑ سے چیر پھاڑ نہ کی ہو۔) اس کا آپ کی ذات پر کوئی بوجھ نہیں تھا (آپ اتنے مضبوط تھے کہ اسے سہار جاتے۔ علاوہ ازیں یہ کسی بھی مطلق العنان آمر کی حقیقی ذہنیت ہے۔) اس عدم اعتمادی نے (جو اس چھوٹے لڑکے کی نظروں میں بالکل حتمی تھی، کیوں کہ ہر جانب مجھے ایسے لوگ دکھائی دیئے جو شان دار تھے۔) اپنے آپ پر میری بے اعتباری اور ہر شے متعلق مستقل بے یقینی پیدا کی۔ تب میں اس بارے میں پر یقین تھا کہ میرے لیے آپ سے فرار ممکن نہیں تھا۔ یہ کہ آپ کا اس بات کو غلط سمجھنا اس باعث تھا کہ آپ کبھی دوسروں کے ساتھ میرے تعلقات کی نوعیت کو نہیں جان پائے اور بے اعتمادی اور حسد کے ساتھ آپ نے (میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ آپ مجھے پسند کرتے تھے) یہ فرض کیا کہ گھریلو زندگی کی محرومی کا ازالہ مجھے کسی اور جگہ کرنا پڑتا کیوں کہ یہ ناممکن تھا کہ گھر سے باہر بھی میں ایسی ہی ایک زندگی گزار پاتا۔

اتفاق سے اس حوالے سے یہ واضح طور پر میرے بچپن کی خاصیت تھی کہ اپنے ہی فیصلے پر بے یقینی سے مجھے آسودگی ملتی۔ میں اپنے آپ پر کہا کرتا ''آہ۔۔۔۔۔۔تم مبالغہ کر رہے ہو۔ تم معمولی باتوں سے اعلیٰ توقعات وابستہ کرنے کا رجحان رکھتے ہو جیسا کہ نوجوان ہمیشہ سوچتے ہیں۔'' لیکن بعد کے سالوں میں یہ لطف بھی مجھ سے یکسر چھن گیا جب مجھے دنیا کا واضح فہم حاصل ہوا۔

صیہونیت میں مجھے آپ سے فرار کی کچھ گنجائش ملی۔ یہاں اصولی طور پر افرار ممکن تھا کیوں کہ یہاں سوچا جا سکتا تھا کہ ہم دونوں ہی صیہونیت کے سائے تلے ملیں یا یہ کہ ہم اس حوالے سے ہی ہم آہنگی پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن میں نے آپ سے کس قسم کی صیہونیت حاصل کی؟ آئندہ سالوں میں تین واضح مختلف رویئے میں نے اپنائے۔

بچپن میں، میں خود کو اس بات پر لعنت ملامت کرتا کہ میں عبادت گاہ بہت کم جاتا۔ روزے بھی نہیں رکھتا تھا اور اسی نوعیت کی کئی اور قابل اعتراض باتیں۔ میں نے سوچا کہ اس طور میں نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ آپ کے ساتھ بھی زیادتی کر رہا تھا اور یوں مجھ میں احساس گناہ بڑھا جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے وابستہ ہو گیا۔

بعد میں نوجوانی میں مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ صیہونیت کا کھوکھلا حصہ جو آپ کے پاس موجود تھا، اس کی بنا پر آخر کیوں آپ مجھے اس بات پر ملامت کرتے تھے کہ میں کوئی کوشش نہیں کرتا (کہ کم از کم جذبہ ایمانی کے لیے، جیسا کہ آپ اسے بیان کرتے تھے) اس سطحی صیہونیت سے جڑنے کی۔ یہ بات جیسا کہ مجھے معلوم ہوتا تھا، مذاق کے سوا اور کچھ نہیں تھی، بلکہ ایک مذاق بھی نہیں۔

سال میں چار دن آپ عبادت گاہ جاتے جہاں آپ، اسے کم از کم یوں کہا جاتا جا سکتا ہے کہ آپ سنجیدہ عبادت گزاروں کی نسبت بیزاری سے بیٹھے ہوئے عبادت گزاروں کے زیادہ قریب ہوتے، محض رسماً عبادتیں کرتے، کبھی خطبہ کے دوران میں پڑھا جانے والا پیرا کتاب مقدس میں سے نکال کر مجھے حیران کر دیتے، جب کہ باقی تمام وقت جب تک کہ میں عبادت گاہ میں موجود رہتا (اور یہی اصل بات تھی) مجھے اردگرد کہیں بھی اپنی مرضی سے گھومنے کی اجازت ہوتی۔ یوں میں وہاں طویل گھنٹے ایک طرف بیٹھ اونگھتا اور جمائیاں لیتا۔ (میرا نہیں خیال کہ میں کبھی دوبارہ اتنا زیادہ بور ہوا ہوں گا، سوائے بعد کے دور میں رقص کی تربیتی کلاسوں کے دوران۔) میں پوری کوشش سے وہاں ہال میں مختلف چیزوں میں اپنی دلچسپی کا کوئی پہلو ڈھونڈ نکالتا۔ مثال کے طور پر توریت کی لوحوں والی الماری کھولی جاتی تو مجھے ہمیشہ وہ تختہ یاد آتا جس پر نشانہ بازی کی جاتی تھی جسے اسی طرح کھولا جاتا تھا۔ اگر آپ بھینسے کی آنکھ میں نشانہ لینے کامیاب ہوتے تو سوائے اس کے کہ وہاں ہمیشہ کوئی دلچسپ شے ہی باہر آتی جب کہ یہاں ہمیشہ وہی بغیر سروں کے قدیم پتلے نکلتے۔

اور پھر یہ میرے لیے خوف زدہ کر دینے والا بھی ہوتا تھا، نہ صرف اس لیے کہ جیسا کہ واضح بھی تھا کہ وہاں بہت سے لوگوں سے آپ کی مڈبھیڑ ہوتی تھی، بلکہ اس لیے بھی کہ ایک بار آپ نے یونہی سرسری طور پر کہا تھا کہ توریت پڑھنے کے لیے مجھے بھی اشارہ کیا جا سکتا تھا۔ اس بات سے میں کئی سال خوف زدہ رہا۔ لیکن اس کے علاوہ میں اپنی بوریت میں زیادہ تر محو رہتا، جب تک کہ (کسی یہودی لڑکے کی تیرھویں

سال گرہ کی تقریب)' بار مٹسوا' کا اہتمام نہ کیا گیا ہوتا، لیکن اس میں بھی تقاضہ چند مضحکہ خیز منتروں کو زبانی یاد کرنے سے زیادہ نہ ہوتا، یعنی با الفاظ دیگر یہ ایک آزمائش کے مضحک انعقاد سے بڑھ کر کچھ نہ ہوتا۔ اور جہاں تک آپ کا تعلق ہے تو چھوٹی چھوٹی باتیں، کوئی اہم واقعات نہیں جیسے آپ کو توریت پڑھنے کے لیے بلایا جاتا تو میرے احساس کے مطابق یہ محض ایک سماجی تقریب ہوتی، یا جب آپ کسی میت کی تجہیز و تکفین کی رسومات میں شامل ہونے کے لیے عبادت گاہ میں ٹھہرتے، تو مجھے ایک زیادہ وقت کے لیے باہر بھیج دیا جاتا، تب باہر بھیجے جانے کے سبب اور کسی خاص دلچسپی کے نہ ہونے کی وجہ سے مجھ میں یہ غیر شعوری احساس بیدار ہوتا کہ ضرور کچھ ناشائستہ واقعہ ہونے والا تھا۔ تو یہ سب کچھ عبادت گاہ میں ہوتا۔ گھر پر بھی اگر عبادت کی جاتی تو وہ اس سے زیادہ سطحی ہوتی جو عید فصح تک محدود ہوتی، جو مسلسل ایک مزاحیہ ناٹک کی صورت اختیار کر گئی، ہسٹریائی قہقہوں کے دوروں کے ساتھ، بلاشبہ عمر میں بڑھتے بچوں کے اثر تلے۔ (آپ نے یہ اثر کیوں پیدا ہونے دیا؟ کیوں کہ آپ ہی پہلے اسے لائے تھے۔)

تو یہ وہ مذہبی روایت تھی جو آپ نے مجھے منتقل کی جس میں زیادہ سے زیادہ 'کروڑ پتی فُجز کے بیٹوں' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک ہاتھ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے جو بڑے دنوں کی چھٹی کے موقع پر اپنے باپ کے ساتھ با قاعدگی سے عبادت گاہ میں آتے۔ ایسی کمزور روایت سے کیوں کر ایک بہتر نتیجہ سامنے آ سکتا تھا؟ سوائے اس کوشش کے کہ اس سے ممکنہ حد تک تیزی سے کنارہ کشی کر لی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے چھٹکارا پانا مجھے مذہبی اخلاص مندی ہی کا حصہ لگا۔

بعد کے دور میں بھی میں نے اسے ایک مختلف انداز ہی میں دیکھا اور محسوس کیا کہ آخر آپ کے لیے کیوں کر ایسا ممکن ہوا کہ آپ نے یہ سوچا کہ میں اس معاملے میں بھی بدنیتی سے آپ سے غداری کر رہا تھا۔ آپ گیٹو کی طرز کی دیہاتی برادری سے صیہونیت کے نام پر چند روایات اپنے ساتھ لائے۔ یہ کچھ زیادہ نہیں تھیں اور یہ کچھ تو شہر میں اور کچھ آپ کی فوجی ملازمت کے دوران کمزور ہوئیں۔ لیکن اپنی نوجوانی کے تاثرات اور یادداشتیں اس حد تک کی صیہونی زندگی کے لیے کافی تھیں۔ خاص طور پر جب کہ آپ کو کچھ زیادہ مذہبی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ مضبوط شخصیت کے مالک تھے اور اس لیے ذاتی طور پر مذہبی اخلاقیات سے شاید ہی متاثر ہوتے۔ جب تک کہ سماجی اخلاقیات سے میں بہت زیادہ گھلی ملی نہ ہوتی۔

بنیادی طور پر جس اصول کا آپ کی زندگی میں غلبہ تھا، وہ صیہونی معاشرے کے ایک خاص طبقے

کے نظریات کی غیر مشروط راستی کا عقیدہ تھا۔ اصل میں یہ نظریات آپ کی فطرت، جو اپنے آپ پر اعتقاد پر مبنی تھی، کا جزو لاینفک تھے۔ اس ہیئت میں بھی کافی صیہونیت موجود تھی لیکن یہ بھی اتنی کم تھی کہ اسے کیا کسی بچے کو منتقل کیا جائے۔ یہ تو منتقلی کے عمل کے دوران ہی کہیں رس کر ضائع ہو گئی۔ ایک حد تک یہ بچپن کی یادیں تھیں جو دوسروں کو منتقل کی جا سکتی تھیں۔ اور کسی حد تک یہ آپ کی دہشت ناک شخصیت تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ ایک بچے کو جو اپنے اعصابی تناؤ کی وجہ سے گہرے مشاہدے کا عادی تھا، یہ سمجھایا جائے کہ آپ صیہونیت کے نام پر جو بودی حرکات کرتے تھے، اور وہ بھی ان کے بودے پن کو نظر انداز کرتے ہوئے، ان سے کوئی اعلیٰ مفہوم اخذ کیا جا سکتا تھا۔ آپ کے لیے ان میں پچھلے وقتوں کی یادگاروں کی حیثیت سے معنویت تھی اور اسی لیے آپ اسے مجھ کو منتقل کرنا چاہتے تھے، لیکن چوں کہ ان میں کوئی داخلی قدر موجود نہیں تھی، حتیٰ کہ آپ کے لیے بھی نہیں، تو آپ انھیں دھمکیوں یا غصے کی بنیاد پر ہی منتقل کر سکتے تھے۔ ایک طرف تو یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر اس پر میری کھلم کھلا نافرمانی نے آپ کو مزید غصہ میں مبتلا کیا۔ آپ اس معاملے میں اپنی کمزور حیثیت کو نہیں سمجھ پا رہے تھے۔

یہ تمام صورت حال بلاشبہ کوئی جدا مظہر نہیں تھی۔ یہودیوں کی اس نئی نسل کے ایک بڑے حصے کے ساتھ ایسا ہی مسئلہ تھا جو مذہبی طور پر نسبتاً زیادہ کٹر مضافات سے شہروں میں آباد ہوئی تھی۔ یہ سب خود بخود ہوا تھا۔ اس سے ہمارے تعلق کی تلخی ہی میں کچھ شدت آئی جو پہلے ہی کم نہیں تھی۔ اب اس تلخی کی ایک اور تکلیف دہ وجہ پیدا ہو گئی تھی۔ اگرچہ آپ کو اپنی ذات میں اس حوالے سے بھرے احساس گناہ کو مان لینا چاہیے تھا، جیسا کہ میں نے مان لیا، اور آپ کو صرف خارجی حالات کے تناظر ہی میں نہیں بلکہ اپنی شخصیت اور اس دور کے حالات کے تناظر میں بھی اس احساس کی وضاحت کرنی چاہیے تھی۔ یعنی محض یہ کہہ دینا ہی کافی نہیں تھا کہ مثال کے طور پر آپ کو بہت سی دوسری مصروفیات اور پریشانیوں میں سر کھپانا پڑتا تھا۔ اس معاملے میں آپ کا رجحان یہ تھا کہ آپ نے اپنے واضح احساس گناہ کو دوسروں کے لیے آپ کی بے جا نفرت میں بدل دیا۔ اس کی بہت آسانی کے ساتھ کہیں بھی تردید کی جا سکتی تھی۔ یہ کوئی ایسی نصیحت کرنے کا معاملہ نہیں تھا جو آپ کو اپنے بچوں کو کرنی چاہیے تھی بلکہ یہ مثالی زندگی کا نمونہ پیش کرنے کا معاملہ تھا۔ اگر آپ کا صیہونی عقیدہ مضبوط ہوتا تو آپ کی مثال کی بھی دوسرے تقلید کرتے۔

آپ حال ہی میں فرینکلن کی جوانی کی یادداشتیں پڑھ رہے تھے۔ میں نے آپ کو یہ کتاب ایک

خاص مقصد کے لیے پڑھنے کو دی تھی۔ یعنی اس لیے نہیں جیسا کہ آپ نے خود کہا کہ اس میں سبزی خوری کی افادیت پر لکھے گئے پیراگرافس موجود تھے بلکہ مصنف کے اپنے باپ سے تعلق کی وجہ سے، جیسا کہ اسے کتاب میں لکھا گیا تھا، اور کے بارے میں پڑھنے کے لیے جس کی کتاب میں وضاحت کی گئی تھی اور مصنف کے اپنے بیٹے کے ساتھ تعلق پر بھی جو بیٹے کے لیے لکھی گئی فرینکلن کی یادداشتوں میں بیان کیا گیا تھا۔ میں یہاں کتاب کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔

حالیہ برسوں میں جب آپنے محسوس کیا کہ صیہونیت میں میری دلچسپی بڑھ رہی تھی تو میرے ساتھ آپ کے رویئے میں تبدیلیوں سے میں نے صیہونیت سے متعلق آپ کے نقطہ نظر کے بارے میں نئی توثیق حاصل ہوئی۔

چوں کہ آپ شروع سے میرے تمام مشاغل اور خاص طور پر ان مشاغل کے بارے میں، جو میری مخصوص دلچسپیوں سے متعلق تھے، قبل از وقت نفرت پیدا کر لیتے تھے، لہٰذا اس موقع پر بھی آپ نے میری مخالفت کی جب کہ اس کے باوجود آپ سے توقع کی جاسکتی تھی کہ آپ کم از کم اس معاملے میں کچھ مختلف رویہ رکھیں گے۔ آخر یہ آپ کی صیہونیت ہی تھی جو یہاں زندگی پا رہی تھی، اور اسی سے ہمارے درمیان نئے تعلق میں داخل ہونے کی صورت پیدا ہو رہی تھی۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ اگر آپ میری مخالفت نہ کرتے تو یہی باتیں اسی وجہ سے میرے اندر شک کو ابھارتیں۔ نہ ہی میں یہ سوچنے کا خواب ہی دیکھ سکتا ہوں کہ میں اس معاملے میں آپ سے کچھ بہتر تھا۔ نہ ہی کبھی اس کی آزمائش ہوئی۔ میری مذہبی دلچسپی کے باعث یہودیت آپ کے لیے ناپسندیدہ شے بن گئی اور صیہونی تحریریں ناقابل فہم ہوگئیں۔ ان سے آپ کو کراہت محسوس ہوتی۔ ہوسکتا ہے اس سے آپ کی مراد یہ ہو کہ آپ کا اصرار تھا کہ وہی یہودیت درست تھی جو آپ نے میرے بچپن میں مجھے سکھائی تھی اور اس کے علاوہ باقی سب کچھ غلط تھا۔ لیکن یہ کہ آپ اس پر اصرار کریں گے، ہمارے وہم وگمان میں نہیں تھا۔ لیکن پھر ناپسندیدگی (اس بات سے قطع نظر کہ ابتدائی طور پر یہ یہودیت کے خلاف نہیں تھی، بلکہ میرے خلاف تھی۔) یہی ثابت کر سکتی تھی کہ لاشعوری طور پر آپ اپنے کھوکھلے عقائد اور بطور یہودی میری تربیت میں اپنی خامیوں سے آگاہ تھے اور کسی طور اس سب کچھ کو یاد کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لیے ہر اس چیز سے آپ فوراً نفرت کرنے لگتے جو آپ کو یہ باتیں یاد دلاتی۔ اتفاق سے میرے نئے صیہونی عقائد سے متعلق آپ کا منفی رویہ مبالغہ آرائی کی حد تک

شدید تھا۔ سب سے پہلے تو اس رویے میں آپ کی نفرت شامل تھی لیکن دوسرے اس کی پیش رفت میں اپنے ساتھی فرد سے بنیادی تعلق فیصلہ کن تھا، جب کہ میرے معاملے میں یہ بات سب سے مہلک تھی۔

آپ میری تحریروں اور ان سے جڑی ہوئی ہر شے سے، جو بھلے ہی آپ کے علم میں نہ ہو، اپنی نا پسندیدگی کے سبب گھر سے زیادہ جڑ گئے۔ یوں میرے اور آپ کے درمیان میری ہی کوششوں سے شدید بُعد پیدا ہوا جس سے کسی حد تک اس کیڑے کی یاد آتی ہے کہ جب اس کی دم کے سرے پر پیر آ جائے تو یہ اپنے اگلے حصے سے کٹ جاتا ہے اور ایک طرف گھسٹنے لگتا ہے۔ ایک خاص حد تک میں محفوظ تھا۔ ہر کسی کے پاس آزادی سے سانس لینے کا موقع موجود تھا۔ میری تحریروں سے آپ نے جو نفرت فوری اور قدرتی طور پر پالی، اس کا میں نے خیر مقدم کیا۔ میری کتابوں کی آمد پر آپ کا انھیں سراہنے کا خاص انداز میرے شوق، میرے غرور کو مجروح کرتا۔ ''اسے میرے بستر کے ساتھ میز پر رکھ دو۔'' (عموماً آپ تب تاش کھیل رہے ہوتے جب کوئی کتاب لائی جاتی) لیکن مجھے اس سے بہت خوشی ہوتی۔ صرف آپ کے خلاف باغیانہ عناد کی وجہ سے نہیں، نہ ہی اس تعلق سے متعلق میرے نقطہ نظر کی نئی تائید کی وجہ سے، بلکہ اندرونی طور پر اس لیے کہ یہ فارمولہ مجھے کچھ یوں لگتا ''اب تم آزاد ہو۔'' بے شک یہ ایک التباس تھا۔ میں آزاد نہیں تھا یا اس بات کو اگر زیادہ رجائیت کے ساتھ کہوں کہ تب آزاد نہیں ہوا تھا۔ میری تحریریں سب آپ سے متعلق تھیں۔ میں نے جو کچھ لکھا، درحقیقت وہی گریہ زاری تھی جو میں آپ کے سینے سے لگ کر نہیں کر سکا۔ یہ آپ کی طرف سے ارادی طور پر طویل الوداع تھا۔ حالاں کہ اسے آپ ہی نے عائد کیا لیکن یہ اسی انداز میں رونما ہوا جیسا میں نے طے کیا۔ لیکن اس کی وقعت ہی کیا تھی؟ سوائے اس کے کہ اس پر بات کی جائے، صرف اس لیے کہ یہ میری زندگی میں رونما ہوا، وگرنہ شاید اس کا ذکر بھی نہ ہوتا۔ اور اس لیے بھی کہ بچپن میں میری زندگی میں اس کی حیثیت ایک پیش آگہی کی تھی، بعد کی عمر میں ایک اُمید کی اور اس کے بھی بعد کی عمر میں بیشتر مایوسی کا۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے پھر دوبارہ آپ کی صورت میں مجھ سے چند معمولی فیصلے کروائے۔

مثال کے طور پر مستقبل کے پیشے کا چناؤ۔ بے شک آپ نے اس معاملے میں مجھے اپنے شان دار اور مہربان انداز میں مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ اگرچہ اس معاملے میں بھی آپ یہودیوں کے متوسط طبقہ کے والدین عمومی طریقہ تربیت، جو آپ کے لیے ایک معیار تھا، یا کم از کم اس طبقے کی اقدار کی پیروی

کر رہے تھے۔ لیکن اس معاملے میں بھی میری شخصیت کے بارے میں آپ کی غلط فہمی نے اہم کردار کیا۔ فی الاصل اپنے پدرانہ غرور، میری حقیقی زندگی سے متعلق آپ کی لاعلمی، اور میرے ظاہری بودے پن سے اخذ کیے گئے نتائج کے سبب آپ نے ہمیشہ مجھے خاموشی سے مستعدی کے ساتھ کام کرنے والا لڑکا تصور کیا۔ آپ کے خیال میں بچپن میں میں ہمیشہ مطالعے میں غرق رہتا، اور بعد کی عمر میں تحریر و تخلیق میں۔ اس کا حقیقت سے دور سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ کہنا زیادہ درست اور کم مبالغہ آمیز ہوگا کہ میں نے کم مطالعہ کیا اور کچھ بھی نہیں سیکھا۔ اور یہ کہ ان تمام سالوں کے بعد جو کچھ میرے ذہن میں باقی رہا ہے تو وہ یکسر غیر معمولی نہیں ہے حالاں کہ میری یادداشت کافی حد تک اچھی ہے اور مجھ میں سیکھنے کی صلاحیت بھی کم تر نہیں ہے۔ لیکن مجموعی علم اور خاص طور پر علم کی کوئی ٹھوس بنیاد، ظاہری مستحکم اور پرسکون زندگی کے لیے صرف ہونے والے وقت اور رقم کے مقابلے میں نہایت افسوس ناک تھی۔ خاص طور پر ان لوگوں کے مقابلے میں بھی جنھیں میں جانتا تھا۔ یہ نہایت افسوس کا مقام ہے لیکن میرے لیے ناقابل فہم نہیں ہے۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، میں اپنے روحانی اور عقلی وجود کے اثبات سے متعلق یوں انتہائی اضطراب کا شکار رہا کہ باقی ہر شے سے بے نیاز ہو گیا۔ ہمارے قصبے میں سکول کے یہودی بچے اکثر بہت عجیب ہوتے ہیں۔ ان میں انتہائی غیر معمولی خصوصیات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میری سرد بے اعتنائی، صاف دکھائی دینے والی، تباہ کن، بچگانہ حد تک بے بضاعت، مضحکہ خیزی کی حد تک پہنچی ہوئی، اور متشددانہ طمانیت بھری، یعنی ایک خود کفیل مگر سرد مہر تخیل پرست لڑکے کی بے اعتنائی، ایسی خصوصیت ہے جو مجھے کسی بھی دوسرے لڑکے میں نہیں ملی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بچے کا خوف اور احساس گناہ سے تباہ ہوتے اعصاب کے خلاف واحد دفاع تھا۔

جو بات میری سوچوں پر اپنا سایہ کیے رہتی، وہ میرے بارے میں فکرمندی ہوتی، جس کی کئی صورتیں تھیں۔ مثال کے طور پر میری صحت کے بارے میں تشویش۔ اس کا آغاز غیر محسوس انداز میں ہوا۔ جیسے کبھی کبھار ہونے والی بدہضمی، بالوں کا گرنا، ریڑھ کی ہڈی کا خم اور ایسی ہی کئی اور باتیں۔ بے شمار تدریجی مدارج سے گزر کر یہ احساس آخر کار ایک حقیقی بیماری کی صورت میں منتج ہوا۔ لیکن میں چوں کہ کسی بھی شے کے بارے میں پر یقین نہیں تھا، چوں کہ مجھے ہر لمحہ اپنے وجود کی نئی تصدیق کی ضرورت پڑتی، چوں کہ کچھ بھی میری اپنی، بلا شرکت غیرے، صرف میری ملکیت ایسا نہیں تھا جو مکمل طور پر مجھ سے ہی

متعین ہوا ہو، سچ کہا جائے تو ایک عاق شدہ بیٹا، سوقدرتی طور پر میں حتی کہ اپنی قریب ترین شے کے بارے میں بھی غیر یقینی پن کا شکار ہو گیا جیسے خود میرا اپنا جسم۔ میں زیادہ لمبا اور دبلا پتلا ہوتا گیا، یہ جانے بغیر کہ اس دبلے پن سے کیسے نمٹوں۔ بوجھ بہت زیادہ تھا۔ لہٰذا میری کمر جھک گئی۔ میں دوڑنے کی اور خاص طور پر ورزش کرنے کی شاذ ہی جسارت کرتا۔ لہٰذا میں لاغر ہی رہا۔ البتہ اپنے اندر ہر اس شے پر حیرت زدہ بھی رہا جو اس سب کچھ کے باوجود معجزاتی طور پر بحال رہی جیسے میرا معدہ ہاضمہ جو مجھے ذہنی طور پر بے لگام کرنے کو کافی تھا۔ یوں میرا ذہن فاسد خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ حتی کہ آخر کار شادی کرنے کی (جس کے بارے میں آئندہ بات کروں گا) غیر انسانی کوشش کے تناؤ سے میرے پھیپھڑوں سے خون خارج ہوا۔

اس تمام قصے میں شان برن پیلس کے میرے فلیٹ کا بہت اہم کردار ہے جو میں نے دراصل اس لیے لے رکھا تھا کیوں کہ مجھے یقین تھا میں یہاں زیادہ اطمینان کے ساتھ اپنا تحریری شغل کر سکتا ہوں۔ لہٰذا یہ سب کچھ کام کی زیادتی کے سبب نہیں تھا جیسا کہ آپ نے ہمیشہ تصور کیا۔ ایسے برس بھی آئے جب میں بہترین صحت کے ساتھ صوفے پر بے کار لیٹ کر اتنا وقت گزار دیتا جتنا آپ نے اپنی پوری زندگی میں فارغ نہیں گزارا ہوگا آپ کی بیماریوں کے وقفوں سمیت۔ میں جب بے انتہا مصروفیت کے ساتھ آپ سے دور بھاگتا تو عام طور پر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتا۔ دفتر میں (جہاں مجھ پر کاہلی کبھی غیر معمولی نہ ہوئی اور جو میرے اضطراب کی وجہ سے کبھی ایک حد سے زیادہ غلبہ نہ پا سکی) اور گھر میں بھی مجھ سے جو کام ہو سکا، اس کا حاصل کچھ بہت قابل ذکر نہیں تھا۔ اگر آپ کو میری جملہ استعداد کا حقیقی اندازہ ہو جائے تو آپ بھونچکا رہ جائیں۔

شاید میں فطری طور پر ست الوجود نہیں ہوں لیکن تب میرے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ جس گھر میں میں رہتا تھا، وہاں مجھے حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا، رد کیا جاتا، مجھے اپنی ذات کی بقاء کے لیے جنگ کرنا پڑتی۔ جب کہ وہاں سے کسی دوسری جگہ فرار ہونے میں بہت خواری تھی۔ لیکن یہ کوئی کام نہیں تھا، کیوں کہ یہ سراسر ناممکن کام تھا۔ ایسا کام جو معمولی مستثنیات کے ساتھ میرے لیے ناقابل عمل تھا۔

یہ وہ صورت حال تھی جس میں مجھے اپنے مستقبل کے پیشے کے بارے میں فیصلہ کرنے کی آزادی دی گئی لیکن کیا میں واقعی اس آزادی کو استعمال کرنے کے اہل تھا؟ کیا مجھے اپنی استعداد پر واقعی اتنا اعتبار

تھا کہ جس کی بنیاد پر میں کسی بھی پیشے میں کامیاب ہو پاتا؟ اپنے بارے میں میری رائے کسی بھی دوسری شے، جیسے کسی خارجی کامیابی کی نسبت آپ کی ذات پر زیادہ منحصر تھی۔ کبھی یہ لمحہ بھر کے مضبوط ہوتی، لیکن اس سے زیادہ نہیں، کیوں کہ دوسری طرف آپ کی شخصیت کا بوجھ زیادہ شدت سے ہمیشہ مجھے نیچے کھینچتا۔ میں سوچتا کہ گرائمر سکول میں پہلے درجے کا امتحان کبھی پاس نہیں کر پاؤں گا۔ لیکن میں نے ایسا کیا۔ حتیٰ کہ انعام بھی جیتا۔ جمنازیم میں داخلے کا امتحان دیتے ہوئے بھی مجھے اپنی کامیابی کی سرے سے کوئی توقع نہیں تھی۔ میں نے اسے بھی پاس کیا۔ لیکن جمنازیم میں پہلے سالانہ امتحان میں ناکام ہونا تو ناگزیر ہوگا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہوا اور میں کامیاب ہوتا چلا گیا۔ اس سے مجھے کوئی اعتماد نہیں ملا بلکہ اس کے برعکس مجھے ہمیشہ یہ یقین رہا اور آپ کا غیر دوستانہ رویہ اس کا ایک مثبت ثبوت تھا کہ میں جس قدر کامیابیاں حاصل کروں گا اسی قدر ان کا نتیجہ ناگزیر طور پر بدترین ہوگا۔

اکثر تصور کی آنکھ سے میں اپنے اساتذہ کے خوفناک اجتماع کو دیکھتا (جمنازیم اس کی واضح ترین مثال ہے لیکن میرے ہر طرف سب کچھ ایسا ہی تھا) کہ جو پہلے درجے سے کامیاب گزرنے پر اکٹھا ہوتا، اور پھر دوسرے درجے میں جب میں اس میں سے بھی کامیاب گزرا، پھر تیسرے درجے میں اور یوں ہر بار وہ اکٹھے ہوتے تاکہ اس انوکھے اور فہم سے بالا معاملے کا تجزیہ کریں کہ کیسے مجھ جیسے انتہائی نااہل، یا کم از کم سب سے بے خبر شخص رینگتا ہوا کامیابی کے ساتھ اس درجے تک پہنچا کہ اب، جب کہ سب کی توجہ مجھ پر ہی مرکوز ہے، فوراً ہی مجھے سکول سے نکال باہر کریں گے تاکہ تمام نیک سیرت افراد اس خوف ناک خواب سے نجات پانے کا جشن منائیں۔ ایسے واہموں کے ساتھ زندگی گزارنا ایک بچے کے لیے آسان بات نہیں ہے۔ ان حالات میں میں اپنے اسباق کی طرف کیا توجہ دیتا؟ کس شے میں اتنی سکت تھی کہ ایسے میں میرے اندر اپنے لیے دلچسپی کی رمق پیدا کرتی؟ اسباق، اور نہ صرف اسباق بلکہ میرے اردگرد موجود ہر شے میں مجھے اس فیصلہ کن عمر میں خاص طرح کی دلچسپی تھی جیسے غبن کرنے والا بنک کلرک نوکری بھی کر رہا ہو لیکن اس خیال سے کانپ کانپ جاتا ہو کہ اس کی چوری پکڑی جائے گی، اس لیے وہ بنک کی روزمرہ سرگرمیوں میں دلچسپی بھی لیتا ہے جن سے اس کو ایک کلرک کی حیثیت سے معاملہ کرنا ہوتا ہے۔

اصل بات کے موازنے میں یوں ہر شے معمولی اور دور تھی۔ یوں داخلے کے معیار پر پورا اترنے کے امتحان کا درجہ آ گیا جس میں سے میں ایک تو جعل سازی کی مدد سے کامیاب ہوا۔ اور پھر انجماد کی

صورت آگئی کیوں کہ اب میں آزاد تھا۔ اگر میرا تعلق صرف میری ذات ہی سے ہوتا، تو جمنازیم کے نظم و ضبط کے باوجود میں اس سے کتنا زیادہ آزاد ہوتا جتنا میں اب تھا۔ اس لیے حقیقتاً مستقبل کے پیشے کے حوالے سے میرے پاس آزادی نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ اصل بات کے مقابلے میں ہر شے میرے نزدیک اتنی ہی قابل اعتنا ہوتی جیسے سکول میں پڑھائے جانے والے مضامین۔ لہذا پیشے کو منتخب کرنے کا معاملہ یوں تھا کہ یہ ایسا ہونا چاہئے جو میری انا کو مجروح کیے بغیر اس بے اعتنائی کو برقرار رکھنے دے۔ قانون کا مضمون ایک واضح انتخاب تھا۔ بے ثمر اُمید کی تحت اپنی اپنے اس فیصلے سے پہلے چند ایک برعکس کوششیں بھی کیں۔ مثلاً پندرہ دن کیمیا کا مطالعہ کیا۔ چھ ماہ جرمن لسانیات کی کلاسیس پڑھیں جنھوں نے میرے ارادے ہی کو پختہ کیا۔ لہذا میں نے قانون کا مطالعہ کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امتحانات سے چند مہینے پہلے، اور اس انداز میں جس نے میرے اعصاب کو شدت سے اپنی گرفت میں لیا، میں ذہنی طور پر مثبت انداز میں لکڑی کے برادے پر جی رہا تھا، جسے ہزاروں لوگوں نے میرے لیے چبایا تھا۔ لیکن ایک ایک خاص حوالے سے یہ سب کچھ میرے موافق تھا، جیسے پہلے جمنازیم میرے موافق تھا اور بعد میں بطور کلرک میری نوکری، کیوں کہ یہ سب میری صورت حال سے مطابقت رکھتے تھے۔ بہرطور میں نے حیران کن پیش بینی کا مظاہرہ کیا۔ حتی کہ بچپن میں اپنے مضمون اور مستقبل کے پیشے سے متعلق مجھے متوقع خدشات کا علم تھا۔ اس طرف سے تو بچاؤ کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی۔ سو اس معاملے میں تو میں ہاتھ پیر چھوڑے بیٹھا تھا۔

لیکن اپنی شادی کی افادیت اور اس کے امکان سے متعلق کوئی پیش بینی نہیں کی۔ یہ میری زندگی کا عظیم ترین خوف، غیر متوقع طور پر مجھ پر غالب آ گیا۔ بچے کی ذہنی نشوونما ست انداز میں ہوئی تھی کہ یہ سب باتیں اس کے لیے غیر متعلق تھیں۔ کبھی کبھار ان کے بارے میں سوچنے کی ضرورت پیدا ہوتی۔ لیکن اس حقیقت کو سمجھنا ناممکن تھا کہ یہاں ایک مستقل، فیصلہ کن اور بلاشبہ ایک انتہائی تلخ تجربہ ہونے والا تھا۔ حقیقت میں شادی کے منصوبے فرار کی انتہائی وسیع البنیاد اور امید افزا کوششیں تھیں اور نتیجتاً ان کی ناکامی بھی وسیع البنیاد تھی۔ میں خوفزدہ ہوں کہ اس میدان میں جو بھی کوشش کی، وہ ناکامی پر منتج ہوئی، اس لیے میں شادی کی ان کوششوں کو آپ کے لیے قابل فہم بنانے میں بھی ناکام ہوں گا۔ اور پھر بھی اس تمام خط کی کامیابی کا انحصار اسی پر ہے، کیوں کہ ان کوششوں میں ایک طرف تو ان تمام چیزوں کو یکجا کر دیا تھا جو مثبت

قوتوں کے انداز میں میرے پاس موجود تھیں۔ دوسری طرف وہاں اکٹھی تھیں، واضح غصے کی صورت میں تمام منفی قوتیں جن کے بارے میں میں نے عرض کی کہ وہ آپ کے مخصوص طریقہ تربیت کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھیں جیسے لاغری، خوداعتمادی کی کمی، احساس گناہ، اور انھوں نے مثبت انداز میں میرے اور شادی کے درمیان ایک طرح کا خط انقطاع کھینچ دیا تھا۔ اس کی وضاحت کرنا میرے لیے بھی مشکل ہوگا کیوں کہ میں نے اتنے بہت سے دن اور راتیں اس سارے معاملے پر بار بار سوچتے ہوئے گزاری تھیں کہ اب میں بھی محض اسے سوچتے ہی گڑبڑاہٹ کا شکار ہو جاتا تھا۔

واحد شے جو وضاحت کو میرے لیے آسان بناتی تھی، وہ میرے خیال میں آپ کی اس معاملے کے بارے میں مکمل غلط فہمی تھی۔ ایسی مکمل غلط فہمی کو معمولی سا درست کرنا بے انتہا مشکل معلوم نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے تو آپ نے شادیوں کی ناکامی کو میری دیگر ناکامیوں کے برابر لا کھڑا کیا۔ مجھے آپ کی اس رائے سے قطعاً کوئی اختلاف نہ ہوتا، اگر آپ میری ناکامی کی سابق توضیحات کو من حیث المجموع قبول کر لیتے۔ درحقیقت یہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ صرف آپ نے اس معاملے کی اہمیت کو کمتر جانا۔ آپ نے اس کی وقعت کو اس حد تک کم تصور کیا کہ جب کبھی ہم اس پر گفتگو کر رہے ہوتے تو اصل میں ہم کسی اور ہی موضوع پر بات کر رہے ہوتے۔

میں جسارت کے ساتھ یہ کہنا چاہوں گا کہ آپ کی ساری زندگی میں کوئی واقعہ ایسا نہیں گزرا جو آپ کے لیے اس قدر اہم ہو جتنا میرے لیے میری شادی کی کوششوں کا معاملہ تھا۔ اس سے میری قطعاً یہ مراد نہیں ہے کہ آپ کو کبھی کسی اہم واقعہ کا تجربہ نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس آپ کی زندگی میری نسبت تجربات سے کہیں زیادہ بھری ہوئی ہے، آپ کو بھرپور توجہ ملی اور آپ کہیں زیادہ منظم رہے، اور صرف اسی وجہ سے آپ کو کسی ایسے واقعہ سے واسطہ نہیں پڑا۔ یہ بالکل ایسی بات ہے کہ ایک شخص کو پانچ چھوٹی سیڑھیاں اور دوسرے شخص کو صرف ایک سیڑھی پھلانگنی ہو جب کہ وہ ایک سیڑھی اس کے لیے اتنی اونچی ہو، جتنی وہ پانچ سیڑھیاں مجموعی طور پر بھی نہیں ہیں، تو وہ پہلا شخص نہ صرف ان پانچ سیڑھیوں کو پھلانگ جائے گا بلکہ وہ ایسی سینکڑوں اور ہزاروں سیڑھیاں پھلانگ سکتا ہے۔ وہ ایک عظیم اور بہت متحرک زندگی گزارے گا۔ لیکن کوئی بھی ایک سیڑھی اس کے لیے کبھی اتنی اہم نہیں ہوگی جتنی وہ ایک سیڑھی اس دوسرے شخص کے لیے ہے، پہلی اونچی سیڑھی، جو سیڑھی جسے پھلانگنا اس کے لیے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ بھی ممکن نہیں ہے۔ جس

سیڑھی کو نہ وہ پھلانگ سکتا ہے اور نہ قدرتی طور پر جس سے دست بردار ہونا اس کے لیے ممکن ہے۔

شادی کرنا، ایک خاندان تشکیل دینا، پیدا ہونے والے بچوں کی ذمہ داری قبول کرنا، اس غیر محفوظ دنیا میں ان کو تحفظ فراہم کرنا اور ان کی رہنمائی بھی کرنا، میرے خیال میں کسی بھی انسان کے لیے ممکنہ ترین کام ہے جو وہ سرانجام دے سکتا ہے۔ یہ بات کہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ یہ اہم ترین کام کرنے میں سرخرو ہوئے، میری رائے کے خلاف نہیں ہے۔ اور دوم یہ مخصوص لوگ جو عموماً یہ کام نہیں کر پاتے، اصل میں ان سے ایسا سرزد ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ کوئی اعلیٰ ترین فعل نہیں ہے، اس کے باوجود یہ قابل احترام اور مقدس ہے (خاص کر کرنے اور ہو جانے کے درمیان کوئی خط امتیاز قائم نہیں کیا جا سکتا ۔) بہر حال یہ ضروری نہیں ہے کہ سیدھے سورج کے وسط میں اڑان لی جائے بلکہ ضروری بات یہ ہے کہ رینگتے ہوئے زمین پر ایسے صاف شفاف حصے تک جایا جائے جہاں سورج چمکتا ہے اور انسان خود کو اس سے گرما سکے۔

میں اس بات کے لیے کیسے تیار ہوتا؟ اتنا برا کہ جتنا ممکن تھا۔ یہ شے ان تمام باتوں سے بھی واضح ہے جواب تک کی گئی ہیں۔ جہاں تک کہ کسی براہ راست انفرادی تیاری اور عمومی بنیادی صورت احوال کی براہ راست تخلیق موجود ہے، آپ نے ظاہری طور پر زیادہ دخل اندازی نہیں کی۔ نہ ہی یہ کسی اور طرح سے ممکن تھا۔ جو شے فیصلہ کن ہے، وہ معاشرتی طبقے، قوم اور مخصوص زمانے کے عمومی جنسی رواج ہیں۔ آپ نے اس معاملے میں بھی کچھ زیادہ دخل اندازی نہیں کی۔ کیوں کہ اس قسم کی دخل اندازی کے لیے آپسی عمومی اعتماد کا ہونا ضروری ہوتا ہے جب کہ ہم دونوں میں ایسی کوئی شے فیصلہ کن وقت آنے سے بہت پہلے سے ہی نہیں تھی۔ اور یہ کوئی خوش گوار بات نہیں تھی کیوں کہ ہماری ضرورتیں مختلف تھیں۔ جس ضرورت نے مجھے جکڑ رکھا تھا، وہ آپ کے لیے بالکل غیر اہم تھی، یا پھر اس کے الٹ تھا۔ جو شے آپ کے لیے معصومیت کی حامل تھی، ہو سکتا ہے وہ میرے لیے احساس گناہ کا باعث بنے، یا پھر اس کے الٹ۔ جو شے آپ کے لیے بے نتیجہ ہو، ہو سکتا ہے وہ میرے لیے آخری امید ہو۔

مجھے یاد ہے ایک شام کو میں آپ کے اور والدہ کے ساتھ گھر سے باہر چہل قدمی کر رہا تھا۔ ہم جوزف پلاز کے نزدیک تھے جہاں آج لینڈر بینک ہے۔ میں نے ایک احمقانہ شیخی، احساس برتری، غرور، کلی اطمینان (جو محض جعلی تھا)، سرد مہری (جو قطعی اصلی تھی) سے ہکلاتے ہوئے گفتگو شروع کی جیسے

عموماً میں آپ سے بات کیا کرتا تھا۔ میں آپ دونوں کو قصوروار قرار دے رہا تھا کہ آپ نے بچپن میں میری رہنمائی نہیں کی کیوں کہ یہ حقیقت تھی کہ میرے سکول کے ساتھیوں نے ہی تب مجھے سنبھالا دیا اور یہ کہ میں شدید خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ (میں یہاں صاف سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ جیسا کہ میرا اندازہ تھا، اپنے بودے پن کی وجہ سے عموماً خود کو ایک بہادر انسان ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ حالاں کہ سوائے اس کے کہ شہر میں بچوں سے جنسی زیادتی کے معمولی جرائم ہوتے تھے، مجھے کسی اور شدید خطرات کا اندازہ نہیں تھا۔)

تب آخر میں میں نے کہا کہ اب خوش قسمتی سے میں ہر بات جانتا ہوں، مجھے کسی نصیحت کی ضرورت نہیں رہی، اور یہ کہ اب سب کچھ ٹھیک تھا۔ میں نے یہ ساری بات اصل میں اس لیے چھیڑی تھی کیوں کہ اس موضوع پر کم از کم گفتگو ہی سے مجھے مسرت ملتی اور کچھ تجسس کی وجہ سے بھی۔ لیکن سب سے بڑھ کر اس لیے بھی کہ میں آپ دونوں سے کسی بات پر انتقام لینا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ آپ کی عادت ہے آپ کے لیے یہ سب کچھ عام سی بات تھی۔ کہا بھی تو بس کچھ ایسا ہی کہ آپ تب مجھے کوئی نصیحت کر سکتے تھے تاکہ میں خطرے سے محفوظ رہ کر یہ باتیں سیکھ جاتا۔ غالباً یہ ویسا جواب تھا جس کی میں آپ سے توقع کر رہا تھا۔ میری گفتگو گوشت اور اچھی خوراک زیادہ کھا لینے والے، ست الوجود، ہمیشہ اپنی ہی ذات میں گم رہنے والے بچے کی پراگندہ سوچ کا نتیجہ تھی۔ لیکن پھر بھی میرا ظاہری احساس ندامت اس جواب سے اتنا مجروح ہوا، یا مجھے لگا کہ اسے ایسا ہونا چاہیے تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں آپ سے اس بارے میں مزید بات نہیں کر سکا اور پر افتخار گستاخی کے ساتھ بات وہاں ختم کر دی۔

آپ نے تب مجھے جو جواب دیا اس کا تجزیہ سہل نہیں ہے۔ ایک طرف اس میں بہر حال روایتی انداز گفتگو کی بے جا بے تکلفی تھی جیسے بالکل قدرتی۔ دوسری طرف جہاں تک اس مشورے کا تعلق ہے، یہ جدید انداز کی ایک غیر مزاحم رائے تھی۔ مجھے علم نہیں ہے کہ تب میری عمر کیا تھی؟ یقیناً سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ اس عمر کے بچے کے لیے بلاشبہ ایک غیر معمولی جواب تھا۔ ہمارے درمیان موجود بُعد اس حقیقت سے بھی ظاہر ہے کہ حقیقی زندگی سے متعلق یہ اولین ہدایت تھی جو میں نے آپ سے براہ راست حاصل کی۔ اس کا حقیقی مفہوم جو تب فوری طور پر میرے ذہن کی گہرائیوں میں گم ہو گیا اور پھر طویل عرصہ بعد جزوی طور پر ہی شعور کی سطح پر ابھرا، کچھ یوں تھا کہ آپ نے تب مجھے جو نصیحت کی، اس میں آپ کے

خیال میں اور اس سے کہیں زیادہ میرے اپنے خیال میں، ممکنہ حد تک ایک غلیظ ترین شے کی طرف اشارہ تھا۔ یعنی آپ یہ چاہتے تھے کہ میں اپنے ساتھ جیسی بھی جسمانی غلاظت گھر لاؤں، وہ غیر اہم تھی کیوں کہ آپ خود کو اور اپنے گھر کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اہم بات اس کے بجائے یہ تھی کہ آپ خود اپنی نصیحت کے دائرے سے باہر تھے، ایک شادہ شدہ انسان، ایک خالص انسان، ان سب باتوں سے ماورا تھے۔ یہ بات تب میرے لیے غالباً اس لیے بھی بہت اہم تھی کہ حتیٰ کہ شادی میرے لیے بے شرمی کی بات تھی، اور اس لیے میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں ان تمام عمومی تفصیلات کا اپنے والدین پر اطلاق کروں جو میں نے شادی سے متعلق حاصل کر رکھی تھیں۔ یوں آپ خود زیادہ پاکیزہ بن گئے، ایک اعلیٰ سطح پر جا بیٹھے۔ لیکن میرے لیے یہ سوچنا بھی محال تھا کہ آپ نے بھی شادی سے پہلے خود کو ایسی کوئی نصیحت کی ہوگی۔ اس لیے آپ کسی طرح کی مادی آلائشات کی آلودگی سے مکمل پاک تھے لیکن یہ آپ تھے جس نے مجھے اس غلاظت میں دھکیلا تھا جیسے ان چند بے تکلفانہ الفاظ سے میرا اس مقدر کو پانا طے تھا۔ اور یوں اگر دنیا صرف دو انسانوں یعنی آپ اور مجھ پر مشتمل ہو، (ایسا تصور جسے قائم رکھنے پر میں زیادہ مائل تھا۔) اس دنیا کی پاکیزگی آپ پر آ کر ختم ہو جائے گی اور آپ کی نصیحت کی فضیلت کی وجہ سے غلاظت کا منبع میرا وجود ہوگا۔ یہ بات بجائے خود نا قابل فہم تھی کہ آپ میری مذمت کریں۔ صرف آپ کا پرانا احساس جرم اور گہری نفرت ہی اس کی کچھ وضاحت کر سکتا تھا۔ یوں اپنے ذات کی تنہائی میں قید ہو گیا اور بلا شبہ یہ بہت دشوار بات تھی۔

غالباً یہ وہ مقام ہے جہاں ہماری بے گناہی سب سے زیادہ واضح ہوئی۔ اے نے بی کو زندگی کے بارے میں اپنے رویے کی روشنی میں بے تکلف الفاظ میں ایک نصیحت کی جو ایک خوشگوار نصیحت نہیں تھی لیکن ایسی نصیحت تھی شہر کے ماحول میں معمول کے مطابق تھی، ایسی نصیحت جو صحت کو ہر خرابی سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ بی کے لیے یہ نصیحت اخلاقی طور پر بہت صحت افزا نہیں تھی۔ لیکن بی کیوں اتنے بہت سے سالوں میں اس کے مطابق اپنا لائحہ عمل تیار کرنے اور اپنے نقائص کی درستگی کے اہل نہیں ہو سکا؟

اس نے اس نصیحت کو کبھی مکمل طور پر قبول ہی نہیں کیا۔ اس کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی کہ کیسے یہ نصیحت بی کے مستقبل کی تمام دنیا کو مسمار کر دیتی۔ لیکن پھر بھی ایسا ایک واقعہ ہوا ضرور، جب کہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اے آپ ہیں اور بی میں خود۔ دونوں طرف موجود بے گناہی کے احساس کو میں اس لیے بھی بہت

بہتر انداز میں سمجھ سکتا ہوں کہ ایک ایسا ہی تصادم ہمارے درمیان بیس سال بعد بھی ہوا، اس سے مختلف حالات میں، اپنے طور پر خطرناک لیکن اس سے کہیں کم نقصان دہ۔ کیوں کہ مجھ میں، چھتیس سال کے نوجوان میں تھا ہی کیا جو مجروح ہوتا؟

میں ان بے یقین دنوں میں سے کسی ایک دن ہمارے درمیان ہونے والی اس مختصر گفتگو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو شادی کے میرے تازہ ترین منصوبوں کے اعلان کے بعد شروع ہوئے تھے۔

آپ نے تب جو کچھ مجھ سے کہا، وہ کچھ یوں تھا۔ ''اس نے غالباً کوئی خاص کرتہ پہنا ہوگا جو پراگ کی یہودی لڑکیوں پر خوب پھبتا ہے۔ اور بلا شبہ اسے دیکھتے ہی تم نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اور وہ بھی ممکنہ حد تک عجلت میں ایک ہفتے میں، کل، بلکہ آج ہی۔ میں تمھیں نہیں سمجھ سکتا۔ آخر تم ایک باشعور انسان ہو، شہر میں رہتے ہو، تم نہیں جانتے کہ کیا کیا جائے سوائے اس کے کہ جو پہلی لڑکی تمھیں ملے، تم اس سے شادی کر لو۔ کیا تم اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کر سکتے؟ اگر تم خوفزدہ ہو تو میں خود تمھارے ساتھ جاؤں گا۔'' آپ نے یہ بات بہت وضاحت اور صاف انداز میں کی تھی لیکن اس کی مزید تفصیل مجھے یاد نہیں رہی۔ غالباً تب ہی سے ہر شے میری آنکھوں میں دھندلا گئی تھی۔ تب میری زیادہ دلچسپی کا مرکز والدہ تھی۔ جو اگرچہ مکمل طور پر آپ سے متفق تھی لیکن اس نے میز پر سے کوئی شے اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ آپ نے کبھی اس سے زیادہ سنگین الفاظ میں میری تذلیل کی ہو اور اس سے زیادہ واضح انداز میں مجھ سے اپنی نفرت کا اظہار کیا ہو۔ بیس سال پہلے جب آپ نے مجھ سے اسی لہجہ میں بات کی، تب آپ کی نگاہوں دیکھتے ہوئے انسان کو شہر کے اس ناموافق لڑکے کے لیے بہر طور کچھ عزت دکھائی دے گی، جو آپ کی رائے میں کچھ وقت مزید ضائع کیے بغیر زندگی کی جنگ میں شامل ہو سکتا تھا۔ لیکن آج یہی خیال اس احساس تنفر میں اضافہ کر سکتا تھا۔ کیوں کہ تب جو لڑکا زندگی کی دوڑ میں پہلی جست کی تیاری کر رہا تھا، آدھے راستے میں رک گیا تھا اور آج لگتا تھا کہ اس نے اس عرصے میں تجربے سے کچھ بھی نہیں سیکھا۔ صرف ان بیس سالوں میں اس کی حالت زیادہ قابل رحم ہو چکی تھی۔

کسی لڑکی کے بارے میں میری رائے کی آپ کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ آپ نے (غیر شعوری طور پر) ہمیشہ میری قوت ارادی کو فتح کرنا چاہا اور اب آپ کو (لاشعوری طور پر) یقین تھا کہ آپ

جانتے تھے اس کی کیا وقعت تھی۔ آپ میری فرار کی دیگر کوششوں سے غیر آگاہ تھے لہٰذا آپ اس ذہنی فکری عمل کا بھی کچھ اندازہ نہیں کر سکے جو شادی کے میرے اس فیصلے کا سبب بنا۔ آپ نے اندازہ لگانے کی کوشش کی اور میرے بارے میں اپنی عمومی رائے کی روشنی آپ نے انتہائی مکروہ، غیر محتاط اور تنفر آمیز انداز میں اس کی وضاحت کی کوشش بھی کی۔ آپ نے ایسے ہی انداز میں اپنی رائے کے اظہار میں لمحہ بھر کے لیے بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ آپ کے ان الفاظ سے میں جس شرمندگی اور ندامت میں مبتلا ہوا، وہ آپ کے خیال میں اس شرمندگی اور ندامت کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی جو میری اس شادی سے آپ کو محسوس ہوتی۔

اب میری شادی کی تمام مساعی کے بارے میں آپ جواب میں بہت کچھ کہہ سکتے تھے اور آپ نے بلاشبہ ایسا کیا بھی۔ آپ کو حق تھا کہ آپ میرے فیصلے کو قطعاً کچھ وقعت نہ دیتے کیوں کہ میں دوبار ''الیف'' سے اپنی منگنی توڑ چکا تھا، دونوں مرتبہ اس کی تجدید بھی کی اور والدہ اور آپ کو غیر ضروری طور پر برلن میں اپنی منگنی کی تقریب میں لے گیا، اور ایسا ہی اور بھی بہت کچھ۔ یہ سب کچھ درست ہے لیکن ایسا کیوں ہوا؟

شادی کی ان دونوں کوششوں کے پس پشت کارفرما میرا بنیادی خیال خاصا مناسب تھا یعنی اپنا گھر بنانا، زندگی میں خود مختار ہونا۔ ایسا خیال جو آپ کے لیے بھی قابل قبول تھا لیکن یہ سارا معاملہ حقیقت میں بچوں کے ایک کھیل کی طرح تھا جس میں ایک بچہ دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دباتا اور پکارتا ہے۔ ''اوہ، بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ، تم کیوں نہیں بھاگتے؟'' ہمارے معاملے میں یہ صورت حال اس وجہ سے پیچیدہ ہوگئی کہ آپ نے ہمیشہ خلوص دل سے چاہا کہ ''بھاگ جاؤ'' لیکن ہمیشہ ان جانے بوجھے مجھے پکڑے یا پھر اپنی شخصیت کے سحر تلے مجھے دبائے رکھا۔

بے شک دونوں لڑکیوں کا انتخاب اتفاقی طور پر کیا گیا تھا۔ لیکن غیر معمولی طور پر بہترین تھا۔ پھر سے آپ کی مکمل غلط فہمی کی صورت کہ آپ کو یقین تھا کہ مجھ جیسا ڈرپوک، ہچکچانے والا اور کم اعتماد انسان پلک جھپکتے میں صرف کسی لڑکی کے کُرتے کو پسند کر کے شادی کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ دونوں شادیاں عمومی فہم کی شادیاں ہوتیں، یعنی اگر ان کا مطلب یہ ہوتا کہ دن اور رات میں سالوں کے وقفے میں پہلی مرتبہ، اور مہینوں میں دوسری مرتبہ میری تمام قوت خیال اس منصوبے کی نوک پلک سنوارنے پر مرکوز تھی۔

ان میں سے کسی لڑکی نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ میں ہی ان کی توقعات پر پورا نہیں اُترا۔ آج بھی ان کے بارے میں میری رائے بالکل وہی ہے جو اس وقت تھی، جب میں ان سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

یہ بھی درست نہیں ہے کہ شادی کی دوسری کوشش میں میں نے پہلی کوشش کے تجربے کو یہ کہہ کر پس پشت ڈال دیا کہ میں درشت اور غیر محتاط تھا۔ دونوں معاملات قطعی مختلف تھے۔ اصل میں پہلے تجربے میں دوسرے تجربے کے لیے ایک امید موجود تھی۔ جب کہ دوسرا تجربہ کہیں زیادہ امید افزا تھا۔ میں اس کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔

تو پھر میں نے شادی کیوں نہیں کی؟ کچھ ویسی ہی خاص مشکلات حائل تھیں جیسی ایسے معاملات میں درپیش ہوسکتی ہیں۔ لیکن زندگی ان مشکلات پر قابو پانے ہی پر مشتمل ہے۔ بنیادی رکاوٹ جو انفرادی معاملات میں مختلف ہوتی ہے، یہ ہے کہ میں ذہنی طور پر شادی کے بالکل اہل نہیں ہوں۔ اس کا ایک بین ثبوت یہ تھا کہ جب سے میں نے شادی کا فیصلہ کیا تھا، میں صحیح معنوں میں سو نہیں سکا تھا۔ میرا سر رات دن مسلسل دکھتا۔ میری زندگی ایسی تھی کہ اسے زندگی کہنا دشوار تھا۔ میں مایوسی سے کپکپاتا۔ لیکن یہ الجھاؤ میرے شادی نہ کرنے کے آخری فیصلے کا سبب نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ میری تن آسانی اور خیال پرستی کے پیش نظر ان گنت پریشانیاں اس معاملے میں شامل تھیں۔ لیکن وہ فیصلہ کن نہیں تھیں۔ وہ کیڑوں کی طرح لاش کو نگلنے کا کام کرتی تھیں۔ فیصلہ کن حملہ کہیں اور سے ہوا۔ یہ میرے اضطراب، نزاری اور خود ملامتی کا عمومی دباؤ تھا۔

میں اس نقطے کو کچھ وضاحت سے بیان کرنا چاہوں گا۔ یہاں شادی کی کوشش میں آپ سے تعلق کے حوالے سے دو بظاہر متضاد عوامل اس شدت سے باہم یک جا ہوئے کہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ شادی یقیناً خود مختاری اور آزادی کی شدید ترین صورت ہے۔ میرا اپنا ایک خاندان ہوگا جو میری رائے میں کسی بھی شخص کی ایک اعلیٰ ترین کامیابی ہوسکتی ہے اور یہ آپ کی بھی اعلیٰ ترین کامیابی تھی۔ میں آپ کا ہم پلہ ہو جاؤں گا، تمام نیا اور پرانا احساس ندامت اور آپ کا آمرانہ مزاج قصہ پارینہ بن جائے۔ یہ بالکل جنوں پریوں کی کہانی کی طرح ہوگا لیکن ظاہر ہے اس میں بھی کچھ قابل اعتراض پہلو بھی موجود ہے۔ یہ بہت بڑی تبدیلی ہے، اتنی بڑی کہ ممکن نہیں ہوسکتی۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ایک شخص کہیں قید ہو اور وہ نہ صرف قید سے فرار ہونے کی خواہش رکھتا ہو قابل حصول بھی ہو بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہ اس قید کو خوشگوار جگہ بنانے

کی خاطر اس کی تعمیر نو کا بھی ارادہ رکھے۔ اگر وہ فرار ہوتا ہے تو وہ اس کی تعمیر نو نہیں کر سکے گا اور اگر وہ اس کی تعمیر نو کرتا ہے تو فرار نہیں ہو پائے گا۔ اگر میں آپ سے اپنے مخصوص غیر آسودہ تعلق کے تناظر میں خودمختار ہونے کی خواہش کرتا ہوں تو مجھے کچھ ایسا کرنا پڑے گا جس کا آپ سے یکسر کوئی تعلق نہ ہو۔ اگرچہ شادی ایک بہترین تدبیر ہے اور انتہائی قابل احترام خودمختاری فراہم کر سکتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ مجھے آپ سے مزید قریب کر دیتی ہے۔ اس عجیب صورت حال سے چھٹکارا پانے کے عمل میں جنون کا دخل ہے اور ہر کوشش کی سزا اس جنون میں اضافے کی صورت میں ہوتی ہے۔

درحقیقت آپ سے میرے اسی گہرے تعلق نے ایک حد تک مجھے شادی کی جانب راغب کیا۔ میں اس برابری کو تصور میں لاتا جو تب میرے اور آپ کے درمیان پیدا ہو سکتی تھی اور جس برابری کو آپ برابری کی کسی بھی دوسری نوعیت کی نسبت زیادہ بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ میرے لیے انتہائی دلکش صورت کہ تب میں ایک آزاد، شکرگزار، احساس گناہ سے پاک، باشعور بیٹا بن سکتا تھا اور آپ ایک منکسر المزاج، متحمل، ہمدرد، شفیق باپ ہو سکتے تھے۔ لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ جو کچھ ہو چکا تھا، اسے ایسی صورت دی جاتی کہ جیسے وہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں خود کو منظر سے ہٹا دینا پڑتا۔

لیکن ہم جیسے کہ ہم تھے، تو اس صورت میں شادی میرے لیے ایک بندش قرار پاتی کیوں کہ یہ تو آپ کا دائرہ تھا۔ کبھی کبھار میں تصور میں دنیا کے نقشے کو اپنے سامنے پھیلا ہوا دیکھتا جس پر آپ کی ذات ایک وتری سمت میں دونوں سروں تک چھائی ہوئی ہے۔ تب میں محسوس کرتا کہ صرف انھی خطوں میں جا کر رہا جا سکتا تھا جن پر یا تو آپ کی ذات کا سایہ نہیں یا پھر وہ آپ کی پہنچ سے باہر ہوں۔ اس خیال کے تناظر میں آپ کی شخصیت کا پھیلاؤ ملاحظہ کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے خطے نہ ہی بہت زیادہ ہیں اور نہ ہی بہت آرام دہ۔ جب کہ شادی کا منطقہ ان میں شامل نہیں ہے۔ اس گہرے موازنے کی بنیاد پر ثابت ہوتا ہے کہ میرا اوقعتاً یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نے اپنے رویئے سے مجھے شادی سے بیزار کیا جیسے آپ نے مجھے اپنے کاروبار سے دور کیا بلکہ اس کے برعکس اس میں بہت دور مماثلت موجود تھی۔ آپ کی شادی میرے لیے کئی حوالوں سے ایک مثالی شادی تھی۔ ایک مثال استقلال کی، ایک دوسرے کی مدد، بچوں کی کثرت، اور حتی کہ جب بچے بڑے ہو گئے اور انھوں نے گھر کے امن کو تباہ کر دیا تو پھر بھی آپ کا

ازدواجی تعلق خوشگوار رہا۔ شاید آپ کی مثالی شادی ہی، شادی سے متعلق میرے تمام اعلیٰ تصورات کا ماخذ تھی۔ شادی کی خواہش کئی دوسری وجوہات کی بنا پر کمزور تھی۔ یہ عوامل آپ کے اپنے بچوں سے تعلق میں موجود تھے، جن کے بارے میں ہی یہ سارا خط ہے۔

ایک عام تصور یہ ہے کہ شادی کا خوف عموماً انسان کے اس خوف سے پیدا ہوتا ہے کہ شاید اس کے بچے کبھی اس سے ویسی ہی بدسلوکی کریں گے جیسی اس نے کبھی اپنے والدین کے ساتھ کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں میرے معاملے میں اس عمومی تصور کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے کیوں کہ میرا احساس گناہ بنیادی طور پر آپ کی ذات سے ہی وابستہ ہے اور یہ اس کے اسی انوکھے پن پر اعتقاد سے پُر ہے جس کے مطابق اس کو دہرانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ بے شک انوکھے پن کا یہ احساس ہی اس کی اذیت دہ نوعیت کا لازمی حصہ ہے۔ بہر طور مجھے یہ کہنا چاہئے کہ میرے لیے مجھ جیسا کم گو، غم زدہ، خشک مزاج، اور ترش رو بیٹا ناقابل برداشت ہوگا۔ میں کہنا چاہوں گا کہ اگر کوئی دوسری صورت ممکن نہ ہو تو میں اس سے دور بھاگ جاؤں گا، ہجرت کر جاؤں گا، جیسا کہ آپ نے میرے شادی کے فیصلے پر تہیہ کیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کا بھی میری شادی کی نااہلیت پر کچھ اثر ہوا۔

جو بات اس سارے معاملے میں کہیں زیادہ اہم ہے، وہ میرا داخلی اضطراب ہے۔ اسے یوں سمجھا جانا چاہئے: جیسا میں نے پہلے ہی یہ ذکر کیا، اپنی تحریر اور اس سے متعلق ہر دوسری شے میں میں نے خود مختاری کی کوششیں، فرار کی کئی کوششیں کیں، بہت کم کامیابی کے ساتھ۔ یہ کوششیں اس سے زیادہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ بات مجھ پر واضح ہے۔ تاہم یہ میرا فرض ہے بلکہ میری زندگی کا جوہر ہے کہ ان پر نگاہ رکھوں، کسی خطرے کو باقی نہ رہنے دوں، بلاشبہ ایسے کسی خطرے کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ان کو اپنی زد میں لے۔

شادی بھی میرے لیے ایک ایسے ہی خطرے کا امکان ہے، گو عظیم ترین مدد کا بھی۔ لیکن میرے لیے اتنا کافی ہے کہ یہ ایک خطرے کا امکان بھی ہے۔ کیا کروں گا، اگر یہ واقعی ایک خطرے کی صورت اختیار کر گئی؟ میں اس ناقابل قبول مگر ناقابل تردید احساس کے ساتھ کیسے ایک ازدواجی تعلق کو برقرار رکھے ہوئے جی سکوں گا کہ یہ خطرہ موجود ہے؟ اس خطرے کے مدمقابل ہوسکتا ہے کہ میں بے یقینی کا شکار ہو جاؤں، لیکن آخری نتیجہ یقینی ہے۔ ہاتھ میں بیٹھا ایک پرندہ جھاڑیوں میں بیٹھے دو پرندوں سے بہتر والی

مثال کا یہاں اطلاق دور از کار ہے۔ میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ سامنے جھاڑیوں میں البتہ سب کچھ ہے۔ چوں کہ فیصلہ میدان جنگ کی صورت حال اور زندگی کی انتہائی ضروریات کی مناسبت سے ہونا ہے، لہٰذا میں اول الذکر متبادل کو ترجیح دینا چاہیے۔ مجھے اپنے پیشے کے چناؤ میں بھی ایسا ہی ایک انتخاب کرنا پڑا۔

شادی میں انتہائی اہم رکاوٹ یہ مسترد نہ کیا جاسکنے والا خیال ہے کہ خاندان کو چلانے اور خاص کر اس کی رہنمائی کے لیے جو شے نہایت ضروری ہے، یہ وہی ہے جسے میں نے آپ کی ذات میں پایا اور بلاشبہ ہر شے آپ میں یکجا ہوگئیں، اچھی بری دونوں، جیسے یہ قدرتی انداز میں آپ میں اکٹھی ہوگئی، مضبوطی، اور دوسروں کی استہزا اسرائی، صحت مندی اور مخصوص بے اعتدالی، وقار اور شخصی ادھورا پن، خود اعتمادی اور ہر دوسرے شخص سے غیر مطمئن ہونا، دنیاوی دانش اور آمریت، انسانی فطرت کا فہم اور زیادہ تر لوگوں پر بے اعتباری۔ البتہ چند اعلیٰ اوصاف بھی کسی خامی کے بغیر جیسے محنت، قوت برداشت، حاضر دماغی اور بے خوفی۔ اس کے مقابلے میں مجھ میں سرے سے کوئی خوبی نہیں تھی یا ان میں سے بہت کم خوبیاں تھیں۔ اور کیا اس بنیاد پر میں شادی کا جوا کھیل سکتا تھا؟ جب کہ میں یہ دیکھتا تھا کہ آپ جیسے شخص کو بھی گھریلو معاملات میں شدید مغز کھپائی کرنا پڑتی تھی اور جہاں تک بچوں کا تعلق تھا، آپ اپنی کوشش میں ناکام بھی تھے۔

بے شک میں نے یہ سوال اپنے آپ سے اتنے بہت سے الفاظ میں نہیں پوچھا اور نہ ہی اتنے بہت سے الفاظ میں اس کا جواب دیا، وگرنہ میں روزمرہ کے خیالات کی زد میں آجاتا اور یقیناً ایسے افراد کی مثال بھی میرے سامنے آتی جو آپ سے بہت مختلف تھے (ایسے ہی ایک قریبی نام لینے کے لیے کہ جو آپ سے مختلف ہو، میرے ذہن میں انکل رچرڈ کا نام آتا ہے۔) لیکن انھوں نے شادی کی اور پھر اس میں ناکام بھی نہیں ہوئے۔ جو بجائے خود بہت اہم بات تھی اور شاید میری حد تک کافی ہوتی۔ لیکن میں نے یہ سوال نہیں پوچھا۔ بچپن سے اسے پالتا رہا۔ میں نے اپنی پرکھ کی نہ صرف شادی کے معاملے میں، بلکہ ہر معمولی سے معمولی معاملے میں بھی۔ یعنی ہر معمولی معاملے میں، جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ جس میں آپ نے اپنی مثال اور اپنے انداز تربیت سے مجھے میری نااہلی پر قائل کرنے کی کوشش کی، اور جو ہر معمولی معاملے میں درست ثابت ہوا اور آپ کا نقطہ نظر مزید مستحکم ہوا تو قدرتی طور پر بڑے معاملات میں بھی یہ حیرت انگیز طور پر درست قرار پایا جیسے میری شادی کا معاملہ۔

شادی کی کوششوں کے وقت تک میں ایسے تاجر کی طرح پروان چڑھا جو روز کے روز کما تا اور پریشانیوں اور خدشات کے ساتھ اسے روز کے روز خرچ کر دیتا ہے لیکن اس کا کوئی معقول حساب نہیں رکھتا۔ وہ معمولی منافع کماتا ہے جسے وہ پالتا پوستا رہتا ہے اور اس کے کم ہونے کی وجہ سے اسے اپنے تخیل میں مبالغے کی حد تک بڑھا کر دیکھتا ہے۔ جب کہ حقیقتاً وہ روزانہ نقصان کا شکار ہوتا ہے۔ ہر بات کا اندراج ہوتا ہے لیکن ان میں توازن قائم نہیں ہوتا۔ اب توازن کی ضرورت پیش آتی ہے جو میری شادی کی کوشش کی صورت میں ہے تو ان بڑی رقموں کے ساتھ جنھیں حساب میں شامل کرنا ضروری ہے، نتیجہ کچھ یوں ہے کہ جیسے کبھی معمولی سا بھی فائدہ نہ ہوا ہو، بس ہر شے ایک بڑی ذمہ داری ہی ہو۔ کیا ایسے میں شادی کی جاسکتی ہے پاگل ہوئے بغیر؟

یہ میری اس زندگی کی تصویر ہے جو آپ کے ساتھ اب تک گزری اور یہ وہ امکانات ہیں جو مستقبل کے حوالے سے اس میں پنہاں ہیں۔ اگر آپ ان وجوہات پر غور کریں جو میں نے آپ سے اپنے خوف سے متعلق پیش کی ہیں، تو آپ کا جواب یوں ہو سکتا ہے "تم نے کہا کہ میں ہمارے درمیان تعلق کی تمام خامیوں کو تم سے منسوب کر کے صورت حال کو اپنے لیے ساز گار بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تمھاری ظاہری کوشش کے باوجود تم صورت حال کو اپنے لیے مشکل نہیں بناتے بلکہ زیادہ سود مند بنا لیتے ہو۔ اول تم نے بھی تمام ذمہ داری اور احساس گناہ سے انکار کیا۔ اس معاملے میں ہم دونوں کا طریقہ کار ایک ہے۔ لیکن جہاں میں نے تمام تر احساس گناہ کو ایسی بے تکلفی کے انداز میں تمھارے سر تھوپنا چاہا جیسا میں سمجھتا بھی تھا۔ تم بھی بیک وقت "بہت چالاک" اور 'بہت شفیق' بننا چاہتے اور مجھے تمام احساس گناہ سے آزاد کرنا چاہتے ہو۔ بے شک دوسرے معاملے میں تم اپنی کوششوں میں کامیاب دکھائی دیتے ہو (اور اس سے زیادہ کی تمھیں خواہش بھی نہیں ہے۔) لیکن کردار اور فطرت اور باہمی نفرت سے متعلق تمام تحریری گھمن گھیری کے باوجود پوشیدہ مفہوم یہی بنتا ہے کہ اصل میں میں جارحیت پسند ہوں۔ جب کہ تم نے جو کچھ کیا، وہ محض تحفظ ذات کی کوشش تھی۔ اب تک تم اپنی منافقت کے ذریعے اب تک بہت کچھ حاصل کر چکے ہوتے کیوں کہ تم تین باتوں کو ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہو: اول یہ کہ تم بے قصور ہو۔ دوم یہ کہ میں اصل قصور وار ہوں۔ اور سوم یہ کہ صرف اپنی بلند حوصلگی کے باعث تم نہ صرف مجھے معاف کرنے پر آمادہ ہو بلکہ (یہ دونوں ہی کم و بیش) ثابت کرنے پر بھی تیار ہو اور خواہش رکھتے ہو کہ یہ مان لو کہ حقیقت کے برعکس، میں بھی بے قصور

ہوں۔شاید کوئی سوچ کہ تمھیں اسی پر بس کر دینا چاہئے لیکن تمہارے لیے اتنا کافی نہیں ہے۔تم نے اپنے دماغ میں یہ بات ڈال لی ہے کہ تم مجھ سے دور رہو گے۔

میں مانتا ہوں کہ ہمارے درمیان ہمیشہ جنگ جاری رہی لیکن جنگیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ بہادروں کی جنگ جس میں خود مختار حلیف ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوتے ہیں۔ ہر حریف اکیلا ہی لڑتا ہے، اکیلا ہی ہارتا ہے اور اکیلا ہی جیتتا ہے۔لیکن دوسری قسم کی جنگ کیڑوں مکوڑوں کی ہے جو نہ صرف ڈنک مارتے ہیں بلکہ سب سے بڑھ کر اپنی زندگی کی بقاء کے لیے دوسرے کا خون چوس لیتے ہیں۔ایسا حقیقی پیشہ ور فوجی ہوتا ہے اور ایسے ہی تم بھی ہو۔تم زندگی کے لیے غیر موافق ہو۔ پریشانیوں اور خود ملامتیوں کے بغیر زندگی کو اپنے لیے آرام دہ بنانے کے لیے تم ثابت کرتے ہو کہ میں نے زندگی کے لیے تمھاری موافقت کو تم سے چھین لیا اور اسے خود سے منسوب کر لیا۔تم اس کی پریشانی ہی کیا ہے کہ تم زندگی کے لیے غیر موافق ہو۔ یہ ذمہ داری تو میری ہے۔تم سکون کے ساتھ لیٹو اور تمام عمر میرے سر پر چڑھ کر جسمانی اور ذہنی طور پر خود کو گھسیٹتے رہو۔مثال کے طور پر حال ہی میں تم نے جو شادی کا فیصلہ کیا تھا، تو تم چاہتے تھے اور اس بات کا اعتراف تم نے اس خط میں بھی کیا ہے کہ تم حقیقتاً شادی کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔لیکن انکار کی جرأت نہ ہونے کی وجہ سے تم چاہتے تھے کہ میں شادی نہ کرنے میں تمھاری مدد کروں، شادی کو تم پر ممنوع قرار دے کر، تا کہ شادی کے نہ ہونے سے جو بدنامی ہو، تو وہ میری ہی ہو۔ میں نے ایسا کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا۔پہلی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں دوسرے کسی بھی معاملے کی طرح تمھاری خوشیوں میں حائل ہونے کی خواہش نہیں کی اور دوم یہ کہ میں نے کبھی اپنے کسی بچے سے اپنی ایسی تحقیر کا نہیں سوچا۔لیکن کیا اپنے جذبات پر قابو پا کر شادی کے معاملے کو یکسر تمھاری صوابدید پر چھوڑ دینا میرے کچھ کام آیا؟ قطعاً نہیں۔تمھاری شادی سے متعلق میری ناپسندیدگی تمھیں اس فیصلے سے روک نہیں سکی بلکہ اس کے برعکس یہ تمھارے لیے اس لڑکی سے شادی کرنے میں ایک اضافی محرک ثابت ہوئی کیوں کہ جیسا تم نے خود کہا، اس طور تمھاری ''فرار کی کوشش'' کامیاب ہو جاتی۔اور شادی کے لیے میری رضامندی بھی تمھیں مجھ کو ملامت کرنے سے باز نہیں رکھ سکی۔ کیوں کہ تم نے یہ ثابت کیا کہ شادی نہ کرنے کے تمھارے فیصلے کا قصور ہر حالت میں میرا ہی بنتا ہے۔ بنیادی طور پر اس معاملے میں دوسرے ہر معاملے کی طرح تم نے مجھ پر یہی ثابت کیا کہ تمھارے لیے میری ہر ملامت درست تھی، اور یہ کہ خاص طور پر ایک باجواز الزام کا ذکر ہی نہیں کیا گیا یعنی غیر اخلاص مندی، کمزوری اور دوسروں پر انحصار کرنے کا الزام۔اگر

میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں تو تم اس وقت بھی اپنے اس خط کے ذریعے مجھے شکار کرنے کی ہی کوشش کر رہے ہو۔"

میں ان سب کے جواب میں اتنا ہی کہوں گا کہ بہر حال یہ سارا جواب الجواب مسودہ جو کسی حد تک آپ کے خلاف ایک بیان قرار دیا جا سکتا ہے، آپ نے نہیں لکھا بلکہ میں نے لکھا ہے۔ نہ ہی دوسروں سے متعلق آپ کی بے اعتباری اتنی شدید ہے جتنی میری ذات پر میری اپنی بے اعتباری، جو آپ نے مجھ میں پروان چڑھائی۔ میں اس جواب دعویٰ کے جواز سے انکار نہیں کرتا جو ہمارے باہمی تعلق کی کرداری توضیح کی نئی صورتیں سامنے لاتا ہے۔ قدرتی طور پر تمام شواہد حقیقت میں اس انداز میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نہیں ہیں جیسے انھیں خط میں دکھایا گیا ہے۔ زندگی ایک چینی معمہ سے کہیں زیادہ الجھی ہوئی شے ہے۔ لیکن اس جواب دعویٰ کے نتیجے میں ہونے والی اصلاح سے، جسے میں تفصیل سے بیان کر سکتا ہوں اور نہ میں ایسا کروں گا، میری ذاتی رائے میں اتنا کچھ ضرور برآمد ہوا ہے جس سے سچ اپنے تمام امکانات کے ساتھ سامنے آیا کہ جس سے ہم دونوں کو کچھ یقین دہانی حاصل ہوئی اور جس سے ہماری زندگی اور موت ہم پر سہل ہو جائے گی۔

آپ کا فرانز

کایا کلپ

رات بھر الجھے ہوئے خوابوں میں مبتلا رہنے کے بعد گریگر سیمسہ ایک صبح بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ اپنے بستر میں وہ ایک دیو ہیکل بد ہیئت کیڑے کی جون دھار چکا تھا۔ وہ اپنی لوہے جیسی سخت پشت کے بل لیٹا تھا اور سر کچھ بلند کرنے پر اس نے دیکھا کہ اس کا گنبد کی مانند ابھرا ہوا بھورے رنگ کا پیٹ

غیر لچک دار محرابی دھاریاں میں تقسیم ہے۔ اس بلندی سے اس کے جسم پر پڑا کمبل جو نیچے سرک جانے کے قریب تھا، ایک طرف نہایت بے ترتیبی سے دھرا تھا۔ اس کی متعدد ٹانگیں، جو باقی جسم کے مقابلے میں افسوس ناک حد تک پتلی تھیں، بے چارگی کے ساتھ ان کی آنکھوں کے سامنے فضا میں لہرا رہی تھیں۔

''میرے ساتھ ہوا کیا؟'' اس نے سوچا۔

یہ کوئی خواب نہیں تھا۔ اس کا کمرہ، جو باقاعدہ طور پر ایک انسان کا کمرہ تھا گو کچھ چھوٹا ضرور تھا، چار مانوس دیواروں میں خاموشی سے گھرا ہوا تھا۔ میز کے اوپر، جس پر کپڑوں کے چند کھلے نمونے بکھرے ہوئے تھے، کہ سیمسہ ایک سفری تاجر تھا، دیوار پر ٹنگی ایک تصویر تھی جسے اس نے کچھ عرصہ قبل ایک باتصویر میگزین سے اتارا تھا اور ایک دلکش سنہری فریم میں لگایا تھا۔ یہ سمور کی ٹوپی اور مفلر میں ملبوس ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ وہ تن کر بیٹھی تھی، دیکھنے والے کی طرف سمور کا ٹھوس دست پوش بلند کیے ہوئے جس میں اس کی تمام کلائی چھپ گئی تھی۔

گریگر سیمسہ کی نگاہ کھڑکی کی جانب مڑی۔ ناگوار موسم نے کہ بارش کی بوندیں کھڑکی کی دھاتی دہلیز پر گرتے ہوئے آواز پیدا کر رہی تھیں، اسے اداس کر دیا۔

''مجھے کچھ دیر اور نیند لینی چاہئے تاکہ اس واہیات واقعہ کو بھول سکوں۔'' اس نے سوچا۔

لیکن ایسا بالکل ممکن نہیں تھا کیوں کہ وہ دائیں کروٹ لیٹنے کا عادی تھا لیکن موجودہ صورت میں وہ دائیں جانب مڑنے سے قاصر تھا۔ وہ خود کو دائیں جانب موڑنے کی جتنی کوشش کرتا، گول پشت اس کو لڑھکا کر واپس اس کی سابقہ حالت میں لے آتی۔ اس نے کوئی سو مرتبہ کوشش کی ہوگی، آنکھیں بند کیے تاکہ اپنی لہراتی ٹانگوں کو نہ دیکھ سکے۔ پھر اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا کیوں کہ اسے اپنی کمر میں ایک طرف معمولی درد محسوس ہوا جیسا اسے زندگی میں پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا۔

''میرے خدایا'' اس نے سوچا ''میرا کام کتنا تھکا دینے والا ہے۔ روز روز سڑکوں پر دھکے۔ چیزیں بیچنے کی اذیت ہیڈ آفس میں ہونے والے اصلی کام سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہی نہیں، مجھے بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے، سفر کی تکلیفیں، ٹرینوں کے جڑے ہوئے ہونے کی پریشانی، بے قاعدہ بری غذا، عارضی اور مسلسل تبدیل ہونے والے انسانی تعلقات جو کبھی گہرے جذبے میں نہیں ڈھلتے۔ لعنت ہو، اس سب کچھ پر۔''

اسے اپنے پیٹ کے اوپر کھجلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے آہستگی سے خود کو سرکاتے ہوئے بستر کے کنارے تک کیا تا کہ وہ اپنے سر کو آسانی سے اوپر اٹھا سکے۔ پھر کھجلی کے مقام کو دیکھا جو ننھے سفید دھبوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا کیا کرے، اور کھجلی کے مقام کو ٹانگ سے چھونے کی کوشش کی۔ لیکن فوراً ہی اسے واپس کھینچ لیا۔ کیوں کہ چھونے سے اسے اپنے جسم میں یخ کپکپی محسوس ہوئی۔

وہ سرک کر پھر سے اپنی سابقہ حالت میں آ گیا۔ ''صبح جلد بیدار ہونے پر اپنا آپ کتنا احمق لگتا ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''انسان کو پوری نیند لینی چاہئے۔ دوسرے سفری تاجر نازک عورتوں کی طرح رہتے ہیں۔ مثلاً میں جب صبح اپنے ہوٹل واپس آتا ہوں تا کہ ملنے والے آرڈرز کی فہرست تیار کروں تو یہ لوگ اطمینان سے بیٹھے ناشتہ کر رہے ہوتے ہیں۔ میں بھی اگر اپنے باس کے ساتھ ایسا ہی کروں تو اسی وقت مجھے نوکری سے نکال باہر کیا جائے۔ پھر بھی کون جانتا ہے کہ یہ رویہ واقعی میرے لیے اچھا ہے؟

اگر والدین کی فکر نہ ہو تو بہت پہلے استعفیٰ دے چکا ہوتا۔ میں اپنے باس کے دفتر میں جاتا اور اس سے وہ سب کچھ کہہ دیتا جو میرے دل میں ہے۔ وہ ضرور میری حرکت پر تڑپ کر میز سے نیچے گر جاتا۔ کتنی عجیب بات ہے، میز پر اونچی جگہ بیٹھنا اور وہاں سے نیچے دیکھتے ہوئے ملازموں سے بات کرنا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اسے ضعف سماعت کا مسئلہ بھی ہے، اس لیے ملازموں کو اس کے قریب ہو کر بات کرنی پڑتی ہے۔ خیر میں نے ابھی امید کا دامن چھوڑا نہیں۔ ایک بار اپنے والدین کا قرض کی رقم چکا دوں، جس میں مزید پانچ سے چھ سال لگیں گے، تو ضرور ایسا ہی کروں گا۔ پھر میں ایک آزاد شخص ہوں گا۔ بہر حال فی الوقت مجھے بستر سے اٹھنا چاہیے تا کہ پانچ بجے کی ٹرین پکڑ سکوں۔''

گریگر نے درازوں والی الماری کے قریب ٹک ٹک بجتی الارم گھڑی کی طرف دیکھا ''اوہ خدایا۔'' اس نے سوچا۔

چھ بج کر تیس منٹ ہو چکے تھے۔ سوئیاں خاموشی سے چکر کاٹ رہی تھیں۔ بلکہ آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ وقت ہو چکا تھا اور سوئیاں پونے سات کا وقت دکھا رہی تھیں۔ کیا ایسا تو نہیں کہ الارم بجا ہی نہ ہو۔ بستر پر لیٹے ہوئے بھی صاف دکھائی دیتا تھا کہ چار بجے کا الارم لگا تھا۔ ضرور الارم بجا ہوگا۔ ہاں، لیکن کیا ممکن تھا کہ الارم کے شور میں، جو فرنیچر میں ارتعاش پیدا کر دیتا تھا، پرسکون سویا جا سکے۔

یہ تو سچ تھا کہ وہ پرسکون نیند نہیں سویا تھا۔ لیکن یہ بھی ظاہر تھا کہ اس کی نیند بہت گہری رہی ہوگی۔ تو اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ اگلی ٹرین سات بجے چھوٹے گی۔ اس پر سوار ہونے کے لیے ضروری تھا کہ وہ جنونی عجلت میں تیار ہو کر سٹیشن پہنچ جائے۔ ابھی تو کپڑوں کے کھلے نمونوں کو بھی باندھنا باقی تھا۔ وہ خود کو ہشاس بشاش محسوس نہیں کرتا تھا۔ بالغرض اگر وہ عجلت میں اگلی ٹرین پر سوار ہو جائے پھر بھی وہ اپنے باس کی ڈانٹ پھٹکار سے بچ نہیں سکتا۔ اس کی فرم کا چوکیدار صبح سٹیشن پر پانچ بجے تک اس کا انتظار کرنے کے بعد واپس دفتر جا چکا اور کب کی اس کی غیر حاضری کی رپورٹ دے چکا ہوگا۔ وہ باس کا چمچہ ہے۔ نہ سر میں عقل، نہ کمر میں ہڈی۔ اگر وہ اپنی بیماری کا بہانہ کرے تو۔۔؟ لیکن یہ بات بہت زیادہ پریشان کن اور مشکوک ہوگی کیوں کہ اپنی ملازمت کے پچھلے پانچ سالوں میں گریگر کبھی بیمار نہیں پڑا۔ اس کا باس فوراً ہیلتھ انشورنس کمپنی کے ڈاکٹر کو لے کر اس کے گھر آن دھمکے گا اور اس کی کاہلی پر اس کے والدین کو ملامت کرے گا اور ان کی ہر حجت کے جواب میں انشورنس کمپنی کے ڈاکٹر کو آگے کرے گا۔ اس کی نظر میں ہر شخص مکمل تندرست مگر ایک نمبر کا کام چور ہے۔ لیکن کیا اس بار واقعی ڈاکٹر کی تشخیص مکمل غلط ہوگی؟ ایک طویل نیند کے بعد پیدا ہونے والی غیر معمولی خماری کے باوجود، حقیقت یہ تھی کہ گریگر سیمسہ خود کو تندرست محسوس کر رہا اور اسے بھوک لگی تھی۔

وہ بہت عجلت میں یہ سب باتیں سوچ رہا تھا، کوئی فیصلہ کیے بغیر کہ بستر سے اٹھا جائے۔ الارم کھڑی میں سوئیاں پونے سات کا وقت بتا رہی تھیں، کہ اس کے بستر کے عقب میں دروازے پر محتاط انداز میں دستک ہوئی۔

''گریگر'' آواز آئی۔ یہ اس کی ماں تھی۔ ''پونے سات ہو گئے۔ تمھیں دفتر نہیں جانا کیا۔'' کیسی نرم آواز۔ گریگر نے جواب دیا تو اپنی آواز سن کر ششدر رہ گیا۔ یہ بلاشبہ اور واضح طور پر اس کی پرانی آواز ہی تھی لیکن اس میں جیسے اندر سے دبی ہوئی، دردناک چیخ بھی شامل تھی جس سے الفاظ ابتدائی طور پر واضح ہوتے لیکن پھر گونج پیدا ہوتی اور الفاظ مسخ ہو جاتے کہ سننے والا انھیں سمجھنے سے قاصر ہو جاتا۔ گریگر ایک تفصیلی جواب دینا چاہتا اور ہر بات کی وضاحت کرنا چاہتا تھا لیکن ایسی صورت حال میں اس نے بس اتنا کہنے پر اکتفا کیا، ''ہاں۔ ہاں، ماں اٹھنے ہی والا تھا۔ شکریہ۔''

ماں اور بیٹے کے بیچ حائل لکڑی کے دروازے نے گریگر کی آواز کی تبدیلی پر پردہ ڈال دیا۔ اسی

لیے ماں اس کے جواب سے مطمئن ہو کر واپس چلی گئی۔ اس مختصر گفتگو سے گھر کے تمام افراد پر واضح ہو گیا کہ گریگر سیمسہ خلاف معمول تا حال گھر پر موجود تھا جب کہ کمرے کے دوسرے دروازے پر اس کا باپ دستک دینے لگا تھا، نقاہت سے مگر گھونسوں کے ساتھ ''گریگر۔۔۔۔۔۔۔گریگر'' اس کے باپ نے اونچی آواز میں کہا ''کیا کوئی پریشانی ہے؟'' پھر کچھ توقف کے بعد دوبارہ اپنی گہری آواز میں ''گریگر۔۔۔گریگر'' کی صدا کرنے لگا۔ کمرے کے تیسرے دروازے پر اس کی بہن نے دھیرے سے دستک دی۔ ''گریگر۔ کیا تم ٹھیک ہو۔ تمھیں کسی شے کی ضرورت تو نہیں۔''

گریگر نے دونوں کو ایک ساتھ جواب دیا ''میں بس ابھی تیار ہو کر آتا ہوں۔'' اس نے انتہائی محتاط انداز میں کوشش کی اور الفاظ کے درمیان طویل وقفے دیے تاکہ آواز میں غیر معمولی فرق کو ختم کر سکے۔ اس کا باپ مطمئن ہو کر ناشتہ کرنے چلا گیا لیکن اس کی بہن نے پھر سرگوشی کی ''گریگر خدا کے لیے دروازہ کھولو'' گریگر کا دروازہ کھولنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس احتیاطی تدبیر پر اس نے خود کو شاباش دی، جو اس نے مسلسل سفر میں رہنے کے باعث اپنائی تھی کہ وہ سونے سے پہلے حتیٰ کہ اپنے گھر میں بھی کمرے کے تمام دروازوں اندر سے بند کر دیتا تھا۔

پہلے تو اس نے چاہا کہ وہ خاموشی سے بغیر پریشان ہوئے بستر سے اٹھے گا۔ لباس تبدیل کرے گا، سب سے بڑھ کر ناشتہ کرے گا اور پھر اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچے گا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ یوں بستر پر لیٹے ہوئے وہ محض سوچتے رہنے سے کسی معقول فیصلے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسے یاد تھا کہ اسے پہلے بھی بستر میں اکثر معمولی درد کا تجربہ ہوا تھا شاید ایک غیر مناسب انداز میں سوئے رہنے سے کہ جونہی وہ بستر سے اٹھا تو بالکل ہشاش بشاش تھا جیسے سارا درد خیالی تھا۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے اتاولا تھا کہ اس کی موجودہ تخیل بازیاں کیسے ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ یعنی یہ کہ اس کی آواز میں تبدیلی ٹھنڈ لگنے کی وجہ سے ہے جو سفری تاجروں کا معمول کا عارضہ ہے، جس کے بارے میں اسے ذرا بھی شبہ نہیں۔

خود کو کمبل کے بوجھ سے آزاد کرنا بہت آسان تھا۔ اس نے فقط اپنے جسم کو معمولی سا اوپر اٹھایا اور کمبل اپنے آپ ایک جانب گر گیا۔ لیکن اس عمل کو جاری رکھنا مشکل تھا خاص کر اس لیے کہ وہ غیر معمولی طور پر چوڑا تھا۔ اسے خود کو اٹھانے کے لیے ہاتھوں اور بازوؤں کی ضرورت تھی۔ ان کی بجائے اس کی بے شمار ننھی ٹانگیں تھیں جو ایک تسلسل کے ساتھ مختلف طرح سے ہوا میں جھول رہی تھیں اور اس کے علاوہ یہ

حرکت اس کے قابو سے باہر تھی۔ اگر وہ ان میں سے کسی ایک کو موڑنے کی کوشش کرتا تو کوئی دوسری مڑ جاتی اور اگر وہ اپنے اعضا کے ساتھ آخر کار ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس دوران میں باقی ٹانگیں جیسے ہر بندش سے آزاد ہو کر، غیر معمولی کرب ناک احتجاج کے طور پر ہوا میں تڑپنے لگتیں۔

"یوں بے کار بستر پر لیٹے رہنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا" گریگر نے خود سے کہا۔

سب سے پہلے اس نے اپنے جسم کے زیریں حصہ کو بستر سے نیچے اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن اس زیریں حصہ کو، جسے اس نے تاحال نہیں دیکھا تھا، اور جس کی نہ کوئی واضح تصویر ہی اس کے ذہن میں تھی، حرکت دینا بہت مشکل ثابت ہوا۔ اس نے آہستگی سے کوشش جاری رکھی۔ جب ایک طرح کی اضطرابی کیفیت میں اس نے آخر کار پوری قوت سے خود کو آگے دھکیلا اور بنا سوچے اس نے ایک غلط سمت کا تعین کیا تو شدت سے بستر کی پٹی سے جا ٹکرایا۔ شدید درد جو اس نے محسوس کیا، اس سے اندازہ ہوا کہ جسم کا زیریں حصہ شاید اس وقت سب سے حساس حصہ تھا۔

یوں اس نے اپنے جسم کے بالائی حصہ کو پہلے بستر سے اتارنے کی کوشش کی اور اپنے سر کو احتیاط سے بستر کی پٹی کی طرف موڑا۔ اس نے یہ کام آسانی سے کر لیا اور اپنے جسم کی چوڑائی اور وزن کے باوجود اس نے سر کی حرکت کے ساتھ خود کو موڑا۔ لیکن جونہی اس نے اپنا سر بستر سے باہر کھلی فضا میں بلند کیا، تو وہ پریشان ہوا کہ کیسے اسی انداز میں حرکت جاری رکھے کیوں کہ اگر وہ اس انداز میں حرکت کرتا ہوا بستر کے نیچے گر جائے تو پھر اس کے سر کو زخمی ہونے سے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا تھا۔ کسی بھی قیمت پر وہ بے ہوش ہو جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے بستر پر رہنے کو ترجیح دی۔

تاہم ایسی ہی کوشش کے بعد جب کہ وہ پھر سے لیٹ گیا، پہلے کی طرح آہ بھرتا ہوا اور ایک بار پھر اپنی چھوٹی ٹانگوں کو آپس میں لڑتے بھڑتے دیکھا، تو جیسے صورت حال پہلے سے بھی بدتر ہو گئی ہو، اور کوئی ایسی صورت دکھائی نہ دیتی ہو کہ اس فوری حرکت میں تنظیم اور ٹھہراؤ لایا جا سکے، اس نے پھر سے خود سے کہا کہ بستر پر یوں بے حرکت لیٹے رہنا سراسر حماقت ہوگی اور اس موقع پر اگر بستر سے نکلنے کی معمولی سی بھی امید موجود ہو تو اسے کسی بھی شے کی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ اسی لمحے وہ مسلسل خود کو یہ بات یاد دلاتا رہا کہ الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ کیے گئے فیصلوں سے پرسکون، بلکہ پرسکون ترین سوچ بہر حال بہتر ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنی نگاہوں کو کھڑکی کی طرف جما لیا کرتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے صبح کے

دھند لکے میں دل کو اجال دینے والی کیفیت کم تھی جس نے تنگ گلی کے پرلی جانب کے منظر کو بھی اپنی اوٹ میں کرلیا تھا۔

''سات بج چکے ہیں۔'' اس نے الارم گھڑی سے آنے والی آواز سن کر خود کو بتایا۔ ''سات بج گئے اور پھر بھی اتنی دھند۔'' اور پھر کچھ دیر وہ کمزور سانسیں لیتا ہوا خاموشی سے لیٹا رہا، جیسے وہ توقع کر رہا ہوں کہ اس مکمل سکوت سے نارمل اور قدرتی صورت حال پھر سے رونما ہو جائے گی۔

پھر اس نے خود سے کہا، ''اس سے پہلے کہ سوا سات بجیں، جیسے تیسے مجھے بستر سے باہر نکلنا ہی ہوگا۔ اور پھر تب تک میرے دفتر سے کوئی شخص مجھے پوچھتا ہوا ضرور یہاں آن پہنچے گا کیوں کہ دفتر سات بجے سے پہلے کھل جاتا ہے۔'' تب اس نے اپنے پورے جسم کو بستر پر لمبائی کے رخ پر ایک باقاعدہ تسلسل سے دائیں بائیں جھلانے کی کوشش کی۔ اگر وہ اس طرح خود کو بستر سے نیچے گر جانے دے تو اس عمل میں وہ چاہتا تھا کہ اپنے سر تیزی سے اوپر اٹھا لے گا جس سے چوٹ سے بچ سکتا تھا۔ اس کی پشت سخت معلوم ہوتی تھی اور قالین پر گرنے سے اس کو کوئی اثر نہیں ہونے کا۔ اس کی بڑی پریشانی اس اونچی دھمک سے متعلق تھی جو یوں گرنے سے پیدا ہوگی اور جو اندازہ ہے کہ دروازوں کے اس طرف اس کے گھر والوں کو چاہے خوف زدہ نہ کرے لیکن مزید تشویش میں مبتلا کر سکتی تھی۔ لیکن اسے یہ خطرہ مول لینا ہی ہوگا۔

گریگر اپنے جسم کو جھلاتا ہوا بستر کی پٹی سے آدھا باہر لے آیا تھا۔ یہ نیا طریقہ اسے ایک کوشش سے بڑھ کر دلچسپ مشغلہ معلوم ہوا۔ اسے مسلسل جھٹکوں سے خود کو جھلانا پڑتا۔ اسے اندازہ ہوا کہ اگر کوئی اس کی مدد کے لیے یہاں موجود ہوتا تو یہ سب کتنا آسان ہو جاتا۔ دو مضبوط انسان، اسے اپنے باپ اور نوکرانی کا خیال آیا تو یہ دونوں کافی ہوں گے۔ انھیں اسے بستر سے باہر نکالنے کے لیے اس کی محرابی پشت میں بازو ڈال کر اوپر اٹھانا اور پھر اس کے بوجھ کے ساتھ کچھ جھک اور پھر کچھ تحمل کا مظاہرہ کرنا ہوگا تا کہ وہ فرش پر گرنے کے عمل کو مکمل کر سکے۔ جہاں اسے امید تھی کہ اس کی ننھی ٹانگیں اپنا کام شروع کر دیں گی۔ اب اس حقیقت سے قطع نظر کہ تمام دروازے مقفل تھے، تو کیا اسے واقعی مدد کے لیے پکارنا چاہیے؟ اپنی تمام مایوسی کے باوجود وہ اس خیال پر اپنے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ کو نہ دبا سکا۔

اپنے جسم کے ساتھ دھینگا مشتی سے وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ مشکل سے اپنا توازن قائم رکھ سکے۔ جلد ہی اسے حتمی فیصلہ کرنا ہوگا کیوں کہ اگلے پانچ منٹ بعد سوا سات ہو جائیں گے۔

جبھی گھر کے صدر دروازے کی گھنٹی بجی۔

''ضرور دفتر سے کوئی ہوگا'' اس نے خود سے کہا اور ساکت ہوگیا جب کہ اس کی لاغر ٹانگیں زیادہ تیزی سے فضا میں مچلنے لگی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے ہر طرف سناٹا طاری رہا۔

''شاید کوئی بھی دروازہ نہیں کھولے گا'' اس نے ایک لغو اُمید کے ساتھ خود سے کہا۔ لیکن حسب معمول گھر کی ملازمہ اپنی بھاری قدموں والی چال کے ساتھ دروازے تک گئی۔ دروازہ کھلا۔ آنے والے کے اولین تعارفی الفاظ سے ہی گریگر جان گیا کہ وہ کون تھا، منیجر بذات خود آیا تھا۔ آخر گریگر ہی اکیلا کیوں ایسی فرم میں کام کرنے کی لعنت میں گرفتار تھا کہ جہاں معمولی کوتاہی بھی افسران کو بڑے شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیتی ہو۔ تو کیا سبھی ملازمین مجموعی طور پر بدمعاش تھے۔ کیا ان میں کوئی ایک بھی مخلص شخص نہیں تھا کہ اگر گریگر صبح کے چند گھنٹے دفتری کام کے لیے استعمال کرنے میں ناکام ہوا تھا تو وہ شخص ضمیر کی ملامت سے ابنارمل ہو جائے گا اور واقعتاً ایسا حالت میں نہیں رہے گا کہ بستر سے اٹھ سکے۔ کیا اتنا واقعی کافی نہیں تھا کہ ایک زیر تربیت شخص تفتیش کرے، جب کہ یہ سوال جواب عمومی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ کیا منیجر کو خود آنا چاہئے اور اس کے معصوم خاندان کو پریشان کرنے کے لیے یہ بتانا ضروری تھا کہ اس مشکوک معاملے کی تحقیق منیجر جیسا زیرک افسر ہی کر سکتا تھا؟ اور اس سے بڑھ کر اس پرجوش کیفیت کے نتیجے کے طور پر جو گریگر کے ذہن میں آنے والے خیال کی وجہ سے تھی نہ کہ کسی حقیقی فیصلے کی وجہ سے، کہ اس نے پوری قوت سے خود کو جھٹکا دے کر بستر سے نیچے گرا لیا۔ زوردار بھد کی آواز پیدا ہوئی لیکن کوئی دھماکہ نہیں ہوا۔ قالین نے گرنے کی دھمک کو جذب کر لیا اور مزید یہ کہ اس کی کمر اس کے اندازے سے زیادہ لچک دار ثابت ہوئی۔ اسی وجہ سے یہ بھاری آواز اتنی شدید نہیں ہو سکی۔ لیکن وہ اپنے سر کو مناسب انداز میں اٹھا کر نہیں رکھ سکا اور یہ فرش سے ٹکرا گیا۔ اس نے اپنا سر موڑا جو چوٹ لگنے سے درد کر رہا تھا اور اسے قالین سے رگڑا۔

''اندر کوئی چیز گری ہے'' اس کے بائیں جانب کمرے میں سے منیجر بولا۔ گریگر نے تصور میں دیکھنے کی کوشش کی کہ جو کچھ اس کے ساتھ آج ہوا تھا، وہ کسی موقع پر کبھی منیجر کے ساتھ بھی ہو۔ کم از کم اس بات کے ممکن ہونے سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جیسے اس سوال کا کوئی کھردرا جواب دینے کے لیے منیجر نے اپنے پالش زدہ جوتوں کی چرچراہٹ

کے ساتھ برابر کے کمرے میں اعتماد سے قدم اٹھائے۔ دائیں جانب کے کمرے میں سے گریگر کی بہن اسے اطلاع دینے کے لیے سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔ ''گریگر۔ منیجر یہاں ہے۔''

''میں جانتا ہوں'' وہ زیرِ لبی بڑبڑایا۔ وہ اپنی آواز کو اتنا بلند کرنے کی جرات نہیں کر سکا کہ وہ اس کی بہن کے کانوں تک پہنچے۔

بائیں جانب بغلی کمرے سے اس کا باپ بولا ''گریگر جناب منیجر تشریف لائے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ تم نے آج پہلی ٹرین کیوں چھوڑی؟ ہم نہیں جانتے کہ کیا جواب دیں۔ اور یہ بھی کہ وہ تم سے بالمشافہ بات کرنا چاہتے ہیں۔ براہ کرم دروازہ کھولو۔ وہ اتنے اچھے ہیں کہ تمھارے کمرے میں بکھرے سامان کا برا نہیں مانیں گے۔''

اسی دوران میں منیجر نے دوستانہ انداز میں کہا، ''صبح بخیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔مسٹر سیمسہ''

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے'' اس کی ماں نے منیجر سے کہا۔ جب کہ اس کا باپ دروازے پر کھڑا مسلسل بول رہا تھا ''جناب آپ یقین کیجیے۔ لڑکے کی طبیعت واقعی خراب ہے۔ ورنہ یہ صبح کی ٹرین کیوں چھوڑتا۔ اس کا تو اپنے کام کے علاوہ کسی اور طرف دھیان جاتا ہی نہیں ہے۔ میں کبھی اس پر ناراض ہوا تو ہوں کہ یہ کبھی شام کو بھی گھر سے باہر نہیں جاتا۔ پچھلے پورے ہفتے سے یہ گھر پر ہی ہے۔ ایک بار بھی شام کو باہر نہیں گیا۔ یہ کرسی پر ہمارے ساتھ بیٹھا رہتا ہے اور خاموشی سے اخبار پڑھتا یا اپنے سفری اوقات کار کو ملاحظہ کرتا ہے۔ ایک طرح کی تبدیلی کے لیے یہ خود کو تراشے کاٹنے میں مصروف رکھتا ہے۔ مثلاً اس نے دو تین شامیں لگا کر ایک چھوٹا فریم بنایا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کتنا شان دار ہے۔ یہ اس کے کمرے میں ٹنگا ہوا ہے۔ جونہی گریگر دروازہ کھولے گا، آپ کو یہ دکھائی دے گا۔ بہرحال مجھے خوشی ہے جناب منیجر کہ آپ یہاں تشریف لائے۔ ہمیں کبھی اسے دروازہ کھولنے کا نہیں کہنا پڑا۔ یہ اپنے معمول میں اتنا سخت ہے اور ضرور اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے حالاں کہ اس نے صبح اس بات کو ماننے سے انکار کیا ہے۔''

''میں ابھی آتا ہوں''۔۔۔۔۔۔۔ گریگر نے جان بوجھ کر مدہم آواز میں کہا اور اپنی جگہ سے نہ ہلا تاکہ ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی اس کی سماعت میں آنے سے نہ رہ جائے۔

''محترمہ! میں خود بھی اس بات کو کسی اور طرح سے نہیں سمجھ سکتا۔'' منیجر نے کہا، ''مجھے امید ہے واقعی

کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے۔ میں آپ سے کہنا چاہوں گا کہ ہم کاروباری لوگ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے، جیسا بھی آپ اسے سمجھیں، کاروبار میں خلل نہ آئے، اس لیے ہم اکثر طبیعت کی معمولی خرابی کو نظرانداز کردیتے ہیں۔''

''کیا منیجر صاحب اندر کمرے میں تشریف لے آئیں'' گریگر کے باپ نے بے چینی سے پوچھا اور دروازے پر دستک دی۔

''نہیں'' گریگر نے جواب دیا۔ بائیں جانب کے کمرے میں یک لخت گہرا سناٹا چھا گیا۔ دائیں جانب کے کمرے میں اس کی بہن سسکیاں لے رہی تھی۔

میری بہن باقی گھر والوں کے پاس کیوں نہیں چلی جاتی ہے؟ شاید وہ ابھی نیند سے بیدار ہوئی ہے اور ٹھیک طرح سے لباس بھی نہیں بدلا ہوگا۔ لیکن وہ رو کیوں رہی ہے؟ شاید اس لیے کہ میں اٹھ نہیں رہا اور منیجر کو کمرے میں نہیں آنے دے رہا، شاید اس لیے کہ اسے میری نوکری چھن جانے کا خوف ہے۔ اور شاید اس لیے کہ منیجر اس کے والدین کو پھر سے پرانے مطالبوں سے زچ کرے گا۔ غالباً اس وقت یہ سوچیں غیر ضروری تھیں۔ وہ ابھی زندہ ہے اور اس کا اپنے گھر والوں کو چھوڑ دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس وقت وہ یہاں قالین پر لیٹا ہوا ہے اور اگر کوئی اس کی موجودہ حالت کا ذرا سا بھی اندازہ رکھے، تو کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ منیجر کو اندر آنے دے۔ لیکن آج کی معمولی سی غفلت پر گریگر کو نوکری سے ہاتھ نہیں دھونے کا خطرہ نہیں تھا۔ اس غفلت کے لیے وہ ایک آسان سی اور مناسب معذرت پیش کر سکتا تھا۔ گریگر کو لگتا تھا کہ اس موقع پر اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا کہیں زیادہ دانش مندانہ بات ہوگی بجائے اس کے کہ اسے رونے دھونے سے اور بول بول کر پریشان کیا جائے۔ لیکن یہی تو وہ بے یقینی پن تھا جس کی وجہ سے باقی سب پریشان تھے اور یہی ان کے ایسے رویے کے لیے ایک معذرت بھی تھا۔

''جناب سیمسہ'' چیف کلرک نے اس مرتبہ بلند آواز میں چلا کر کہا ''کیا پریشانی ہے؟ تم اپنے کمرے میں چھپے بیٹھے ہو، صرف ہاں یا نہ میں جواب دیتے ہو۔ اپنے والدین کے لیے سنگین اور غیر ضروری مشکل پیدا کرتے ہو، اور میں یہ بھی کہوں گا کہ نہایت ناشائستگی سے اپنے پیشہ وارانہ فرائض سے غفلت برت رہے ہو۔ میں تمھارے چیف اور تمھارے والدین کی طرف سے تم سے مخاطب ہوں۔ میں پوری سنجیدگی کے ساتھ تم سے درخواست کرتا ہوں کہ فوری طور پر صاف وضاحت پیش کرو۔ مجھے

حیرت ہے۔ حیرت ہے۔ میں سوچتا تھا کہ تم ایک متحمل مزاج، معقول انسان ہو اور اب تم اچانک عجیب انداز میں کمرے میں گھوم رہے ہو۔ چیف نے مجھے آج تمھارے اس رویے سے متعلق ایک ممکنہ وضاحت دی تھی جو کچھ عرصہ پہلے تمھیں سونپی گئی رقم اکٹھا کرنے کی ذمہ داری سے متعلق تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے انھیں اپنی ضمانت دی کہ یہ وجہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہاں میں نے تمھارے ناقابل تصور اکھڑ پن کو ملاحظہ کیا جس سے تمھارے بارے میں بات کرنے کی میری خواہش کو سرے سے ختم کر دیا۔ یاد رکھو تمھاری نوکری بھی بہت زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ اصل میں یہ ساری باتیں میں تم سے بالمشافہ ملاقات میں کہنے والا تھا لیکن چوں کہ تمھاری وجہ سے میرا وقت یہاں ضائع ہو رہا ہے، اس لیے مجھے مناسب لگا کہ یہ بات تمھارے والدین کے علم میں بھی آنی چاہئے۔ کچھ عرصے سے تمھاری کارکردگی بھی تسلی بخش نہیں رہی۔ میں مانتا ہوں کہ یہ ایسا وقت نہیں ہے کہ ہم غیر معمولی کاروبار کی توقع کریں۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں لیکن کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا سیمسہ جب سرے سے کوئی کاروبار ہی نہ کیا جائے۔ نہ اس بات کی کبھی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے۔''

''لیکن جناب منیجر صاحب'' گریگر نے اپنے آپ کو اور غصے میں ہر احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب، میں ابھی اسی وقت دروازہ کھول رہا ہوں۔ معمولی غفلت، غنودگی کی لہر نے مجھے بستر سے اٹھنے سے روکے رکھا۔ میں اس وقت بھی بستر پر لیٹا ہوا ہوں۔ لیکن اب میں خود کو پھر سے بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ بس بستر سے اٹھنے ہی والا ہوں۔ تھوڑا سا اور انتظار کر لیجئے۔ سب کچھ ایسا بہتر نہیں تھا جیسا میں نے ان کے بارے میں سوچا تھا۔ لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ کیسے اچانک حالات انسان کو اپنے قابو میں کر لیتے ہیں۔ ابھی کل شام تک میں بھلا چنگا تھا۔ میرے والدین اس بات کو جانتے ہیں۔ اصل میں کل شام ہی کو مجھے شک تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میرے ساتھیوں نے اس بات کو مجھ میں محسوس کیا ہوگا۔ بھلا یہ بات دفتر میں کیوں نہیں بتائی؟ لیکن لوگ ایسا سوچتے ہیں کہ وہ گھر میں آرام کیے بغیر بیماری پر قابو پا لیں گے۔ منیجر صاحب میرے والدین سے کچھ مت کہیے۔

جناب میرے خلاف آپ کی شکایت بے بنیاد ہے۔ کسی نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ شاید وہ آرڈرز آپ کی نظر سے نہیں گزرے جو میں نے حال میں حاصل کیے ہیں۔ پھر یہ کہ جناب میں ابھی آٹھ بجے کی ٹرین پکڑ لوں گا۔ چند گھنٹوں کے آرام نے مجھے بہتر کر دیا ہے۔ آپ بے شک یہاں مت

ٹھہریے۔ میں ابھی خود دفتر پہنچ جاؤں گا۔ مجھ پر مہربانی کیجئے کہ یہ بات چیف تک پہنچا دیجئے اور انھیں میرا سلام کہیے گا۔''

جب کہ گریگر تیزی سے یہ سب کچھ کہہ رہا تھا، حتی کہ یہ جانے بغیر کہ کیا اس نے منہ سے نکل رہا تھا، وہ کسی کوشش کی بغیر درازوں والی الماری تک پہنچ گیا، شاید اس ریاضت کے باعث جو ابھی اس نے بستر پر کی تھی اور اب وہ اس پر خود کو اس پر بلند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اصل میں وہ دروازہ کھولنا چاہتا تھا۔ وہ واقعی چاہتا تھا کہ منیجر اسے دیکھے اور اس سے بالمشافہ ملے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ان لوگوں کا جو ابھی اس کے بارے میں بات کر رہے تھے، اسے نئی جون میں دیکھنے پر کیا ردعمل ہوتا ہے؟ اگر وہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں تو گریگر ہر ذمہ داری سے مکت اور پرسکون ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ ہر بات خاموشی سے قبول کر لیتے ہیں تو پھر اسے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی اور اگر اسے واقعی جانا پڑے تو وہ آٹھ بجے کے قریب سٹیشن پہنچ سکتا تھا۔

شروع میں تو وہ چند ایک بار درازوں والی ہموار الماری پر سے پھسلا۔ لیکن آخر کار اس نے خود کو جھلایا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اب اسے مزید اپنے نچلے دھڑ میں درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا بھلے ہی وہ کتنی شدت سے ابھی موجود ہو۔ اس نے قریب پڑی کرسی کی پشت پر خود کو گر جانے دیا۔ اس کے کنارے پر وہ اپنی ننھی ٹانگوں کی مدد سے خود سے چمٹ گیا۔ ایسا کرنے سے اس نے خود پر قابو پا لیا اور خاموش ہو گیا۔ اب اسے منیجر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

منیجر اس کے والدین سے کہہ رہا تھا، ''کیا آپ کو ایک لفظ بھی سمجھ میں آیا؟ کیا یہ ہمیں بیوقوف بنا رہا ہے۔؟''

''خدا کے لیے'' اس کی ماں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا ''شاید وہ بہت بیمار ہے۔ ہم اسے بلاوجہ پریشان کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ گریٹ۔۔۔۔۔۔ گریٹ'' وہ چیخ چیخ کر اپنی بیٹی کو پکارنے لگی۔

''ماں'' گریگر کی بہن نے دوسرے دروازے سے جواب دیا۔ دونوں گریگر کے کمرے کے ذریعے ایک دوسرے سے مخاطب تھیں۔

''فوراً ڈاکٹر کو بلاؤ۔ گریگر بیمار ہے۔ بھاگ کر ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ کیا تم نے ابھی اسے بولتے نہیں سنا؟''

''یہ تو کسی جانور کی آواز تھی۔'' منیجر نے کہا جو اس کی ماں کے مقابلے میں غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔

''اینا۔۔۔۔اینا'' گریگر کے باپ نے ہاتھ سے تالی بجاتے ہوئے ہال میں سے باورچی خانے میں پکار کر کہا ''فوراً کسی تالا کھولنے والے کو بلاؤ۔''

دونوں لڑکیاں پھڑ پھڑاتے سکرٹس کے ساتھ بڑے کمرے میں سے بھاگتی ہوئی گزریں۔ کیسے اس کی بہن اتنی جلد تیار ہو گئی؟ انھوں نے اپارٹمنٹ کا باہری دروازہ کھولا۔ لیکن دروازے بند ہونے کی آوازیں نہیں آئیں۔ شاید وہ عجلت میں اسے کھلا چھوڑ گئی تھیں جیسا کہ کسی ایسے اپارٹمنٹ میں ہوتا ہی ہے جہاں کوئی ناگہانی حادثہ ہو جائے۔

تاہم گریگر بہت مطمئن تھا۔ اچھا ہی ہے کہ لوگ اب اس کی آواز مزید نہیں سمجھ پاتے۔ حالاں اسے ان کی صاف سمجھ آتی تھی، پہلے سے بھی زیادہ صاف، شاید اس لیے کہ اس کے کان ان آوازوں کے عادی ہو گئے تھے۔ لیکن کم از کم لوگوں کو اب یہ علم تھا کہ وہ کسی ابتلا میں گرفتار تھا۔ وہ اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھے۔ جس اعتماد اور یقین کے ساتھ ابتدائی انتظامات کیے گئے، وہ اسے اچھے لگے۔ اسے اپنا آپ پھر سے انسانوں میں شامل لگا اور وہ ڈاکٹر اور تالا کھولنے والے سے، کہ دونوں میں وہ کوئی واضح فرق نہیں کر پاتا تھا، شان دار اور حیران کن نتائج کی توقع کر رہا تھا۔ تنقیدی گفتگو کے لیے کہ جو آئندہ ہونے والی تھی، وہ اپنی آواز کو ممکنہ حد تک صاف کرتے ہوئے کھانسا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے اسے گھٹا ہوا رکھنے کا اہتمام کیا، کیوں کہ ایسا ممکن تھا کہ اس کے کھانسنے کی آواز بھی انسانی آواز سے مختلف معلوم ہو۔ اسے خود کو اعتبار نہیں رہا تھا کہ وہ کوئی فیصلہ لے سکے۔ اس دوران میں بغلی کمرے میں مکمل سکوت چھایا رہا۔ شاید اس کے والدین منیجر کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے باہم سرگوشیاں کر رہے تھے۔ یا پھر وہ سب گریگر کے کمرے کے دروازے سے کان لگائے جھکے بیٹھے اور سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

گریگر نے آرام کرسی کی مدد سے آہستگی سے خود کو دروازے کی طرف دھکیلا پھر اسے چھوڑ دیا اور خود کو اس کی جانب سرکایا اور اسے پکڑ کر سیدھا ہو گیا، جب کہ اس کے ننھے پیروں کے تلووں پر لیس دار مواد لگا تھا جس کی مدد سے وہ مضبوطی سے چپک گئے اور اتنی محنت کے بعد کچھ دیر کے لیے وہیں ٹکے رہے۔

تب اس نے اپنے منہ سے چابی کو تالے کے سوراخ میں گھمانے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے تب اسے پتہ چلا کہ اس کے تو دانت ہی نہیں تھے۔ تو چابی پر کیسے اپنی گرفت جماتا؟ لیکن یہ کام کرنے کے لیے اس کے جبڑے قدرتی طور پر مضبوط تھے۔ ان کی مدد سے اس نے واقعی چابی کو گھما لیا۔ اسے اندازہ نہیں ہوا کہ یوں وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہا تھا کیوں کہ بھورے رنگ کا لعاب سا اس کے منہ سے بہتا ہوا چابی سے ہو کر نیچے فرش پر گرنے لگا تھا۔

''سن رہے ہو۔ وہ تالا کھول رہا ہے'' دوسرے کمرے میں منیجر نے سرگوشی کی۔ گریگر کے لیے یہ ایک بڑی حوصلہ افزائی تھی۔ ان سب کو، اس کے والد اور والدہ سمیت سب کو پکار کر اس کی ہمت بندھانی چاہئے تھی کہ ''ہمت کرو گریگر۔'' انھیں چلا کر کہنا چاہئے تھا ''کرتے رہو۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے رہو۔''

یہ تصور کرتے ہوئے کہ اس کی تمام کوششوں سے ان کی حیرت کو ہوا ملتی ہے، وہ اپنی تمام قوت کے ساتھ دیوانہ وار اپنے جبڑے چابی پر چلانے لگا۔ جیسے ہی چابی کچھ گھومی، وہ تالے کے گرد گھوم گیا۔ اب وہ صرف اپنے منہ کی مدد سے خود کو سیدھا رکھے ہوئے تھا اور یا تو وہ چابی سے لٹکا رہتا یا ضرورت پڑنے پر اپنے جسم کے تمام وزن سے اسے نیچے دباتا۔ تالے کی واضح کلک کی آواز، جو آخر کار بلند ہوئی، نے گریگر کو جگا یا۔ تیز تیز سانس لیتے ہوئے اس نے خود سے کہا، ''مجھے تالا کھولنے والے کی ضرورت نہیں ہے'' اس نے دروازے کو مکمل کھولنے کے لیے اس کے دستے پر اپنا سر رکھ کر دبایا۔

چوں کہ اسے دروازے کو اس انداز میں کھولنا پڑا تھا جب کہ وہ تو پہلے سے کھلا تھا گو وہ دوسروں کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے خود کو آہستگی سے دروازے کے کنارے پر موڑنا تھا، بہت احتیاط کے ساتھ تاکہ وہ دروازے کی دہلیز ہی پر پشت کے بل نیچے نہ گر جائے۔ وہ ابھی تک اسی کوشش میں مصروف تھا اور کسی اور بات پر دھیان دینے کی اسے مہلت نہیں تھی، کہ منیجر اسے بلند آواز میں چیختا سنائی دیا ''اوہ''۔

ایسا لگا جیسے کسی نے سیٹی ماری ہو۔ تب اس نے منیجر کو دیکھا، دروازے کے نزدیک اپنے کھلے منہ پر ہاتھ رکھے اور آہستگی سے واپس مڑتے ہوئے، جیسے کوئی ان دیکھی قوت اسے واپس دھکیل رہی ہو۔ اس کی ماں منیجر کی موجودگی کے باوجود پریشان حالی میں ہوا میں لہراتے ہوئے بالوں کے ساتھ کہ رات کی نیند کے اثرات ابھی ختم نہیں ہوئے تھے، وہاں بے سدھ تھی۔ پہلے تو بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ

اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ پھر دو قدم گریگر کی طرف بڑھی، اور پھر اپنے سکرٹس میں دھم سے گر گئی جو اس کے سب طرف پھیل گیا۔ اس کا چہرہ اس کی چھاتیوں میں ڈوبا ہوا تھا، مکمل پوشیدہ۔ اس کے باپ نے غصے میں اپنا گھونسا گریگر کی طرف لہرایا جیسے وہ اسے واپس کمرے میں دھکیل دینا چاہتا ہو۔ پھر بے یقینی سے کمرے میں ہر طرف دیکھا، ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو ڈھاپنا اور یوں دھاڑیں مار کر رونے لگا کہ اس کی بڑی چھاتی کانپنے لگی۔

اس موقع پر گریگر کمرے میں داخل نہیں ہوا بلکہ اپنے جسم کو دروازے کے مضبوط پٹ کے ساتھ لگا کر باہر کی طرف جھکایا، اس طرح کہ اس کا آدھا جسم ہی دکھائی دیتا تھا، اور اس کا سر بھی دائیں بائیں گھومتا ہوا جس سے وہ وہاں موجود افراد کو دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں دن کافی نکل آیا تھا۔ باہر گلی کے دوسری جانب سامنے ایستادہ گہرے بھورے رنگ کی عمارت، جو ایک ہسپتال تھا، کی سامنی دیوار میں کھڑکیوں کی دراڑیں تھیں۔ بارش بدستور جاری تھی، لیکن بڑے قطروں کی صورت میں جو واضح اور ٹھوس انداز میں زمین پر گر رہے تھے۔ میز کے گرد ناشتے کے برتنوں کا انبار پڑا تھا۔ کیوں کہ گریگر کے باپ کے لیے ناشتہ دن بھر کی اہم ترین خوارک تھی جسے وہ گھنٹوں اخبارات کے مطالعہ کے ذریعے طول دیتا تھا۔ بالکل سامنی دیوار پر گریگر کی فوجی ملازمت کے زمانے کی ایک تصویر ٹنگی تھی۔ وہ لیفٹننٹ کے عہدے کا فوجی لباس زیب تن کیے ہوئے تھا، مسکراتا ہوا اور بے فکر، ایک ہاتھ تلوار کے دستے پر جمائے ہوئے، دیکھنے والے کے دل میں اپنے یونیفارم اور عہدے کے لیے احترام پیدا کرتے ہوئے۔ بڑے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ چوں کہ اپارٹمنٹ کا دروازہ بھی بند نہیں تھا، اس لیے یہاں سے اپارٹمنٹ کے باہر سیڑھی اور نیچے جاتے ہوئے ابتدائی زینے بھی دکھائی دیتے تھے۔

''اب'' گریگر نے کہا، یہ بخوبی جانتے ہوئے ایک وہی تھا جو اپنے حواس میں تھا، ''میں کپڑے تبدیل کرتا ہوں، کپڑوں کے نمونے پیک کرتا ہوں اور روانہ ہو جاتا ہوں۔ کیا آپ مجھے روانہ ہونے کی اجازت دیں گے، کیا نہیں؟ مینجر صاحب آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میں کاہل نہیں ہوں۔ مجھے کام کر کے خوشی ہوتی ہے۔ سفر تھکا دینے والا کام ہے۔ لیکن اس کی مجھے عادت ہو گئی ہے۔ آپ کہاں جا رہے ہیں مینجر صاحب؟ کیا واپس دفتر؟ کیا واقعی؟ کیا آپ وہاں ہر بات سچ سچ بتائیں گے؟ وقتی طور پر ہو سکتا ہے کسی سے کوئی کام نہ ہو سکے، لیکن شاید ایسے ہی موقعوں پر اس کی گزشتہ کارکردگی یاد رکھنے اور یہ سوچنے کی

ضرورت ہوتی ہے کہ رکاوٹیں ختم ہو جانے کے بعد یہی ملازم زیادہ احتیاط اور مستعدی سے کام کرے گا۔ میں واقعی چیف صاحب کا ممنون ہوں۔ آپ تو یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔ اصل میں مجھے اپنے والدین اور بہن کی فکر کھائے جاتی ہے۔ ابھی میں ایک مشکل میں ہوں لیکن جلد ہی اس سے چھٹکارا پالوں گا۔ میرے لیے صورت حال پہلے ہی خراب ہے، اسے مزید خراب مت کیجئے۔ میری طرف سے دفتر میں بات کیجئے گا۔ سفری تاجروں کو عام طور پر پسند نہیں کیا جاتا۔ میں جانتا ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں، ہم نوٹوں سے بھری ہوئی بوریاں کماتے اور مزے کی زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے پاس ایسا سوچنے کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں ہوتی۔ لیکن آپ، جناب منیجر صاحب آپ دوسروں کی نسبت میرے حالات سے زیادہ واقف ہیں۔ حتیٰ کہ میں اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ جناب چیف سے بھی بہتر میرے واقف حال ہے، جو ادارے کے مالک ہونے کے ناطے کسی ملازم کی برطرفی کی صورت میں آسانی سے ایک غلط فیصلہ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ سفری تاجر جو سال کا زیادہ حصہ دفتر سے باہر رہتے ہیں، آسانی سے ایسی افواہوں، سازشوں اور بے بنیاد شکایتوں کے آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں جن کے خلاف چیف صاحب بھی ان کو بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر پاتے۔ کیوں کہ زیادہ خود انھیں بھی اپنے ان ملازموں کی کچھ زیادہ خبر نہیں ہوتی اور جب وہ اپنے سفر کے اختتام پر تاکہ اپنے حواس کو بحال کر سکے تو یہ سنگین نتائج انھیں درپیش ہوتے ہیں، جن کی ابتدا کا سراغ لگانا بھی ممکن نہیں۔ جناب منیجر یہ مانتے ہوئے کچھ تو کہہ کر جائیے کہ میں نے جو کچھ کہا، اس میں کچھ صداقت ہے۔''

لیکن گریگر کی گفتگو کے آغاز ہی میں منیجر پرے مڑ گیا تھا اور اب وہ بھنچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اپنے متغیر کندھوں کے پیچھے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گریگر کی گفتگو کے دوران وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکا بلکہ گریگر سے نظریں ہٹائے بغیر دروازے کی سمت مسلسل چلتا رہا لیکن بتدریج جیسے کمرے سے جانے کی خفیہ ممانعت کا سامنا ہو۔ وہ ہال کمرے ہی میں تھا اور اس فوری جھٹکے سے، جس کے ساتھ اس نے اپنا پیر دہلیز کے پرلی طرف رکھا، یہی قیاس ہوتا تھا کہ جیسے اس طرف پیر کے تلوے جل رہے تھے۔ ہال میں اس نے اپنا دایاں ہاتھ جسم سے پرے لے جاتے ہوئے زینے کے کٹہرے کی طرف پھیلایا جیسے وہاں اسے کوئی ماورائے فطرت آرام ملنے والا ہو۔

گریگر نے اندازہ لگایا کہ اگر اسے ادارے میں اپنی نوکری کو کسی بڑے خطرے میں نہیں ڈالنا، تو

اسے منیجر کو کسی صورت میں بھی اس ذہنی حالت میں نہیں جانے دینا چاہئے۔اس کے والدین البتہ یہ بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔ پچھلے کئی سالوں میں ان کا یہ خیال پختہ ہو چکا تھا کہ گریگر زندگی بھر کے لیے اس ادارے میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اور یہ بھی کہ وہ آج کل اپنی موجودہ پریشانیوں میں یوں الجھے ہوئے تھے کہ ایسی پیش بینی ان کے بس میں نہیں تھی۔لیکن گریگر متوقع خطرات کو بھانپ سکتا تھا۔منیجر کو واپس لانے، پرسکون کرنے، قائل کرنے، اور آخر اس کی رائے کو بدلنے کی ضرورت تھی۔ گریگر اور اس کے خاندان کا مستقبل اسی بات پر منحصر تھا۔

کاش اس کی بہن یہاں ہوتی۔ وہ بہت سمجھدار ہے۔وہ تو جب خاموشی سے سیدھا لیٹا ہوا تھا تبھی اس نے رونا دھونا شروع کر دیا تھا۔اور یہ منیجر، عورتوں کا دوست، جلد اس سے متاثر ہو جاتا۔پھر وہ چالاکی سے گھر کا دروازہ بند کر لیتی اور اس سے بات کر کے اسے اس خوف سے باہر لے آتی۔لیکن وہ یہاں موجود نہیں تھی۔تمام صورت حال کو گریگر ہی نے سنبھالنا تھا۔

پھر یہ سوچے بغیر کہ وہ حرکت کرنے کی اپنی موجودہ اہلیت سے مکمل بے خبر تھا اور یہ سوچے بغیر کہ اس کی تقریر کو ممکنہ حد تک یا اغلباً پھر سے نہیں سمجھا گیا تھا، اس نے دروازے کے پٹ سے خود کو ہٹایا، داخلی راستے پر خود کو آگے دھکیلا، اور چاہا کہ خود ہی منیجر تک جائے جو ایک مضحکہ خیز انداز میں نیچے اترتے زینے کے کٹہرے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔لیکن جونہی گریگر نے خود کو متوازن کھڑا کرنے کی کوشش کی، مختصر چیخ کے ساتھ وہ دھپ سے اپنی بے شمار ننھی ٹانگوں پر جا گرا۔ایسا ہوا ہی تھا کہ اس نے اس صبح پہلی بار اپنے آپ کو اتنا تازہ دم محسوس کیا۔ننھی ٹانگوں کے نیچے ٹھوس فرش تھا۔وہ مکمل طور پر اس کے اختیار میں تھی۔اس نے خوشی کے ساتھ اندازہ لگایا۔ بلکہ اس کے حسب منشا کسی بھی سمت میں اسے لے جانے پر تیار تھیں۔اسے یقین ہو گیا کہ اس کی تمام تر ابتلا کی حتمی اصلاح کی صورت اسے مل گئی تھی۔لیکن اس وقت جب وہ محدود انداز میں جھولتے ہوئے اپنی ماں کے قریب اور براہ راست اس کے سامنے لیٹا تھا جو بظاہر اپنے آپ میں چھپی ہوئی تھی تو ایک دم سے وہ اپنے بازوؤں کو ایک دوسرے سے دور پھیلائے اور اپنی انگلیوں کو اکڑائے ہوئے سیدھا کھڑی ہوئی اور اونچی آواز میں پکاری، ''بچاؤ۔۔۔۔۔خدا کے لیے میری مدد کرو۔''

اس نے اپنا سر جھکایا ہوا تھا جیسے وہ زیادہ بہتر زاویے سے گریگر کو دیکھنا چاہتی ہو۔لیکن اس تاثر

کے برعکس اندھا دھند پیچھے ہٹی، یہ فراموش کرتے ہوئے کہ اس کے عقب میں میز پڑا تھا تمام برتنوں کے ساتھ۔ وہ میز کے قریب پہنچی تو اس پر بیٹھ ہی گئی جیسے غیر حاضر دماغی کے ساتھ اور بالکل ہی نہیں دیکھ پائی کہ اس کے برابر ہی الٹے پڑے ایک بڑے برتن سے کافی تیز بہاؤ کے ساتھ نیچے قالین پر گر رہی تھی۔

''ماں۔۔۔۔۔ ماں'' گریگر نے دھیمے لہجہ میں کہا اور اس کی طرف دیکھا۔ مینجر کا خیال عارضی طور پر اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ دوسری طرف جونہی اس کی نظر بہتی کافی پر پڑی، وہ اپنے جبڑوں کو ہوا میں چند ایک بار چلانے سے خود کو نہ روک سکا۔ اس پر اس کی ماں پھر سے چلائی، تیزی سے میز پر سے لڑھکتی ہوئی اپنے شوہر کے بازوؤں میں جا گری جو اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن گریگر کے پاس ابھی اہل خانہ کے لیے کوئی مہلت نہیں تھا۔ مینجر زینے تک پہنچ چکا تھا۔

اپنی ٹھوڑی سیڑھیوں کے جنگلے پر ٹکائے مینجر نے آخری مرتبہ مڑ کر دیکھا۔ جبھی گریگر نے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا تاکہ ممکن ہو تو اس تک پہنچ سکے۔ لیکن مینجر نے جیسے یہ بات بھانپ لی کیوں کہ وہ چھلانگ مارتا ہوا ایک ساتھ چند سیڑھیاں نیچے اترا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا، مسلسل چلاتے ہوئے، ''اوہ'' اس کی چیخیں تمام سیڑھیوں میں گونجتی رہی۔

لیکن بدقسمتی سے مینجر کی روانگی نے اس کے باپ کو بالکل ہی سٹپٹا دیا۔ اب تک وہ نسبتاً پرسکون رہا تھا۔ مینجر کے پیچھے بھاگنے یا کم از کم گریگر کو یہ سب کچھ کرنے سے روکنے کے لیے آگے بڑھنے کے بجائے اس نے مینجر کی چھڑی اٹھائی جسے وہ بدحواسی میں اپنی ٹوپی اور اوورکوٹ کے ساتھ کرسی پر بھول گیا تھا۔ اپنے بائیں ہاتھ میں اس نے میز پر پڑا اخبار اٹھایا اور زور زور سے اپنا پیر فرش پر مارتے ہوئے وہ چھڑی اور اخبار کو ہوا میں جھٹکتے ہوئے گریگر کو واپس اس کے کمرے کی طرف دھکیلنے لگا۔ گریگر کی ہر درخواست بے اثر تھی۔ کوئی درخواست بھلا سمجھی ہی کہاں جائے گی۔ چاہے وہ کیسے ہی احترام کے ساتھ اپنا سر موڑنے کا خواہاں ہو، اس کا باپ زیادہ سخت انداز میں پیر زمین پر مارنے لگا تھا۔ کمرے کے پرلی جانب اس کی ماں نے سرد موسم کے باوجود کھڑکی کھولی اور اپنے رخساروں کو ہتھیلیوں پر رکھے آگے جھکے ہوئے اس نے اپنے چہرے کو کھڑکی سے بہت باہر نکالا ہوا تھا۔

باہر گلی اور زینوں کی قطار میں سے تیز سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا، کھڑکی کے پردے پھڑ پھڑائے، میز پر پڑے اخبار تھرتھرائے اور صفحے فرش پر بکھر گئے۔ اس کا باپ وحشی انسان کی طرح منہ سے ''شوشو'' کی

آوازیں نکالتا تیزی سے آگے بڑھا۔ گریگر کو الٹا چلنے کی سرے سے کوئی ریاضت نہیں تھی اس لیے یہ عمل بہت سست تھا۔ اگر اسے پیچھے مڑ جانے کی مہلت دی جاتی تو وہ اب تک اپنے کمرے میں پہنچ چکا ہوتا۔ لیکن اسے ڈر تھا کہ مڑنے کے طویل عمل سے اس کا باپ کہیں اور زیادہ برانگیختہ نہ ہو جائے۔ ہر لمحہ اسے خوف محسوس ہوتا کہ باپ کے ہاتھ میں پکڑی چھڑی ابھی دھائیں سے اس کی کمر یا سر پر پڑے گی۔

آخر گریگر کے پاس کوئی راستہ باقی نہیں بچا۔ کیوں کہ اس نے خوف سے دیکھا کہ اس سے اپنی چال کو ایک سمت میں قائم رکھنا ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے باپ پر مستقل محتاط نگاہ رکھتے ہوئے، ممکنہ حد تک تیزی سے پیچھے مڑنا شروع کیا لیکن حقیقتاً یہ سارا عمل بہت سست تھا۔ شاید اس کا باپ اس کی منشاء کو جان گیا۔ اس نے گریگر کی حرکت میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ لیکن فاصلے سے چھڑی کی نوک سے وہ وقفے وقفے سے اس کی سمت درست کرتا۔ کاش اس کا باپ ناقابل برداشت انداز میں اسے نہ ہشکارتا۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے گریگر اپنے اوسان خطا کر بیٹھا تھا۔ وہ مکمل مڑنے کے قریب ہوتا جب اچانک اس کے کانوں میں ہشکارنے کی آواز آتی اور اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی اور وہ پھر سے واپس مڑ جاتا۔ لیکن آخر کار جب وہ اپنا سر مکمل طور پر کھلے دروازے کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ واضح ہو گیا کہ اس کا جسم اتنا چوڑا تھا کہ اس میں سے نہیں گزر جا سکتا تھا۔ ظاہر تھا کہ اس ذہنی کیفیت میں اس کے باپ کو ذرا بھی خیال نہ آیا کہ وہ دروازے کے دوسرے پٹ کو دھکا دے کر کچھ اور کھول دے گا تاکہ گریگر آسانی سے گزر سکے۔ اس کے باپ کے ذہن میں واحد خیال بس یہی تھا کہ گریگر جتنی جلد ہو سکے، اپنے کمرے میں چلا جائے۔ وہ کبھی ان تفصیلی تیاریوں کی اجازت نہیں دے سکتا تھا جن کی گریگر کو اپنی سمت درست کرنے اور یوں کمرے میں ہونے کے لیے ضرورت تھی۔ شاید اپنی غیر معمولی آواز کے ساتھ وہ گریگر کو یوں آگے ہشکار رہا تھا جیسے راستے میں سرے سے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ گریگر کے پیچھے اس موقع پر یہ آواز کسی ایک باپ کی آواز نہیں لگتی تھی۔ نہ ہی اب یہ کوئی مذاق کی بات تھی۔ کچھ بھی ہو جائے، گریگر نے زور لگا کر خود کو دروازے میں دھکیلا۔ اس کے جسم کا ایک حصہ بلند ہو گیا۔ وہ ایک ترچھے رخ میں دروازے کے بیچ لیٹ گیا۔ اس کے جسم کا ایک حصہ رگڑ کی وجہ سے زخمی تھا۔ سفید دروازے کی سطح پر دھبے سے بن گئے۔ جلد ہی وہ دروازے میں بری طرح پھنس گیا اور اب معمولی سا بھی ہلنے کی اس میں طاقت نہیں رہی تھی۔ اس کے جسم کے ایک جانب ننھی ٹانگیں فضا میں تڑپ رہی

تھیں جبکہ دوسرے حصے کی ٹانگیں تکلیف دہ انداز میں فرش سے چپکی ہوئی تھیں۔ تب اس کے باپ نے اس کی پشت پر واقعتاً ایک زوردار ٹھوکر ماری اور وہ دور جا پڑا، خون میں لتھڑا ہوا، کمرے کے اندرون میں دور۔ چھڑی سے دروازہ زور سے بند کر دیا گیا۔ اب ہر طرف مکمل سناٹا تھا۔

(II)

گریگر پہلے شام کے اندھیرے میں اپنی نیم بے ہوشی سے مشابہ نیند سے بیدار ہوا۔ وہ کسی کھڑاک کے بغیر ضرور خود ہی جلد بیدار ہو جاتا، کیوں کہ وہ خود کو چاق و چوبند اور تر و تازہ محسوس کر رہا تھا، تاہم اسے لگا کہ جیسے کمرے سے باہر تیز قدموں اور ہال کو جاتے کمرے کو احتیاط سے بند کیے جانے کی آواز نے اسے بیدار کیا تھا۔ باہر گلی میں بجلی کے قمقموں کی زرد روشنی یہاں وہاں کمرے کی چھت اور فرنیچر کے اوپرے حصوں پر لیٹی ہوئی تھی لیکن کمرے کے نچلے حصے میں گریگر کے گرد اندھیرا تھا۔ اس نے آہستگی سے خود کو دروازے تک دھکیلا، عجیب انداز میں اپنے محاسوں کے ذریعے راستہ ٹٹولتے ہوئے جن کی اہمیت کا احساس اسے پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ ان سے اردگرد کے حالات سے باخبر ہو سکتا تھا۔ اس کے جسم کا بایاں حصہ کسی طویل زخم کی مانند دکھ رہا تھا اور اسے اپنی ٹانگوں کی دو قطاروں پر چلنا پڑ رہا تھا۔ مزید یہ کہ صبح کے ہنگامے میں اس کی ایک ٹانگ بری طرح زخمی ہوئی تھی اور یہ تو ایک معجزہ ہی تھا کہ بس ایک ہی ٹانگ زخمی ہوئی اور بے جان پیچھے لٹک رہی تھی۔

دروازے کے نزدیک پہنچنے پر اس پر کھلا کہ کیا شے اس کی بیداری کا سبب بنی تھی۔ یہ کھانے کی خوشبو تھی۔ وہاں ایک برتن پڑا تھا، میٹھے دودھ سے بھرا ہوا، جس میں سفید ڈبل روٹی کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ وہ خوشی سے قہقہہ لگانے لگا۔ کیوں کہ وہ اب صبح سے بھی زیادہ بھوکا تھا۔ اس نے اپنا سر آنکھوں تک بلکہ ان کے سمیت دودھ میں ڈبو لیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اسے مایوسی سے واپس کھینچ لیا صرف اس لیے نہیں کہ جسم کے زخمی بائیں حصے کے ساتھ برتن میں جھکنا تکلیف دہ تھا کہ وہ تبھی کھا سکتا تھا اگر اس کا سارا ہانپتا ہوا جسم ایک منظم انداز میں کام کرے۔ بلکہ اس کی وجہ دودھ بھی تھی جو ویسے تو اس کی مرغوب ترین غذا تھا اور اسی لیے اس کی بہن نے اسے یہاں رکھا ہوگا، لیکن اب اسے اس میں کوئی رغبت نہیں تھی۔ وہ کراہت کے ساتھ برتن سے پرے ہٹ گیا اور رینگتا ہوا واپس کمرے کے وسط میں چلا گیا۔

اس نے دروازے کی درز میں سے باہر جھانکا، رہائشی کمرہ میں گیس کا قمقمہ روشن تھا۔لیکن جہاں عام دنوں میں اس وقت اس کا باپ اس کی ماں اور کبھی کبھار اس کی بہن کو بھی اپنے سامنے بٹھا کر اونچی آواز میں اخبار پڑھ کر سنایا کرتا تھا، اب ہر طرف خاموشی تھی۔اب شاید اونچی آواز میں پڑھنے کی روایت کی وجہ سے جس کے بارے میں اس کی بہن نے اسے ہمیشہ بتایا اور خط میں لکھا بھی تھا، انھوں نے یہ معمول ترک کر دیا تھا۔لیکن ہر طرف سناٹا تھا، اس کے باوجود کہ اپارٹمنٹ بلاشبہ خالی نہیں تھا۔

''میرا خاندان کیسی خاموش زندگی گزارتا ہے'' گریگر نے خود سے کہا اور اپنے سامنے پھیلے اندھیرے میں دیکھتے ہوئے اس نے بہت فخر محسوس کیا کہ وہ اس لائق تھا کہ اپنے والدین اور بہن کو ایسا خوبصورت گھر مہیا کر سکے۔لیکن کیا ہوگا اگر یہ تمام خاموشی، ساری آسودہ حالی، سارا اطمینان ایسے بھیانک انداز میں ختم ہو جائے؟ ان سوچوں میں گھر جانے سے خود کو بچانے کے لیے گریگر نے خود کو متحرک رکھنے کا فیصلہ کیا۔یوں وہ کمرے میں ادھر اُدھر رینگنے لگا۔

اس طویل شام کے دوران پہلے ایک بغلی دروازہ اور پھر دوسرا بغلی دروازہ معمولی سا کھلا لیکن پھر فوراً ہی بند ہو گیا۔ضرور کوئی اندر آنا چاہ رہا تھا لیکن شاید اس نے نہ آنے ہی کو ترجیح دی۔گریگر نے فوراً ہی رہائشی کمرے کے دروازے کے قریب لے جا کر کھڑا کر لیا تاکہ محترز نووارد کو کسی طرح سے اندر آنے دے یا کم از کم یہ جان لے کہ وہ کون تھا؟ لیکن پھر کسی نے دروازہ نہیں کھولا اور اس کا انتظار رائیگاں گیا۔ پہلے جب دروازہ بند تھا تو سبھی اندر آنے کے خواہش مند تھے۔اب جب کہ اس نے دروازہ کھول لیا تھا، اور دوسرے دروازے بھی صبح سے کھل چکے تھے، کوئی بھی اندر نہیں آیا اور اب باہر سے قفلوں میں چابیاں لگا دی گئی تھیں۔

رہائشی کمرہ میں روشنی رات گئے بجھائی گئی۔اور اب یہ جاننا آسان تھا کہ اس کے والدین اور بہن اتنی رات تک جاگتے رہے تھے کیوں کہ ان تینوں کے دبے پاؤں جانے کی آواز واضح تھی۔اب یہ واضح تھا کہ اگلی صبح تک کوئی اس سے ملنے نہیں آئے گا۔سو اس کے پاس بہت وقت تھا کہ وہ کسی مداخلت کے بغیر اس بارے میں سوچے کہ کیسے اسے صفر سے پھر سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔لیکن یہ بلند چھت والا کشادہ کمرہ جس کے فرش پر لیٹنے پر وہ مجبور تھا، اسے بے چین کر رہا تھا جب کہ اس کی وجہ اسے معلوم نہیں تھی۔ حالاں کہ وہ پانچ برسوں سے یہاں مقیم تھا۔نیم شعوری طور پر مڑنے اور اس میں کسی طرح کی

ہچکچاہٹ محسوس کیے بغیر وہ تیزی صوفے کے نیچے گھس گیا جہاں اس کے باوجود کہ اس کی کمر کچھ دبی ہوئی تھی اور اپنا سر اٹھانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا لیکن اسے گہری طمانیت کا احساس ہوا اور افسوس ہوا کہ اس کا جسم اتنا چوڑا تھا کہ صوفے کے نیچے ٹھیک طرح سے سما نہیں پا رہا تھا۔

وہ تمام رات وہاں لیٹا رہا جو کچھ تو اس نے نیم خوابی کی کیفیت میں گزاری، جب کہ اس کی بھوک مسلسل اسے نئے سرے سے بیدار کر دیتی، لیکن کچھ پریشانی اور مبہم امید کے ساتھ گزاری جس سے وہ اس نتیجے تک پہنچا کہ اسے وقتی طور پر خود کو پرسکون اور مطمئن رکھنے اور اپنے خاندان کی فکر کرنے کی ضرورت تھی جس کے لیے وہ اپنی موجودہ کیفیت کی وجہ سے مشکلات پیدا کرنے پر مجبور تھا۔

صبح سویرے جب کہ ابھی تاریکی پوری طرح غائب نہیں ہوئی تھی، گریگر کو ان فیصلوں کو پرکھنے کا ایک موقع مل گیا جو اس نے ابھی کیے تھے۔ اس کی بہن، جو تقریباً پورے لباس میں تھی، نے کمرے کا ہال کی طرف کا دروازہ کھولا اور غور سے اندر جھانکا۔ فوری طور پر وہ اسے دکھائی نہیں دیا۔ لیکن جونہی اس نے اسے صوفے کے نیچے دیکھا، میرے خدایا، کہ اسے کہیں نہ کہیں تو ہونا تھا، وہ اڑ تو سکتا نہیں تھا۔ وہ اچانک اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ خود پر قابو رکھے بغیر اس نے باہر سے پھر سے دروازہ دھڑاک سے بند کر دیا۔ لیکن جیسے اسے اپنے رویے پر افسوس ہوا ہو، اس نے فوراً پھر سے دروازہ کھولا اور اس طور دبے پاؤں اندر داخل ہوئی جیسے وہ کسی سنگین مجرم یا مکمل اجنبی کے سامنے آ رہی ہو۔ گریگر نے اپنا سر صوفے کے کنارے سے باہر نکالا اور اسے دیکھا۔

''کیا وہ برتن میں پڑے دودھ کو دیکھ کر جان لے گی کہ اس نے اسے اس لیے نہیں چھوڑا تھا کہ اسے بھوک نہیں تھی؟ اور کیا وہ گریگر کے لیے کوئی زیادہ مناسب غذا لائے گی؟ اگر وہ خود سے ایسا نہیں کرتی تو وہ اسے اس جانب متوجہ کرنے کے بجائے وہیں بھوکا رہ کر مرجانے کو ترجیح دے گا۔ حالاں کہ اسے شدید خواہش محسوس ہو رہی تھی کہ وہ صوفے کے نیچے سے باہر آئے، خود کو بہن کے قدموں میں گرا دے اور اس سے گڑگڑا کر التجا کرے کہ وہ اس کے کھانے کو کوئی اور شے لائے۔

اس کی بہن نے حیرت سے دودھ کے برتن کو دیکھا جو لبالب بھرا تھا بس معمولی سا دودھ کناروں سے چھلکا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی اسے اٹھایا، اپنے ننگے ہاتھوں سے نہیں، بلکہ ایک کپڑے کی مدد سے، اور اسے کمرے سے باہر لے گئی۔ گریگر کو شدید تجسس تھا کہ وہ متبادل کے طور پر کیا لائے گی؟ اس نے تصور

میں بہت سی اشیا کو دیکھا۔ لیکن وہ تصور نہیں کرسکتا تھا جو اس کی بہن نے اصل میں اپنی نیک دلی کی وجہ سے اسے فراہم کیا۔ اس کے ذائقے کو جاننے کے لیے وہ ہر غذا ایک اخبار میں ڈال کر لے آئی۔ پرانی نیم باسی سبزیاں، گزشتہ رات کے کھانے میں بچی ہوئی ہڈیاں جن پر لگی سفید چٹنی سخت ہو چکی تھی، کچھ کشمش اور بادام، پنیر کا ایک ٹکڑا جسے دو روز قبل گریگر نے کھانے سے انکار کر دیا تھا، چپاتی کا ایک خشک اور ایک مکھن میں بھیگا ہوا ٹکڑا، اور مکھن میں چپڑا نمکین ڈبل روٹی کا ٹکڑا۔ اس کے علاوہ اس نے برتن بھی دوبارہ وہاں رکھ دیا شاید جسے مکمل طور پر گریگر کے لیے مختص کر دیا گیا تھا، اور جس میں پانی بھرا تھا۔

اپنے جذبات کی نزاکت کی وجہ سے یہ جانتے ہوئے کہ اس کی موجودگی میں گریگر نہیں کھائے گا، وہ فوراً کمرے سے باہر چلی گئی اور حتیٰ کہ دروازے کو تالا لگا دیا تا کہ گریگر جان لے کہ وہ حسب خواہش پرسکون ہو سکتا تھا۔ گریگر کی ننھی ٹانگیں شدت سے متحرک ہوئیں کہ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ اس کے زخم کسی طرح سے پہلے ہی مندمل ہو چکے تھے۔ اسے چلنے میں چنداں دقت نہیں ہوئی۔ اس پر اسے حیرت بھی ہوئی اور اسے یاد آیا کیسے مہینہ بھر سے زیادہ ہو چکا تھا جب اس کی انگلی پر چاقو سے معمولی زخم آیا تھا اور کیسے پرسوں تک یہ زخم کتنا درد کر رہا تھا۔

''کیا میری حسیات کمزور ہو گئی ہیں؟'' اس نے نہایت رغبت سے پنیر کو چاٹتے ہوئے سوچا جو اسے تمام خوراک میں سب سے پرکشش معلوم ہوا تھا۔ تیزی سے اور آنکھوں میں بھرے طمانیت کے آنسوؤں کے ساتھ اس نے ایک ایک کر کے پنیر، سبزیاں اور چٹنی کھائی۔ اس کے برعکس تازہ خوراک میں اسے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی حتیٰ کہ ان کی بُو سے اس کی طبیعت مالش کرنے لگی اور جو چیزیں وہ کھانا چاہتا تھا، وہ انھیں باقی خوراک سے دور لے گیا۔

جب تک کہ اس کی بہن نے دروازے کے تالے میں چابی گھمائی، ایک اشارے کے طور پر کہ اب اسے کھانا چھوڑ دینا چاہیے، وہ دیر سے کھا پی کر فارغ ہو چکا اور وہیں کاہلی سے لیٹا ہوا تھا۔ اس کھٹکے سے وہ چونکا حالاں کہ وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ وہ لپک کر صوفے کے نیچے گھس گیا۔ لیکن بس مختصر وقفے ہی میں جس دوران اس کی بہن کمرے میں ٹھہری، صوفے کے نیچے گھسے رہنے کے لیے اسے شدید ضبط نفس کی ضرورت پڑی کیوں کہ بسیار خوری سے اس کا پیٹ یوں پھول گیا تھا اور تنگ جگہ پر اس کا سانس گھٹا ہوا تھا۔ دم گھٹنے کے معمولی دورے کے دوران اس نے بہن کو شدت کرب سے باہر ابل آئی

آنکھوں سے دیکھا، جو باقی ماندہ خوراک کو، جس میں وہ چیزیں بھی شامل تھیں جنھیں اس نے چھوا تک نہیں تھا، جھاڑو سے اکٹھا کر کے کوڑے کی ٹوکری میں ڈال رہی تھی۔ گویا وہ خوراک اب کسی کام کی نہیں رہی تھی۔ پھر اس نے جلدی سے ہر شے ٹوکری میں ڈال دی جسے اس نے لکڑی کے ڈھکن سے بند کیا اور اسے اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ پرے مڑی ہی ہوگی کہ گریگر تیزی سے صوفے کے نیچے سے نکل آیا، ہاتھ پیر کھولے اور اپنے جسم کو خوب پھیل جانے دیا۔

اس انداز سے گریگر کو ہر صبح کھانا فراہم کیا جاتا۔ ایک بار صبح جب اس کے والدین اور ملازمہ ابھی سو رہے ہوتے، اور دوسری مرتبہ دوپہر کے کھانے کے بعد، جب اس کے والدین قیلولہ کے لیے لیٹتے، تو اس کی بہن خادمہ کو کسی بہانے گھر سے باہر بھیج دیتی۔ بے شک اس کے والدین اسے بھوک سے مرتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے تھے لیکن شاید وہ خود سے یہ جاننے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے کہ اس نے کیا کھایا، بس بیٹی سے سن کر ہی مطمئن ہو جاتے۔ غالباً ان کی بہن بھی جان بوجھ کر انھیں اس معاملے سے دور رکھتی تھی، جو بس معمولی سا ایک دکھ ہی تو تھا کہ وہ پہلے ہی سے اس سے کہیں بڑے دکھ بھوگ رہے تھے۔

گریگر اس بارے میں کچھ بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس صبح اس کے گھر والوں نے ڈاکٹر اور تالا کھولنے والے کو دوبارہ ٹالنے کے لیے کیا کیا بہانے کیے تھے۔ چوں کہ وہ اسے سمجھ ہی نہیں سکتے تھے، کوئی بھی نہیں، حتیٰ کہ اس کی بہن بھی نہیں۔ لیکن وہ سوچتا کہ وہ شاید انھیں سمجھ سکتا تھا۔ اور یوں جب اس کی بہن کمرے میں داخل ہوتی تو وہ اسے سننے کی کوشش کرتا اور اسے اس کے ٹھنڈے سانس لینے اور اولیا سے مانگی گئی دعائیں سنائی دیتی تھیں۔ بعد میں کہیں جب وہ اس نئی صورتحال سے مانوس ہوگئی تو گریگر کو کبھی کبھار کوئی ایسی بات سننے کو مل جاتی جو دوستانہ جذبے کا اظہار ہوتی یا ایسا ہی کچھ ظاہر کرتی۔

''آج اسے کھانا پسند آیا'' وہ کہتی جب گریگر واقعی سب کچھ چٹ کر جاتا۔ جب کہ اس کے برعکس صورت حال میں، جیسا آہستہ آہستہ اکثر و بیشتر ہونے لگا تھا، وہ دکھی لہجہ میں کہتی ''آج پھر سب کچھ ویسے پڑا ہے۔''

گریگر کو ویسے تو گھر کی کوئی بات نہیں بتائی جاتی تھی لیکن وہ بغلی کمرے میں سے کافی کچھ سن لیتا۔ جونھی اسے کسی کمرے میں آواز سنائی دیتی وہ بھاگ کر دروازے سے لگ کر کھڑا ہو جاتا اور اپنا سارا جسم اس سے لگا دیتا۔ خاص طور پر شروع کے دنوں میں کوئی گفتگو اس گھر میں ایسی نہیں ہوتی تھی جس کا تعلق کسی

نہ کسی حوالے سے گریگر سے نہ ہو، بس اسے خفیہ رکھا جاتا۔ دو دن تک ہر کھانے کے بعد ہونے والی گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ انھیں اب کیا کرنا چاہئے؟ لیکن وہ اسی موضوع پر کھانوں کے درمیانی وقفوں میں بھی بات کرتے۔ کم از کم دو افراد خانہ ہر وقت گھر میں موجود رہتے کیوں کہ کوئی بھی وہاں اکیلا رہنے پر آمادہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ کبھی کسی بھی صورت میں گھر کو خالی چھوڑ کر جاتے۔

علاوہ ازیں پہلے دن ہی ملازمہ، جس کے بارے میں یہ واضح نہیں ہے کہ وہ اس واقعہ کے بارے میں کیا کچھ جانتی تھی، اس کی ماں کے پیروں میں گر گئی اور اس سے فوری چھٹی کی درخواست کی اور جب پندرہ منٹ کی بحث و تکرار کے بعد وہ گھر کو روانہ ہوئی تو اس نے آنسو بہاتے ہوئے اپنے برخاست کیے جانے پر اس کی ماں کا شکریہ ادا کیا۔ گویا ان لوگوں نے اس پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو۔ اور اگر چہ اس سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا تھا لیکن اس نے پھر بھی وعدہ کیا کہ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گی کہ یہاں کیا کچھ ہوا۔ کوئی معمولی سی بات بھی نہیں۔

اب اس کی بہن کو اس کی ماں کے ساتھ مل کر کھانا پکانے کی ذمہ داری سنبھالنا پڑی حالاں کہ اس سے کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی کیوں کہ وہ لوگ کچھ کھاتے ہی نہیں تھے۔ گریگر کو اکثر سنائی دیتا کہ گھر کا کوئی فرد دوسرے کو کھانے کی پیشکش کرتا اور اسے عموماً کچھ ایسا ہی جواب ملتا ''شکریہ۔۔۔۔۔۔ پیٹ بھرا ہوا ہے۔'' غالباً انھوں نے شراب تو بالکل ہی ترک کر دی تھی۔ کبھی کبھار اس کی بہن باپ سے پوچھتی کہ کیا وہ بیئر پیے گا اور پھر خود ہی اسے باپ کے لیے لانے کی پیش کش بھی کرتی۔ لیکن جب وہ جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار کرتا تو اس کے ممکنہ تحفظات دور کرنے کے لیے کہتی کہ وہ نگران کی بیوی کو بیئر لینے بھیج دے گی۔ لیکن پھر اس کا باپ واضح طور پر نہ کہہ دیا اور یہ کہ اس بارے میں مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔

اس حادثہ کے بعد پہلے ہی روز اس کے والد نے اپنی بیوی اور بیٹی کو خاندان کی مالی صورت حال اور آئندہ کے متوقع حالات سے آگاہ کیا۔ کبھی کبھار وہ اپنی کرسی سے اٹھتا اور چھوٹے سیف میں سے چند دستاویز یا کوئی نوٹ بک نکال لیتا جسے اس نے پانچ سال پہلے اپنے کاروبار کے زوال کے وقت سے سنبھال کر رکھا تھا۔ سیف کا پیچیدہ قفل کھولے جانے اور مطلوبہ شے تلاش کیے جانے کے بعد اسے پھر سے بند کیے جانے کی آواز صاف سنائی دیتی۔ اس کے باپ کی طرف سے کی جانے والی یہ وضاحتیں پہلی

پر لطف شے تھی جو گریگر کو اپنی قید میں سننے کو ملی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ شاید اس کے باپ کے کاروبار سے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ کم از کم اس کے باپ نے اسے اس تاثر کے برعکس کبھی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ نہ گریگر ہی نے کبھی اس سے اس بارے میں کچھ پوچھا۔

ہمیشہ گریگر کی واحد خواہش یہ رہی کہ وہ اپنے تمام وسائل کو استعمال کرتے ہوئے اپنے خاندان کو کاروباری گھاٹے کو ممکنہ حد تک تیزی سے فراموش کرنے میں مدد دے جس نے انھیں سنگین حالات سے دوچار کیا۔ اس نے خاص طور پر غیر معمولی مشقت سے کام کیا، پورے جوش وخروش کے ساتھ جس نے اسے تقریباً راتوں رات ایک جونیئر کلرک سے ایک سفری تاجر بنادیا اور اس کے ساتھ ہی آمدنی کے امکانات بھی بڑھا دیئے۔ گریگر نے اپنی کامیابی کو دولت کی صورت میں تبدیل کیا جسے وہ اپنے خوش اور حیرت زدہ خاندان کے سامنے میز پر رکھ سکتا تھا۔ وہ اچھے زمانے تھے لیکن وہ پھر کبھی نہیں آئے، کم از کم ویسی شان وشوکت کے ساتھ نہیں، حالاں کہ بعد میں بھی گریگر نے بہت کچھ کمایا کہ اس کی یہ حیثیت ہوگئی تھی کہ وہ تمام گھر کی معاشی ذمہ داریوں کو اکیلا ہی پورا کر سکے، اور اس نے ایسا ہی کیا۔

وہ سب اس آسودہ حالی کے عادی ہو گئے، گریگر اور اس کے اہل خانہ، دونوں ہی۔ وہ شکر گزاری کے ساتھ رقم وصول کرتے، اور وہ انھیں رقم دے کر خوشی محسوس کرتا، حالاں کہ اس کے بدلے میں اب مزید گہری محبت وصول نہیں ہوتی تھی۔ گریگر اب صرف اپنی بہن کے نزدیک تھا۔ اس کے برعکس اس کی بہن موسیقی کی گرویدہ تھی اور ایک ہونہار اور متاثر کن وائلن نواز بھی۔ یہ اس کا خفیہ منصوبہ تھا کہ وہ اگلے سال بہن کو موسیقی کی تعلیم کے لیے پیٹرز برگ میں کنزرویٹوریم میں بھیجے گا جہاں تعلیم بہت مہنگی تھی لیکن اس خرچ کو اس نے کسی اور طرح سے پورا کرنا تھا۔ گھر میں گریگر کے مختصر قیام کے وقفوں میں اپنی بہن سے بے تکلف گفتگو کے دوران کنزرویٹوریم کا ذکر بھی ہوتا لیکن اس طور جیسے وہ کوئی ایسا خواب دیکھ ہو جس کی تعبیر ممکن نہیں تھی۔ ان کے والدین اس معصومانہ گفتگو کو خاطر میں نہ لاتے، لیکن گریگر کا ارادہ مصمم تھا اور اس نے سوچ رکھا تھا کہ اس سال کرسمس کے موقع پر وہ اپنے عظیم فیصلے کا اعلان کرے گا۔

موجودہ حالات میں یہ ساری باتیں جو اس کے دماغ میں گھومتی رہتی تھیں، بالکل بے فائدہ تھیں۔ کہ وہ دروازے سے چپکا کھڑا اور سن رہا ہے۔ کبھی کبھار وہ تھک کر سننا چھوڑ دیتا، اس کا سر بے احتیاطی سے دروازے پر گر جاتا۔ لیکن وہ اسے پھر سے اٹھا لیتا جیسے نئے سرے سے کیوں کہ سر کے ٹکرانے کی

آواز فوراً دوسرے کمرے میں سن لی جاتی۔ وہاں یک لخت خاموشی چھا جاتی۔ ''وہ اب کیا کر رہا ہوگا؟'' اس کا باپ کچھ توقف کے بعد کہتا، ظاہر ہے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے۔ اور پھر کچھ دیر بعد گفتگو کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جاتا۔

جب باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے اس کا باپ خود کو بار بار دہراتا، کچھ تو اس لیے کہ کاروباری معاملات سے علیحدہ ہوئے ایک زمانہ ہو چلا تھا، اور کچھ اس لیے کہ گریگر کی ماں کو پہلی بار سمجھانے سے بات بالکل سمجھ میں نہ آتی۔ ان بار بار کی جانے والی وضاحتوں ہی سے گریگر کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تمام تر بدقسمتی کے باوجود پچھلے وقتوں سے بچائی ہوئی کچھ رقم ابھی موجود تھی۔ یہ بہت زیادہ نہیں تھی لیکن اس دوران میں استعمال نہیں کیا گیا تھا اور اس پر کچھ سود اکٹھا ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں گریگر ہر ماہ گھر میں جو رقم دیتا تھا وہ سبھی خرچ نہیں ہوتی تھی۔ معمولی سی ہی رقم وہ اپنے لیے رکھتا تھا۔ یوں کچھ یہ رقم بھی پس انداز کی گئی تھی۔ دروازے کے پیچھے گریگر نے اس غیر متوقع احتیاط پسندی پر خوشی سے سر ہلایا۔ وہ یہ اضافی رقم اپنے باس کو دے کر اپنے باپ کے قرض کم کر سکتا تھا، اور وہ دن جب وہ خود کو مکمل طور پر اس بوجھ سے آزاد کر لیتا، جلد آ سکتا تھا لیکن اب یہی بہتر تھا جیسا اس کے باپ نے طے کیا تھا۔

یہ سرمایہ بہر حال اتنا نہیں تھا کہ اس کے سود سے خاندان کی ضروریات زندگی پوری ہوتیں۔ یہ سرمایہ آئندہ صرف دو ایک سالوں کے لیے ہی ان کی ضروریات پوری کرنے کے اہل تھا۔ یہ کہنا چاہئے کہ یہ وہ سرمایہ تھا اسے استعمال ہی نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہنگامی صورت حال کے لیے علیحدہ رکھ لینا چاہئے تھا۔ گھر کا خرچہ چلانے کے لیے بہر حال مزید رقم کمانے کی ضرورت تھی۔ اس کا باپ صحت مند مگر بوڑھا تھا اور خود پر اعتماد کھو چکا تھا۔ گزشتہ پانچ برسوں میں، جو اس نے کام کیے بغیر گزارے تھے، کہ یہ اس کی تناؤ اور ناکامی سے بھری ہوئی زندگی میں پہلی چھٹی تھی، وہ کافی فربہ اور کاہل اور کام چور بھی ہو چلا تھا۔ تو پھر کیا گریگر کی بوڑھی ماں گھر سے نکلے اور کمائے۔ وہ دمہ کی مریض تھی اور اس کے لیے تو گھر میں گھومنا پھرنا ہی محال ہوتا تھا، اور وہ ہر دوسرے دن دمے کے دورے میں کھلی کھڑکی کے برابر صوفے پر لیٹی سانس لینے کی تگ و دو کر رہی ہوتی تھی۔ تو کیا اس کی بہن کمانے کے لیے گھر سے باہر جائے گی؟ وہ تو سترہ سال کی نو عمر لڑکی تھی۔ اب تک اس کی زندگی ناز و نعم میں گزری تھی، نئے کپڑے پہننے، دیر تک سوئے رہنے، ماں کے ساتھ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے، کبھی کبھار گھر سے باہر کسی تقریب وغیرہ میں جانے اور سب

سے بڑھ کر وائلن بجانے میں۔ جب بھی وہ پیسہ کمانے کے مسئلے پر بات شروع کرتے، تو گریگر لڑکھڑا کر دروازے سے ہٹ آتا اور پھر اس کے برابر ہی صوفے کے ٹھنڈے چمڑے پر خود کو گرا دیتا جیسے وہ شدید ندامت اور غم سے دہک رہا ہو۔

وہ اکثر تمام رات وہاں پڑا رہتا، بغیر ایک پل کو بھی آنکھ لگائے اور صوفے کے چمڑے کو پیروں سے کھرچتے ہوئے۔ یا کسی طرح پورا زور لگا کر کرسی کو گھسیٹ کر کھڑکی تک لاتا اور اس پر چڑھ کر کھڑکی کی دہلیز تک جاتا اور کرسی کے سہارے کھڑکی پر جھکتا اور کھڑکی سے باہر جھک کر تکتا۔ ایسا کرنے سے وہ آزادی کے بھرپور احساس سے محظوظ ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن اب ایسا کرنے کا مطلب تجربہ کرنے کے بجائے پرانی یادوں کو تازہ کرنا تھا۔ کیوں کہ یوں اس نے جو کچھ دیکھا وہ روز بروز مبہم ہو رہا تھا، حتیٰ کہ وہ چیزیں بھی جو بہت قریب تھیں۔ وہ ہمیشہ گلی کے دوسرے سرے پر واقع ہسپتال کے منظر کو برا بھلا کہتا لیکن اب یہ اس کی نظر کی پہنچ سے دور تھا، اور اگر اسے یہ علم نہ ہوتا کہ وہ چارلوٹن سٹراس میں رہتا ہے جو شہر کے وسط میں ہونے کے باوجود ایک خاموش گلی تھی، تو ضرور وہ سوچتا کہ وہ کھڑکی کے باہر دور تک پھیلے ایک وسیع وعریض صحرا کو دیکھ رہا تھا جہاں بھورا آسمان اور بھوری زمین یوں گڈمڈ ہو رہی تھیں کہ انھیں علیحدہ کرنا ممکن نہیں تھا۔

تفصیلات پر نگاہ رکھنے والی اس کی بہن کے لیے کرسی کو دو مرتبہ کھڑکی کے قریب دیکھنا یہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ وہ اسے کمرے کی صفائی کے بعد ہمیشہ واپس اسی جگہ رکھ دے اور کھڑکی کا پٹ بھی کھلا رہنے دیا کرے۔

اگر گریگر کچھ بولنے کے قابل ہوتا اور ان تمام انتظامات پر بہن کا شکریہ ادا کر پاتا جو اس نے اس کے لیے کیے تو یہ سب کچھ برداشت کرنا اس کے لیے سہل ہوتا لیکن اس صورت حال میں یہ بات اسے اذیت دیتی۔ اس کی بہن خاص طور پر اپنے کام کے ناگوار پہلوؤں کو گوارہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتی اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ اس میں کامیاب بھی ہوئی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ گریگر خود بھی اس قابل ہو گیا کہ بہتر انداز میں ہر بات سمجھ سکے۔

اب جونہی وہ کمرے میں داخل ہوتی، گریگر کو ناگواری کا احساس ہوتا۔ وہ اندر آتے ہی فوراً دروازہ بند کر دیتی اس احتیاط کے طور پر کہ کوئی دوسرا گریگر کے کمرے کا منظر نہ دیکھ پائے۔ پھر وہ سیدھے کھڑکی

کی جانب لپکتی اور عجلت میں اس کے پٹ وا کرتی جیسے کمرے میں اس کا دم گھٹا جا رہا ہو۔ چاہے سخت سردی ہی کیوں نہ ہو وہ کچھ دیر وہاں کھڑی ہوتی اور ٹھنڈی ہوا میں گہرے سانس بھرتی۔ وہ دن میں دو بار اپنی بھاگ دوڑ اور پر شور عجلت سے گریگر کو پریشان کرتی۔ وہ تمام وقت صوفے کے نیچے لیٹا کانپتا رہتا، اچھی طرح سے جانتے ہوئے کہ وہ اسے اس ناگوار صورت حال سے ضرور بچا لیتی اگر اس کے لیے گریگر کی موجودگی میں بند کھڑکیوں کے ساتھ اس کمرے میں رہنا ممکن ہوتا۔

گریگر کی قلب ماہیت کے تقریباً ایک ماہ بعد جب اس کی ظاہری حالت سے خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تھی، اس کی بہن ایک روز معمول کی نسبت جلد آ گئی اور اسے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پایا، یکسر بے حرکت اور شاید وہاں سے انتہائی خوف ناک دکھائی دیتا ہوا۔ اپنے طور پر اگر وہ کمرے میں داخل نہ ہوتی تو یہ بات گریگر کے لیے باعث تعجب نہ ہوتی کیوں کہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس کی بہن کے لیے اس کی موجودگی میں فوری طور پر کھڑکی کا پٹ کھولنا آسان نہیں تھا۔ لیکن ایک تو وہ اندر داخل نہیں ہوئی بلکہ سیدھی پیچھے مڑی اور دروازہ دھماکے سے بند کر کے بھاگ گئی۔ کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ گریگر نے اپنی بہن کو دھمکایا یا اسے کاٹ کھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ جلدی سے صوفے کے نیچے چھپ گیا۔ آدھا دن گزرنے کے بعد ہی وہ دوبارہ کمرے میں آئی۔ اس بار وہ معمول کی نسبت زیادہ محتاط دکھائی دیتی تھی ۔اس سے گریگر کو احساس ہوا کہ وہ اب بھی اسے مکروہ دکھائی دیتا تھا اور یہ کہ ایسا آئندہ بھی رہے گا۔ اور یہ کہ یونہی بھاگ جانے کی خواہش پر اسے تب بھی قابو پانا ہوتا ہوگا جب وہ اس کا کچھ حصہ صوفے کے نیچے سے باہر کو نکلا ہوا دیکھتی ہوگی۔ ایک دن اپنی بہن کو اس منظر سے بھی نجات دلانے کے لیے اس نے چار گھنٹے کی محنت سے بستر کی چادر گھسیٹ کر صوفے پر اپنی کمر تک پھیلائی اور اسے یوں ترتیب دیا کہ وہ اس میں مکمل چھپ جائے اور اس کی بہن کو اگر کسی کام سے نیچے جھکنا پڑے تب بھی وہ اسے دکھائی نہ دے۔ اگر اس کی بہن کو یہ اہتمام غیر ضروری لگے تو اسے بس اتنا ہی کرنا ہوگا کہ اسے وہاں سے اٹھا لے کیوں کہ یہ بات گریگر کو بھی پسند نہیں تھی کہ وہ اس طرح مکمل طور پر خود کو اس سے علیحدہ کر لے۔ لیکن اس نے چادر کو چھوا بھی نہیں۔ گریگر کو تو ایسا بھی لگا کہ جب ایک بار اس نے چادر کے نیچے سے احتیاط سے اپنی بہن کو جھانکا کہ جان سکے اسے یہ انتظام کیسا لگا تو اس کے چہرے پر شکر گزاری کے احساس کی جھلک تھی۔

شروع کے چودہ دن اس کے ماں باپ اتنی ہمت مجتمع نہیں کر سکے کہ اسے دیکھنے اس کے کمرے

میں آتے۔اب وہ اکثر اسے بہن کے کام کی تعریف کرتے سنائی دیتے تھے جو وہ اب کر رہی تھی، جب کہ اس سے پہلے وہ اسے ایک کاہل اور کام چور لڑکی گردانتے تھے اور اکثر اس سے نالاں رہتے۔لیکن اب وہ دونوں ماں اور باپ گریگر کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے انتظار کرتے جب کہ اس کی بہن کمرے کی صفائی کرتی، اور جونھی وہ باہر جاتی تو انھیں اندر کی ہر شے کے بارے میں بتاتی مثلاً آج گریگر نے کیا کچھ کھایا؟ اس کا رویہ کیسا تھا؟ اور کیا اس کی کیفیت میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی تھی یا نہیں؟ گریگر کی ماں ہمیشہ اندر جانے اور گریگر سے ملنے پر اصرار کرتی لیکن اس کا شوہر اور بیٹی اسے مختلف حیلوں سے کمرے میں جانے سے باز رکھتے۔گریگر غور سے ان دلائل سنتا اور ان سے کلی اتفاق کرتا۔کچھ عرصہ بعد اس کی ماں کو بزور روکا جانے لگا جس سے وہ چیختی ''مجھے گریگر کے پاس جانے اور اسے دیکھنے دو۔وہ میرا بد قسمت بیٹا ہے۔کیا تمھیں احساس نہیں ہے کہ میرا اس کے پاس جانا ضروری ہے۔''

گریگر سوچتا کہ شاید اس کی ماں کو کمرے میں آنے کی اجازت ملنی چاہیے تھی۔روز روز نہ سہی لیکن ہفتے میں ایک بار۔وہ بہر حال اس کی بہن سے زیادہ سمجھ دار تھی جو اپنی تمام جرات مندی کے باوجود بہر حال ایک بچی ہی تو تھی اور اسے اپنے کام کا ویسا ادراک نہیں تھا جیسا کسی بالغ فرد کو ہو سکتا تھا۔

اپنی ماں کو دیکھنے کی گریگر کی خواہش جلد ہی پوری ہوئی۔اپنے والدین کا خیال کرتے ہوئے وہ کوشش کرتا کہ دن میں وہ اسے کھڑکی میں کھڑے ہوئے نہ دیکھ پائیں۔کمرے کی چند مربع میٹر جگہ میں اسے رینگنے کے لیے زیادہ جگہ نہ مل پاتی۔تمام رات خاموشی سے لیٹے رہنا مشکل تھا۔خوراک میں بھی اس کی پہلی سی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔اس لیے تفریح طبع کے لیے اس نے دیواروں اور چھت پر رینگنے کو اپنی عادت بنالیا۔چھت سے لٹکے رہنے میں اسے بہت حظ ملتا۔یہ شغل فرش پر لیٹے رہنے سے کہیں مختلف تھا۔ وہ زیادہ آسانی سے سانس لے پاتا۔وہ اپنے جسم کو معمولی سا جھلاتا رہتا۔اور وہاں او پر آرام دہ اور آسودہ کیفیت میں ایسا ہو سکتا تھا کہ وہ چھت سے گر کر خود کو محظوظ کرے اور دھپ سے فرش آن گرے۔لیکن اب اسے پہلے کی نسبت اپنے جسم پر زیادہ کنٹرول تھا۔وہ چھت سے گرتا بھی تو اسے کوئی نقصان نہ ہوتا۔

جلد ہی اس کی بہن نے اس کے نئے مشغلے کو جان لیا۔وہ دیواروں پر رینگتے ہوئے اپنے تلووں سے لگے لیس دار مواد سے اپنے پیچھے باریک لکیریں چھوڑ جاتا۔اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اس کی راہ میں حائل ہونے والے فرنیچر خاص طور پر درازوں والی الماری اور میز پرے ہٹا دیا جائے۔اب یہ ایسا

کام نہیں تھا جسے وہ اکیلی ہی کر پاتی۔ اپنے باپ کو بلانے کی وہ جرات نہیں کر سکتی تھی۔ سولہ سالہ ملازمہ نے باورچن کے جانے کے بعد سے ہمت سے کام سنبھالا ہوا تھا۔ لیکن وہ بھی اس کے لیے مددگار نہیں ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ گھر والوں کی خاص اجازت سے باورچی خانے کا دروازہ سارا وقت بند رکھتی اور صرف ضرورت پڑنے پر ہی اسے کھولتی۔ اس کی بہن کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایسے وقت جب گریگر کا باپ گھر پر نہ ہو، وہ اپنی ماں کو مدد کے لیے ساتھ لائے۔

گریگر کو کمرے کے قریب آتے ہوئے ماں کی خوشی کی آواز گریگر کو سنائی دی لیکن دروازے پر پہنچ کر وہ ایک دم سے بجھ گئی۔ پہلے، ظاہر ہے کہ گریگر کی بہن کمرے میں داخل ہوئی اور جائزہ لیا کہ کیا سب کچھ وہاں درست تھا۔ اس کے بعد ہی اس نے ماں کو اندر آنے کو کہا۔ گریگر نے جلدی سے چادر کو صوفے سے نیچے کھینچ لیا اور اسے کئی جگہ سے موڑ لیا تا کہ ایسا معلوم ہو کہ یہ اتفاقاً گری تھی۔ اس نے چادر سے باہر جھانکنے سے بھی مکمل احتراز کیا۔ اس نے کسی اور موقع پر ماں کو دیکھنے کی خواہش کو ٹال لیا۔ بس اسی بات پر خوش تھا کہ وہ اندر آئی تھی۔

''اندر آ جاؤ۔ وہ چھپا ہوا ہے'' اس کی بہن نے ہاتھ کے اشارے سے ماں کو اندر بلاتے ہوئے کہا۔ درازوں والی پرانی الماری اتنی بھاری تھی کہ ان کمزور عورتوں کے لیے اسے ہلانا مشکل تھا لیکن گریگر صاف سن سکتا تھا کہ کیسے انھوں نے اسے اپنی جگہ سے سرکایا۔ اس کی بہن اس کام کے زیادہ سخت حصے کی ذمہ داری اپنے سر لیتی اور اپنی ماں کی سرزنش کو نظر انداز کر دیتی کہ اسے زیادہ بوجھ نہیں اٹھانا چاہیے۔ اس کام میں بہت دیر لگی۔ قریب پندرہ منٹ کی مسلسل زور آزمائی کے بعد اس کی ماں نے کہا کہ انھیں اس الماری کو وہیں پڑے رہنے دینا چاہئے جہاں یہ اب تھی کیوں کہ ایک تو یہ اتنی بھاری تھی کہ گریگر کے باپ کی واپسی تک اس کام کو پورا کرنا ممکن نہیں تھا جب کہ اسے کمرے کے وسط میں یونہی چھوڑ دیا جائے تو یہ گریگر کے لیے چلنے پھرنے میں زیادہ دشواری پیدا کرے گی۔ پھر یہ ضروری نہیں تھا کہ فرنیچر کا ہٹایا جانا واقعی گریگر کے لیے سود مند ثابت ہو گا۔ اس نے بالکل برعکس سوچا۔ ننگی دیواروں کو دیکھ کو وہ دل کی گہرائیوں سے غم زدہ ہو گئی۔ ایسا ممکن ہے کہ گریگر بھی ایسا ہی محسوس کرے۔ وہ طویل عرصے سے کمرے میں اس فرنیچر کا عادی تھا اور اسے لگے گا کہ ایک خالی کمرے میں اسے تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔

''یقیناً ایسا ہی محسوس کرتا ہو گا'' اس کی ماں نے یوں دھیمی آواز میں سرگوشی کے انداز میں کہا جیسے وہ

نہیں چاہتی تھی کہ گریگر (جس کے بارے میں وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں تھا) اس کے لہجہ ہی کو سن پائے۔ چوں کہ وہ قائل تھی کہ گریگر کو اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں، وہ مزید بولی ''کیا یوں فرنیچر باہر لے جانے سے گریگر یہ نہیں سوچے گا کہ ہم اس کی صحت یابی کی اُمید کھو بیٹھے ہیں اور اسے اس کے حال پر چھوڑ رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ ہم گریگر کے کمرے کو ویسے ہی رہنے دیں جیسے یہ ہمیشہ سے ہے۔ تاکہ جب وہ صحت یاب ہو جائے تو اپنے کمرے کی ہر شے کو اپنی جگہ پر موجود پائے۔ اس طرح وہ ماضی کے تلخ واقعات کو آسانی سے بھلا دے گا۔''

ماں کی گفتگو سن کر گریگر کو احساس ہوا کہ گزشتہ دو ماہ میں کسی سے براہ راست گفتگو نہ ہو سکنے اور اس کا خاندان جیسی زندگی گزار رہا تھا، اس کی یکسانیت سے وہ الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ کیوں وہ اپنے کمرے کو فرنیچر سے خالی دیکھنا چاہتا تھا۔ کیا وہ اپنے کمرے کو واقعی ایک غار، ایک گرم کمرے میں بدلنا چاہتا تھا جس میں اس کا موروثی عمدہ فرنیچر موجود تھا۔ اس سے اسے ہر طرف کسی رکاوٹ کے بغیر رینگنے کی آزادی حاصل ہو گی۔ لیکن اس سے وہ اپنا ماضی بھی بھول جائے گا جو اس کے انسان ہونے سے جڑا تھا۔ وہ اسے بھولنے کے بہت قریب تھا اور یہ اس کی ماں کی آواز تھی جسے اس نے مدت سے نہیں سنا تھا اور اب جس نے اسے چونکا یا۔ کسی شے کو ہلایا نہیں جانا چاہئے تھا۔ ہر شے یہیں رہے گی۔ یہ فرنیچر اس پر جو اثر چھوڑتا ہے، اس کے بغیر وہ اپنی حالت میں بہتری نہیں لا سکتا۔ اور اگر یہ فرنیچر اس کے خالی ذہن کے ساتھ رینگنے میں رکاوٹ ڈالتا ہے تو یہ کوئی نقصان نہیں بلکہ الٹا اس کے فائدہ ہی میں تھا۔

بدقسمتی سے اس کی بہن متفق نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہو گیا تھا اور ایسا کسی وجہ کے بغیر نہیں تھا کہ وہ اپنے والدین کے سامنے ان باتوں کے حوالے سے گریگر کی ترجمان تھی جو اس سے متعلق تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ماں کا مشورہ یہ جواز فراہم کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ اصرار کرے کہ نہ صرف میز اور درازوں والی الماری اپنی جگہ سے ہٹائی جائے جیسا کہ اس نے پہلے سے سوچ رکھا تھا بلکہ اس اہم صوفے کے اردگرد بھی فرنیچر کو پرے ہٹایا جائے۔

یہ بلاشبہ طفلانہ ڈھٹائی سے بڑھ کر کچھ تھا یا غیر متوقع اعتماد تھا جو اس نے ابھی حاصل کیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنی بات پر اصرار کر رہی تھی۔ اس نے یہ دیکھا تھا کہ گریگر کو رینگنے کے لیے کھلے کمرے کی

ضرورت تھی جب کہ صاف دکھائی دیتا تھا کہ فرنیچر اب اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ اس عمر کی لڑکیاں مختلف باتوں کے بارے میں جذباتی ہو جاتی اور ایسا محسوس کرتی ہیں کہ چاہے کیسے بھی، انھیں اپنی بات منوانی ہے۔ شاید اسی باعث اسے تحریک ہوئی کہ اسے اپنے بھائی کی حالت زیادہ گھمبیر دکھائی دے تاکہ وہ اس کے لیے زیادہ سہولت پیدا کر سکے۔ تب گریٹ ہی شاید واحد فرد ہوگی جو ایسے کمرے میں داخل ہونے کی جرات کر سکے جس میں گریگر ننگی دیواروں پر رینگ رہا ہو۔

اس لیے اس نے اپنی ماں کی تجویز رد کرنے کا فیصلہ کیا۔ گریگر کی ماں پہلے ہی اس کمرے میں خود کو آرام دہ محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس نے جلد ہی اس بارے میں گفتگو ختم کر دی اور اپنی پوری طاقت سے درازوں والی الماری کو سرکانے میں بیٹی کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اس الماری کے بغیر تو وہ پھر بھی گزارہ کر سکتا تھا لیکن لکھنے کی میز کو تو کمرے ہی میں رہنا چاہیے۔ وہ دونوں عورتیں کراہتی ہوئیں الماری کو دھکیل کر کمرے سے باہر لے گئیں جب گریگر نے صوفے کے نیچے سے اپنا سر باہر نکالا تاکہ دیکھ سکے کہ وہ اس معاملے میں کیا کر سکتا تھا۔ اس نے ممکنہ حد تک پوری احتیاط کی اور خیال رکھا لیکن بدقسمتی سے اس کی ماں پہلے کمرے میں داخل ہوئی جب کہ گریٹ دوسرے کمرے میں الماری کے گرد بازو پھیلائے اکیلی ہی اسے دائیں بائیں جھلا رہی تھی گو ایک انچ بھی آگے نہ سرکا پائی تھی۔

گریگر کی ماں اس کی نئی جون سے مانوس نہیں تھی۔ اس کی صورت سے دہشت کھا سکتی تھی۔ اس لیے وہ فوراً صوفے کے نیچے دوسرے کونے میں چلا گیا لیکن اپنی گھبراہٹ میں وہ صوفے پر سے چادر کو سرکنے سے نہ روک سکا۔ بس اسی نے اس کی ماں کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ وہ کچھ دیر ساکت کھڑی رہی اور پھر واپس مڑ گئی۔

گریگر نے خود کو تشفی دی کہ یہ تمام تبدیلیاں یکسر غیر معمولی نہیں تھیں محض اس کے کمرے کا کچھ فرنیچر اپنی جگہ سے ہٹایا جا رہا تھا لیکن جلد ہی وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ ان دونوں عورتوں کی اٹھا پٹخ، ان کا ایک دوسرے کو پکارنا، فرش سے فرنیچر کی رگڑ، یہ سب کچھ اس کے ہر طرف ایک طوفان بدتمیزی کے مترادف تھا۔ اپنے سر اور ٹانگوں کو سمیٹے اور جسم کو فرش سے چمٹائے ہوئے وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ زیادہ دیر اس سے یہ صورتحال برداشت نہیں ہو سکے گی۔ وہ دونوں اس کا کمرہ خالی کر رہی تھیں، ہر اس شے کو باہر لے جا کر جو اسے پسند تھی۔ الماری وہ پہلے ہی باہر لے جا چکی تھیں جس میں اس کی آری اور

دیگر اوزار پڑے تھے لیکن اب لکھنے کی میز کو کھینچنے کے درپے تھیں جس کے نیچے فرش خستہ ہو چکا تھا۔ میز جس پر وہ کاروباری زیرتربیت کے طور پر، ہائی سکول کے زمانے میں، حتیٰ کہ جب وہ چھوٹی عمر کے بچوں کے سکول میں تھا تب بھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے انتظار نہیں کر سکا کہ کیا واقعی دونوں عورتوں کی نیت نیک تھی۔ وہ تقریباً یہ بھی فراموش کر بیٹھا کہ وہ دونوں کمرے میں موجود تھیں اور یہ کہ وہ اتنی تھک چکی تھیں کہ آپس میں بات کرنا بند کر کے کام میں جتی ہوئی تھیں اور اسے کمرے میں بس ان کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دیتی تھی۔

سو جب وہ دونوں عورتیں دوسرے کمرے میں میز پر جھکی ہوئی اپنا سانس درست کر رہی تھیں، وہ صوفے سے باہر نکل آیا۔ چار بار اپنی سمت تبدیل کی، یہ فیصلہ کیے بغیر کہ وہ پہلے کس شے کو بچائے کہ اس کی نظر دیوار پر ٹنگی سمور میں ملبوس عورت کی تصویر پر گئی جس پر سے وہ سب کچھ اتارا جا چکا تھا جو پہلے اس پر تھا۔ وہ تیزی سے تصویر تک گیا اور اس کے چوکھٹے میں شیشے سے چمٹ کر اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کے گرم پیٹ پر شیشے کی ٹھنڈی سطح کا لمس اچھا لگا۔

یہ تصویر جواب مکمل طور پر اس کے جسم کے نیچے چھپ گئی تھی، کوئی اس سے نہیں چھین سکتا تھا۔ اس نے اپنا سر گھما کر رہائشی کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا تاکہ جان سکے کہ کب ان میں سے کوئی واپس آتی ہے۔

انھوں نے ستانے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ جلد ہی لوٹ آئیں۔ گریٹ نے ماں کو بازو سے تھاما ہوا تھا اور اسے تقریباً سہارا دے کر چل رہی تھی۔

"اب کونسی چیز باہر لے جائیں" گریٹ نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ اس کی نظر دیوار سے چپکے گریگر کی نظروں سے چار ہوئیں۔ شاید صرف اس لیے کہ اس کی ماں وہاں موجود تھی، وہ پرسکون رہی، اور فوراً اپنا چہرہ ماں کی طرف جھکا لیا تاکہ وہ گریگر کو نہ دیکھ پائے اور بولی، تیز تیز اور دہشت زدہ لہجے میں "چلیے کچھ دیر کے لیے واپس ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔"

گریگر سمجھ سکتا تھا کہ اس کی بہن کی منشا کیا تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ماں کو پہلے کسی محفوظ جگہ چھوڑ آئے اور پھر اسے دیوار سے نیچے اتارے۔ خیر وہ جو چاہے اپنی سی کر کے دیکھ لے۔ وہ اس چوکھٹے سے دست بردار نہیں ہوگا۔ اس سے زبردستی کی گئی تو وہ گریٹ کا چہرہ نوچ لے گا۔

گریٹ کے کانپتے ہوئے لہجے سے ماں کی ذہن میں شبہات پیدا ہوئے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ آئی، اور دیوار کے پھول دار کاغذ پر بھورے رنگ کا بڑا ابھار دیکھا اور پھر یہ سوچنے سے پیشتر کہ وہ گریگر ہی ہے، اس نے چیخ ماری ''اوہ خدایا، اوہ خدایا۔'' پورے بازو کھول کر وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئی جیسے وہ ہر شے سے دست بردار ہوگئی ہو اور وہاں بے حرکت پڑی رہی۔

''گریگر'' اس کی بہن نے مٹھی بھینچتے اور غصیلی نظروں سے گریگر کی جانب دیکھتے ہوئے چیخ کر کہا۔ اس کی قلب ماہیت کے بعد سے وہ پہلی مرتبہ اس سے براہ راست مخاطب ہوئی تھی۔ وہ بھاگ کر بغلی کمرے میں گئی تاکہ اپنی ماں کی بے ہوشی کو ختم کرنے کے لیے کوئی بودار نمک لائے۔ گریگر اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس تصویر کی حفاظت تو پھر بھی ہوسکتی تھی۔ اگرچہ وہ مضبوطی سے شیشے سے چمٹا ہوا تھا اور اس سے جدا ہونے کے لیے اسے زور لگانے کی ضرورت پڑی۔ پھر وہ بھی رینگتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا تاکہ ہمیشہ کی طرح اسے کوئی مفید مشورہ دے سکے۔ لیکن وہ بس اس کے عقب میں کھڑے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکا۔ وہ مختلف شیشیوں میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ جونہی وہ پیچھے مڑی گریگر کو دیکھ کر یکدم گڑبڑا گئی اور اس کے ہاتھ سے ایک بوتل نیچے فرش پر گر کر چکنا چور ہوگئی۔ شیشے کا ایک ٹکڑا گریگر کے چہرے میں کھب گیا اور کسی طرح کی تیزابی دوا نے اسے بھگو دیا۔

مزید ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گریٹ نے بقیہ بوتلیں اٹھائیں یعنی جتنی اس کے لیے لے جانی ممکن تھیں اور ماں کی جانب لپکی۔ جاتے جاتے پیر کی ٹھوکر سے پیچھے دروازہ بھیڑ گئی۔ یوں گریگر اپنی ماں سے دور کر دیا گیا تھا جو اسی کی وجہ سے موت کے دھانے پر جا پہنچی تھی۔ اس نے دروازہ کھولنے کی جرات نہیں کی کہ ہو بہن کا تعاقب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی بہن کا ماں کے پاس ٹھہرنا ضروری تھا۔ وہ سوائے انتظار کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بے چینی اور اپنی مذمت کے احساس کے ساتھ وہ رینگنے لگا۔ وہ ہر شے پر رینگنے لگا، دیواروں، فرنیچر، اور چھت، اور آخر شدید الجھاؤ میں جب کہ تمام کمرہ اسے اپنے گرد گھومتا دکھائی دینے لگا تو چکرا کر کھانے کی میز کے درمیان گر گیا۔

وہ کاہلی کے ساتھ کچھ دیر وہاں لیٹا رہا، خاموش اور بے حرکت۔ اس کے گرد گہرا سناٹا تھا، اور شاید یہ ایک اچھا شگون تھا۔ اسی لمحے دروازے کی گھنٹی بجی۔ ملازمہ نے تو اپنے آپ کو باورچی خانے میں بند کیا ہوا تھا۔ گریٹ ہی کو دروازے تک جانا اور اسے کھولنا پڑا۔ اس کے باپ نے اندر آتے ہی پوچھا ''کیا

ہوا؟'' گریٹ کے چہرے سے اس نے پریشانی کو بھانپ لیا ہوگا۔

گریٹ نے اسے غم آگیں آواز میں جواب دیا اور سر اس کی چھاتی سے ٹکا لیا ''ماں بے ہوش ہوگئی تھی۔لیکن اب بہتر ہے۔گریگر باہر آگیا تھا۔''

''مجھے یہی ڈر تھا'' اس کے باپ نے غصے میں کہا ''جیسا میں نے ہمیشہ کہا۔لیکن تم عورتیں کسی کی سنو بھی۔''۔گریگر پر واضح تھا کہ گریٹ نے باپ کو پوری بات نہیں بتائی تھی اور یہ کہ اس کے باپ نے اس کا یہ مطلب لیا تھا کہ کچھ بہت برا ہوا تھا، اور یہ کہ گریگر کسی طرح کی سزا کا حق دار تھا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے اپنے باپ کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔کیوں کہ چاہے ایسا ممکن ہوتا، لیکن اس کے پاس ہر بات کی وضاحت کرنے کی مہلت نہیں تھی۔

وہ میز سے اتر کر اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا اور اس سے لگ کر کھڑا ہوگیا تاکہ جب اس کا باپ ہال سے کمرے میں داخل ہو تو اسے دروازے کے قریب کھڑا دیکھ کر اس کے نیک ارادوں کو فوراً سمجھ جائے کہ گریگر بلا تاخیر اپنے کمرے میں واپس جانا چاہتا تھا۔لہٰذا اسے دھکیلنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ صرف دروازہ کھول دینا کافی ہوگا اور وہ وہاں سے دفعان ہوجائے گا۔

اس کے باپ کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی ایسی باریکیوں پر توجہ دیتا۔'آہ' وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایسے بولا جیسے بیک وقت غصے میں ہو اور خوش بھی ہو۔گریگر نے دروازے سے سر پیچھے موڑ کر باپ کی طرف دیکھا اور پھر اسے کچھ بلند کیا۔اس نے حقیقتاً کبھی اپنے باپ کا اس طور تصور نہیں کیا تھا جیسے وہ اب اس کے سامنے کھڑا تھا۔حال ہی میں ہر طرف رینگنے کی اپنی نئی عادت کی وجہ سے وہ اپنے پچھلے وطیرے کے برعکس گھر میں ہونے والی بات سے بے نیاز ہوتا گیا تھا۔اسے حالات میں تبدیلی کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہئے تھا لیکن پھر بھی، پھر بھی کیا واقعی یہ اس کا باپ تھا؟ وہی تھکا ہارا شخص جسے گریگر اپنے کاروباری سفر سے واپسی پر بستر میں لیٹا ہوا دیکھتا تھا اور وہ شام کو لوٹتا تو وہ شب خوابی کے لباس میں ملبوس آرام کرسی میں بیٹھے ہوئے اس کا استقبال کرتا، اور جو بمشکل کھڑا ہو پاتا لیکن مسرت کے ساتھ اپنے بازو پھیلا دیتا اور جو سال کے دوران کئی موقعوں پر اتوار کو یا چھٹی کے دن گریگر اور اس کی ماں کے درمیان اوورکوٹ میں اچھی طرح لپٹا ہوا چہل قدمی کو نکلتا تو اپنی سست رفتاری کی وجہ سے ان سے پیچھے رہ جاتا اور اور وہ دونوں اس کے لیے اپنی رفتار سست کر لیتے، اور جو چھڑی کو احتیاط کے ساتھ آگے زمین پر ٹکا دیتا اور

جب کوئی بات کہنا چاہتا تو یک لخت رک جاتا اور اس کے تخاطب اس کے گرد جمع ہو جاتے۔

اب وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ سنہری بٹنوں والی چست نیلی وردی میں ملبوس، جیسی وردی بینکنگ انسٹی ٹیوٹ کے قاصد پہنتے ہیں۔ کوٹ کے اونچے سخت کالر سے باہر نکلی ہوئی اس کی مضبوط دوہری ٹھوڑی، گھنی بھوؤں میں ڈھکی ہوئی گہری اور اور تیز آنکھیں تازہ اور چوکنا معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے ہمیشہ الجھے رہنے والے سفید بال نہایت احتیاط اور نفاست سے کنگھی کر کے سر سے چپکائے گئے تھے۔ اس نے غالباً کسی بنک کے سنہری طغرے والی ٹوپی لی اور اسے ترچھے رخ سے کمرے میں پرے صوفے کی جانب اچھال دیا، اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں گھسیڑے اور اپنے لمبے یونیفارم کوٹ کے پلو اٹھا کر غصیلے انداز میں گریگر کی جانب بڑھا۔ غالباً اسے خود بھی شعور نہیں تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا؟ لیکن وہ اپنے قدموں کو غیر معمولی طور پر اونچا اٹھا رہا تھا۔ اس کے جوتوں کے تلوؤں کا حجم دیکھ کر گریگر حیران ہو گیا۔ وہ اس کے سامنے کھڑے رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیوں کہ وہ اپنی نئی زندگی کے شروع سے ہی جانتا تھا کہ اس کے باپ کے خیال میں اس سے ہمیشہ سخت گیری کا رویہ برتنا ضروری تھا۔ اسی لیے اس نے باپ کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ اس کے رکنے پر خود بھی رک جاتا اور چل پڑتا جب وہ چلتا۔ اس طرح ان دونوں نے تمام کمرے کے چند چکر لگائے، کسی نتیجہ خیز کارروائی کے بغیر اور حتی کہ ایسا کوئی تاثر دیئے بغیر کہ وہ ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہوں کیوں کہ سب کچھ بہت آہستگی سے ہو رہا تھا۔ گریگر اس دوران فرش سے دست بردار نہیں ہوا، خاص کر اس ڈر سے کہ دیوار یا چھت پر چڑھ جانا ہو سکتا ہے اس کے باپ کو برانگیختہ کرے۔ جو کچھ بھی وہ کر رہا تھا، یہ بات صاف تھی کہ زیادہ دیر بھاگنے کے عمل کو جاری نہیں رکھ سکے گا۔ کیوں کہ اس کے باپ کے ہر قدم کے مقابلے میں اسے کتنے ہی قدم اٹھانے پڑتے تھے۔ اس کا سانس پھول گیا۔ بچپن میں بھی اس کے پھیپھڑے قابل اعتبار نہیں تھے۔

یوں اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کرنے کی کوشش میں تاکہ وہ بھاگ سکے، وہ بمشکل اپنی آنکھیں کھلی رکھ پاتا تھا۔ اس کی سوچ کا عمل اتنا سست تھا کہ اسے سوائے بھاگنے کے خود کو بچانے کی اور کوئی صورت سجھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ جیسے یہ بات بھول ہی گیا کہ وہ دیواروں کو بھی استعمال کر سکتا تھا جو اگرچہ درزوں اور دستوں سے احتیاط سے آراستہ نقش ونگار والے فرنیچر کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔ تبھی ایک ہلکے وزن کی شے اس کے قریب گری اور لڑھکتی ہوئے اس کے سامنے رک گئی۔ یہ ایک سیب تھا۔ پھر ایسی ہی ایک اور

شے اس کے اوپر گری۔ گریگر خوف سے سہم گیا۔ بھاگتے رہنے کا کوئی مطلب نہیں تھا کہ اس کے باپ نے سیبوں کی بوچھاڑ شروع کر دی تھی۔ اس نے میز پر پڑے برتن میں سے پھل اٹھا کر اپنی جیبیں بھر لی تھیں اور اب نشانہ لینے میں وقت ضائع کیے بغیر ایک کے بعد دوسرا سیب اس پر برسا رہا تھا۔ بغیر تیزی سے اس پر برسا رہا تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے سرخ سیب فرش پر لڑھک رہے تھے، ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے جیسے ان میں بجلی کی موٹریں لگی ہوں۔ ایک سیب نسبتاً کم زور سے گریگر کی پشت سے ٹکرایا اور اسے زخمی کیے بغیر فرش پر لڑھک گیا۔ فوراً بعد ایک اور سیب شدت سے اس کی پشت سے لگا اور اس میں کھب گیا۔ گریگر نے خود کو گھسیٹ کر دور لیجانے کی کوشش کی تا کہ اپنی جگہ تبدیل کر کے اس حیران کن اور غیر معمولی درد سے چھٹکارا پالے۔ لیکن اسے لگا جیسے اسے وہاں گاڑ دیا گیا ہو اور اس نے خود کو پھیلایا، اپنی حسیات کے الجھاؤ کے ساتھ۔

حواس گُل ہونے سے پہلے آخری لمحوں میں اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھلتے دیکھا، اس کی بہن چیخ رہی تھی، اس کی ماں اپنے بلاوز ہی میں بھاگ کر باہر نکل آئی تھی۔ (کہ گریٹ نے ماں کے بے ہوش ہونے کے بعد اس کے کچھ کپڑے اتار دیئے تھے تا کہ اسے سانس لینے میں دشواری نہ ہو۔) وہ اپنے شوہر کی طرف بھاگی۔ اس کے سکرٹس ڈھیلے ہو گئے اور ایک ایک کر کے فرش پر گھسٹنے لگے۔ سکرٹس میں لڑکھڑاتے ہوئے اس نے خود کو اپنے شوہر پر گرا لیا اپنے بازو اس کے گرد لپیٹے ہوئے اس سے مکمل جڑتے ہوئے۔ اس کے بعد گریگر کی بصارت کی حس اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کی ماں اپنے شوہر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

III

کسی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ گریگر کے جسم میں گڑے ہوئے سیب کو باہر نکالے۔ لہذا وہ اس زخم کی واضح یادگار کے طور پر وہیں رہا۔ وہ اسے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا کہ برداشت کر رہا تھا اور اس کی حالت اتنی سنگین تھی کہ حتی کہ اس کا باپ بھی اس کی موجودہ مکروہ اور افسوس ناک ہیئت کے باوجود یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آخر وہ اسی خاندان کا ایک فرد تھا جس سے دشمنوں جیسا رویہ روا رکھنا مناسب نہیں تھا۔ اس کے برعکس خاندان کے طور پر یہ ان کا فرض تھا کہ اس سے کراہت کے احساس کو دبا لیں، اور خود کو پر سکون

رکھیں، اور صرف پرسکون رکھنے کی کوشش کریں۔

ان چوٹوں کی وجہ سے گریگر چلنے پھرنے کی طاقت بہت حد تک کھو چکا تھا، شاید مستقل طور پر۔ اس کی حالت دیرینہ مریض کی سی ہوگئی تھی اور کمرے میں وہ آہستگی سے دیر دیر سے رینگ رینگ کر چلتا۔ دیوار پر رینگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن (اس کے خیال میں) اس خستہ حالی کا ازالہ مکمل طور پر یوں کیا گیا کہ ہر شام کو بیٹھک کی طرف کا دروازہ کھول دیا جاتا۔ اس کی عادت ہوگئی تھی کہ روزانہ دروازہ کھلنے سے ایک دو گھنٹے پہلے وہ اس پر نظریں جمائے رکھتا اور پھر کمرے کے اندھیرے میں لیٹا ہوا، جہاں سے وہ خود دکھائی نہ دے، وہ گھر والوں کو رات کے کھانے کے میز کی روشنی میں بیٹھے ہوئے دیکھتا اور ان کی گفتگو سنتا، ایک طور سے ہر کسی کی اجازت کے ساتھ، اور یوں پہلے سے بہت مختلف صورت میں۔

اب ان کی گفتگوئیں گزرے ہوئے دنوں جیسی پرجوش نہیں ہوتی تھیں، گزرے ہوئے دن، جنھیں گریگر کسی چھوٹے سے ہوٹل میں گہری تھکن کے ساتھ رات کو خود کو نم زدہ بستر پر گراتے ہوئے خواہش کے ساتھ یاد کرتا تھا۔ آج کل وہ زیادہ تر خاموش رہتے۔ رات کے کھانے کے فوراً بعد اس کا باپ آرام کرسی پر لیٹا سو جاتا۔ اس کی ماں اور بہن ایک دوسرے کو خاموش رہنے کے اشارے کیا کرتی۔ اس کی ماں لیمپ کی زرد روشنی میں کمر جھکائے ہوزری کے ملبوسات کی ایک فرم کے لیے کپڑے سیتی۔ اس کی بہن کسی جنرل سٹور میں سیلز گرل کے طور پر کام کرنے لگی تھی۔ شام کو وہ شارٹ ہینڈ اور فرانسیسی زبان کی تربیت حاصل کرتی ھتی تا کہ آئندہ کوئی بہتر نوکری اسے مل سکے۔ کبھی اس کا باپ یک دم بیدار ہو جاتا اور اپنی بیوی سے کہتا ''تم آج سارا وقت کپڑے سیتی رہی ہو'' جیسے واقعی وہ نہ جانتا ہو کہ وہ سو رہا تھا۔ پھر وہ فوراً دوبارہ سو جاتا۔ جب کہ دونوں عورتوں میں ایک تھکن آمیز مسکراہٹ کا تبادلہ ہوتا۔

اس کا باپ ایک طرح کے اکھڑ پن کے ساتھ گھر میں بھی اپنی دفتری وردی پہنے رکھنے پر اصرار کرتا۔ اس کا شب خوابی کا لباس ایک طرف بیکار ہی کھونٹی سے ٹنگا رہتا۔ وہ اپنی وردی میں ہی کرسی میں بیٹھے بیٹھے سو جاتا، پوری وردی میں جیسے ہر وقت اپنے کام کے لیے مستعد ہو اور جیسے اسے توقع ہو کہ وہ یہاں بھی اپنے افسران کی آواز سن لے گا۔ وردی چوں کہ شروع سے نئی نہیں تھی لہٰذا اس مسلسل استعمال سے چند ہی روز میں، اس کے باوجود کہ گریگر کی ماں اور بہن اس کی اچھی دیکھ ریکھ کرتے تھیں، بھدی دکھائی دینے لگی تھی۔ گریگر اپنی اکثر شامیں محض اپنے باپ کی انتہائی نفاست سے پالش کیے گئے چمکدار سونے کے

بٹنوں والی وردی پر لگے تیل کے دھبوں پر نظر جمائے گزار دیتا جب کہ اس میں ملبوس اس کا باپ نہایت بے آرامی مگر تحفظ کے گہرے احساس کے ساتھ سوتا۔

جونھی گھڑی میں دس کا گھنٹا بجتا، اس کی ماں نہایت نرم الفاظ میں اس کے باپ کو بیدار کرتی اور اسے قائل کرتی کہ وہ اپنے بستر میں جا کر لیٹ جائے۔ یہاں کرسی میں لیٹنے سے وہ مناسب نیند نہیں لے پائے گا اور اگر وہ روزانہ صبح چھ بجے کام پر پہنچنا چاہتا ہے تو اسے ایک پر سکون نیند کی اشد ضرورت تھی۔ جب سے وہ ملازم ہوا تھا، ایک قسم کے ضدی پن میں گرفتار ہو گیا تھا اور کرسی پر لیٹے رہنے پر اصرار کرتا حتیٰ کہ وہاں باقاعدہ سو جاتا اور تب اسے کرسی سے اٹھا کر بستر تک لے جانا اور بھی مشکل ہو جاتا۔ اس کی بیوی اور بیٹی محبت بھرے اصرار اور سرزنش سے اسے بستر میں جانے پر قائل کرتیں۔ چوتھائی گھنٹہ تک جواب میں بند آنکھوں کے ساتھ کچھ دیر انکار میں سر ہلاتا رہتا۔ اس کی بیوی اس کی آستین کو آہستہ آہستہ جھنجھوڑتی، اسے اُٹھنے کی ترغیب دینے کے لیے کان میں سرگوشی کرتی، گریگر کی بہن اپنا کام چھوڑ کر ماں کی مدد کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی۔ لیکن اس پر کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ کرسی میں مزید دھنس جاتا۔ تب دونوں عورتیں محبت کے ساتھ اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھاتیں تو وہ فوراً نیم غنودگی میں اپنی آنکھیں کھولتا اور دونوں کو فرداً فرداً دیکھتے ہوئے عموماً کہتا ''یہی اصل زندگی ہے۔ یہ میرے بڑھاپے کا سکون ہے۔'' دونوں عورتوں کی مدد سے وہ احتیاط سے خود کو بلند کرتا جیسے سب سے زیادہ بدن کا بوجھ وہ خود ہی اٹھائے ہوئے ہو اور عورتوں کو اسے دروازے تک لے جانے دیتا، پھر انھیں واپس بھیج دیتا اور خود ہی آگے بڑھتا۔ جب کہ گریگر کی ماں اپنی سوئی اور بہن اپنا قلم چھوڑ دیتی تاکہ اگر اسے مدد کی ضرورت ہو تو بھاگ کر اس تک پہنچ جائیں۔

اس تھکے ہوئے اور کام کے بوجھ تلے دبے ہوئے خاندان میں کسے اتنے فرصت تھی کہ گریگر کو اتنی توجہ دے جس کا وہ مستحق تھا؟ گھر کا بجٹ مختصر ہو گیا تھا۔ ملازمہ کو برخاست کر دیا گیا تھا۔ اس کی جگہ ایک چوڑے جسم کی موٹی ہڈی والی عورت جس کے سفید بال اس کے بڑے سر پر بندھے رہتے، صبح اور شام آ کر گھر کا موٹا موٹا کام کر دیتی۔ باقی سارا کام گریگر کی والدہ اپنی سلائی کی بہت زیادہ مصروفیات سے وقت نکال کر خود کرتی تھی۔ انھی شام کی گفتگوئیں سے گریگر کو خاندانی زیورات کی قیمت کے بارے میں معلوم ہوا تھا جسے وہ انھیں بیچ کر حاصل کرنے کی توقع کر رہے تھے، حالاں کہ ان زیورات کو اس کی ماں اور بہن

مختلف تقریبات میں بڑے شوق سے پہنا کرتی تھیں۔

تاہم سب سے زیادہ دکھ انھیں اس بات کا تھا کہ اگرچہ یہ گھر ان کی موجودہ ضرورت سے کہیں بڑا تھا لیکن وہ اسے نہیں بیچ سکتے تھے کیوں کہ گریگر کو اپنے ساتھ کسی اور جگہ منتقل کرنا ممکن نہیں تھا۔ حالاں کہ گریگر جانتا تھا کہ اس کے علاوہ بھی کئی ایسی وجوہات تھیں جنھوں نے ان کی یہاں سے منتقلی کو مشکل بنایا تھا۔ جب کہ اسے کسی بڑے ہوادار ڈبے میں ڈال کر کسی بھی جگہ منتقل کرنا کافی آسان تھا۔ گھر بیچنے کا فیصلہ نہ کرنے کی بنیادی وجہ ان کی قطعی ناامیدی تھی اور یہ خیال تھا کہ وہ ایک ایسی بڑی بدقسمتی کا شکار ہو چکے تھے جس کا کسی ایسے شخص کو کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا جسے وہ جانتے یا جس سے ان کا کوئی تعلق تھا۔

وہ ہر ایسا کام کرنے پر مجبور تھے، جس کی دنیا میں غریبوں سے توقع کی جا سکتی تھی۔ اس کا باپ بنک کے ملازمین کے لیے ناشتہ لے جاتا۔ اس کی ماں اجنبیوں کے کپڑے دھونے کی صورت میں قربانی دے رہی تھی۔ اس کی بہن تمام دن گاہکوں کے لیے کاؤنٹر کے پیچھے ادھر اُدھر بھاگتی۔ ان میں اس سے زیادہ کام کرنے کی سکت نہیں تھی۔

گریگر کی کمر کا زخم پھر سے ویسا درد کرنے لگا تھا جیسا شروع میں تھا۔ اس کی بہن اور ماں اس کے باپ کو بستر پر لٹا کر لوٹتیں تو اپنا کام چھوڑ کر ایک دوسرے کے گال سے گال ملا کر بیٹھ جاتیں اور اس کی ماں گریگر کے کمرے کی طرف اشارہ کرتی اور کہتی ''گریٹ، دروازہ بند کر دو'' اور جب وہ پھر سے گہرے اندھیرے میں گھر جاتا، وہ اسی کمرے میں بیٹھی رہتیں، ان کے آنسو بہنے لگتے یا وہ کرسیوں پر بیٹھی خشک آنکھوں کے ساتھ میز کو تکتی رہتیں۔

گریگر دن اور رات میں بہت کم سو پاتا۔ کبھی وہ سوچتا کہ اگلی شام کو جب دروازہ کھلے گا تو وہ پھر سے اپنے پریشان حال خاندان کے تمام معاملات کو اپنے ذمے لے لے گا جیسا وہ ہمیشہ سے کرتا آیا تھا۔ عرصہ ہوا وہ اپنے باس اور چیف کلرک کو بھول چکا تھا تب وہ پھر سے اسے یاد آتے۔ سفری تاجر اور زیر تربیت عملہ، احمق چائے والا چھوکرا، دوسرے اداروں میں اس کے چند دوست، ایک دیہاتی ہوٹل میں کام کرنے والی ملازمہ جس سے جڑی کئی حسین اور خوشگوار یادیں ظاہر ہوتیں اور پھر سے غائب ہو جاتیں، ٹوپیوں کی دکان میں کام کرنے والی خزانچی جس کے بارے میں وہ سنجیدہ تھا لیکن اس معاملے میں پیش رفت میں سست۔ یہ سب لوگ اسے اجنبیوں اور ایسے لوگوں کے ساتھ یاد آتے جنھیں وہ بھول چکا

تھا لیکن اس کی اور اس کے خاندان کی مدد کرنے کے بجائے وہ سب اس کی رسائی سے دور تھے، اور اسے خوشی ہوتی جب وہ سب پھر سے اس کے ذہن سے غائب ہوجاتے۔ باقی وقت وہ اپنے خاندان کے بارے میں نہیں سوچتا تھا بلکہ اس بات پر برہم رہتا کہ اسے مناسب توجہ نہیں دی جارہی تھی، اور اگرچہ وہ اس بارے میں کچھ واضح طور پر نہ سوچ پاتا کہ وہ کیا چاہتا تھا، لیکن اس نے منصوبہ بنایا کہ کیسے وہ باورچی خانے میں داخل ہوگا اور پھر ہر وہ شے حاصل کرے گا جس کا وہ حق دار تھا چاہے اسے سرے سے بھوک نہ ہو۔

اس کی بہن بھی اب اسے خوش کرنے کے لیے اس کے کھانے پینے میں دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ بلکہ ہر روز صبح اور دوپہر کو اپنے کام کو جاتے ہوئے عجلت میں جو غذا اسے دستیاب ہوتی، اسے گریگر کے کمرے میں سرکا دیتی اور شام کو یہ دیکھے بغیر کہ اس نے کتنا کھایا تھا، جھاڑو سے اسے صاف کر دیتی۔ جب کہ غذا کو اکثر چھوا بھی نہیں گیا ہوتا تھا۔ وہ اب بھی شام کو کمرے کی صفائی کرتی تھی۔ لیکن اب اس کے ہاتھ میں تیزی نہ ہوتی۔ کمرے میں دیواروں پر گرد کی تہیں جمی رہتی تھیں، اور فرش پر جا بجا گرد و غبار اور گندگی کے گولے تھے۔

شروع میں گریگر ایک طرح سے ملامت کرنے کے انداز میں اپنی بہن کے آنے پر جان بوجھ کر کسی غلاظت سے پُر جگہ پر جا کر بیٹھ جاتا لیکن وہ چاہے ہفتوں وہاں بیٹھا رہے، اس کی بہن بمشکل اس پر توجہ دیتی۔ اس کی طرح گرد اس کی بہن کو بھی دکھائی دیتی تھی لیکن اس نے گریگر کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کچھ زود رنج بھی ہوگئی تھی اور یہ بات اس کے حوالے سے نئی تھی لیکن جسے گھر میں ہر فرد سمجھ سکتا تھا کہ گریگر کے کمرے کی صفائی اس کی اور صرف اسی کی ذمہ داری تھی۔

گریگر کی ماں نے ایک بار اس کے کمرے کی مکمل صفائی کی اور اسے پانی کی بہت سی بالٹیاں استعمال کرنے کی ضرورت پڑی تھی۔ حالاں کہ اتنی زیادہ سیلن گریگر کے لیے نا قابل برداشت تھی اور وہ کاہلی سے صوفے پر لیٹا رہا، برہم اور بے حرکت۔ لیکن اس کی ماں کو اس حرکت کی اس سے بھی کہیں زیادہ سزا ملی۔ شام کو جونہی اس کی بہن گھر میں داخل ہوئی اور اس نے گریگر کے کمرے میں تبدیلی محسوس کی، وہ سخت دکھ کے ساتھ واپس بیٹھک میں بھاگی جہاں اس کی ماں کے فضا میں درخواست کے انداز میں بلند ہاتھوں کے باوجود، وہ زار و قطار رو دی۔ اس کا باپ اپنی کرسی میں بیٹھا ششدر رہ گیا۔ دونوں میاں بیوی

حیرت اور لاچارگی سے اسے تکنے لگے، تب وہ خود بھی غصے میں آ گئے۔ گریگر کے باپ نے جو اس کی ماں کے دائیں جانب بیٹھا تھا، بیوی کو قصوروار کہا کہ وہ گریگر کے کمرے کی صفائی کی بیٹی کی ذمہ داری میں کیوں دخل دیتی ہے۔ ماں کے بائیں جانب گریگر کی بہن چیخ کر بولی کہ وہ آئندہ کبھی اس کمرے کی صفائی نہیں کرے گی۔ جب کہ اس کی ماں اپنے شوہر کو جو غصے میں لال پیلا ہو رہا تھا، بیڈ روم لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی بہن آنسو بہاتی ہوئی میز پر اپنے چھوٹے ہاتھوں سے گھونسے برسانے لگی۔ گریگر بھی غصے میں پھنکارا کیوں کہ کسی کو یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ کمرے کا دروازہ بند کر دے تاکہ گریگر اس منظر کو دیکھنے اور اس شور شرابے سے بچا رہے۔

گریگر کی بہن گھر سے باہر کام کی مصروفیات کی وجہ سے تھک جاتی تھی اور گریگر کی دیکھ بھال، جیسا کہ وہ پہلے کیا کرتی تھی، اس کے لیے اضافی کام تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کی ماں کو اس کی جگہ لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ نہ ہی گریگر کو نظر انداز کیے جانے کی کوئی وجہ تھی۔ اب تو گھر میں نئی خادمہ بھی موجود تھی۔ بوڑھی بیوہ، جس کا چوڑا ہڈیالا جسم اس قدر مضبوط تھا کہ وہ اپنی لمبی زندگی میں ہر طرح کے حالات میں زندہ رہ سکے، گریگر سے قطعی خوفزدہ نہیں تھی۔

ایک روز اتفاق سے اُس نے بغیر کسی حقیقی تجسس کے گریگر کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اسے بالکل اپنے سامنے پایا۔ وہ بالکل ششدر رہ گیا اور اگرچہ کوئی اس کے تعاقب میں نہیں تھا، لیکن وہ کمرے میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگا جب کہ وہ نہایت اطمینان سے بازوؤں کو چھاتی پر باندھے غور سے اسے دیکھتی رہی۔ تب سے وہ روزانہ صبح اور شام کو کچھ دیر کے لیے دروازہ کھول کر اسے ایک نظر دیکھ لیتی۔ شروع میں وہ اسے پکارتی ایسے الفاظ میں جنھیں دوستانہ کہا جا سکتا ہے جیسے ''بوڑھے غلیظ بھنورے ادھر آؤ'' یا ''بوڑھے غلیظ بھنورے ادھر دیکھو''

گریگر نے اس طرح سے مخاطب کیے جانے پر کبھی جواب نہیں دیا بلکہ اپنی جگہ پر ایسے بے حرکت کھڑا رہتا جیسے دروازہ کبھی سرے سے کھلا ہی نہ ہو۔ اس کے گھر والوں کو چاہیے تھا کہ وہ اس بوڑھی ملازمہ کو اپنی مرضی سے گریگر کو تنگ کرنے کی اجازت دینے کے بجائے اسے ہر روز کمرے کی صفائی کرنے کا حکم دیں۔ ایک روز صبح سویرے جب کھڑکی کے پٹوں پر زوروں کی بارش ہو رہی تھی شاید موسم بہار کی نوید بن کر، بوڑھی ملازمہ گریگر کے کمرے میں آئی اور ویسے ہی بے تکلفی سے اسے مخاطب کرنے لگی۔ گریگر اس

سے اتنا برانگیختہ ہوا کہ غصے میں اس پر چڑھ دوڑا۔ وہ سست رو مگر پرعزم تھا لیکن یہ ایک حملے جیسی حرکت تھی۔ بڑھیا خوفزدہ ہونے کی بجائے ایک طرف دروازے کے پاس پڑی کرسی اٹھا کر کھلے منہ کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی ہوگئی، اس واضح ارادے کے ساتھ کہ تب تک اپنا منہ بند نہیں کرے گی جب تک وہ گریگر کی کمر پر کرسی نہیں دے مارتی۔

''ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھو گے'' اس نے دھمکی آمیز لہجہ میں کہا۔ گریگر واپس مڑ گیا۔ اس نے کرسی کو پھر سے فرش پر ڈال دیا۔

گریگر اب شاذ ہی کچھ رغبت سے کھاتا۔ وہ رینگتے ہوئے خوراک کے قریب سے گزرتا جسے اس کے لیے بطور خاص بنایا گیا ہوتا تو وہ محض وقت گزاری کے لیے ایک آدھ لقمہ منہ میں ڈال کر چبانے لگتا۔ پھر اسے کئی گھنٹوں چباتا اور عموماً اسے باہر اگل دیتا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ شاید کمرے میں بھری مایوسی کی وجہ سے اس کی بھوک ختم ہوگئی تھی۔ لیکن وہ جلد ہی وہاں کی جانے والی تبدیلیوں کا عادی ہوگیا۔

گھر والے جن اشیاء کے لیے گھر میں کہیں اور جگہ نہ پاتے، انھیں گریگر کے کمرے میں پھینک دیتے۔ جب کہ اب ایسی اشیا کی وہاں بہتات ہوگئی تھی کیوں کہ گھر کا ایک کمرہ انھوں نے تین افراد کو کرایہ پر دے دیا تھا۔ وہ تینوں معزز کرایہ دار، جو باریش بھی تھے، جیسا کہ گریگر نے ایک دن انھیں دروازے کی درز میں سے جھانک کر دیکھا تھا، اس بات پر مصر ہوتے کہ ہر شے صاف ستھری ہو۔ نہ صرف ان کے اپنے کمرے میں بلکہ چوں کہ وہ اس گھر میں کرایہ دار تھے، اس لیے ہر کمرے میں اور خاص طور پر باورچی خانے میں بھی۔ غیر ضروری سامان، ایسی شے تھا جسے وہ بالکل برداشت نہ کر پاتے، خاص طور پر اگر وہ گرد آلود بھی ہو تو۔ وہ اپنے ساتھ ضرورت کا بہت سا فرنیچر اور سامان لائے تھے۔ اسی باعث گھر کی بہت سی چیزیں غیر ضروری ہوگئی تھیں کہ اگرچہ وہ فروخت نہیں ہوسکتی تھیں، لیکن گھر والے انھیں تلف کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ ایسی تمام اشیا آخر گریگر کے کمرے ہی میں جگہ پاتیں۔ باورچی خانے کی کوڑے کرکٹ کی ٹوکری کا آخری ٹھکانہ بھی یہی کمرہ تھا۔

بوڑھی خادمہ ہمیشہ جلدی میں ہوتی اور ہر وہ شے جسے اس کی اسے فوری ضرورت نہ ہوتی، وہ اسے بے پرواہی سے گریگر کے کمرے میں اچھال دیتی۔ خوش قسمتی سے گریگر کو اکثر اس خاص شے اور اسے اندر گرانے والے ہاتھ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا۔ لیکن جب بڑھیا کے پاس وقت اور موقع ہوتا وہ انھیں

واپس بھی لے جاتی۔ یا انھیں ایک ہی ہلے میں باہر اچھال دیتی۔ لیکن اصل میں ہوتا یوں کہ تمام چیزیں وہیں پڑیں رہتیں جہاں انھیں گرایا گیا ہوتا۔ تاوقتیکہ گریگر خود اس کاٹھ کباڑ میں سے اپنا راستہ بنائے اور انھیں بدقت گھسیٹ کر کسی مناسب مقام پر دھکیل دے۔

اول اول وہ ایسا اپنی ضرورت کے تحت کرتا تھا کیوں کہ اسے کمرے میں رینگنے کے لیے زیادہ جگہ کی ضرورت تھی لیکن بعد میں وہ محض تفریح طبع کے لیے ایسا کرنے لگا حالاں کہ اس دھینگا مشتی کے بعد اداس ہو جاتا اور گھنٹوں اپنی جگہ انتہائی تھکاوٹ کے ساتھ ساکت لیٹا رہتا۔ وہ تینوں کرایہ دار کبھی کبھار رات کا کھانا گھر پر ہی بیٹھک میں کھاتے جہاں سبھی بیٹھتے تھے۔ لہٰذا گریگر کے کمرے کا بیٹھک کی طرف کھلنے والا دروازہ اکثر شاموں کو بند رہتا۔

گریگر کو بھی یہ ماننا آسان لگا کہ شام کو دروازہ کھلا رہنا ضروری نہیں تھا۔ یہ کھلا ہوتا تو اسے بھی اس کا کوئی مصرف سمجھ میں نہ آتا۔ اب وہ کمرے کے تاریک ترین گوشے میں گھر والوں کے لیے تقریباً غیر موجود پڑا رہتا۔ ایک بار بوڑھی ملازمہ نے دروازے کو معمولی سا کھلا رہنے دیا۔ حتیٰ کہ وہ کرایہ داروں کے رات کے کھانے کے لیے بیٹھک میں آنے تک کھلا رہا۔ روشنی جلا دی گئی۔ وہ میز کے گرد براجمان ہو گئے جہاں کبھی گریگر اپنے ماں باپ کے ساتھ بیٹھ کر کھایا کرتا تھا۔ انھوں نے نیپکن کھولے اور اپنے چھری اور کانٹے پکڑے۔ گریگر کی ماں دروازے سے گوشت کا ڈونگا اٹھائے نمودار ہوئی۔ فوراً ہی اس کے عقب میں گریٹ ابلے ہوئے آلوؤں کی رکابی تھامے داخل ہوئی۔ کھانے میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور سارا کمرہ اس کی خوش بو سے بھر گیا۔ تینوں کرایہ دار سامنے پڑی رکابیوں پر جھک گئے گویا کچھ کھانے سے پہلے غذا کے معیار کا اندازہ کرنا چاہتے ہوں۔ درمیان میں بیٹھے ہوئے کرایہ دار نے، جو ان تینوں میں زیادہ بارعب شخصیت کا مالک معلوم ہوتا تھا، اپنی رکابی میں پڑا گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ گوشت ٹھیک سے پکا ہے یا اسے باورچی خانہ میں واپس بھیج دیا جائے۔ اس نے اطمینان کے ساتھ سر ہلایا۔ گریگر کی ماں اور بہن، جو پریشانی سے اس پر نظریں جمائے کھڑی تھیں، نے فوراً سکون کا گہرا سانس لیا اور مسکرا دیں۔

تمام گھر والے باورچی خانہ میں ہی کھانا کھا لیتے تھے۔ گریگر کا باپ باورچی خانہ میں جانے سے پیشتر بیٹھک میں آیا۔ اپنی ٹوپی اتار کر تینوں کو جھک کر سلام کیا اور میز کا ایک چکر کاٹا۔ وہ تینوں ایک ساتھ

اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی داڑھیوں کو کھرو جنے لگے۔ اس کا باپ کے جاتے ہی وہ مکمل خاموشی کے ساتھ کھانے میں جت گئے۔ گریگر کو یہ بات غیر معمولی لگی کہ کمرے سے آنے والی مختلف آوازوں میں ان تینوں کرایہ داروں کے دانت بجنے کی آوازیں شامل تھیں جیسے وہ گریگر کو یہ دکھانا چاہ رہے ہوں کہ کچھ کھانے کے لیے آپ کو دانتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور بغیر دانتوں کا جبڑا چاہے جس قدر عمدہ ہو، کسی کام کا نہیں ہوتا۔

''میں کچھ کھانا چاہوں گا'' گریگر نے بے چینی سے خود سے کہا ''لیکن یہ سب کچھ نہیں جو یہ کھا رہے ہیں۔ یہ خود تو سب کچھ کھا جاتے ہیں، اور یہاں میں مر رہا ہوں۔''

اس تمام عرصہ میں گریگر کو یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی وائلن سنا ہو۔ لیکن اس شام اسے باورچی خانے میں سے وائلن بجائے جانے کی آواز سنائی دی۔ کرایہ دار کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ درمیان والا بارعب کرایہ دار کہیں سے ایک اخبار اٹھا لایا تھا۔ اس نے اس کا ایک ایک صفحہ باقی دونوں کو بھی دیا اور اب وہ کرسیوں میں نیم دراز ہو کر مطالعے اور تمباکو نوشی میں مصروف تھے۔ وائلن کی آواز پر تینوں متوجہ ہوئے اور کھڑے ہو گئے اور دبے پاؤں بیٹھک کے دروازے تک گئے جہاں وہ ایک دوسرے سے جڑے اندر دیکھنے لگے۔ ان کے اس اشتیاق کو باورچی خانہ میں موجود افراد نے محسوس کیا۔ گریگر کے باپ نے وہیں سے پکار کر کہا ''جناب اگر وائلن کی آواز آپ کی سماعت پر گراں گزر رہی ہو تو اسے بند کیا جا سکتا ہے''

''بالکل نہیں'' درمیان والے بارعب کرایہ دار نے کہا ''بلکہ اگر محترمہ اس کمرے میں آ کر وائلن بجانا پسند کریں تو ہمیں خوشی ہوگی۔ یہ کمرہ بہرحال زیادہ آرام دہ اور گرم بھی ہے۔''

''کیوں نہیں جناب، زہے نصیب۔'' گریگر کے باپ نے مسرت سے کہا جیسے وائلن وہ خود ہی بجا رہا ہو۔ تینوں کرایہ دار واپس کمرے میں آ گئے اور انتظار کرنے لگے۔ جلد ہی گریگر کا باپ میوزک سٹینڈ، ماں موسیقی کی تحریر والے کاغذوں اور بیٹی وائلن کے ساتھ دروازے میں نمودار ہوئی۔ گریگر کی ماں نے اس کے وائلن بجانے کے لیے سارا انتظام کیا۔ گریگر کے والدین جنھوں نے اس سے پہلے کبھی گھر کا کمرہ کرایے پر نہیں دیا تھا اور اسی لیے وہ اپنے کرایہ داروں سے کچھ زیادہ ہی مہربانی سے پیش آ رہے تھے، اپنی کرسیوں پر بیٹھنے کی بھی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ گریگر کا باپ دایاں ہاتھ اپنے تیل آلود کوٹ کے دو

بٹنوں پر دبا کر رکھے دروازے کے ساتھ جھکا کھڑا تھا۔ گریگر کی ماں کو ایک کرایہ دار نے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔ اس نے کرسی وہاں سے سرکائی جہاں وہ اسے پیش کی گئی تھی اور پرے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔

گریگر کی بہن نے وائلن بجانا شروع کیا۔ والدین دائیں بائیں کھڑے بغور اس کے ہاتھوں کی حرکت دیکھ رہے تھے۔ وائلن کی آواز کے سحر میں بڑھتا ہوا گریگر دروازے تک آیا جب کہ اس کا سر باہر بیٹھک میں تھا۔ کبھی وہ اپنی خوش طبعی اور ملنساری پر ناز کیا کرتا تھا۔ لیکن اب اسے کم ہی اس بات کا احساس ہوتا کہ وہ دوسروں سے متعلق بے حسی کا شکار ہو چلا تھا۔ مزید یہ کہ اسے اب خود کو چھپائے رکھنے کی زیادہ ضرورت تھی کیوں کہ وہ گرد میں اٹا ہوا تھا جو اس کے کمرے میں ہر جگہ موجود تھی اور اس کی معمولی حرکت سے بھی اڑتی۔ اس کے جسم کے اطراف اور پشت سے دھاگے، بال اور خوراک کے باقی ماندہ اجزاء چپکے ہوئے گھسٹتے تھے۔ اب وہ ہر شے سے ایسا بے نیاز ہو چکا تھا کہ پشت کے بل قالین پر لیٹ کر خود کو پونچھنے کا بھی اسے دھیان نہیں رہا تھا جب کہ پہلے وہ دن میں کئی مرتبہ ایسا کیا کرتا تھا۔ اس صورت حال کے باوجود اسے بیٹھک کے بے داغ فرش پر چلتے ہوئے قطعی کوئی عار محسوس نہیں ہوئی۔

کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ اہل خانہ موسیقی سننے میں منہمک تھے۔ تینوں کرایہ داروں نے جیبوں میں ہاتھ گھسیڑے ہوئے اور میوزک سٹینڈ کے پاس کھڑے ہو کر موسیقی کی تحریر پڑھنے کی کوشش کی۔ اس سے گریگر کی بہن کچھ ہچکچائی۔ لیکن جلد ہی وہ اہل خانہ کے انہماک کے برعکس کھڑکی میں جا کر ایک دوسرے سے سر بھڑائے اور آہستہ آواز میں باتیں کرنے لگے۔ وہ کھڑکی میں کھڑے رہے جب کہ گریگر کے باپ نے بے چینی سے انھیں دیکھا۔ یہ بات واقعتاً بالکل صاف تھا کہ وہ اس سے بہتر یا زیادہ پُر لطف موسیقی سننے کی توقع کر رہے تھے۔ وہ مایوس ہوئے تھے۔ انھیں مزید سننے کی خواہش نہیں تھی لیکن اب محض رسماً اپنے سکون کا اس کے ہاتھوں غارت ہونا برداشت کر رہے تھے۔ یہ بات خاص طور پر پریشان کن تھی کہ جس انداز میں وہ منہ اور ناک سے مسلسل تمبا کو خارج کر رہے تھے۔

بہرکیف گریگر کی بہن بہت عمدگی سے وائلن بجا رہی تھی۔ اس کا سر ایک جانب جھکا ہوا تھا اور وہ بہت محتاط اور ملول انداز میں موسیقی کی تحریر پر نگاہ جمائے ہوئے تھی۔ گریگر رینگتا ہو کچھ مزید آگے بڑھا، اپنے سر کو فرش پر جھکائے ہوئے تا کہ اگر موقع ملے تو وہ بہن سے آنکھیں چار کر سکے۔ کیا واقعی وہ ایک

جانور تھا کہ موسیقی سے فسوں زدہ ہو گیا تھا؟ اسے لگا کہ وہ ایسی غیر معلوم نمو کی راہ پا گیا تھا جس کی اسے کب سے آرزو تھی۔

اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنی بہن کے مزید قریب ہو کر اس کا سکرٹ کھینچ کر اسے اپنی جانب متوجہ کرے گا اور اسے وائلن سمیت اس کے کمرے میں آنے کی دعوت دے گا کیوں کہ یہاں کوئی اس کے فن کا ایسا معترف نہیں تھا جیسا وہ تھا۔ اس نے کبھی اسے اپنے کمرے سے جانے کا نہیں چاہا۔ کم از کم جب تک وہ زندہ ہے، تب تک۔ اس کی کراہت انگیز صورت کم از کم ایک بار تو اس کے لیے فائدہ مند ہو گی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے کمرے کے ہر دروازے پر موجود ہوتا کہ حملہ کرنے والوں کو پھنکار اور ان پر تھوک سکے۔ اس کی بہن اسکے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں ہو گی بلکہ اپنی مرضی سے وہاں ٹھہرے گی۔ وہ اس کے ساتھ صوفے پر اپنا سر جھکا کر کان اس کے منہ کے قریب لا کر بیٹھے گی اور وہ اسے رازداری سے بتائے گا کہ وہ اسے کنزرویٹوریم بھیجنے کا پکا ارادہ رکھتا تھا۔ گزشتہ کرسمس کو اس نے اپنے فیصلے کا باقاعدہ اعلان کرنا تھا، اگر یہ سانحہ سارے منصوبے کو تلپٹ نہ کر دیتا۔ کیا کرسمس واقعی گزر چکی ہے؟ کاش یہ سانحہ نہ ہوا ہوتا اور اپنے ارادے سے ہٹنے پر قائل کرنے والوں کو انکار کر پاتا۔ یہ ساری باتیں سن کر اس کی بہن یقیناً جذبات کی شدت سے دھاڑیں مار کر رو پڑے گی۔ گریگر کود کر اس کے کندھوں پر چڑھ جاتا اور اس کی گردن پر بوسا دیتا جسے وہ کام پر جانے کی وجہ سے ہار یا کالر وغیرہ سے آزاد رکھتی تھی۔

''جناب سیمسہ'' درمیان والے بارعب کرایہ دار نے چیخ کر اس کے باپ کو مخاطب کیا۔ مزید کوئی الفاظ ضائع کیے بغیر گریگر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جو آہستگی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وائلن خاموش ہو گیا۔ تینوں میں سے درمیان والے کرایہ دار نے پہلے سر جھٹکتے ہوئے مسکرا کر دوستوں کی جانب دیکھا اور پھر دوبارہ گریگر پر نظریں جما دیں۔ گریگر کے باپ کو اسے واپس کمرے میں دھکیلنے سے پہلے غالباً اپنے کرایہ داروں کا غصہ فرو زیادہ ضروری محسوس ہوا۔ حالاں کہ وہ قطعاً ناراض نہیں تھے بلکہ ان کے لیے گریگر کی آمد وائلن سے کہیں زیادہ دلچسپ تھی۔ گریگر کا باپ اپنے بازو پھیلائے ان کی طرف بڑھا اور انھیں اپنے کمروں میں جانے پر اصرار کرنے لگا جب کہ گریگر اور ان کے درمیان دیوار بن کو گریگر کو ان کی نظروں سے اوجھل کرنا بھی اس کا مقصد تھا۔

اب ان کے چہروں سے ناراضگی کے تاثرات جھلکے لیکن یہ بات واضح نہیں تھی کہ ان کی ناراضگی کا

سبب گریگر کے بوڑھے باپ کا رویہ تھا یا یہ امر کہ گریگر جیسی مخلوق بغلی کمرے میں ان کی ہمسایہ دار تھی اور وہ اس سے لاعلم تھے۔ انھوں نے گریگر کے باپ سے وضاحت مانگی، اپنے بازو فضا میں لہرائے جیسے خود اس نے پھیلائے ہوئے تھے، بے چینی سے اپنی ڈاڑھیوں کو کھرونچا اور پیر جھٹکتے ہوئے آہستگی سے اپنے کمرے کی طرف مڑے۔ اس دوران اس کی بہن اس صدمے سے نکل آئی تھی جس سے اسے وائلن بجانے سے اچانک روک دیے جانے کی صورت میں دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس نے ہاتھ نیچے لٹکا لیے اور کچھ دیر ایک ہاتھ میں وائلن اور دوسرے میں گز پکڑے، مگر موسیقی کی تحریر پر یوں نظر جمائے رہی جیسے اب بھی وائلن بجا رہی ہو۔ پھر اچانک اس نے خود کو سنبھالا۔ عجلت میں وائلن اپنی ماں کی گود میں ڈالا جو تا حال کرسی پر بیٹھی دمہ کے دورے کی زد میں آئے ہوئے اپنے سانس سے گتھم گتھا تھی اور بھاگتی ہوئی اس کمرے میں چلی گئی جس کی طرف اس کی باپ کے اصرار سے تینوں کرایہ دار بھی بڑھ رہے تھے۔ گریگر کی بہن کے تجربہ کار ہاتھوں کے تلے چادریں اور کمبل ادھر اُدھر اڑ رہے اور ایک تنظیم میں آ گئے اور اس نے ہر شے قرینے سے رکھ دی اور اس سے پہلے کہ تینوں کرایہ دار کمرے تک پہنچتے، وہ اپنا کام ختم کر کے واپس جا چکی تھی۔

گریگر کا بوڑھا باپ اپنے کام میں اتنا منہمک تھا کہ وہ ہر احترام اور لحاظ کو بالائے طاق رکھے اپنے کرایہ داروں سے بحث رہا تھا۔ وہ انھیں اصرار کرتا اور آہستہ آہستہ پیچھے دھکیلتا ہوا ان کے کمرے کے دروازے تک لے آیا حتیٰ کہ درمیان والے کرایہ دار نے طوفانی غصے میں زور سے اپنا پیر زمین پر پٹخا جس سے گریگر کا باپ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ بلند کرتے ہوئے اور گریگر کی والدہ اور بہن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تاکہ ان کی توجہ حاصل کرے ”میں ابھی اور یہاں یہ اعلان کرتا ہوں کہ اس گھر اور اس خاندان میں موجود غیر مناسب واقعات کے پیش نظر،“ اس موقع پر اس نے مختصر اور فیصلہ کن انداز میں فرش کی طرف دیکھا ”میں اسی لمحے آپ کو کمرہ چھوڑنے کا نوٹس دیتا ہوں۔ جتنے دن بھی میں یہاں رہا ہوں، اس کا کرایہ نہیں دوں گا بلکہ اس کے برعکس میں آپ کے خلاف اپنے ذہنی سکون میں خلل ڈالنے پر قانونی کارروائی کروں گا۔ اور یقین کیجیے کہ آپ کے خلاف جرم ثابت کرنا مشکل ہرگز نہیں ہے۔“ وہ خاموش تھا اور اپنے سامنے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کسی بات کی توقع کر رہا ہو۔ تبھی اس کے دونوں دوست اس کے ہم آواز ہوئے۔ ”ہم بھی اسی وقت نوٹس دیتے ہیں“ اس کے ساتھ ہی انھوں نے دروازے کو دستے

سے پکڑا اور زور سے اسے بند کر دیا۔

گریگر کا باپ لڑکھڑاتا ہوا اپنی نشست کی طرف بڑھا، ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا اور دھپ سے اس پر جا گرا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ معمول کی شام کی مختصر نیند پوری کرنے کے لیے نیم دراز ہو لیکن جس بے قاعدہ انداز وہ اپنے سر کو تیز تیز جھٹک رہا تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ نینداس سے کوسوں دور تھی۔ اس تمام دوران میں گریگر خاموشی کے ساتھ اسی جگہ جما رہا جہاں تینوں کرایہ داروں نے اسے دیکھا تھا۔ اپنے منصوبہ کی ناکامی اور غالباً تیز بھوک سے پیدا ہونے والی نقاہت نے اس کے لیے حرکت کرنا مشکل بنا دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کسی بھی لمحے سبھی اس پر چڑھ دوڑیں گے۔ وہ منتظر تھا۔ اسی لیے وہ اس بات پر بھی نہ چونکا جب اس کی ماں کے لرزتے ہاتھوں سے وائلن چھوٹ گیا اور دھپ سے فرش پر گرا۔

''اماں، ابا،'' اس کی بہن نے دونوں ہاتھ میز سے ٹکراتے ہوئے جیسے اس صورت حال کا آغاز کرتے ہوئے کہا ''یہ سب کچھ اس طرح نہیں چل سکتا۔ شاید آپ محسوس نہیں کرتے لیکن میں کرتی ہوں۔ میں اس بھیانک جانور کو اپنا بھائی نہیں کہہ سکتی۔ میں یہی سمجھتی ہوں کہ ہمیں اس کریہہ وجود سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم نے اس کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور خود پر قابو رکھا۔ میرے خیال میں کوئی اس بات کے لیے ہمیں قصوروار نہیں کہہ سکتا۔''

''یہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے'' گریگر کے باپ نے خود سے کہا۔ اس کی ماں جواب تک اپنے سانس سے الجھی ہوئی تھی، منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگی۔ اس کے ہاتھ سامنے پھیلا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں الجھاؤ کا تاثر تھا۔

گریگر کی بہن تیزی سے ماں کی طرف بڑھی۔ اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھا۔ اس کی باتوں سے گریگر کے باپ کو کوئی خیال سوجھا۔ وہ سیدھا بیٹھا ہوا تھا اور میز پر کرایہ داروں کے باقی ماندہ کھانے سے بھری رکابیوں کے درمیان پڑی اپنی ٹوپی کو انگلیوں میں نچا رہا تھا اور وقفے وقفے سے ساکت پڑے ہوئے گریگر کو دیکھ لیتا۔

''ہمیں کوشش کر کے اس سے چھٹکارا پانا ہوگا'' اس کی بہن نے اس مرتبہ براہ راست اپنے باپ سے بات کرتے ہوئے کہا۔ جب کہ اس کی ماں مسلسل کھانسی میں الجھی ہوئی تھی۔ ''تم دونوں اپنی صحت تباہ کر بیٹھو گی، مجھے صاف دکھائی دیتا ہے۔ ہم اتنی سخت محنت نہیں کر سکتے جو ہمیں کرنی پڑ رہی ہے اور پھر گھر

آ کر ایسی اذیت کا سامنا کرنا پڑے تو۔۔ یہ ناقابل برداشت ہے۔اب مزید یہ صورت حال میری برداشت سے باہر ہے۔'' وہ یوں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی کہ اس کے آنسو اس کی ماں کے چہرے پر گرنے لگے جنھیں وہ ایک میکانکی انداز میں ساتھ ساتھ وہاں سے پونچھتی جاتی۔

''میری بچی، ہم کیا کریں؟'' اس کے باپ نے اس کی بات کو سمجھتے ہوئے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ گریگر کی بہن نے اپنے کندھے جھٹک کر اس معاملے میں اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور گریہ زاری جس نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا، اس کے گزشتہ اعتماد کے برعکس تھی۔

''کاش یہ ہماری باتیں سمجھ سکتا'' گریگر کے باپ نے جیسے ایک سوال پوچھا۔اس کی بہن نے آنسوؤں کے ساتھ شدت سے اپنا ہاتھ ہلایا اس اشارے کے طور پر کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''کاش یہ ہماری باتیں سمجھ سکتا۔'' گریگر کے باپ نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دہرایا اس انداز میں جیسے بیٹی کی بات کی سچائی کو مان رہا ہو کہ ایسا ممکن نہیں تھا۔''تو پھر شاید ہم کوئی بات طے کر پاتے۔لیکن یہ تو بالکل۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

''اسے یہاں سے دفعان ہو جانا چاہیے'' گریگر کی بہن سے چیخ کر کہا ''بس یہی ایک حل ہے ابو۔ آپ کو ذہن سے یہ بات نکال دینی چاہیے کہ یہ گریگر ہے۔اب تک یہ سوچ کر ہم خود کو نقصان پہنچاتے رہے۔ یہ گریگر ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ اگر یہ گریگر ہوتا تو ضرور خود ہی محسوس کرتا کہ کوئی انسان کیسے اس طرح کے جانور کے ساتھ گزارا کر سکتا۔ یہ اب تک خود ہی کہیں چلا گیا ہوتا؟ ہم اپنے بھائی کو کھو دیتے لیکن اس کی یاد کو ہمیشہ عزت اور احترام سے اپنے دلوں میں بسائے رکھتے۔لیکن یہ جانور ہمیں سزا دے رہا ہے۔ یہ ہمارے احسانوں کا یہ بدلہ دے رہا ہے کہ ہمارے کرایہ داروں کو بھگا دیا۔ یہ تمام گھر پر اکیلے ہی قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہمیں بھی گلیوں کی خاک چھنوائے گا۔ابو دیکھیے۔ ذرا دیکھیے تو۔'' وہ یک لخت چیخی ''یہ پھر سے میری طرف آ رہا ہے'' وہ شدید خوف و ہراس میں، جو گریگر کے لیے ناقابل فہم تھا، اپنی ماں سے بھی پرے ہو گئی کہ اس نے خود کو کرسی میں جھٹکے سے یوں اٹھایا جیسے وہ گریگر کے قریب رہنے سے اپنی ماں کی بھینٹ چڑھانا بہتر سمجھتی ہو۔ وہ اپنے باپ کے پیچھے جا چھپ گئی جو صرف اس کی وجہ سے پر جوش ہو گیا تھا اور بیٹی کے سامنے بازو نصف پھیلائے کھڑا تھا جیسے اس کی حفاظت کر رہا ہو۔

لیکن گریگر کا کسی کو ہراساں کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اپنی بہن کو تو بالکل ہی نہیں۔ اس نے تو

بس اتنا ہی کیا کہ کمرے میں جانے کے لیے خود کو موڑا۔ اگرچہ یہ بجائے خود بہت ہلا دینے والا عمل تھا کیوں کہ اپنی تکلیف دہ صورت حال میں مڑنے کے لیے شدید کوشش کی ضرورت تھی اور وہ ایسا کرنے کے لیے اپنے سر کی مدد لے رہا تھا۔ بار بار اسے اٹھاتا اور فرش پر مارتا۔ وہ رکا اور اس نے ارد گرد دیکھا۔ لگتا تھا جیسے وہ اس کے نیک ارادوں کو بھانپ گئے ہوں اور اب صرف اس سے محتاط ہوں۔ انھوں نے ناگوار خاموشی کے ساتھ اسے دیکھا۔ اس کی ماں ٹانگیں پھیلائے کرسی میں لیٹی تھی اور اس کی آنکھیں تھکاوٹ سے نیم وا تھیں۔ اس کی بہن اپنے باپ کی گردن میں بازو حمائل کیے بیٹھی تھی۔

''شاید یہ اب مجھے مڑنے دیں گے۔'' گریگر نے سوچا اور نئے سرے سے مڑنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد اس کا دم پھول جاتا اور اسے اپنا سانس درست کرنے کے لیے رکنا اور آرام کرنا پڑتا۔ کسی نے اسے ہشکارنے کی کوشش نہیں کی۔ گویا اسے کلیتاً اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ جونہی اس نے مڑنے کا عمل پورا کیا، وہ سیدھا آگے چلنے لگا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اپنے کمرے سے وہ کتنا دور تھا اور یہ بات وہ بالکل ہی نہ سمجھ پایا کہ اس نے اس کمزور حالت میں اتنی تھوڑی دیر میں یہ فاصلہ کیسے طے کرلیا، اسے محسوس کیے بغیر۔ اس نے رینگنے کی رفتار کو ممکنہ حد تک تیز کرنے پر توجہ مرکوز کرلی اور یہ بات محسوس ہی نہ کر پایا کہ اس کے اہل خانہ کی طرف سے کوئی لفظ، کوئی چیخ تک اسے سنائی نہیں دی جو اس کی توجہ بٹاتی۔ اس نے تب تک اپنا سر نہیں موڑا جب تک اپنے کمرے کے دروازے کی دہلیز پر نہ پہنچ گیا۔ لیکن گردن کے سخت ہو جانے والے پٹھوں کے سبب وہ فقط ایک مختصر دائرے میں گھوم کر رہ گیا۔ ہاں اتنا دیکھنا ہی کافی تھا کہ اس کے عقب کا منظر کسی تبدیلی کے بغیر تھا۔ صرف اس کی بہن کھڑی تھی۔ آخری بار اس نے دیکھا کہ اس کی ماں مکمل طور پر سو چکی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے دھڑاک سے دروازہ بند کیا، اس کی کنڈی چڑھائی اور اسے تالا لگا دیا۔ عقب میں اس پر شور دھماکے سے وہ اتنا گڑبڑا گیا کہ اس کی مختصر ٹانگیں اس کے جسم کے نیچے ڈھے گئیں۔ یہ ضرور اس کی بہن ہوگی۔ وہی اتنی اتاؤلی ہوتی ہے۔ وہ اس کے کمرے میں داخل ہونے کے انتظار میں ہی وہاں کھڑی اور اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔ گریگر اسے اپنے پیچھے آتا نہ دیکھ سکا۔ جونہی اس نے قفل میں چابی گھمائی، وہ تیز آواز میں اپنے والدین سے بولی، ''آخر جان چھوٹی۔''

''اب کیا کروں؟'' گریگر اندھیرے میں اپنے ارد گرد دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ جلد ہی اسے معلوم

ہوا کہ اس میں اپنا پیر تک ہلانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ یہ بات اتنی غیر متوقع نہیں تھی۔ بلکہ ان ننھی لاغر ٹانگوں پر اب تک چلتے پھرتے رہنا بجائے خود غیر فطری سی بات تھا۔لیکن اب اس نے خود کو نسبتاً پرسکون محسوس کیا۔ یہ سچ ہے کہ اس کا سارا جسم درد میں جکڑا ہوا تھا لیکن درد جیسے آہستہ آہستہ کم سے کم ہو رہا تھا اور جیسے آخر بالکل ختم ہو جائے گا۔ پیٹھ میں کھبا ہوا سیب اور اس کے گرداگرد سوجا ہوا حصہ جو مکمل طور پر سفید گرد میں ڈھکا ہوا تھا، اب اسے بالکل محسوس نہیں ہوتا تھا۔اسے اپنے خاندان کے لیے دل میں محبت اور شفقت کے جذبات مچلتے محسوس ہوئے۔اس نے محسوس کیا کہ اگر ممکن ہوتا تو وہ اپنی بہن کے کہنے سے بھی پہلے کہیں چلا جاتا۔ وہ اسی خالی اور پرامن استغراق کی کیفیت میں رہا حتی کہ مینار میں لگے گھڑیال نے صبح کے تین بجے کے گھنٹے بجائے۔اس نے کھڑکی سے باہر سارے میں آہستگی سے پھیلتی سفیدی کو دیکھا۔تب کسی منشا کے بغیر ہی اس کا سر مکمل نیچے ڈھلک گیا اور اس کے نتھنوں سے زندگی کا آخری سانس خارج ہوا۔

بوڑھی ملازمہ صبح سویرے ہی آ گئی تو اس کے باوجود کہ اسے اکثر منع کیا جاتا تھا کہ وہ دروازوں کو دھڑ دھڑ بند نہ کیا کرے لیکن اپنی جسمانی طاقت اور عجلت پسندی کے سبب وہ ایسا کرنے سے باز نہ رہ پاتی جس سے کسی کے لیے اس کے آنے کے بعد پرسکون سوئے رہنا ممکن نہ رہتا۔اس نے حسب معمول گریگر کے کمرے میں جھانکا تو پہلی نظر میں وہاں کوئی غیر معمولی بات معلوم نہ ہوئی۔ اس نے سوچا کہ گریگر وہاں جان بوجھ کر بے حرکت لیٹا ہوا اور تھکن اور منہ بسورے ہوئے تھا۔وہ اسے ایک ذہین بہانے باز جانور قرار دیتی تھا۔اتفاق سے اس نے ایک لمبا جھاڑو ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ اس نے جھاڑو کی نوک سے دروازے کی دہلیز ہی سے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ جب اس میں اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی تو اس نے آگے بڑھ کر اسے چھوا۔تبھی اسے معلوم ہوا کہ وہ اسے کسی طرح کی مزاحمت کے بغیر فرش پر ہر طرف لڑھکا سکتی تھی تو اس نے زیادہ سنجیدگی سے اس طرف توجہ کی۔ جلد ہی وہ اصل معاملے کو سمجھ گئی۔اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اس کے ہونٹوں سے سیٹی کی آواز برآمد ہوئی۔ اس نے خواب گاہ کے دروازے چوپٹ کھولنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور خواب گاہوں کی تاریکی میں چیخ کر بولی ''ادھر آؤ۔ دیکھو، یہ مرا ہوا ہے۔کب سے پڑا ہے۔ پتھر جیسا سخت۔''

مسٹر اور مسز سیمسہ اپنی شادی کے بستر پر اٹھ بیٹھے اور یہ سمجھنے سے پہلے کہ کیا کہا جا رہا تھا، انھیں خود کو خادمہ کی دھماکہ خیز چیخ و پکار کے صدمہ سے نکلنے میں کچھ وقت لگا۔لیکن پھر وہ دونوں تیزی سے بستر کے

دونوں اطراف سے نیچے اترے۔ مسٹر سیمسہ نے کمبل اپنے کندھوں پر اوڑھ رکھا تھا۔ مسز سیمسہ اپنے شب خوابی کے لباس میں ہی باہر نکلیں اور یوں وہ گریگر کے کمرے میں گئے۔ راستے میں انھوں نے بیٹھک کا دروازہ کھولا جہاں کرایہ داروں کے جانے کے بعد سے گریٹ سوگئی تھی۔ وہ اپنے پورے لباس میں تھی جیسے سرے سے سوئی ہی نہ ہو جبکہ اس کے چہرے پر ٹھنڈی زردی اس بات کی تصدیق کرتی تھی۔

''کیا مر گیا؟'' مسز سیمسہ نے خادمہ کو استفہامیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ حالاں کہ وہ اس واقعہ کی تصدیق خود بھی کر سکتی تھیں اور اسے چھوئے بغیر بھی یہ بات جان سکتی تھیں۔

''ہاں، واقعی ایسا ہی ہے'' خادمہ نے جواب دیا اور اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے جھاڑو کی نوک سے گریگر کی لاش کو جھٹکا جس سے وہ لڑھکتا ہوا فرش پر پرے چلا گیا۔ مسز سیمسہ ایک قدم آگے بڑھیں جیسے وہ خادمہ کو لاش کی بے حرمتی کرنے سے باز رکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔

''خیر۔۔ ہمیں اس کے لیے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔'' مسٹر سیمسہ نے کہا۔ انھوں نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ تینوں عورتوں نے ان کی پیروی کی۔

گریٹ، جو لاش پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹا پائی تھی، بولی ''دیکھو کتنا کمزور ہے۔ کتنے عرصے سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ خوراک جیسے اس کے کمرے میں رکھی جاتی، ویسے ہی اٹھالی جاتی۔'' گریگر کا جسم بے شک بالکل خشک ہو گیا اور پچک گیا تھا۔ انھوں نے اب تک اسے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اب وہ ٹانگوں کے سہارے کے بغیر فرش پر پڑا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی حرکت اس سے ہوئی تھی کہ وہ اس سے نظریں ہٹانے پر مجبور ہوتے۔

''گریٹ تم کچھ دیر کے لیے ہمارے ساتھ آؤ'' مسز سیمسہ نے ایک دردناک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ گریٹ لاش سے نظریں ہٹائے بغیر والدین کے پیچھے پیچھے بیڈروم میں چلی گئی۔ خادمہ نے دروازہ بند کیا اور کھڑکی کو پورا کھولا۔ اگرچہ ابھی دن صحیح طور پر نہیں نکلا تھا، تازہ ہوا میں معمولی حدت کا احساس گھلا ہوا تھا۔ مارچ کا مہینہ بھی تو اپنے اختتام پر تھا۔

تینوں کرایہ دار اپنے کمرے سے باہر نکلے تو ناشتہ تیار نہ دیکھ کر جز بز ہوئے۔ انھیں نظر انداز کیا گیا تھا۔

''ہمارا ناشتہ کہاں ہے'' درمیان والے کرایہ دار نے چیخ کر خادمہ سے پوچھا۔ اس نے اپنے

ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں ایک فوری اور خاموش اشارے سے سمجھایا کہ وہ گریگر کے کمرے میں جا کر خود دیکھ لیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور اپنے گھسے ہوئے کوٹوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گریگر کی لاش کے گرد کھڑے رہے۔ کمرے میں اب دن کی خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔

تبھی خواب گاہ کا دروازہ کھلا اور مسٹر سیمسہ اپنی پوری وردی میں ملبوس، ایک بازو میں بیوی اور دوسرے بازو میں بیٹی کو حمائل کیے باہر آئے۔ ان کے چہروں سے معمولی گریہ زاری کا تاثر جھلکتا تھا۔ وقفے وقفے سے گریٹ اپنا سر اپنے باپ کے بازو میں چھپا لیتی۔

''فوراً میرا گھر خالی کر دو'' مسٹر سیمسہ نے اپنا ایک بازو بیوی سے علیحدہ کیے بغیر دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا کیا مطلب ہے؟'' درمیان والے بارعب کرایہ دار نے پریشانی سے ایک کمزور مسکراہٹ کے ساتھ کہا جب کہ باقی دونوں کرایہ داروں نے اپنے ہاتھ اپنی پشت پر باندھ رکھے تھے اور مسلسل انھیں آپس میں رگڑ رہے تھے ایسے تاثر کے ساتھ کہ جیسے وہ کسی زبردست مقابلے کی تیاری کر رہے ہوں جس میں ان کی فتح یقینی تھی۔

''میرا مطلب بالکل واضح ہے'' مسٹر سیمسہ نے کہا اور اپنے دونوں ہم رکابوں کے ہمراہ اس کرایہ دار کی طرف بڑھے۔

پہلے تو وہ کرایہ دار کچھ دیر خاموش رہا، فرش کو تکتے ہوئے جیسے اس کے دماغ میں تمام عوامل نئی طرح سے خود کو ترتیب دے رہے ہوں۔

''ٹھیک ہے تو پھر ہم چلے جائیں گے۔'' اس نے مسٹر سیمسہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ کسی طرح کے تذلیل کے احساس سے دوچار ہوا ہو اور ان سے اپنے موجودہ فیصلے کے لیے اجازت کی توقع کر رہا ہو۔ مسٹر سیمسہ نے اپنی آنکھیں پوری کھولیں اور کئی ایک بار معنی خیز انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ اس پر بلا تاخیر وہ کرایہ دار لمبے ڈگ بھرتا باہری دروازے کے طرف ہو لیا۔ اس کے دونوں ساتھی اپنے ہاتھ ملنا موقوف کر چکے اور غور سے انھیں سن رہے تھے۔ وہ بھی تیزی سے اپنے دوست پیچھے چل دیئے جیسے انھیں اس خوف نے آلیا ہو کہ مسٹر سیمسہ بھی آگے چل پڑیں گے اور تیسرے ساتھی کے ساتھ ان کے رابطے منقطع کر دیں گے۔

وہاں ہال کمرے میں تینوں نے سٹینڈ پر سے اپنی ٹوپیاں اٹھائیں، خانے میں سے اپنی چھڑیاں پکڑیں، کوئی لفظ بولے بغیر جھکے اور فلیٹ سے باہر چلے گئے۔ مسٹر سیمسہ اور دونوں عورتیں ان کے پیچھے انھیں سیڑھیوں تک دیکھنے گئیں لیکن ان کے ارادوں پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اور زینے کے کٹہرے پر جھکے ہوئے انھوں نے دیکھا کہ تینوں کرایہ دار آہستگی سے مگر حتمی انداز میں سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ ہر منزل پر موڑ پر پہنچ کر وہ غائب ہو جاتے لیکن چند لمحوں کے بعد اچانک پھر ظاہر ہوتے۔ جوں جوں وہ نیچے اترے، سیمسہ خاندان کی ان میں دلچسپی بھی کم ہوئی۔ جب ایک قصاب کا لڑکا سر پر ایک تھال اٹھائے پر افتخار انداز میں اوپر آتے ہوئے ان تینوں کے قریب سے گزرا اور ان کی نسبت زیادہ نزدیک آ گیا تو مسٹر سیمسہ اور دونوں عورتیں زینے کے کٹہرے سے ہٹ آئیں اور جیسے ایک بہت بڑے بوجھ سے آزاد ہو کر وہ ہال کمرے میں لوٹ آئے۔

انھوں نے فیصلہ کیا کہ آج کے دن کا سب سے بہتر مصرف آرام کرنا اور شام کو باہر چہل قدمی کے لیے باہر جانا ہے۔ نہ صرف انھوں نے اپنے روزمرہ کے کام سے فراغت حاصل کی تھی بلکہ انھیں اس کی شدید ضرورت بھی تھی۔ وہ تینوں میز پر بیٹھ گئے اور الگ الگ چھٹی کی درخواستیں لکھیں۔ مسٹر سیمسہ نے اپنے بنک کی انتظامیہ کو، مسز سیمسہ نے اپنے آجر کو اور گریٹ نے اپنی فرم کے سربراہ کو۔

جب کہ وہ درخواستیں لکھ رہے تھے، خادمہ اندر آئی یہ بتانے کے لیے کہ وہ آج کے دن کا اپنا کام ختم کر کے واپس جا رہی تھی۔ انھوں نے درخواستوں سے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھے بغیر اثبات میں سر ہلائے لیکن جب ایسا لگا کہ خادمہ جانا ہی نہیں چاہتی تھی، تو انھوں نے ناراضگی کے ساتھ اسے دیکھا۔

''ٹھیک ہے جاؤ'' مسٹر سیمسہ نے کہا۔ خادمہ چہرے پر مسکراہٹ لیے دروازے میں کھڑی انھیں تکنے لگی جیسے وہ انھیں ایک بہت اچھی خبر سنانا چاہتی ہو لیکن صرف اسی صورت میں سنائے گی اگر بطور خاص اس سے فرمائش کی جائے۔ اس کی ٹوپی کے کنارے پر لگا ہوا مور کا ایک مختصر پر، جو مسٹر سیمسہ کے لیے تب سے ناگواریت کا باعث تھا جب سے وہ یہاں کام پر لگی تھی، ہر جانب لہرا رہا تھا۔

''اب کیا بات ہے'' مسز سیمسہ نے خادمہ سے پوچھا جس کی وہ گھر بھر میں سب سے زیادہ عزت کرتی تھی۔

''اوہ'' خادمہ نے عاجزی سے مسکراتے ہوئے کہا اور دوستانہ انداز میں ہنس دی جس سے اس کے

لیے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ''اصل میں، وہاں پڑی شے، اس کے بارے میں بالکل پریشان نہ ہوں، کہ کیسے اس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ میں نے اس کا بندوبست کر دیا ہے'' یہ سن کر مسز سیمسہ اور گریٹ نے پھر سے سر جھکا لیا جیسے اپنی درخواستوں پر توجہ مرکوز رکھنا چاہتی ہوں۔ مسٹر سیمسہ جان گئے کہ خادمہ اپنی کارگزاری کو تفصیلاً بیان کرنا چاہتی تھی۔ چناں چہ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے اس پر واضح کیا کہ مزید بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جونہی اسے مزید بات کرنے سے روکا گیا، اسے اچانک یاد آیا کہ اسے کہیں بہت ضروری پہنچنا تھا اور وہ بے چینی سے بولی ''خدا حافظ، آپ سب کو۔'' پھر عجلت میں مڑی اور حسبِ دستور ہولناک انداز میں دروازہ بند کرتی باہر نکل گئی۔

''اسے آج رات ہی نوٹس دے دیا جائے گا'' مسٹر سیمسہ نے کہا۔ لیکن ان کی بات کا نہ ان کی بیوی نے کوئی جواب دیا اور نہ ہی بیٹی نے، جیسے خادمہ اس ذہنی سکون کو درہم برہم کر گئی تھی جسے انھوں نے بہت مدت کے بعد ابھی حاصل کیا تھا۔ وہ دونوں اٹھیں اور کھڑکی کے قریب گئیں جہاں وہ ایک دوسرے کے گرد اپنی بانہیں حمائل کیے کھڑی ہو گئیں۔ مسٹر سیمسہ اپنی کرسی میں بیٹھے بیٹھے گھومے تاکہ انھیں دیکھ سکیں اور پھر کچھ دیر بغور انھیں تکا کیے۔ پھر پکار کر ان سے کہا ''اب ادھر آ جاؤ۔ جو کچھ ہو چکا اسے بھول جاؤ۔ آ جاؤ اور اب میرا بھی کچھ خیال کرو۔'' دونوں عورتوں نے فوراً ویسا ہی کیا جیسا انھیں کہا گیا تھا۔ تیزی سے اس تک پہنچیں، اسے بوسہ دیا، اس کے گلے لگیں اور پھر جلد جلد درخواستیں لکھنے کا کام مکمل کیا۔

اس کے بعد وہ تینوں ایک ساتھ فلیٹ سے نکلے جیسا انھوں نے پچھلے کئی مہینوں سے نہیں کیا تھا اور شہر سے باہر جانے والی ٹرام میں بیٹھ گئے۔ سورج کی گرم روشنی سے بھری پوری ٹرام میں فقط وہی تین مسافر تھے۔ اپنی نشستوں پر پیچھے گرے ہوئے نیم دراز ہو کر انھوں نے اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کی اور بغور دیکھنے پر جانا کہ مستقبل کچھ اتنا برا بھی نہیں تھا۔ اب تک انھوں نے اپنی نوکریوں کے بارے میں کبھی آپس میں گفتگو نہیں کی تھی جب کہ تینوں کی نوکریاں اچھی تھیں اور خاص طور پر ایک اچھے مستقبل کی نوید دیتی تھیں۔ فی الوقت ان کے حالات میں سب سے زیادہ بہتری آسانی سے دوسرے گھر میں منتقل ہونے سے بھی پیدا ہو گی۔ اب انھیں ضرورت تھی ایسے فلیٹ کی جو موجودہ فلیٹ سے چھوٹا اور سستا ہو جسے گریگر نے ان کے لیے منتخب کیا تھا۔ ایسا فلیٹ جو ایک اچھی جگہ واقع ہو اور سب سے بڑھ کر ان کے بجٹ کے مطابق ہو۔

اس تمام عرصے میں گریٹ زیادہ خوب صورت دکھنے لگی تھی۔ پچھلے دنوں میں جن پریشانیوں کا انھیں سامنا رہا، انھوں نے اس کے رخساروں کو زرد کر دیا تھا لیکن اب جب کہ وہ بات کر رہے تھے، مسٹر سیمسہ اور مسز سیمسہ دونوں ہی بیک وقت اس خیال کی زد میں آئے کہ ان کی بیٹی ایک خوبصورت اور جاذبِ نظر دوشیزہ کے روپ میں تیزی سے جوان ہو رہی تھی۔ وہ خاموش ہو گئے۔ بس آنکھوں ہی آنکھوں میں اور حتی کہ اس بات کو جانے بغیر دونوں میاں بیوی نے اس بات پر متفق ہو گئے کہ جلد ہی اپنی بیٹی کے لیے کوئی اچھا بر تلاش کرنے کا وقت آجائے گا۔ غالباً یہ ان کے خوبصورت خوابوں اور بہترین ارادوں کی فطری تائید تھی کہ جونہی وہ اپنی منزل پر پہنچے، گریٹ ہی پہلے اٹھی اور انگڑائی لے کر اپنے جوان جسم کو پھیلایا۔

عظیم دیوارِ چین

عظیم دیوار چین کا انتہائی شمالی حصہ مکمل ہو گیا۔ تعمیراتی کام جنوب مشرقی اور جنوب مغربی سمت سے شروع ہوا اور اس مقام پر یہ دونوں دھارے متصل ہوئے۔ بتدریج جزوی تعمیر کے اصول کا مزدوروں کی مشرقی اور مغربی دونوں عظیم افواج نے چھوٹے پیمانے پر بھی اطلاق کیا تھا۔ یہ طریقہ کار کچھ یوں تھا کہ بیس بیس مزدوروں کے جتھے ترتیب دیے گئے جو دیوار کے مختلف حصوں پر کام کریں گے۔ مثلاً پانچ سو گز لمبی دیوار پر۔ اس دوران دوسرا جتھا اسی لمبائی کی ایک اور دیوار بنائے گا جو آخر میں پہلی دیوار سے آن ملے گی۔ جب دونوں دیواروں کا مقام اتصال دریافت ہو جائے گا تو اس ہزار میٹر لمبے حصے سے آگے تعمیراتی کارروائی کو جاری نہیں رکھا جائے گا۔ اس کے بجائے مزدوروں کے جتھے کسی یکسر نئی جگہ سے پھر سے دیوار کی تعمیر کا کام شروع کر دیں گے۔

قدرتی طور پر اس انداز تعمیر سے دیوار میں متعدد کشادہ خلاء باقی رہ گئے جنھیں بعدازاں بتدریج اور تھوڑا تھوڑا کر کے پُر کیا گیا۔ کئی خلاف تو اس وقت بھی باقی رہے جب دیوار کی تکمیل کا سرکاری اعلان ہو چکا تھا۔ اصل میں ایسا کہا جاتا ہے کہ ایسے خلا ابھی تک موجود ہیں جنھیں کبھی پُر نہیں کیا گیا حالاں کہ یہ محض ایک قیاس تھا جس کا تعلق ان متعدد اسطوریات سے تھا جو اس دیوار کی ساخت سے متعلق پیدا ہوئیں اور جن کے بارے میں انفرادی سطح پر یہ کہنا ناممکن ہے کہ انھیں آنکھوں سے دیکھا گیا اور وہ ان کے اپنے معیارات کے مطابق درست ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ دیواری ڈھانچہ عظیم الشان ہے۔

ابتدائی طور پر یہ سوچا جا سکتا تھا کہ دیوار کو ایک تسلسل سے تعمیر کرنا ہر اعتبار سے سود مند ہوتا یا کم از کم دونوں بنیادی حصوں میں اسے مسلسل تعمیر کیا جاتا۔

دیوار کی تعمیر کا مقصد شمالی اقوام کے حملوں سے بچاؤ فراہم کرنا تھا۔ جیسا کہ عام طور پر اعلان کیا گیا اور عام لوگوں میں مشہور تھا۔ لیکن اگر یہ تعمیر مسلسل نہیں ہے تو پھر یہ کس طور کسی کا دفاع کر سکے گی؟ درحقیت نہ صرف یہ کہ دیوار کسی کو تحفظ نہیں دے سکتی بلکہ یہ ڈھانچہ مستقل خطرے کا شکار ہے۔ دیوار کے وہ حصے جو ویران علاقوں میں موجود ہیں، انھیں خانہ بدوش بار بار ڈھا سکتے تھے۔ خاص طور پر وہ لوگ جنھوں نے دیوار کی تعمیر سے متعلق پریشانی کے باعث ٹڈیوں کی طرح غیر معمولی رفتار سے اپنے ڈیرے بدلے اور اسی باعث غالباً وہ اس دیوار کی تعمیراتی پیش رفت کا ہم سے بہتر اندازہ رکھتے تھے، ہم جو اس کے معمار

ہیں۔

بہر حال تعمیر کا یہ کام، جس انداز میں کیا گیا، اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اسے سمجھنے کے لیے ہمیں درج ذیل اُمور کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ یہ دیوار صدیوں تک تحفظ کے لیے بنائی گئی تھی۔ لہٰذا تعمیراتی کی بنیادی شرائط میں انتہائی محتاط تعمیر، گزشتہ تمام معلوم شدہ ادوار اور اقوام کے تعمیراتی علم کا اطلاق اور اس کے معماروں میں ذمہ داری کا غیر تغیر پذیر احساس شامل تھا۔ بے شک خالصتاً دستی کاموں کے لیے قرب و جوار کی آبادیوں سے بے خبر مزدور مردوں، عورتوں اور بچوں وغیرہ کو جو یومیہ معقول معاوضہ پر اپنی خدمات بیچنے پر آمادہ ہوں، ملازم رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن حتیٰ کہ چار یومیہ مزدوروں کی نگرانی کے لیے بھی ایک باعلم شخص، تعمیرات کے فن میں ماہر شخص کی ضرورت تھی۔ یعنی ایسا شخص جو اس عمل میں شامل ہر شے سے دل کی گہرائیوں سے دلچسپی رکھے۔ کام جتنا بڑا تھا، اس کے تقاضے بھی اتنے ہی بڑے تھے۔ ایسے اشخاص اگرچہ بڑی تعداد میں موجود تھے، گویوں ہجوم کی صورت میں نہیں، کہ جنھیں اس تعمیراتی کام کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

چوں کہ یہ کام کسی فکری منصوبہ بندی کے بغیر شروع نہیں ہوا تھا۔ اس دیوار کا پہلا پتھر رکھنے سے پچاس سال قبل فن تعمیرات اور بالخصوص معماری کے فن کو اُس پورے چین میں، جسے ایک دیوار میں ملبوس ہونا تھا، علم کی سب سے اہم شاخ تصور کیا جاتا تھا اور باقی تمام فنون زندگی اس سے اپنی مناسبت ہی کی بنیاد پر وقعت حاصل کرتے۔ مجھے اب بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ بچپن میں جب میں بمشکل اپنے پیروں پر چل سکتا تھا، دوسرے لڑکوں کے ساتھ اپنے استاد کے باغ میں کھڑا تھا اور ہمیں پتھروں کی ایک دیوار بنانے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور تب استاد اپنی قبا کو باندھتا ہوا، لپک کر دیوار کی طرف آیا اور اس سے ٹکرا کر اسے منہدم ہی تو کر دیا اور اس نے ہمارے کام کے گھٹیا پن پر ہمیں اس خوفناک انداز میں جھڑکا کہ ہم روتے ہوئے ادھر اُدھر اپنے گھروں کو بھاگ گئے۔ ایک معمولی واقعہ لیکن اس دور کے مجموعی مزاج کی روح کے اعتبار سے اہم۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ جب اس دیوار کی تعمیر کا آغاز ہوا میں تب بیس برس کا تھا اور میں نے اپنے ابتدائی سکول کا آخری امتحان پاس کیا تھا۔ میں نے خود کو خوش قسمت اس لیے کہا کیوں کہ جنھوں نے مجھ سے پہلے تہذیب کے اعلیٰ ترین اعزاز حاصل کیے، انھیں سال ہا سال تک اپنے علم کے استعمال کا کوئی

موقع نہیں ملا اور وہ اپنے ذہنوں میں انتہائی شاندار تعمیراتی منصوبوں کو لیے ہوئے بے کار ہی زندگی گزارتے رہے اور نا اُمیدی کے اندھیروں میں ڈوب گئے۔ لیکن جنھیں اس تعمیراتی منصوبے میں نگران کے طور پر بھرتی کیا گیا، چاہے ان کا عہدہ کس قدر کم حیثیت ہی کا تھا، حقیقتاً اپنے کام کی وقعت سے آگاہ تھے۔ یہ وہ معمار تھے جنھوں نے دیوار کی تعمیر پر بہت غور و خوص کیا تھا، اور کبھی اس سوچ بچار سے باز نہیں آئے اور انھوں نے زمین پر دیوار کا پہلا پتھر نصب کرتے ہوئے خود کو اس کا ایک حصہ محسوس کیا۔ اس نوع کے معمار نہ صرف اپنے کام کو انتہائی رفیع انداز میں کرنے کے متمنی تھے بلکہ وہ دیوار کو اس کی مکمل صورت میں ایستادہ دیکھنے کے شدید مشتاق بھی تھے۔ یومیہ اجرت پر کام کرنے والے البتہ اس اشتیاق سے محروم تھے کہ ان کی نگاہ محض اپنی اجرت پر رہتی۔ جب کہ اعلیٰ نگران، اور بلاشبہ درمیانے درجے کے نگران بھی، اس دیوار کی کثیر الجہت تعمیر میں اتنا کچھ دیکھنے کے اہل تھے کہ اپنے جذبوں کو بھرپور اور اعلیٰ تر رکھ سکیں۔ انھیں اپنے ان ماتحت نگرانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے جو اپنے بظاہر معمولی نوعیت کے کاموں سے ذہنی طور پر برتر ہوتے تھے، کچھ اور طرح کے اقدامات بھی ضروری تھے۔

مثال کے طور پر ان سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ مہینوں یا سالوں تک اپنے پُرآرام گھروں سے سینکڑوں میل دور ایک غیر آباد پہاڑی علاقے میں مسلسل ایک پتھر پر دوسرا پتھر رکھتے جائیں۔ ایسے دشوار کام، جس کی تکمیل طویل ترین زندگی میں بھی ممکن نہیں تھی، سے جڑی بے بسی انھیں مضطرب بناتی اور سب سے بڑھ کر اس کام کے لیے ان کی اہلیت بھی گھٹاتی۔ اسی باعث پھر جزوی تعمیر کا طریقہ کار اپنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پانچ سو گز کی دیوار تقریباً پانچ سالوں میں مکمل ہو سکتی تھی۔ تب تک یقیناً یہ نگران بالکل شل ہو چکے ہوتے اور اپنے آپ، دیوار اور دنیا پر ان کا ایقان قطعاً فنا ہو چکا ہوتا۔

یہی وجہ تھی کہ جب لوگ ہزار گز لمبی دیوار کی تکمیل کا جشن منا رہے تھے، انھیں دور، بہت دور کے سفر پر بھیج دیا گیا جس میں انھوں نے یہاں وہاں کھڑے دیوار کے تکمیل شدہ حصوں کو دیکھا۔ حکام بالا کی بستی کے قریب سے گزرے جہاں انھیں عزت و اکرام کے تمغوں سے آراستہ کیا گیا۔ مزدوروں کے جتھوں کی چہل بازیوں کو سنا جو دور دراز کی سرزمینوں سے امنڈے چلے آ رہے تھے۔ بڑے جنگلات کو دیکھا جنھیں دیوار کی تعمیر میں استعمال کے لیے کاٹا جا رہا تھا۔ پہاڑوں کا نظارہ کیا جنھیں دیوار کے لیے پتھروں کی صورت میں کاٹا جا رہا تھا۔ مقدس عبادت گاہوں سے بلند ہوتی مناجات کو سنا جن میں نیک اور

پارسا لوگ دیوار کی تعمیر کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ ان مناظر نے ان میں گہرا تحمل پیدا کیا۔ ان کے گھروں کی خاموش زندگی نے، جہاں وہ کچھ عرصہ ٹھہرے، ان کے ارادوں کو پختہ کیا۔ جس خوش اعتقادی سے ان کی کارگزاریوں کو سنا گیا اور دیوار کی تکمیل سے متعلق جس یقین کا اظہار سادہ اور پُرامن شہریوں نے کیا، اس نے ان کے دلوں کو بشاشت سے بھر دیا۔ ہمیشہ پُراُمید رہنے والے بچوں کی طرح انھوں نے اپنے گھروں کو خیر آباد کہا۔ قوم کی دیوار کے لیے پھر سے کام کرنے کی خواہش بے قابو ہو گئی۔ وہ مقررہ وقت سے پہلے ہی روانہ ہو گئے۔ نصف سے زیادہ گاؤں دور تک انھیں الوداع کہنے آیا۔ راستے کے دونوں اطراف میں لوگوں کے بڑے ہجوم اشتہار اور کتبے اٹھائے کھڑے تھے۔ اس سے پہلے انھیں کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کا دیس کتنا خوبصورت، عظیم، رفیع الشان اور محبت کیے جانے کے لائق تھا۔ ہر شہری بھائی تھا جس کی حفاظت کی خاطر وہ یہ دیوار تعمیر کر رہے تھے اور جو تمام عُمر اس کے کارنامے پر، جو اس نے کیا تھا، شکر گزاری کا تحفہ بھیجتا رہے گا۔ اتحاد، اتحاد۔ کندھے سے کندھا ملائے بھائیوں کا ایک دائرہ، خون کا ایک دھارا جو اب کسی ایک جسم میں بہنے تک محدود نہیں رہا تھا، بلکہ خوشی سے گھومتا اور چین کی نامختتم اقوام میں شامل ہو جاتا ہے۔

بس تبھی جزوی تعمیر کا نظام قابل فہم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی اور بھی کئی وجوہات ہیں۔ نہ ہی اس بات میں کوئی انوکھا پن ہے کہ میں نے طویل عرصہ اس سوال پر توقف کیا۔ یہ اس دیوار کی مجموعی تعمیر کے اہم مسائل میں سے ایک ہے، گو بظاہر یہ پہلی نظر میں غیر اہم معلوم ہوتا ہے۔ اگر میں اس دور کے نظریات اور احساسات کو آپ تک پہنچانے یا انھیں قابل فہم بنانے کی کوشش کروں، تو پھر میں اس سوال کی گہرائی میں نہیں جا سکوں گا۔

سب سے پہلے تو مجھے یہ بات کہنی چاہئے کہ اس دور میں ایسے ایسے کارنامے کیے گئے جو کسی طور برج بابل کی تعمیر سے کم تر نہیں تھے، حالاں کہ جہاں تک الہامی تائید کا تعلق ہے تو کم از کم انسانی رائے کے مطابق، وہ اس کام سے قطعی مختلف تھی۔ میں نے یہ بات اس لیے کہی کیوں کہ اس تعمیر کے زمانے میں ایک عالم نے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے نہایت جامع انداز میں ان کا موازنہ پیش کیا۔ اس کتاب میں عالم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ برج بابل اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہا۔ ان اسباب کی بنا پر نہیں جنھیں عمومی طور پر پیش کیا گیا یا کم از کم ان تسلیم شدہ وجوہات میں اہم ترین اسباب کبھی منصۂ شہود

پر نہیں آئے۔ اس نے یہ شواہد مختلف تحریری دستاویزات اور تاریخی کتابچوں سے ہی حاصل نہیں کیے بلکہ اس نے دعویٰ کیا کہ اس نے خود موقعہ پر جا کر تفتیش کی اور یہ دریافت کیا کہ برج ایک ناقص تعمیر تھی اور اس کا یہ نقص اس کی کمزور بنیادوں کے سبب ناگزیر تھا۔ یوں ہر اعتبار سے ہمارا ادور سابقہ ادوار سے انتہائی برتر تھا۔ ہمارے دور کا تقریباً ہر تعلیم یافتہ شخص پیشے کے اعتبار سے معمار تھا اور بنیادیں رکھنے کے معاملے میں اس سے غلطی ممکن ہی نہیں تھی۔

لیکن یہی کچھ ثابت کرنا ہمارے عالم کی منشا نہیں تھی بلکہ اس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ پوری انسانی تاریخ میں یہ عظیم دیوار ہی واحد تعمیر تھی جو پہلی مرتبہ ایک نئے برج بابل کے لیے محفوظ بنیادیں فراہم کرے گی۔ پہلے دیوار اور پھر برج۔ اس دور میں اس کتاب کو تقریباً ہر شخص نے پڑھا لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں آج بھی یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس نے برج بابل کی تعمیر کا تصور کیسے پیش کیا؟ کیسے ایک دیوار جو مکمل دائرہ بھی نہیں بنا پاتی تھی بلکہ دائرے کا صرف نصف یا چوتھائی حصہ بناتی تھی، ایک برج کی بنیادوں کا فریضہ انجام دے سکتی تھی؟ اس بات کو صرف روحانی حوالے ہی سے سمجھا جا سکتا تھا۔ تو پھر اصل دیوار ہی کیوں تعمیر کی جائے جو بہر حال ایک ٹھوس شے تھی، لاکھوں لوگوں کی عمر بھر کی کاوش کا نتیجہ۔ اور کتاب میں موجود مینار کے منصوبے جو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کسی حد تک مبہم تھے، اور لوگوں کی توانائیوں کا رخ اس احمقانہ نئے کام کی طرف موڑنے کے لیے تفصیلی تجاویز بھی درج تھیں؟

اس دور میں لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے وحشیانہ خیالات گھومتے رہتے تھے۔ اس عالم کی کتاب ایسی ہی ایک مثال ہے۔ شاید اس لیے کہ تب بہت سے لوگ ایک مقصد کے حصول کے لیے ممکنہ حد تک مزدوروں کی فوج میں اکٹھا ہونا چاہتے تھے۔ انسانی فطرت، بنیادی طور پر تغیر پذیر، ریت کی طرح غیر مستحکم، کسی بندش کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر یہ خود کو پابند کرے تو جلد ہی دیوانگی کے ساتھ اپنی حدود کو چیر پھاڑ دے، حتیٰ کہ یہ ہر شے کے پرخچے اڑا دے، دیوار، حد بندیوں اور خود اپنے بھی۔

ایسا ممکن ہے کہ ان خیالات کو بھی، جو دیوار کی تعمیر کے خلاف عام تھے، جزوی تعمیر کے اطلاق کا فیصلہ کرتے ہوئے اعلیٰ قیادت نے پیش نظر رکھا ہو۔ ہم، اور یہاں میں ''ہم'' کا لفظ بہت سے لوگوں کی نمائندگی کے لیے استعمال کر رہا ہوں۔ ہم خود بھی اس بات سے بے خبر تھے جب تک کہ ہم نے اعلیٰ قیادت کے فرامین کا بغور تجزیہ نہ کیا۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ اعلیٰ قیادت کے بغیر نہ ہمارا کتابی علم اور نہ انسانی

فطرت کا فہم ہی ان عاجزانہ کاموں کے لیے کافی ہے، جو ہم مجموعی عظیم کام کے دوران کر چکے ہیں۔ اعلیٰ قیادت کے دفتر میں کہ اس بارے میں کوئی ایسا شخص نہیں جانتا جس سے میں تب یا اب پوچھا ہے کہ یہ دفتر کہاں تھا اور کون وہاں بیٹھتا تھا، لیکن اس دفتر میں انسان اس بارے میں پر یقین ہو سکتا ہے کہ تم انسانی خیالات اور خواہشات دائرے میں گھومتی ہیں اور تمام انسانی مقاصد اور کامیابیاں ایک اس کے مدمقابل دائرے میں۔ اور کھڑکی کے ذریعے الہامی دنیاؤں کی رفعت وعظمت رہنماؤں کے ہاتھوں میں آ گری جب انھوں نے اپنے منصوبوں کی جھلک پائی۔

اسی باعث ایک انتہائی دیانتدار مبصر کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اعلیٰ قیادت اگر سنجیدگی سے چاہے تو ان مشکلات پر قابو پا سکتی تھی جو مسلسل تعمیر کے نظام کے اطلاق میں حائل تھیں۔ سو ناگزیر طور پر یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اعلیٰ قیادت نے جان بوجھ کر جزوی تعمیر کے نظام کا انتخاب کیا جب کہ جزوی تعمیر محض ایک عارضی تدبیر، اور اسی لیے غیر موزوں تھی۔ تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اعلیٰ قیادت خود غیر موزوں منصوبے کی خواہاں تھی۔ ایک عجیب نتیجہ۔ بالکل درست اور ایک اعتبار سے اس معاملے پر بہت بحث کی گنجائش ہے۔ اس پر اب زیادہ محفوظ طریقے سے بات ہو سکتی ہے۔ لیکن ان دنوں میں بہت سے لوگ اور ان میں کئی بہترین افراد بھی اس مخفی مقولہ کو مانتے تھے جو کچھ یوں تھا ''اپنی پوری توانائی کے ساتھ اعلیٰ قیادت کے فرامین کو سمجھنے کی کوشش کرو لیکن صرف ایک خاص حد تک اور اس کے بعد مزید غور وفکر ترک کر دو'' یہ بہت دانش مندانہ مقولہ جس کی مزید وضاحت ایک حکایت میں ہوتی ہے جس کا بعد میں اکثر ذکر کیا جاتا رہا۔ ''مزید غور وفکر ترک کر دو لیکن اس لیے نہیں کہ یہ تمھارے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ ایسا یقینی نہیں ہے کہ یہ تمھارے لیے نقصان دہ ہے۔ اس کا نقصان دہ یا بے ضرر ہونا، اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ موسم بہار میں بہتے دریا کے بارے میں سوچو۔ پانی کی سطح بلند ہوتی اور یہ طاقتور ہو جاتا اور دور دور تک پھیلے اپنے کناروں پر مٹی کو زرخیز کرتا ہے، اپنے بہاؤ کو متعین رکھتے ہوئے اور آخر کار سمندر میں جا گرتا ہے جہاں اسے جوش وخروش سے خوش آمدید کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ ایک قیمتی حلیف ہے۔ بس اسی حد تک تم اعلیٰ قیادت کو سمجھنے کے لیے اپنے غور وفکر کو بڑھا سکتے ہو۔ لیکن اس کے بعد دریا اپنے کناروں سے باہر چھلک پڑتا ہے، اپنی حد اور صورت کھو دیتا ہے۔ اپنے بہاؤ کو سست کر لیتا ہے۔ زمین کے نشیب میں چھوٹے چھوٹے دریا بنا کر یہ اپنی اصل منزل کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کھیتوں کو اجاڑتا ہے لیکن زیادہ

دیرا اپنی نئی وسعت برقرار نہیں رکھ پاتا۔ اسے دوبارہ اپنے سابقہ کناروں کے اندر لوٹنا پڑتا اور آنے والے گرم موسم میں بدحالی کے ساتھ خشک ہونا پڑتا ہے۔ لہذا تم اعلیٰ قیادت کے فرامین پر اپنے غور و فکر کو خاص حدود ہی میں رکھو۔

اب اگر چہ یہ حکایت، ہوسکتا ہے کہ دیوار کی تعمیر کے دوران غیر معمولی حکمت اور طاقت رکھتی ہو لیکن میرے موجودہ مضمون کے ساتھ اس کا تعلق نہایت محدود ہے۔ میری تحقیق خالصتاً تاریخی ہے۔ ان گمشدہ طوفانی بادلوں میں اب مزید بجلی نہیں چمکتی اور اسی لیے میں جزوی تعمیر کے نظام کی ایسی توجیہہ تلاش کرنے کی جستجو کر سکتا ہوں جو اس سے کہیں بڑھ کر ہو جو تب لوگوں کی تشفی کے لیے کافی تھی۔ میری استعداد فکر مجھ پر جن حدود کا اطلاق کرتی ہے، وہ بہت کم ہیں۔ لیکن جو معاملہ زیر بحث ہے اس کی حد بندی ممکن نہیں۔ یہ عظیم دیوار کس کی حفاظت کے لیے تھی؟ شمالی اقوام کیخلاف۔ میں خود چین کے جنوب مشرق سے آیا ہوں۔ وہاں ہمیں شمالی لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ان کے بارے میں ہم قدیم کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ ان کی بربریت کے قصے، جو ان کی فطرت کے مطابق ہیں، ہمیں اپنے پر امن درختوں کے نیچے سرد آہ بھرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ فنکار ہمیں اس شیطانی مخلوق کی صحیح شبیہیں بنا کر دکھاتے ہیں۔ ان کے کھلے ہوئے منہ، نوکیلے دانتوں سے آراستہ ان کے جبڑے، نیم وا آنکھیں جیسے پہلے سے ہی اپنے شکار کو تاڑ چکی ہوتی ہیں جنھیں ان کے جبڑے چیر پھاڑ دیں اور ہڑپ کر جائیں گے۔ جب ہمارے بچے سرکشی پر مائل ہوتے ہیں تو ہم انھیں یہ تصویریں دکھاتے ہیں اور وہ فوراً روتے ہوئے ہمارے بازوؤں میں آگرتے ہیں۔ لیکن ان شمالی اقوام کے بارے میں ہم اس سے بڑھ کر کچھ نہیں جانتے۔ ہم نے انھیں کبھی نہیں دیکھا اور اگر ہم اپنے دیہاتوں تک محدود رہیں تو ہم انھیں کبھی دیکھ بھی نہیں پائیں گے۔ چاہے وہ اپنے جنگلی گھوڑوں پر سوار ہو کر ممکنہ حد تک تیز رفتاری سے سیدھے ہماری سمت ہی کیوں نہ بڑھتے آئیں۔ زمین اتنی وسیع ہے کہ وہ ہم تک نہیں پہنچ پائیں گے اور فضا میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جائیں گے۔

اگر صورت حال یہی ہے تو ہم کیسے اپنے گھروں، چھوٹے چھوٹے پلوں کے ساتھ بہتی ہوئی ندیوں، اپنے ماں اور باپ، اپنی روتی ہوئی بیویوں، اپنے بچوں کو چھوڑ کر، جنھیں ہمارے سرپرستی کی ضرورت ہوتی ہے، دور دیس میں تربیت حاصل کرنے چلے جاتے ہیں جب کہ ہماری سوچیں شمال میں اس دیوار سے بھی آگے کہیں ٹکی ہوتی ہیں۔ کیوں؟ اعلیٰ قیادت کے لیے ایک سوال؟ ہمارے رہنما ہمیں جانتے

ہیں۔وہ بڑی فکروں میں مبتلا ہونے کے باوجود ہماری خبر رکھتے ہیں، ہمارے ادنیٰ معمولات سے آگاہ ہے۔ہمیں ہمارے غیر اہم جھونپڑوں میں اکٹھے بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں اور شام کی مناجات کو قبول یا رد کرتے ہیں جنھیں گھر کا سربراہ اپنے خاندان میں بیٹھ کر پڑھتا ہے۔اگر مجھے اعلیٰ قیادت کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ میرے خیال میں اعلی قیادت ازمنہ قدیم سے موجود ہے۔لیکن کبھی اکٹھی نہیں ہوئی۔جیسے چینی سرکاری اہل کار کسی شخص کے عمدہ خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے لیے عجلت میں جمع ہو جاتے اور پھر اسی عجلت میں اجلاس برخاست کر دیا جاتا ہے تا کہ اسی رات ڈھول پیٹ کر لوگوں کو بیدار کیا جائے اور انھیں اپنے فیصلے سے مطلع کیا جائے۔ چاہے یہ فیصلہ کسی ایسے دیوتا کی عقیدت میں چراغاں کرنے سے متعلق ہی کیوں نہ ہو، جس نے ان کے آقاؤں کو گذشتہ کل میں اپنی عنایتوں سے نوازہ ہو، صرف اس لیے کہ آنے والے کل میں چراغاں ختم ہونے سے پہلے انھیں کسی تاریک گوشے میں لے جائے اور کسی سونٹے سے ان کی گوشمالی کرے۔

بلکہ میرا خیال ہے کہ اعلیٰ قیادت ازل سے موجود ہے اور اسی طور دیوار کی تعمیر کا فیصلہ بھی۔شمال کے بے شعور لوگ فرض کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کے سبب ہے۔ ہمارا مخلص نا سمجھ شہنشاہ فرض کرتا ہے کہ یہ اس کا فیصلہ ہے۔لیکن ہم جو دیوار کے اصل معمار ہیں، جانتے ہیں کہ معاملہ اس سے مختلف ہے لیکن اپنی زبانیں بند رکھتے ہیں۔

دیوار کی تعمیر کے دوران اور آج کے دن تک میں نے خود کو مختلف اقوام کی تاریخ کے تقابلی مطالعے میں مکمل طور پر غرق کیے رکھا۔چند خاص معاملات ایسے ہیں کہ جن کی اس طریقہ کار سے گہرائی میں جا کر تفصیلی تفتیش ہو سکتی ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ ہم چینیوں کی بھی خاص لوک اور سیاسی روایات موجود ہیں جو اپنی سلاست میں منفرد ہیں اور جو اپنے ابہام میں بھی انفرادیت رکھتی ہیں۔ان مظاہر اور خاص طور پر موخر الذکر مظہر کی حقیقت جاننے کی خواہش نے ہمیشہ مجھے دق کیا اور آج بھی ایسا ہی ہے جب کہ دیوار کی تعمیر کا مسئلہ بنیادی طور پر انھی مسائل سے جڑا ہوا ہے۔

ہماری انتہائی مبہم روایات میں سے ایک خود ہمارا شہنشاہ ہے۔قدرتی طور پر پیکنگ میں شاہی دربار میں البتہ اس بارے میں کچھ صراحت موجود ہے لیکن یہ بھی حقیقت کی نسبت التباسی زیادہ ہے۔اعلی تعلیم کے مدارس میں تاریخ اور سیاسی قانون کے اساتذہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ان امور سے کلی آگاہ ہیں

اور یہ کہ یہ علم وہ شاگردوں کو منتقل کرنے کے اہل ہیں۔ جوں جوں نچلے درجوں کے مدارس میں جایا جائے تو اساتذہ اور شاگردوں کے اپنے علم پر شکوک وشبہات ناپید ہو جاتے ہیں۔ اور چند ایسے اخلاقی معیارات کی بنیاد پر قائم ایک بلند و بالا سطحی تہذیب موجود ہے جو صدیوں سے لوگوں کے ذہنوں میں ٹھونسے گئے ہیں۔ معیارات، جن کے ابدی سچ ہونے میں گو کہ ابھی تک کوئی فرق نہیں پڑا، اس الجھاؤ کی دھند میں غائب رہتے ہیں۔

لیکن اصل میں اسی بادشاہت سے متعلق یہ سوال ہے جسے میرے خیال میں عوام سے پوچھا جانا چاہئے کہ وہ جواب دیں۔ کیوں کہ آخر وہی شہنشاہیت کی اصل بنیاد ہیں۔ مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ اپنے آبائی گاؤں کے بارے میں بس ایک ہی بار اور کچھ بتا سکوں گا۔ سوائے فطرت کے دیوتاؤں اور ان سے متعلق مذہبی رسومات کے، جو ہمارے پورے سال کو حسین اور بھرپور تبدیلیوں سے خوش رنگ بنائے رکھتی ہیں، کہ ہم صرف اپنے شہنشاہ کے بارے میں ہی سوچ پاتے ہیں۔ لیکن موجودہ شہنشاہ کے بارے میں نہیں۔ یا یہ کہ ہم اپنے موجودہ شہنشاہ کے بارے میں تبھی کچھ سوچیں گے جب ہمیں علم ہو گا کہ وہ کون ہے یا اس کے بارے میں کچھ تو ہمیں حتمی طور پر معلوم ہو؟ یہ سچ ہے اور ایک یہی وہ تجسس ہے جو ہمیں اندر سے بھرے رکھتا ہے کہ ہم ہمیشہ اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہو سکتا ہے یہ عجیب لگے کہ ایسی کوئی معلومات حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ نہ ہی زائرین سے جنھوں نے ہماری زمین کے بڑے حصے کی سیر کی ہوتی ہے، نہ قرب وجوار کے دیہاتوں سے اور نہ ان ملاحوں سے جنھوں نے نہ صرف ہمارے دیہات کی چھوٹی ندی میں کشتی چلائی ہوتی ہے بلکہ مقدس دریاؤں میں بھی کشتی رانی کر چکے ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہمیں سننے کو بہت سی باتیں ملتی ہیں لیکن ایک بھی حتمی نہیں ہوتی۔

ہماری سرزمین اس قدر وسیع ہے کہ کوئی حکایت اس میں ہر سو سما نہیں سکتی۔ آسمان بھی ہماری دھرتی کا بمشکل احاطہ کر پاتا ہے۔ پیکنگ تو اس میں محض ایک نقطہ ہے، اور شاہی محل اس نقطے سے بھی کمتر۔ اس اعتبار سے ہمارا شہنشاہ دنیا کی تمام تر سلطنتوں سے عظیم اور طاقتور ترین ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے۔ لیکن موجودہ شہنشاہ ہماری طرح کا ہی ایک انسان، ہماری ہی طرح ایک نرم گدے پر لیٹتا ہے جو ایک فراخدلانہ تناسب کا حامل ہے، لیکن اغلباً پھر بھی ممکنہ حد تک بہت تنگ اور مختصر۔ ہماری ہی طرح وہ کبھی کبھار لیٹ جاتا اور جب بہت تھکا ہوا ہو تو منہ کے خوبصورت دہانے کو کھول کر جمائی لیتا ہے۔

ہم اپنے شہنشاہ کے بارے میں کیسے کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ جنوب میں ہزاروں میل کی دوری پر تقریباً پہاڑی علاقوں کی سرحدوں پر وہ رہتا ہے۔ اگر کبھی کوئی بات ہم تک پہنچے بھی تو وہ اتنی دیر سے پہنچتی ہے کہ تب تک وہ فرسودہ اور دقیانوسی ہو چکی ہوتی ہے۔ شہنشاہ ہمیشہ اپنے شان دار مگر مبہم درباری وزراء اور اہل علم کے انبوہ میں گھرا رہتا ہے، دوستوں اور نوکروں کے روپ میں بغض اور عداوت کے درمیان۔ یہ لوگ شاہی قوت میں توازن قائم کرتے ہیں اور ہمیشہ اپنے زہر آگیں تیروں سے شہنشاہ کا تختہ الٹنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ شہنشاہ غیر فانی ہے مگر وہ خود ہی اپنے تخت سے لڑکھڑاتا اور گر جاتا ہے۔ ہاں، تمام سلسلہ ہائے سلاطین آخر میں غرق ہو جاتے اور ایک ہی مرتبہ ان پر موت کی خرخراہٹ غالب آتی ہے۔

اس جدوجہد اور ابتلا کا عوام کو کچھ علم نہیں ہو پاتا۔ تاخیر سے پہنچنے والوں کی طرح، شہر میں اجنبیوں کی طرح وہ کسی پُرہجوم ذیلی گلی کے آخری سرے پر ساتھ لائی ہوئی غذا چباتے ہوئے سکون کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں جب کہ سامنے شہر کے مرکز میں کسی بازار میں ہمارے حکمران کو پھانسی دی جا رہی ہوتی ہے۔

ایک حکایت اس صورتحال کو بہت عمدگی سے بیان کرتی ہے۔ اس کے مطابق شہنشاہ نے تمھیں ایک پیغام بھیجا۔ تم جو ایک عاجز وجود ہو، ایک مبہم سایہ ہو جو شاہی سورج کے سامنے انتہائی دوری میں بھی دبک جاتا ہے۔ بادشاہ نے اپنے بستر مرگ سے خاص تمھیں ایک پیغام بھیجا ہے۔ اس نے پیغامبر کو بستر کے برابر جھکنے کا حکم دیا اور سرگوشی میں اسے اپنا پیغام بتایا۔ اتنا اہم ہے یہ پیغام اس کے لیے کہ اس نے پیغامبر کو حکم دیا کہ وہ اس کے کان میں پیغام دہرائے۔ پھر سر کی جنبش سے تصدیق کی کہ پیغامبر نے اس کا پیغام صحیح سنا۔ اس کی موت کا منظر دیکھنے کے لیے آئے ہوئے تماشائیوں کے سامنے کہ درمیان کی سبھی حائل دیواروں کو ڈھا دیا گیا ہے اور کشادہ اور اونچے زینوں میں دائرے میں شہنشاہ کے شہزادے کھڑے ہیں۔ ان سب کے سامنے بادشاہ نے یہ پیغام دیا۔ پیغامبر فوراً ہی روانہ ہو جاتا ہے۔ ایک توانا، ہٹا کٹا جفاکش شخص، کبھی اپنے دائیں بازو کو، کبھی اپنے بائیں بازو کو فضا میں گھماتے ہوئے زور لگا کر مجمع میں سے اپنے لیے راستہ بناتا ہے۔ جہاں کچھ مزاحمت ہوتی ہے، وہ اپنی چھاتی پر آویزاں سورج کے نشان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ اس قدر آسانی سے مجمع سے گزرتا ہے کہ کسی دوسرے کے لیے ایسا ممکن

نہیں۔

لیکن ہجوم اتنا بڑا ہے کہ اس میں شامل لوگوں کا شمار ممکن نہیں۔ اگر وہ کھلے میدان تک پہنچ پاتا تو کتنی تیزی سے وہ اڑتا اور بلاشبہ جلد ہی تم اپنے دروازے پر اس کے گھونسوں کی خوش آمدیدی بوچھاڑ سنتے۔ لیکن اس کے برعکس اس کی تمام جدوجہد رائیگاں جاتی ہے۔ ابھی تک وہ اندرونی محلات کی خلوت گاہوں میں سے راستہ بنا رہا ہے۔ ان کے اختتام تک وہ کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔ بالغرض اگر وہ ان سے گزر جائے تب بھی اس کی سعی لاحاصل ہے۔ ان سے آگے اسے سیڑھیاں اترنا ہوں گی۔ اگر وہ انھیں بھی طے کر جاتا ہے تب بھی اس کی محنت بے سود ہے۔ اس سے آگے بڑے دربار عبور کرنے ہوں گے۔ ان درباروں کے آگے دوسرے بیرونی محلات ہیں اور پھر مزید سیڑھیاں اور دربار، اور ایک بار پھر سے ایک بیرونی محل۔ اسی طرح ہزاروں برس بیت جائیں گے۔ اگر پایان کار وہ کسی طور بیرونی دروازے تک پہنچتا ہے، لیکن ایسا کبھی، کبھی نہیں ہوگا، لیکن اگر ایسا ہوتا ہے تو شاہی دارالخلافہ اس کے سامنے ہوگا، دنیا کا مرکز، اپنی ہی تردید میں چلاتا ہوا۔ کوئی اس میں سے نہیں گزر سکتا چاہے وہ کسی مردہ شخص کا پیغام لے کر ہی کیوں نہ چلے۔ لیکن تم ڈھلتی ہوئی شام میں اپنے کھڑکی میں بیٹھتے ہو اور خواب دیکھتے ہو کہ یہ پیغام تم تک پہنچ گیا۔

تو یوں پُر اُمیدی اور نا اُمیدی کے احساس کے ساتھ ہم لوگ اپنے شہنشاہ کا احترام کرتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کونسا شہنشاہ تخت نشین ہے حتیٰ کہ موجود شاہی خاندان کے نام کے بارے میں بھی بے اعتمادی رہتی ہے۔ مدرسوں میں شاہی خاندنوں کے بارے میں تخت نشینی کی تاریخوں کے ساتھ بہت کچھ پڑھایا جاتا ہے لیکن اس معاملے میں عمومی بے یقینی اتنی شدید ہے کہ بڑے بڑے عالم بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے دیہاتوں میں مرے ہوئے شہنشاہوں کو تخت نشین تصور کر لیا جاتا ہے اور ایک شہنشاہ جو صرف گیتوں میں زندہ ہے، حال ہی میں اس کے ایک فرمان کو پروہت نے قربان گاہ کے سامنے پڑھ کر سنایا۔ جنگیں جو تاریخ میں بہت پہلے لڑی گئی تھیں ہمارے لیے خبر تازہ ہیں۔ ہمارے پڑوسی دمکتے ہوئے چہروں کے ساتھ دوسروں کو یہ خبر سنانے بھاگے چلے جاتے ہیں۔ شہنشاہوں کی خود پسند اور ناز و نعم میں بگڑی ہوئی بیویاں، مکار درباری امرا کے شاہی اطوار کی ڈسی ہوئیں، اپنی تعیش پسندی کے سبب ہمیشہ سجی سنوری، حرص و طمع میں لت پت، اپنی ہوس میں بے قابو، اپنی بدعادات کو ہر بار نئے انداز میں جاری رکھتی ہیں۔ جتنی زیادہ گرد وقت کی ان پر چڑھتی ہے، ان کی بدفعلیوں کو اتنے ہی تیز رنگوں میں مصور کیا جاتا

ہے اور غم واندوہ کی تیز چیخ کے ساتھ ہمارے دیہات کے معصوم لوگ آخر ایسی حکایت سنتے ہیں کہ کیسے ہزاروں برس پہلے ایک ملکہ اپنے شوہر کا خون غٹا غٹ پی گئی۔

یوں ہم لوگ مردہ شہنشاہوں کو یاد کرتے ہیں جب کہ زندہ حکمرانوں کو مردوں میں الجھا دیتے ہیں۔ اگر ایک بار، صرف ایک بار کسی انسان کی زندگی میں کوئی شاہی عہدیدار صوبوں کا دورہ کرتا ہوا اتفاقیہ طور پر ہمارے دیہات میں نکل آئے اور بادشاہ کی طرف سے چند فرامین پڑھ کر سنائے، محصول وغیرہ کی فہرستوں کی پڑتال کرے، مدرسہ کے طالب علموں کا معائنہ کرے، ہمارے افعال اور معاملات سے متعلق پروہت سے پوچھ گچھ کرے، اور پھر اپنی پالکی میں سوار نے ہونے سے پہلے، بے جا طویل فہمائشوں کی صورت میں لوگوں مجمع کو اپنے تاثرات بیان کرے تو ہر فرد کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ اُمڈ آتی ہے۔ ہر کوئی چور نظروں سے ایک دوسرے کو تکتا ہے، اور اپنے بچوں پر جھک جاتا ہے تا کہ وہ شاہی عہدیدار کی نظروں میں آنے سے بچ جائیں۔ کیوں، وہ خود سے ہی سوچتے ہیں کہ وہ ایک مردہ شخص کے بارے میں یوں بات کر رہا ہے جیسے وہ زندہ ہو، اس کا شہنشاہ تو عرصہ ہوا مر کھپ گیا۔ شاہی خاندان نیست و نابود ہو چکا۔ ہمارا عہدیدار ہم سے مذاق کر رہا ہے لیکن ہم یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے ہم نے اس کے مذاق کو سمجھا ہی نہیں تا کہ وہ برا نہ مانے۔ لیکن ہم اپنے موجودہ شہنشاہ کے علاوہ کسی دوسرے کے وفادار نہیں ہوں گے۔ ایسا نہ کرنا ایک جرم ہوگا۔ شاہی عہدیدار کی پالکی کی روانگی کے ساتھ ہی دیہات کے حکمران کے طور پر ایک طاقت ور شبیہہ خوش قسمتی سے خارج ہوتی ہے۔

اسی طرح ہم لوگ مختلف ریاستی جنگوں اور ریاستی انقلابات سے بھی بہت کم اثر لیتے ہیں۔ مجھے اپنی جوانی کا ایک واقعہ یاد ہے۔ ہمارے ایک پڑوسی مگر خاصے فاصلے پر موجود دشمن گاؤں میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ اس کے کیا اسباب تھے، مجھے اب یاد نہیں ہیں؟ نہ ہی اب ان کی کوئی اہمیت ہے۔ یوں تو ہر وقت ہی بغاوت کے امکانات تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ہم لوگ ایک پر جوش قوم ہیں۔

ایک روز باغیوں کا شائع کردہ ایک دستی اشتہار ایک گداگر کے ذریعے، جو کسی طور اس بغاوت زدہ گاؤں سے ہو کر آیا تھا، میرے والد صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ اتفاق سے اس روز وہاں ایک دعوت تھی۔ ہمارے کمرے مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ پروہت درمیان میں بیٹھا تھا۔ اس نے بلند آواز میں یہ اشتہار پڑھا۔ اچانک سب مہمان قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ اس افراتفری میں انھوں نے اسے پھاڑ دیا اور

فقیر کو، جسے پہلے ہی وہاں سے بہت خیرات مل چکی تھی، دھکے دے کر کمرے سے باہر نکال دیا اور تمام مہمان اس خوبصورت دن سے لطف اندوز ہونے کے لیے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ کیوں؟ اس پڑوسی صوبے کی بولی چند بنیادی حوالوں سے ہماری زبان سے بالکل مختلف ہے اور یہ اختلاف لکھے ہوئے لفظوں کی خاص ساخت میں بھی بہت نمایاں ہے جو ہمارے لیے ان کی قدیمی خصوصیت ہوتی ہے۔ پروہت نے بمشکل دو صفحے پڑھے ہوں گی کہ ہم اپنے فیصلے پر پہنچ گئے۔ قدیم تاریخ کو عرصہ دراز پہلے بیان کیا گیا، پرانے زخم بھرے ہوئے بھی عرصہ گزر گیا۔ یاد کرنے پر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ زندگی کی ہولناکی جامع انداز میں گداگر کے الفاظ میں بیان ہوئی تھی۔ ہم نے قہقہے لگاتے ہوئے سر جھٹکے اور اسے مزید سننے سے انکار کر دیا۔ ہم لوگ اپنے حال کو فراموش کر دینے کے اتنے مشاق ہیں۔

اگر ان تمام شواہد سے کوئی یہ نتیجہ نکالنا چاہے کہ درحقیقت ہمارا کوئی شہنشاہ نہیں ہے، تو یہ نتیجہ حقیقت سے بہت دور نہیں ہوگا۔ اس بات کو ہر زمانے میں بار بار دہرایا گیا۔ جنوب میں ہم لوگوں سے زیادہ شہنشاہ کا کوئی وفادار نہیں ہے۔ لیکن شہنشاہ نے ہماری وفاداری سے کبھی استفادہ نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے گاؤں کے اختتام پر مقدس اژدھا ایک مختصر استھان پر کھڑا ہے اور جب سے انسانی یادداشت کا آغاز ہوا ہے، یہ خراج تحسین کے طور پر پیکنگ کی سمت اپنا شعلہ فشاں سانس پھینکتا رہا ہے۔ دیہات میں لوگوں کے لیے پیکنگ دوسری دنیا سے بھی زیادہ حیران کن شے ہے۔ کیا وہاں بھی ایسا گاؤں ہوسکتا ہے جہاں پہلو بہ پہلو کھڑے مکانات، اس سے کہیں زیادہ رقبے تک کھیتوں کھلیانوں کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں جتنا رقبہ ہمیں یہاں پہاڑوں پر سے دکھائی دیتا ہے۔ اور ان کے درمیان دن اور رات لوگوں کے بھنچے ہوئے گنجان مجمع موجود ہوں گے؟ ہمارے لیے کسی ایسے شہر کے بارے میں سوچنا کہیں زیادہ دشوار ہے بنسبت اس کے کہ ہم یقین کر لیں کہ پیکنگ اور اس کا شہنشاہ ایک ہی ہیں یعنی ایسا بادل جو مثال کے طور پر قرنوں سے سورج کے نیچے امن سے سفر کر رہا ہے۔

ایسی آراء قائم کرنے کا نتیجہ مجموعی طور پر آزاد اور بھرپور زندگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو بلاشبہ غیر اخلاقی نہیں ہے۔ اپنی سیاحتوں کے دوران مجھے شاذ ہی کبھی ایسی خالص اخلاقیات دیکھنے کا موقع ملا جیسی یہ میرے آبائی دیہات میں موجود ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ ایسی زندگی ہے جو کسی رواجی قانون کی پابند نہیں ہوتی اور صرف انھی فہمائشوں اور نصائح کو پیش نظر رکھا جاتا ہے جو ہم تک ازمنہ قدیم سے چلے آئے

ہیں۔

میں تعمیمات سے حفاظت کرتا ہوں اور یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے صوبے کے دس ہزار دیہاتوں میں یہی صورت حال ہے، چین کے پانچ سو صوبوں میں تو اس سے بھی کم۔ پھر بھی میں نے اس موضوع پر جو مختلف تحریریں پڑھی ہیں اور جیسا میں نے خود مشاہدہ کیا ہے، اس کی بنیاد پر میں یہ کہنے کی جرات کرسکتا ہوں کہ انسانی مواد کی فراوانی کے باعث خاص طور پر اس دیوار کی تعمیر نے ہوش مند انسان ایک موقع دیا کہ وہ تقریباً سبھی صوبوں کی روح کا سفر کرے، اور ان شواہد کی بنیاد پر میں یہ دعویٰ کرنے کی ہمت کرسکتا ہوں کہ ہمارے شہنشاہ سے متعلق موجود رویے میں کوئی ایسی بات ہے جو مستقل اور عمومی طور پر ہمارے گاؤں کے مزاج سے لگا کھاتی ہیں۔

اس کے برعکس میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے کہ اس رویئے کو ایک خوبی ثابت کرنے کی خواہش کروں۔ یہ سچ ہے، ایسے رویئے کی بنیادی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے جو دنیا کی قدیم ترین شہنشائیت میں بھی ایسی صراحت کے ساتھ شہنشاہیت کا ادارہ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی یا اسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا کہ اس ادارے کا دائرہ عمل براہ راست اور لامختتم انداز میں ملک کی دور دراز سرحدوں تک رسائی پاسکے۔ دوسری طرف لوگوں کو ایک خاص حد تک عقیدے کی کمزوری اور تخیلاتی قوت کی کمی کا مسئلہ بھی درپیش ہے جس کی وجہ سے یہ پیکنگ میں شہنشاہت کے انجماد کو ختم کرنے اور اسے اس کی قابل محسوس حقیقت کے ساتھ اپنی چھاتیوں سے بھینچ لینے سے قاصر رہتے ہیں جن کی اس سے بڑھ کر کوئی خواہش نہیں ہوگی کہ وہ ایک بار اس لمس کو محسوس کریں اور پھر مر جائیں۔

یہ رویہ کسی اعتبار سے خوبی نہیں ہے۔ سب سے زیادہ غیر معمولی بات یہ ہے کہ یہ کمزوری ہم لوگوں کی زندگیوں کو آپس میں جوڑنے والے اہم ترین اثرات میں سے ایک معلوم ہوتی ہے۔ اگر میں اسے یوں بیان کرنے کی جسارت کروں کہ یہی وہ وجہ ہے جو ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ کسی بنیادی نقص کی تلاش نہ صرف ہمارے ضمیر کی وقعت بلکہ اس سے بھی زیادہ بری بات یہ ہوگی کہ یہ ہماری بنیادوں کی وقعت کو گھٹانے کے مترادف ایک کوشش ہوگی۔ اور اسی باعث میں ان سوالات سے متعلق اپنی تحقیقات کو اس درجہ سے مزید آگے نہیں بڑھاؤں گا۔

ایک کتے کی تحقیقات

میری زندگی کتنی بدل گئی ہے لیکن ابھی اندر ہی اندر کتنا کچھ بدلنا باقی ہے۔ میں ماضی کی

یادوں کو کھنگالتا ہوں اور اس وقت کو یاد کرتا ہوں جب میں کتوں کے طبقہ کا ایک رکن تھا، ان کی تمام خصوصیات میں شراکت دار، ان ہی کی طرح کا ایک کتا، تو گہرے تجزیے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے مجھ میں مختلف ہونے کا، معمولی سی عدم موافقت کا احساس موجود تھا جو مجھے میں معمولی سا بے چین رکھتی جسے شاندار عوامی تقریبات میں شمولیت بھی ختم نہ کر پاتی۔

مزید یہ کہ کبھی کبھار، نہیں، کبھی کبھار نہیں بلکہ اکثر و بیشتر میرے حلقے کے کسی ساتھی کتے، جس کا میں شائق ہوتا، کی بس ایک نگاہ، محض ایک نگاہ جیسے پہلی مرتبہ میں اسے دیکھ رہا ہوں، مجھے مایوس کن جھنجھلاہٹ اور خوف سے بھر دیتی، حتی کہ ناامیدی سے بھی۔ میں نے ممکنہ حد تک اپنی ایسی سوچوں کو دبانے کی کوشش کی۔ تب میرے دوستوں نے، جن سے میں نے رجوع کیا، میری اعانت کی۔ زیادہ پرامن زمانے آئے۔ یہ سچ ہے ان زمانوں میں بھی غیر متوقع حیرتوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن تب میں نے انھیں زیادہ معنویت کے ساتھ قبول کیا، جو میری زندگی میں زیادہ بامعنی انداز میں شامل ہو گئیں خاص طرح کی اداسی اور کاہلی کے ساتھ۔ لیکن اس کے باوجود مجھے ایک حد تک سرد مہر، محتاط، شرمیلے اور متوازن کتے کی حیثیت سے، یعنی ایک عام کتے کی زندگی جینے کی بھی گنجائش حاصل رہی۔

کیسے طمانیت کے ان وقفوں کے بغیر میں اس عمر تک پہنچ سکتا تھا جس سے میں اب محظوظ ہو رہا ہوں؟ کیسے میں جدوجہد کے بعد استقامت کی منزل تک پہنچ سکتا تھا جس کے باعث میں جوانی کے خدشات اور بڑھاپے کے خوف سے نبرد آزما ہوا؟ اور کیسے میں فکر کی اس نہج تک پہنچ سکتا تھا جہاں میں اس قابل ہوں کہ اپنی واقعتاً ناخوشگوار، یا اگر اسے آسان لفظوں میں بیان کیا جائے تو کم خوشگوار زندگی سے نتائج اخذ کر سکتا اور پھر ان کے مطابق زندگی کو ترتیب دے سکتا ہوں؟ تنہا اور تیاگی، جس کے پاس بے ثمر مگر جہاں تک میرا تعلق ہے تو ناگزیر مختصر تحقیقات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے، سو یوں میں جیتا ہوں۔ لیکن اس شدید تیاگ کے باوجود میں دوسرے کتوں سے غافل نہیں ہوا۔ ان کی خبریں گاہے بگاہے مجھ تک پہنچتی ہیں اور کبھی کبھار میں بھی اپنی خبریں ان تک پہنچاتا۔ وہ میرا احترام کرتے ہیں لیکن وہ میری طرز معاشرت کا ادراک نہیں کر پاتے۔ لیکن انھیں مجھ سے کوئی کد بھی نہیں ہے، حتی کہ نوجوان کتے، جنھیں میں کبھی فاصلے سے گزرتے دیکھتا ہوں، ایک نئی نسل جس کے بچپن سے متعلق محض مبہم یادیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں، تو وہ مجھے تعظیم سے سلام کیے بغیر نہیں گزرتے۔

یہ فرض نہیں کرنا چاہئے کہ اپنی تمام عجیب عادات کی وجہ سے، جو دن کی روشنی کی طرح سب پر عیاں ہیں، میں کتوں کی برادری سے بہت زیادہ مختلف ہوں۔ بے شک جب میں اس نقطے پر غور وخوض کرتا ہوں، جس کے لیے وقت اور استعداد بدرجہ اتم میرے پاس موجود ہے، تو مجھے صاف محسوس ہوتا کہ کتے ہر لحاظ سے ایک شان دار مخلوق ہیں۔ ہم کتوں کے علاوہ دنیا میں ہر طرح کی مخلوق موجود ہے۔ بدہیئت، محدود، ہونق مخلوقات جن کی زبان محض چند میکانکی چیخوں پر مشتمل ہے۔ ہم میں سے بہت سے کتے ان کا بغور مشاہدہ کرتے اور انہیں نام دیتے ہیں۔ ان کی مدد کرنے، انھیں تعلیم دینے، ان کی ذہنی سطح کو بلند کرنے اور ایسا ہی بہت کچھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ان سے یکسر بے نیاز ہوں جب تک کہ وہ میرے معاملات میں دخل اندازی نہ کریں۔ میرے ذہن میں وہ سب آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ میں انہیں نظر انداز کر دیتا ہوں۔

لیکن ایک بات اتنی واضح ہے کہ ذہن سے محو نہیں ہوتی کہ ہم کتوں کے مقابلے میں ان میں اکٹھے رہنے کے رویے کا کس قدر فقدان ہے۔ کیسے خاموشی اور اجنبیت کے ساتھ اور عجیب تنفر کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور کس قدر گھٹیا مفادات انھیں مختصر وقفہ کے لیے عارضی طور پر متحد کر دیتے ہیں، اور کیسے یہی سطحی مفادات ان میں آپسی رنجشیں اور تفاوت پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

ان کے مقابلے میں ہم کتوں کی مثال لیجیے۔ بہت اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہم واقعتاً ایک ڈھیر کی صورت میں اکٹھے رہتے ہیں، ہم سب جو ایک دوسرے سے ایسی لاتعداد اور واضح ترامیم کے سبب مختلف بھی ہیں جو وقت کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ ہم ایک دوسرے کی جانب کھنچتے جاتے ہیں اور کوئی طاقت ہمیں اکٹھے رہنے کی خواہش کی آسودگی سے مانع نہیں رکھ سکتی۔ ہمارے تمام قوانین اور روایات، جن میں سے چند ایک مجھے تاحال یاد ہیں اور باقی ذہن سے محو ہو چکے، ہماری اس مسرت کامل، اکٹھے رہنے کی پرحدت آسودگی کی خواہش کے تحت، جس کی ہم اہلیت رکھتے ہیں، وجود میں آئے۔

لیکن ذرا تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ کیجئے۔ میرے علم کے مطابق کوئی دوسری مخلوق ایسی نہیں ہے جس میں کتوں سے زیادہ آپسی اختلافات موجود ہوں۔ نہ ہی کسی نوع میں طبقوں، پیشوں، قسموں کا اس قدر تنوع موجود ہے۔ اتنا تنوع کہ جس کا ایک ہی نظر میں مشاہدہ و تجزیہ ممکن نہ ہو۔ ہم، جن کی ایک

خواہش تو ہمیشہ ساتھ رہنے کی ہے اور باقی سب باتوں کے باوجود ہم بار ہا ایسے ماورائی لمحات تک رسائی پانے میں کامیاب بھی ہوئے، دوسروں کے برعکس ایسے عجیب مشاغل کے باعث ایک دوسرے سے جدا رہنے پر بھی مجبور ہیں جو اکثر ہمارے پڑوسیوں کے لیے بھی ناقابل فہم ہوتے ہیں اور جو ایسے قوانین کے تابع ہوتے ہیں جو ہم کتوں کی دنیا سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ الٹا اس کے خلاف ہوتے ہیں۔

کیسے چکرا دینے والے یہ سوالات ہیں۔ ایسے سوالات جن کا جواب دینا کسی کی ترجیح میں شامل ہوگا۔ میں اس نقطہ نگاہ کو بھی سمجھتا ہوں، خود اپنے نقطہ نظر سے بھی کہیں بہتر انداز میں۔ لیکن ان سوالات کی میں گرفت میں ہوں۔

آخر میں ویسا کیوں نہیں کرتا جیسا دوسرے کرتے ہیں؟ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکمل مفاہمت کے ساتھ رہنا اور خاموشی سے ہر اس شے کو قبول کر لینا جو اس مفاہمت کو مجروح کرے، اسے ایک بڑے قضیے میں ہونے والی ایک معمولی غلطی سمجھ کر نظر انداز کر دینا، ہمیشہ اپنی توجہ انہی چیزوں پر مرکوز رکھنا جو ہمیں خوشی سے آپس میں باندھے رکھتی ہیں۔ نہ کہ وہ چیزیں جو بار بار، جیسے جبراً ہمیں ہمارے سماجی دائرے سے باہر دھکیل دیتی ہیں۔

مجھے اپنی جوانی کا ایک واقعہ یاد ہے۔ میں تب انبساط کی ایسی ناقابل توضیح خوشگوار کیفیتوں میں سے ایک میں سرشار تھا جن سے انسان بچپن میں ضرور دوچار ہوتا ہے۔ میں ننھا سا کتا تھا۔ ہر بات مجھے اچھی لگتی۔ ہر بات سے میں اپنا تعلق محسوس کرتا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے اردگرد عظیم وقوعات رونما ہو رہے تھے جن کا میں محور ہوں اور جن کی خاطر مجھے آواز بلند کرنی چاہیے۔ ایسے واقعات کہ جن کے لیے اگر میں کدوکاوش نہ کروں اور مسرت سے اپنی دم نہ ہلاؤں تو ان کو سفاکانہ انداز میں ہونے سے روک دیا جائے گا۔ طفلانہ تخیلات جو پختہ عمر میں کافور ہو گئے۔ لیکن تب یہ بہت طاقت ور تھے۔ میں کلی طور پر ان کے سحر میں تھا۔

تب واقعی ایک خاص واقعہ ہوا، ایک انتہائی غیر متوقع واقعہ جس سے میری شدید توقعات کو ایک جواز ملا۔ بجائے خود وہ کوئی بہت غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ میں ایسے بہت سے منظر پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ غیر معمولی مناظر، اور وہ بھی اکثر و بیشتر، لیکن تب اس کے اولین تاثر نے پوری طاقت سے مجھے اپنی گرفت میں لیا۔ یہ ایسا تاثر تھا کہ بعد کی ساری زندگی جس کا نقش کبھی مدہم نہیں

ہوتا اور نہ ہی اس کے اثرات کم ہوتے ہیں۔

المختصر میری کتوں کے ایک گروہ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ یا یہ کہ میری ان سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی بلکہ وہ میرے سامنے آ گئے۔ اس سے پہلے میں کچھ دیر سے تاریکی میں بھاگ رہا تھا عظیم واقعات کی پیش آگاہی سے مملو۔ ایسی پیش آگاہی جو ہو سکتا ہے کہ التباسی ہو کیونکہ یہ ہمیشہ مجھ پر طاری رہی۔ میں دیر سے اندھیرے میں آگے پیچھے بھاگ رہا تھا، اندھے اور بہرے کی طرح محض ایک مبہم خواہش کے تحت، کہ میں دفعتاً تھم گیا، اس احساس کے ساتھ کہ میں درست جگہ پہنچ چکا تھا۔

نگاہ بلند کر کے میں نے دیکھا کہ وہ ایک چمکتا ہوا دن تھا، معمولی سا دھندلا، اور ہر طرف انتہائی نشہ آور خوشبو کی آمیزش اور پھیلاؤ تھا۔ میں نے ہچکچاہٹ آمیز بھونکار کے ساتھ صبح کو خوش آمدید کہا اور پھر جیسے میں نے انھیں تاریکی میں سے جادو کے زور پر پیدا کیا ہو، سات ہولناک آوازوں کے ساتھ جیسی آوازیں میں نے کبھی نہیں سنی تھیں، وہ سات کتے روشنی میں ظاہر ہوئے۔

میں فوراً بھاگ جاتا اگر میں نے واضح طور پر نہ دیکھ لیا ہوتا کہ وہ واقعی کتے ہیں اور یہ کہ وہی ان آوازوں کو پیدا کر رہے ہیں، گو میں صحیح طور پر نہیں جان سکا کہ وہ ایسا کس طرح کر رہے تھے؟ لیکن جیسا کہ پھر ہوا کہ میں کھڑا رہا۔ تب میں موسیقی کے تخلیقی جوہر سے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا جس سے صرف کتوں کی نسل ہی کو سرفراز کیا گیا تھا۔ قدرتی طور پر یہ میری بہت آہستگی سے تقویت پانے والی مشاہداتی قوتوں کے دائرے میں آنے سے رہ گئی تھی۔ بے شک موسیقی نے مجھے وجود کے مکمل فطری اور ناگزیر عنصر کے طور پر تب سے گھیرے رکھا تھا جب میں دودھ پیتا کمزور سا بچہ تھا۔ ایسا عنصر جسے باقی وجود سے علیحدہ شناخت کرنے پر کسی شے نے مجھے مجبور نہیں کیا تھا۔ میرے بزرگوں نے اس جانب میری توجہ منعطف کرنے کے لیے ایسے اشاروں سے کام لیا تھا جو ایک بچے کو سمجھانے کے لیے مناسب ہو سکتے تھے۔

بہرکیف میرے لیے سب سے حیران کن اور بلاشبہ تباہ کن سات عظیم موسیقاروں کا یہ گروہ تھا۔ انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ نہ انھوں نے کچھ گایا۔ وہ بس خاموش کھڑے رہے، تقریباً مستقل طور پر خاموش۔ بس کھلی فضا میں وہ موسیقی پیدا کرتے۔ ان کی ہر ادا میں موسیقی تھی۔ پیروں کو اٹھانا اور زمین پر رکھنا، سر کو خاص طرح سے جھٹکنا، بھاگنا اور ساکت کھڑے رہنا، ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہونے

کا انداز۔ وہ ہموار آسن جسے وہ یوں لگاتے کہ ایک کتا دوسرے کی پشت پر اپنے دونوں پیر جما لیتا اور پھر باقی سب یونہی ایک قطار میں کھڑے ہو جاتے حتیٰ کہ پہلا کتا باقی چھ کتوں کے بوجھ سے دبنے لگتا یا وہ زمین پر لیٹ جاتے اور طے شدہ، متفقہ مختلف پیچیدہ آسن میں پیٹ کے بل رینگتے۔ کبھی کسی سے غلطی سرزد نہ ہوتی۔ حتیٰ کہ آخری کتے سے بھی نہیں جو نسبتاً کم اعتماد تھا اور لے اور تال میں فوری طور ان کے ساتھ مل نہیں پاتا تھا، لیکن اس کی غیر پختگی دراصل باقیوں کی انتہائی مشاکی سے موازنے کی وجہ سے تھی۔ اور اگرچہ دوسروں کے مقابلے میں وہ غیر پختہ بلکہ انتہائی غیر پختہ تھا لیکن وہ دوسروں کے کام میں مخل نہ ہوتا۔ جب کہ دوسرے عظیم فنکار لے کو ناقابل تغیر انداز میں مضبوطی سے تھامے رکھتے۔

لیکن یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ میں نے انہیں دیکھا۔ یا یہ کہ واقعی میں نے انہیں دیکھا؟ وہ کسی گوشے سے ظاہر ہوئے۔ میں نے دل سے انہیں کتے ہونے کی حیثیت سے خوش آمدید کہا اور اگرچہ میں ان میں سے پھوٹتی آوازوں سے شدید بوکھلاہٹ کا شکار تھا، لیکن آخر وہ کتے ہی تو تھے۔ آپ کے اور میرے جیسے ہی کتے۔ میں نے عادت سے مجبور ہو کر انہیں راستے میں ملنے والے دیگر کتوں جیسے کتے تصور کیا اور خواہش محسوس کی کہ ان سے ملوں اور خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کروں۔ وہ بہت قریب تھے۔ بے شک وہ مجھ سے عمر رسیدہ تھے اور میری طرح لمبے اُونی بالوں والے کتے نہیں تھے۔ لیکن اپنے جسم اور ساخت میں بہت زیادہ غیر مانوس بھی نہیں تھے۔ ایسے یا ان سے ملتے جلتے بہت سے کتوں کو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

لیکن جب میں ان سوچوں میں مستغرق تھا، موسیقی غیر محسوس طور پر انتہائی شدید ہوگئی جیسے کوئی سانس باہر کھینچ لے اور مجھے ان حقیقی چھوٹے کتوں سے بہت دور جا پھینکے، میری منشاء کے بالکل برعکس۔ میں نے ایک چیخ ماری جیسے جسم میں شدید درد اٹھا ہو۔ میرا ذہن موسیقی کے اس جھماکے کے سوا کچھ بھی سننے سے قاصر تھا جو ہر سمت سے، بلندیوں سے، گہرائیوں سے، ہر جگہ سے آتا سنائی دے رہا تھا، سننے والے کو گھیرے میں لیے، اپنی گرفت میں کیے، اسے رگیدتے اور اس کے نیم بے ہوش جسم پر اس قدر نزدیک سے نفیریاں بجاتے ہوئے کہ وہ بہت دور بجتی معلوم ہوتیں اور سنائی نہ دیتی تھیں۔

تب ایک عارضی پرسکون وقفہ آیا کہ سننے والا اتنا تھک جاتا ہے، اتنا بے زار اور اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ مزید کچھ سننے کی سکت کھو دیتا ہے۔ آرام کا وقفہ آیا اور میں نے پھر سے ان سات چھوٹے

کتوں کو دیکھا، عجیب حرکات کرتے اور کودتے پھلانگتے ہوئے۔ میں ان کی خلوت پسندی کے باوجود ان پر بھونکنے کی خواہش محسوس کی، ان سے درخواست کرنے کی خواہش کہ مجھے بھی بہرہ یاب کریں۔ ان سے سوال پوچھنے کی خواہش کہ وہ کیا کر رہے تھے؟ تب میں ایک بچہ تھا اور مجھے اعتماد تھا کہ میں کسی سے کچھ بھی پوچھ سکتا ہوں۔ لیکن ابھی میں ان سے پوچھنے ہی لگا تھا، اور ابھی ان سات کتوں سے کتوں کی سی عمدہ اور مانوس شرائط پر تعلق استوار کرنے ہی لگا تھا کہ جب اچانک موسیقی پھر سے جاری ہوگئی۔ اس نے میری ساری خوش طبعی نگل لی، مجھے دائروں میں چکر دیئے جیسے میں صرف ان کا شکار نہیں تھا بلکہ انھی موسیقاروں میں سے ایک تھا۔ انھوں نے مجھے دائیں بائیں دھکیلا۔ میری رحم کی التجا پر ذرا بھی کان دھرے بغیر۔ بالا آخر اس تشدد سے مجھے مکت کیا ایک چوبی باڑھ کی بھول بھلیوں میں اچھال کر جو اس جگہ کے ارد گرد پھیلی تھی۔ گو میں اسے پہلے نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اب میں اس کی گرفت میں تھا، اس نے میرا سر نیچے زمین پر جھکائے رکھا، اور اگرچہ موسیقی تا حال میرے عقب میں کھلی جگہ میں جاری تھی لیکن مجھے اپنا سانس درست کرنے کی مہلت مل گئی۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان سات کتوں کی فنکاری نے مجھے اتنا حیران نہیں کیا کہ یہ میرے لیے ناقابل فہم تھی اور یقیناً میری استعداد سے ماورا بھی، اس کے بجائے مجھے ششدر کیا ان کی جرات نے جس سے وہ خود اپنی ہی پیدا کردہ موسیقی کو کھلم کھلا سن رہے تھے اور ان کی قوت نے کہ گرے بغیر سکون کے ساتھ اسے برداشت کر رہے تھے۔ لیکن اب اپنے خفیہ جائے پناہ سے میں نے زیادہ قریب ہو کر دیکھا تو معلوم ہوا یہ انتہائی سرد مہری نہیں بلکہ انتہائی اضطراب کی کیفیت تھی جو ان کے مظاہرے کی نمایاں خصوصیت تھی۔ ان کے اعضاء جو بظاہر اپنی حرکات میں متوازن معلوم ہوتے، ہر ہر قدم پر مسلسل قابل فہم جھٹکے کے ساتھ تھرتھراتے تھے۔ جیسے مایوسی سے سکتے میں آئے ہوئے وہ ایک دوسرے پر اپنی نگاہیں جمائے رکھتے اور جب ان کے تناؤ میں لمحہ بھر کے لیے کمی ہوتی، ان کی زبانیں جبڑوں سے باہر لٹک آتی تھیں۔ یہ ناکامی کا خوف نہیں تھا جو انہیں اس قدر مضطرف کیے رکھتا۔ کتے جو یہ سب کچھ کر گزرنے کی جرات اور استعداد رکھتے ہیں، انہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تو پھر وہ کیوں خوف زدہ تھے؟ کون سی طاقت انہیں یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر رہی تھی، جو وہ کر رہے تھے۔

میں خود کو زیادہ دیر روک نہیں سکا۔ خاص طور پر جبکہ وہ ناقابل فہم انداز میں اعانت کے طلب

گار معلوم ہوتے تھے۔ یوں موسیقی کے تیز شور میں میں نے بلند آواز اور دوٹوک انداز میں ان سے سوالات پوچھے۔ لیکن انتہائی عجیب، انتہائی غیر معمولی بات۔ انہوں نے کسی سوال کا جواب نہیں دیا جیسے وہ وہاں سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ جو کتے دوسرے کتوں کے خیر سگالی کے جذبات کا جواب نہیں دیتے، وہ ان مہذب آداب کے خلاف ایک جرم کے مرتکب ہوتے ہیں جو ایک ادنی کتے کے لیے بھی اسی انداز میں نا قابل معافی ہے جیسے کسی بھی عظیم ترین کتے کے لیے۔ شاید وہ سرے سے کتے ہی نہیں تھے؟ لیکن آخر وہ کس اعتبار سے کتے نہیں تھے؟

کیا میں نے غور کرنے پر ان کی مدھم چیخیں نہیں سنی تھیں جس سے وہ ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے، ایک دوسرے کی توجہ درپیش مشکلات کی طرف منعطف کرتے اور انہیں غلطی سے بچنے کی ہدایت کرتے تھے؟ کیا میں نہیں دیکھ سکتا تھا کہ آخری اور سب سے نوعمر کتا ہی بیشتر اس چیخ و پکار کا تخاطب ہوتا اور جو اکثر چور نظروں سے مجھے دیکھتا جیسے میرے سوال کا جواب دینا چاہتا ہو لیکن ایسا کرنہ پارہا ہو کیوں کہ اس کی اجازت نہیں تھی؟ آخر اس امتناع کی کیا وجہ تھی؟ ایسی بات جس کی ہمارے قوانین غیر مشروط اجازت دیتے تھے، یہاں ممنوع کیوں تھی؟ اس خیال سے مجھے طیش آ گیا اور موسیقی میرے ذہن سے تقریباً محو ہوگئی۔ وہ کتے قانون کی خلاف ورزی کررہے تھے۔ وہ چاہے کتنے ہی عظیم موسیقار ہوں، قانون ان کے لیے بھی تھا۔ میں بچہ ہونے کے باوجود اس بات سے اچھی طرح باخبر تھا۔ تب مجھے ایک اور بات جاننے کو ملی۔ ان کے پاس خاموش رہنے کی ٹھوس وجوہات تھیں۔ وہ ایک طرح کے احساس ندامت کی وجہ سے خاموش تھے۔ وہ اپنے ساتھ کیا کررہے تھے؟ اسی موسیقی کی وجہ سے جس کا میں نے مشاہدہ کیا۔ لیکن انہوں نے ساری شرم اتار پھینکی تھی۔ بدبخت مخلوق اب ایسی حرکت کی مرتکب ہورہی تھی جو ہماری نگاہ میں بیک وقت انتہائی مضحکہ خیز اور قابل ندامت تھی۔ وہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر چل رہے تھے۔ لعنت ہے ان پر۔ وہ اپنی برہنگی کو ظاہر کررہے تھے۔ شوریدہ سری سے اپنی شرم گاہ کا مظاہرہ کررہے تھے۔ وہ یہ سب کچھ یوں کررہے تھے جیسے یہ کوئی مستحسن عمل ہو اور جب اپنی سعد جبلتوں سے مجبور ہوکر وہ اپنے اگلے پنجے زمین پر ٹکا دیتے تو واقعی پریشان ہوجاتے جیسے کوئی بڑی غلطی سرزد ہوئی ہو جیسے فطرت ایک بڑی غلطی تھی۔ فوراً پھر سے اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا لیتے اور ان کی آنکھیں اس بات پر معافی کی درخواست معلوم ہوتیں کہ انھیں اپنی ذلیل حرکت سے کچھ دیر کے لیے سبک دوشی اختیار کرنی پڑی۔ کیا

دنیا سر کے بل کھڑی تھی؟ میں کہاں تھا؟ آخر کیا ہوسکتا تھا؟ صرف اپنے طور پر میں نے ہچکچاہٹ کا رویہ اختیار کرنے سے اجتناب کیا، چھلانگ لگا کر تختوں کے انبار سے باہر آیا، کھلی جگہ پر چھلانگ مار کر آگے بڑھا اور کتوں کی طرف گیا۔ میں ایک نوجوان مفکر، اب استاد کا منصب نبھاؤں گا۔ انھیں ان کی غلطی کا احساس دلانا ہوگا کہ وہ کیا کر رہے تھے اور انہیں مزید گناہ کے ارتکاب سے باز رکھوں گا۔

''اور بوڑھے کتے بھی۔ اور بوڑھے کتے بھی'' میں خود سے دہراتا گیا۔ لیکن ابھی خود کو آزاد ہی کر پایا تھا اور کتوں سے ایک یا دو چھلانگوں کے فاصلے پر ہی تھا کہ موسیقی نے پھر سے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ شاید میں اپنے جوش وخروش میں اس کو سہار ہی لیتا کہ میں اس سے آگاہ تھا، اگر اس کے تمام تر شاہانہ وقار کے ساتھ جو دہشت انگیز ہونے کے باوجود ناقابل تسخیر نہیں تھا، ایک صاف، چبھتا ہوا مسلسل سُر جو کسی تبدیلی کے بغیر بہت فاصلے سے سنائی دیا۔ موسیقی میں حقیقی دھن، بلند نہ ہوتی اور مجھے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہ کرتی۔ آہ، ان کتوں کی موسیقی نے مجھے ہوش وحواس سے بے گانہ کر دیا۔ میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ مجھ میں انہیں نصیحت کرنے کی خواہش کافور ہوگئی۔

وہ چاہے اپنی گلی ٹانگوں کو اٹھائے چلتے رہیں، گناہ کے مرتکب ہوں اور ایک دوسرے کو خاموشی سے گناہ کی ترغیب دیتے رہیں۔ میں فقط چھوٹا سا کتا۔ کون مجھ سے ایسے مشکل کام کی توقع کرتا؟ میں نے بھی خود کو اس سے کہیں زیادہ غیر اہم بنا لیا جتنا میں تھا۔ میں منہ بسور کر روں روں کرنے لگا اور اگر کتے مجھ سے پوچھتے کہ ان کے مظاہرے سے متعلق میری کیا رائے تھی تو میں ایک لفظ بھی ان کی مخالفت میں نہ کہہ پاتا۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گزری کہ کتے اپنی تمام موسیقی اور نور افشانی سمیت اسی تاریکی میں غائب ہوگئے جس میں سے وہ نمودار ہوئے تھے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اس تمام قصے میں کچھ بھی قابل ذکر نہیں ہے۔ لمبی زندگی کے دوران فرد ہر قسم کے واقعات سے دوچار ہوتا ہے جنھیں ان کے پورے سیاق وسباق میں اور ایک بچے کی آنکھ سے دیکھا جائے تو بہت حیران کن معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی چٹ پٹے معروف مقالہ کے مصداق ''سب کچھ غلط سمجھے'' اور اس سے جڑی ہوئی ہر شئے کو بھی۔

اسے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ یہ ایک سادہ معاملہ تھا کہ سات موسیقار صبح کے سکوت میں اپنے فن کی ریاضت کے لیے اکٹھے ہوئے۔ اور یہ کہ ایک بہت چھوٹا کتا راستہ بھٹک کر ادھر آنکلا۔ ایک

ناگوار خاطر نووارد جسے انھوں نے خاص دہشت زدہ کردینے والی اور غیر مانوس موسیقی سے بھگانے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ اس نے اپنے سوالات سے انہیں دق کیا۔ وہ تو محض اس کی موجودگی سے ہی پریشان تھے، اس کی اذیت دہ مداخلتوں کو کیا برداشت کرتے اور اس پر مستزاد یہ کہ ان سے ان سوالات کے جوابات کی بھی توقع کی جائے۔ بے شک قانون ہمیں دوسروں کے سوالات کے جواب دینے کا پابند بناتا ہے لیکن کیا یہ ننھا سا راہ بھٹکا ہوا کتا واقعتاً اتنا اہم تھا کہ اس کو بغور سنا جاتا۔ اور شاید وہ اسے سمجھ ہی نہیں سکے کیوں کہ ممکن ہے کہ اس نے بھونک بھونک کر بہت غیر واضح انداز میں سوالات پوچھے ہوں۔ یا شاید وہ اس کی بات سمجھ گئے ہوں اور گہرے ضبط نفس کے ساتھ اسے جوابات بھی دیے ہوں۔ لیکن وہ ننھا سا کتا جو موسیقی سے غیر مانوس تھا، جوابات کو موسیقی میں الگ شناخت نہیں کر سکا۔ جہاں تک پچھلی ٹانگوں پر چلنے کا معاملہ ہے تو شاید دوسرے کتوں کے برعکس وہ چلنے کے لیے انھی ٹانگوں کو استعمال کرتے ہوں۔ اگر یہ گناہ ہے تو پھر بے شک گناہ سہی۔

لیکن وہ اکیلے تھے۔ سات دوست اکٹھے۔ یوں کہا جائے کہ اپنی فرضی چار دیواری میں ایک قریبی اجتماع، اور کہا جا سکتا ہے کہ ذاتی نوعیت کا۔ ذاتی دوست عوام تو نہیں ہوتے اور جہاں عوام موجود نہیں ہے، وہاں ایک ننھا سا گلیوں کا آوارہ کتا عوام کی نمائندگی کرنے کے اہل نہیں ہوتا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر کیا ایسا نہیں کہ سرے سے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ معاملہ گو بالکل ایسا نہیں ہے لیکن قریب قریب ایسا ہی ہے۔ والدین کو اپنے بچوں کو یوں آزادانہ گھومنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ بلکہ انہیں سکھانا چاہئے کہ زبان پر قابو رکھیں اور بڑوں کی عزت کریں۔

اگر یہ معروضات مان لی جائیں تو پھر سارا قصہ ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ لیکن بہت سی باتیں جو پختہ ذہن لوگوں کے لیے بے معنی ہوتی ہیں، بچے انہیں ویسے نہیں سمجھ پاتے۔ میں بھاگتا ہوا دوسروں تک گیا۔ انہیں ساری روداد سنائی، ان سے سوالات پوچھے، الزامات لگائے اور معاملے کی تفتیش کی۔ دوسروں کو اس جگہ آنے پر اکسایا جہاں یہ سارا واقعہ ہوا تھا۔ میں سب کو وہ جگہ دکھانے پر اتاؤلا تھا کہ جہاں میں کھڑا تھا اور جہاں وہ ساتوں موجود تھے، اور کہاں اور کیسے انہوں نے رقص کیا اور موسیقی پیدا کی، اور اگر کوئی مجھ پر ہنسنے اور مجھے دھتکارنے کی بجائے میرے ساتھ وہاں آتا تو شاید میں اپنی معصومیت کی قربانی دے دیتا اور اسے اپنی پچھلی ٹانگوں پر چل کر دکھاتا تا کہ اس منظر کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش

کرسکوں۔

بچوں کی ان کی خطاؤں پر مذمت ضرور کی جاتی ہے لیکن آخر کار انھیں معاف بھی کر دیا جاتا ہے۔ میں نے اپنی طفلانہ خصوصیات کو برقرار رکھا اور اس سب کچھ کے باوجود ایک کہن سال کتا بن گیا۔ خیر اس وقت میں بے تکلفی سے اس گزرے ہوئے واقعے پر مسلسل بات کرتا رہا جسے، میں آج اعتراف کرتا ہوں کہ میں نہایت کم اہمیت دیتا ہوں۔ لیکن تب میں اس کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کرتا رہتا اور اس بات کے قطع نظر کہ میرے سامع کون ہیں، میں سارا وقت اس مسئلے پر بحث کرنے میں گزارتا جو میرے لیے اتنا ہی اکتا دینے والا تھا جتنا کسی اور کے لیے۔ لیکن فرق یہ تھا کہ صرف اسی وجہ سے میں اسے حل کرنے تک ان تھک محنت کرتا رہا کہ میں پھر سے ایک آزاد، پرسکون اور عام زندگی گزارنے کی آزادی حاصل کرسکوں۔ سو نسبتاً کم طفلانہ حربوں کے ساتھ، جب کہ یہ فرق کچھ بہت زیادہ نہیں ہے، میں نے ان برسوں میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور ہنوز یہ جاری ہے۔

یہ سارا قصہ اس مجلس موسیقی سے شروع ہوا۔ میں اس مجلس کو قصوروار نہیں ٹھہراتا۔ یہ میرا داخلی میلان ہے جو مجھے اس طرف کھینچ لایا اور اگر یہ مجلس موسیقی منعقد نہ ہوتی تو یہ میلان خود کو بروئے کار لانے کے لیے کوئی دوسری ممکنہ صورت پیدا کر لیتا۔ لیکن یہ بات مجھے ہمیشہ غمزدہ کرتی ہے کہ یہ اتنی جلد وقوع پذیر ہوا۔ اس نے میرے بچپن کے ایک بڑے حصے کو آلودہ کیا۔ ایک جوان کتے کی پرمسرت زندگی، جس سے بہت سے دوسرے کتے کئی سالوں تک محظوظ ہوتے ہیں، میرے معاملے میں فقط چند مہینوں کی مختصر مدت پر محیط ہے۔ یہ سب ایسا ہی ہے۔ بچپن سے بڑھ کر بھی کچھ چیزیں اہم ہوتی ہیں۔ لیکن شاید مجھ میں طفلانہ مسرت کے حصول کا زیادہ امکان موجود ہے جسے میں نے زندگی بھر کی محنت کے بعد اپنے بڑھاپے میں اتنا زیادہ کمایا کہ کسی بھی حقیقی بچے میں اسے سہارنے کی قوت نہیں ہوگی، جتنی تب مجھ میں ہوگی۔

میں نے اپنی تحقیقات کا آغاز سادہ ترین چیزوں سے کیا۔ مواد کی کمی نہیں تھی۔ بدقسمتی سے ان کی کثرت نے ہی مجھے اپنے تاریک لمحوں میں مایوسی کا شکار کیا۔ میں نے اس سوال سے تحقیق کا آغاز کیا کہ کتوں کی نسل کس شے سے اپنی پرورش کرتی ہے؟ اگر آپ پسند فرمائیں تو بے شک یہ سوال کسی بھی حوالے سے ایک آسان سوال نہیں ہے۔ ہمیشہ سے اس سوال نے ہمیں اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ یہ ہمارے تمام تر استغراق کا مقصد رہا، ان گنت مشاہدات اور مقالات اور آرا اس موضوع پر شائع ہو چکے

ہیں۔ یہ علم کے ایک الگ شعبے کی صورت اختیار کر چکا ہے جو اپنی حیرت انگیز وسعت کے سبب نہ صرف کسی ایک مفکر کے دائرہ فہم سے بلکہ مجموعی طور پر تمام مفکرین کے دائرہ فہم سے ورے ہے۔ ایک بوجھ جسے کتوں کی مجموعی برادری کے سوا کوئی نہیں اٹھا سکتا، لیکن وہ بھی دشواری کے ساتھ اور محض جزوی طور پر۔ کیوں کہ یہ آباؤ اجداد کے فراموش شدہ ورثے کی طرح بار بار شکستگی کا شکار ہوتا ہے اور جسے نئے سرے سے بحال کرنا پڑتا ہے۔ میری تحقیق کی دشواریوں اور نا قابل حل صورت احوال کا ذکر تو رہنے ہی دیجیے۔

کسی کو مجھے یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس سے کسی بھی اوسط درجے کے کتے کی طرح آگاہ ہوں۔ مجھے حقیقی سائنسی معاملات پر تحقیق کرنے کی خواہش نہیں ہے۔ میرے دل میں علم کی اتنی قدر موجود ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ لیکن میرے پاس علم میں اضافہ کرنے کے لیے آلات، محتاط محنت، فراغت اور یہی نہیں، بلکہ خاص طور پر گذشتہ چند سالوں میں خواہش کا بھی فقدان رہا ہے۔ میں اپنی خوراک نگلتا ہوں لیکن اس سے متعلق معمولی ابتدائی سیاسی و معاشی ضابطے کا مشاہدہ میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس سلسلے میں علم کا جوہر ہی میرے لیے کافی ہے، یعنی یہ سادہ اصول جس کے تحت مائیں بچوں سے اپنا دودھ چھڑواتی اور انہیں باہر کی دنیا میں بھیجتی ہیں۔ وہ اصول یہ ہے ''جس حد تک ممکن ہو زمین کو پانی دو''

کیا اس ایک جملے میں سبھی کچھ موجود نہیں ہے؟ اس وقت سے جب ہمارے اولین آباؤ اجداد نے سائنسی تحقیق کا آغاز کیا، اب تک اس تحقیق نے اس میں کیا فیصلہ کن اہمیت کی شے کا اضافہ کیا ہے؟ محض تفصیلات، محض تفصیلات، اور وہ بھی کس قدر غیر یقینی۔ لیکن یہ اصول باقی رہے گا جب تک ہم کتے رہیں گے۔ اس کا تعلق ہماری بنیادی خوراک سے ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے پاس دیگر وسائل بھی ہیں لیکن محض چٹکی بھر۔ اگر سال بھر حالات موافق رہیں تو ہم اس بنیادی خوراک پر گزر اوقات کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ خوراک زمین سے حاصل ہوتی ہے لیکن زمین کو اسے نشوونما دینے کے لیے ہمارے پانی کی ضرورت ہے اور صرف اسی قیمت پر وہ ہمیں خوراک فراہم کرتی ہے۔ جب کہ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ یہ فراہمی مخصوص منتروں، گیتوں اور مذہبی عبادات سے تیز تر کی جا سکتی ہے۔

لیکن میرے خیال میں اتنا کافی ہے۔ کوئی ایسی بات باقی نہیں رہی جو بنیادی نوعیت کی ہو۔ اس رائے پر میں کتوں کی برادری کی واضح اکثریت کے ساتھ ہوں اور مجھے بین طور پر دیگر تمام بدعتی آرا

سے قطع تعلق کر لینا چاہئے۔ سچی بات تو یہ ہے مجھے عجیب ہونے یا اکثریت کے خلاف سچا بننے کا شوق نہیں ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے، جب کسی معاملے پر اپنے ساتھیوں سے میرا اتفاق رائے ہو جیسا کہ اس معاملے میں ہے۔ میری اپنی تحقیقات کسی اور حوالے سے ہیں۔ میرا ذاتی مشاہدہ بتاتا ہے کہ زمین کو سائنسی قواعد کے مطابق پانی دیا جائے اور کھرچا جائے تو اس میں نشوونما کا عمل جاری ہوتا ہے۔ اور وہ بھی ایسا اعلیٰ درجے کا، ایسی کثرت کے ساتھ، اس انداز سے، ایسی جگہوں پر، ایسے وقتوں میں، جیسا سائنس کے جزوی یا کلی طور پر قائم کردہ قوانین چاہتے ہیں۔

میرے لیے یہ سب کچھ قابل قبول ہے۔ میرا سوال کچھ یوں ہے کہ ''زمین یہ خوراک کہاں سے حاصل کرتی ہے؟'' ایسا سوال جسے عموعی طور پر لوگ نہ سمجھنے کا مکر کرتے ہیں اور جس کا بہترین جواب وہ یہ دیتے ہیں ''اگر تمہارے پاس کھانے کو کم ہے تو ہم تمہیں اپنا حصہ دیں گے۔'' ذرا اس جواب پر غور کیجئے۔

میں جانتا ہوں کتوں کی دنیا کی خصوصیات میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ اس خوراک کو، جس پر ایک بار ملکیت حاصل کر لی جائے، دوسروں کے ساتھ بانٹا جائے۔ زندگی دشوار ہے، زمین سرکش ہے، سائنس بہت ترقی کر چکی لیکن عملی طور پر اتنی ہی ناقص۔ جس کسی کے پاس خوراک ہو، وہ اسے سنبھال کر رکھتا ہے۔ یہ خود غرضی نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس کتوں کا ایک قانون، عوام کا ایک متفقہ فیصلہ، اور اپنی انانیت پر ان کی فتح ہے۔ کیونکہ خوراک کے مالک ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ جواب کہ 'اگر تمہارے پاس کھانے کو کافی نہیں ہے تو ہم تمہیں کچھ خوراک دے دیں گے' محض بات کرنے کا ایک انداز ہے، ایک چٹکلا، دل لگی کی ایک صورت۔ میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم بات مجھے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب میں ان دنوں اپنے سوالات کی آگ میں جھلستا ہوا ہر طرف خوار پھرتا تھا، تو میرے معاملے میں انھوں نے یہ بات مذاقاً نہیں کی تھی۔

یہ سچ ہے کہ انہوں نے کبھی مجھے کھانے کو کچھ نہیں دیا۔ اتنے مختصر وقفہ میں وہ بھلا کیسے خوراک کا بندوبست کر سکتے تھے اور بالفرض اگر کسی کے پاس کھانے کو کچھ موجود ہوتا تو بھوک کی شدت میں یہ بات کہاں یاد رہتی ہے۔ لیکن یہ پیش کش کرتے ہوئے ان کا تمام تر سنجیدگی سے یہی مطلب تھا جو وہ کہہ رہے تھے۔ اور یہاں وہاں مجھے کچھ خوراک حاصل کرنے کی اجازت بھی دے دی جاتی اگر میں ہوشیاری

سے کام لے کر جھٹنے میں جلدی کرتا۔

ایسا کیوں کر ہوا کہ لوگوں کا مجھ سے برتاؤ عجیب ہوگیا۔ میری دل جوئی کرتے، میری طرف داری کرتے۔ کیوں کہ میں ایک کمزور کتا تھا، غذائی قلت کا شکار اور اپنی ضروریات سے بے گانہ۔ لیکن غذائی قلت کے شکار بہت سے کتے ہر طرف بھاگتے پھرتے تھے اور دوسرے ان سے جہاں ممکن ہوتا، ان کی ناک کے نیچے سے معمولی سی بدترین خوراک بھی اچٹ لیتے۔ اکثر کسی طمع کی وجہ سے نہیں بلکہ اصولی بنیادوں پر۔ نہیں، وہ مجھ سے خاص ہمدردانہ رویہ روا رکھتے۔ میں اس حوالے سے زیادہ تفصیلی ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے واثق یقین ہے کہ یہ ایسا ہی تھا۔ تو کیا یہ میرے سوال تھے جن سے وہ محفوظ ہوتے اور یہ کہ جو انہیں بہت مکارانہ معلوم ہوتے تھے۔ نہیں۔ میرے سوالات انہیں کبھی مسرور نہیں کر سکے بلکہ عموماً وہ انھیں احمقانہ معلوم ہوتے۔ لیکن پھر بھی شاید یہ میرے سوال ہی تھے جنہوں نے ان کی توجہ کو میری جانب پھیرا۔ یہ یوں تھا کہ وہ کوئی غیر ممکن کام کرتے اور یہ کہ میرے سوالات برداشت کرنے کے بجائے خوراک سے میرا منہ بند کر دیتے جو کہ انھوں نے کبھی نہیں کیا لیکن وہ ایسا کرنا چاہتے تھے۔

لیکن اس صورت میں بہتر ہوتا کہ وہ مجھے پرے دھکیل دیتے اور میرے سوالات کو سننے سے انکار کر دیتے لیکن وہ ایسا بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بے شک میرے سوالات سننے میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن شاید اس لیے کہ یہ سوالات میں نے پوچھے تھے، اس لیے انھوں نے مجھے پرے نہیں دھکیلا۔ یہی وہ وقت تھا جب میرا ایک احمق کتے کے طور پر تمسخر اڑایا جاتا اور کبھی مجھے ادھر اُدھر دھکیلا جاتا۔ ایسا وقت جب مجھے انتہائی عوامی محبت حاصل تھی۔ اور ایسا اس کے بعد کبھی میسر نہیں آیا۔ مجھ ہر جگہ آنے جانے کی آزادی تھی۔ میرے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوتی۔ میری خوشامد بھی کی جاتی گو یہ چاپلوسی ترش روئی کے پیراہن میں ہوتی۔ اور یہ سب کچھ میرے سوالات، میرے اضطراب اور علم کی میری پیاس کے باعث تھا۔

کیا وہ مجھے تھپکی دے کر سلانا چاہتے تھے؟ میری توجہ کو بغیر کسی سختی کے، بلکہ بہت شفقت سے، غلط راستے سے ہٹانا چاہتے تھے، ایسا راستہ جس کا غلط ہونا شک وشبہے سے مکمل بالاتر بھی نہیں تھا کہ تشدد جائز ہوتا۔ ایک طرح کے احترام اور خوف کے احساس نے بھی انہیں تشدد کرنے سے باز رکھا۔ حتیٰ کہ

ان دنوں بھی مجھے اس بات کا کشف ہوا۔ آج میں اس بارے میں ان تمام لوگوں سے بھی بہتر طور پر جانتا ہوں جنھوں نے تب عملی طور پر اسے برتا۔ اصل میں صرف یہی چاہتے تھے کہ میں اپنی راہ سے ہٹ جاؤں۔ انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ انھیں برعکس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ میری بیدار مغزی اور بڑھ گئی۔ پھر مجھے یہ بھی زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آ گیا کہ دراصل یہ میں ہی تھا جو دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ کہ اس میں کسی حد تک میں کامیاب بھی تھا۔

کتوں کی تمام دنیا کی اعانت سے ہی میں اپنے سوالات کو سمجھنے کے اہل ہوا۔ مثلاً جب میں پوچھتا "اس خوراک کو زمین کہاں سے حاصل کرتی ہے؟" تو کیا اس کا مطلب تھا کہ میں زمین کے بارے میں فکر مند تھا جیسا بظاہر دکھائی دیتا تھا۔ کیا میں زمین کی محنتوں کے بارے میں پریشان تھا؟ قطعی طور پر نہیں۔ جیسا کہ میں نے بہت جلد سمجھ لیا کہ یہ مسئلہ میری عقل سے ماورا ہے۔ جس بات کی مجھے پرواہ تھی، وہ کتوں کی نسل کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ کیونکہ فی الحقیقت ہماری نسل کے علاوہ اور یہاں تھا بھی کیا؟ اس وسیع اور خالی دنیا میں بھلا کس سے درخواست کی جا سکتی تھی؟ تمام تر علم، مجموعی طور پر تمام سوالات اور ان کے جوابات، ایک کتے میں سمائے ہوتے ہیں۔

کاش کوئی یہ آگاہی حاصل کر لے، اسے سب کے سامنے لائے، اور کاش ہم کتے یہ بات سمجھ سکیں کہ ہم اس سے بے انتہا زیادہ جانتے ہیں جتنا ہم دعویٰ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ انتہائی باتونی کتا بھی ان جگہوں کی نسبت، جہاں سے خوراک دستیاب ہو سکتی ہے، اپنے علم کے معاملے میں کہیں زیادہ حساس ہے۔ خواہش سے کانپتے، اپنی ہی دم سے خود کو پیٹتے، اپنے ساتھی کتے کی احتیاط سے چوری کرتے ہوئے تم پوچھتے ہو، درخواست کرتے، چیختے، کاٹتے ہو اور پا لیتے ہو، وہ سب کچھ پا لیتے ہو جو تم کسی کوشش کے بغیر پا سکتے تھے۔ شفقت بھری توجہ، دوستانہ مقاربت، مخلصانہ قبولیت، پرجوش ہم آغوشیاں اور سب کا مل کر بھونکنا، یہ سب کچھ ایک طرح کے وجد کے حصول کے لیے ہے، بھول جانا اور پھر سے خود کو پا لینا۔ لیکن ایک چیز جسے پانے کی تم سب سے زیادہ خواہش کرتے ہو، علم کا حصول، تمھیں اس سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ان دعاؤں کا جو خاموشی سے مانگی گئی ہوں یا با آواز بلند، تمھیں کچھ ایسا ہی جواب ملے گا، چاہے تم گمراہ کرنے کی تمام طاقتوں کو بروئے کار لے آؤ، یعنی دزدیدہ نگاہیں، کھوکھلی نظریں اور مضطرب اور ڈھکی ہوئی آنکھیں۔ یہ اس سے مختلف نہیں ہے جیسی یہ تب تھا جب میں ایک ننھے کتے کی حیثیت سے گلوکار کتوں

پر چلایا اور وہ جواباً یکسر خاموش رہے تھے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''تم اپنے ساتھی کتوں کی شکایت کرتے ہو، اہم سوالوں پر ان کی خاموشی کی۔ تمہارا دعوی ہے کہ وہ اس سے زیادہ جانتے ہیں، جتنا وہ اعتراف کرتے ہیں، اس سے زیادہ جتنا وہ جائز قرار دیتے ہیں۔ اور یہ کہ اس خاموشی نے، جس کی پراسرار وجہ بلاشبہ مکارانہ طور پر مخفی رکھی گئی ہے، وجود کو تمھارے لیے زہر آلود اور ناقابل برداشت بنا دیا ہے۔ سو اب یا تو تم اسے تبدیل کرو گے یا اسی کے ساتھ گزارا کرو گے۔ ایسا ہوسکتا ہے۔ لیکن تم خود ایک کتے ہو۔ تمہارے پاس ایک کتے کا علم ہے۔ تو اسے سامنے لاؤ، محض ایک سوال کی صورت میں ہی نہیں، بلکہ ایک جواب کی صورت میں۔ اگر تم اس کا اظہار کرتے ہو تو کون تم سے مخاصمت کا سوچے گا؟ کتوں کی اکثریت ایسے تم سے آن ملے گی جیسے مدت سے اسی انتظار میں ہو۔ تب تمہیں وضاحت، سچ اور حرف اعتراف حاصل ہوگا، اتنا ہی زیادہ جتنا تم خواہش کرتے ہو۔

اس لعنتی زندگی، جس کے خلاف تم نے کتنا ہی سخت سست کہا، کا سایہ چھٹ جائے گا اور ہم سب شانے سے شانہ ملائے آزادی کی تنہا دنیا کی طرف چل پڑیں گے۔ بالفرض اگر ہمیں یہ حتمی تکمیل حاصل نہیں ہوتی، اگر حالات پہلے سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں، اگر مکمل سچ نصف سچ سے بھی زیادہ ناقابل فہم ہو جاتا ہے، اگر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ خاموش کتے وجود کے محافظ کی حیثیت سے درست تھے اور اگر مبہم امید، جسے ہم ہنوز استوار رکھنا چاہتے ہیں، مکمل ناامیدی میں ڈھل جاتی ہے، تب بھی یہ کوشش باوقعت ہوگی کیوں کہ تمہیں ایسی زندگی گزارنے کی خواہش نہیں ہے جسے جینے کے لیے تمھیں مجبور کیا گیا ہے۔

تو پھر تمھارے لیے یہ بات قابل مذمت کیوں ہے کہ کہ وہ سب خاموش ہیں؟ جبکہ تم خود بھی خاموش ہو۔ اس کا جواب آسان ہے۔ کیوں کہ میں خود بھی ایک کتا ہوں۔ اپنی بنیاد میں ویسے ہی خاموشی کے حصار میں قید ہوں جیسے باقی سب ہیں۔ سختی سے خود اپنے ہی سوالوں کے خلاف مزاحم، خوف کے مارے سنجیدہ ہوں۔ آسان انداز میں کیا مجھے یہ امید ہے کہ ہوسکتا ہے وہ میرے سوالوں کے جواب دیں جو میں نے، خاص طور پر اپنی بلوغت کی عمر میں اپنے ساتھی کتوں سے پوچھے؟ کیا واقعی مجھے ایسی کوئی احمقانہ امید ہے؟ کیا میں ہمارے وجود کی بنیادوں پر غور و خوض، ان کی گہرائی کا ادراک اور ان کی تعمیر پر مشقت کا مشاہدہ کرسکتا ہوں، وہی سیاہ محنت، اور پھر یہ توقع کرسکتا ہوں کہ اس سب کچھ کو بھلا دیا، نظر انداز

کر دیا اور منسوخ کر دیا جائے گا، صرف اس لیے کہ میں سوال پوچھتا ہوں؟ نہیں، اصل میں ایسی کوئی توقع میں نہیں رکھتا۔ میں اپنے ساتھی کتوں کی فطرت سے واقف ہوں۔ میں ان کے گوشت ہی کا ایک حصہ ہوں۔ ان کے قابل رحم، ہمیشہ اصلاح پاتے اور ہمیشہ پرجوش گوشت کا حصہ۔

لیکن ہمارے درمیان قدرِ مشترک محض گوشت یا خون ہی نہیں ہے بلکہ علم بھی ہے اور صرف علم ہی نہیں بلکہ اس کی کلید بھی۔ میرے پاس یہ کلید نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں دوسروں کے ساتھ مل جاؤں۔ ان کی مدد کے بغیر میں یہ کلید حاصل نہیں کر سکتا۔ بہترین گودے سے بھری سخت ترین ہڈیاں تمام کتوں کے دانتوں کی متحدہ گرفت سے ہی مسخر ہو سکتی ہیں لیکن یہ بلاشبہ کہنے کی حد تک ہے اور مبالغہ آمیز ہے۔ اگر سارے دانت تیار ہوں، تو انھیں کاٹنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ہڈیاں خود بخود تڑخ جائیں گی اور ان کا گودا کمزور ترین کتوں کے لیے آزادانہ طور پر قابل حصول ہو جائے گا۔ اگر میں اس استعارے سے جڑا رہوں تو سچ یہ ہے کہ میرے اہداف، میرے سوالات، میری تحقیقات کا مقصد عظیم الشان ہوگا۔ کیوں کہ میں تمام کتوں کو متحد ہونے پر مجبور کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی اجتماعی آمادگی کے دباؤ سے ہی ہڈیاں تڑخ جائیں۔ اور پھر میں چاہوں گا وہ اپنی عمومی زندگی کی طرف لوٹ جائیں جس سے انہیں محبت ہے جب کہ میں خود بھی تن تنہا اس گودے کو چاٹ جاؤں۔ یہ وحشت ناک بات معلوم ہوتی ہے۔ جیسے کہ میں گودے کی خوراک پر ہی زندہ رہنا چاہتا ہوں، صرف کسی ہڈی کا گودا ہی نہیں بلکہ کتوں کی نسل کی ہڈی کا۔ لیکن یہ محض ایک علامت ہے۔ جس گودے کا میں یہاں ذکر کر رہا ہوں، وہ خوراک نہیں ہے۔ اس کے برعکس، وہ زہر ہے۔

میرے سوالات خود میرے لیے ایک مقصد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں اس خاموشی سے خود کو متحرک کرنا چاہتا ہوں جو میرے ہر طرف ایک مکمل جواب کی صورت میں پھیلی ہے۔

''تم کب تک اس حقیقت کو برداشت کر پاؤ گے کہ کتوں کی دنیا، جیسا کہ تمھاری تحقیقات نے اسے زیادہ سے زیادہ واضح کیا ہے، خاموش رہنے پر پابند ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ آخر تم کب تک اسے برداشت کر پاؤ گے؟''

یہ حقیقتاً میری زندگی کا سب سے اہم سوال ہے جس کے آگے تمام سوال بے وقعتی کے دریا میں غرق ہو جاتے ہیں۔ اسے میں نے ہی پوچھا ہے اور میرے سوا کسی سے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بدقسمتی سے چھوٹے مخصوص سوالات کی نسبت اس کا جواب دینا میرے لیے زیادہ آسان ہے۔ میں اپنے قدرتی اختتام تک اس مسئلے سے دوچار رہوں گا۔ بڑھاپے کا تساہل ان تمام پریشان کن سوالات کے آگے زیادہ سے زیادہ مزاحمت پیش کرے گا۔ زیادہ امکان ہے کہ میں اسی خاموشی میں مرجاؤں گا، یونہی خاموشی میں گھرا ہوا، بلاشبہ بہت پرامن طریقے سے۔ میں ان باتوں پر بڑے تحمل سے غور کرتا ہوں۔ انتہائی قابل تعریف حد تک مضبوط دل اور پھیپھڑے، جن کو ان کے مقررہ وقت سے پہلے مکمل استعمال کرنا غیر ممکن ہے، ہم کتوں کو گویا کسی عداوت کے تحت ودیعت کیے گئے ہیں۔ ہم تمام سوالوں کو، خود اپنے سوالوں کو بھی، خاموشی کی فصیلوں میں، جو کہ ہم ہیں، محفوظ کر لیتے ہیں۔

حال ہی میں میں نے اپنی زندگی پر غور وخوض کرنے کے لیے کوشش کی ہے، اس فیصلہ کن اور بنیادی غلطی کو تلاش کرنے کی جو ضرور مجھ سے سرزد ہوئی۔ میں اسے کھوج نہیں سکا۔ لیکن وہ مجھ سے سرزد ہوئی ہے کیوں کہ اگر واقعی یہ مجھ سے سرزد نہ ہوئی ہوتی اور ایک طویل زندگی کی محنت شاقہ کے باوجود اپنی خواہش کو نہیں حاصل کر پایا، تو اس سے یہی ثابت ہوگا کہ میری خواہش ناقابل حصول ہے اور اس کا نتیجہ مکمل ناامیدی کی صورت میں ہوگا۔

سو اپنی تمام زندگی کے کام پر نگاہ ڈالو۔ سب سے پہلے تو اس سوال سے متعلق میری تحقیقات ہیں کہ زمین ہمیں دینے کے لیے خوراک کہاں سے حاصل کرتی ہے؟ ایک نوجوان کتے کے طور پر جو فطری طور پر زندگی کا حریص ہے، میں نے تمام لذتوں سے منہ موڑ لیا، واضح طور پر تمام مسرتوں سے احتراز کیا، اور جب شدید ترغیب سے دوچار ہوتا تو اپنے سر کو اگلے پنجوں میں چھپالیتا اور خود کو اپنے کام کی طرف متوجہ کرتا۔ میں کوئی مفکر نہیں تھا، نہ ان معلومات کے اعتبار سے جو میں نے حاصل کیں، نہ اپنے طریقہ کار اور نہ اپنی منشاء کے اعتبار سے۔ شاید یہ ایک عیب تھا۔ لیکن یہ بنیادی نوعیت کا نقص نہیں تھا۔ میں نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ بہت چھوٹی عمر میں ہی میں اپنی ماں کے سایہ عاطفت سے نکل آیا۔ جلد میں خودمختاری کا عادی ہو گیا اور ایک آزاد زندگی گزاری۔

غیر پختہ خودمختاری باقاعدہ تعلیم کے لیے غیر موافق ہوتی ہے۔ لیکن میں پوری سمجھداری کے ساتھ یقین کرتا ہوں کہ میں نے بہت مشاہدہ کیا، بہت زیادہ سنا، ہر قسم اور ہر مزاج کے کتوں سے تبادلہ خیال کیا، ہر بات کو سمجھا اور ذہانت کے ساتھ اپنے خاص مشاہدات کو باہم مربوط کیا۔ اس سے تعلیم کی کمی کا

کسی حد تک ازالہ ہوا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ خودمختاری اگر علم کے حصول میں ایک رکاوٹ ہے، تو یہ اس صورت میں حقیقی سہولت بھی ہے جب کوئی اپنے طور پر تحقیقات کرے۔ میرے معاملے میں تو یہ اور بھی ضروری تھی کیونکہ میں سائنس کے اصل طریقہ کار کے اطلاق کے اہل نہیں تھا کہ اپنے پیش رووٴں کی محنتوں سے استفادہ کر پاتا اور ہم عصر محققین سے رابطہ استوار کرتا۔ میرا کلی انحصار اپنے وسائل پر ہی تھا۔ بہت شروع سے آغاز کیا اور اس ادراک کے ساتھ کہ جو نوجوانوں کو تو زندہ کرتا ہے لیکن کہنہ سالی میں ایک صدمے سے کم نہیں ہے، کہ خوش بخت نکتہ، جس تک میں اپنی مشقوں کے ساتھ پہنچا، حتمی نقطہ ہی ہونا چاہیے تھا۔

کیا واقعی میں اس وقت اور اب بھی اپنی تحقیقات میں اکیلا ہی تھا؟ ہاں اور نہیں بھی۔ یہ بات قابل یقین نہیں ہے کہ تب ایسے کتے موجود نہیں ہوں گے اور آج بھی ایسے کتے موجود نہیں ہیں جن کا معاملہ مجھ جیسا نہ ہو۔ میں اس بارے میں پر یقین نہیں ہوسکتا۔ میں کتوں کی فطرت سے بال برابر بھی علیحدہ نہیں ہوں۔ ہر کتے میں میری طرح سوال کرنے کی اور ہر کتے کی طرح مجھ میں جواب نہ دینے کی حس موجود ہے۔ ہر کسی میں سوال کرنے کی حس ہوتی ہے۔ ورنہ کیسے میرے سوالات معمولی حد تک بھی میرے سامعین کو متاثر کر پاتے۔

مجھے اعتراف ہے کہ وہ اکثر میرے وجدانہ تلذذ، ایک مبالغہ آمیز تلذذ سے متاثر ہوتے۔ ورنہ کیسے مجھے اس سے زیادہ کامیابیاں حاصل کرنے سے روکا جاسکتا تھا جتنی میں حاصل کر چکا ہوں۔ اور یہ کہ اس بات کے لیے بدقسمتی سے کسی خاص ثبوت کی ضرورت نہیں ہے کہ مجھ پر خاموش رہنے کی پابندی ہے۔ میں اپنے اندر سے کسی بھی دوسرے کتے سے مختلف نہیں ہوں۔ ہر کتا، چاہے اسے میری رائے سے کتنا ہی اختلاف ہو اور وہ میرے نظریات کو رد کرے، وہ بخوشی اس بات کو قبول کرے گا اور کسی بھی دوسرے کتے کی طرح میں بھی اس بات کو قبول کرلوں گا۔ فقط عناصر کی ترکیب مختلف ہے۔ ایسا فرق جو ایک فرد کے لیے بہت اہم اور ایک نوع کے لیے بہت وقیع ہے۔ کیسے کوئی یہ یقین کرسکتا ہے کہ ماضی اور حال میں ان دستیاب عناصر کبھی ایسی ترکیب کی صورت میں تبدیلی نہیں ہوئی کہ جو مجھ سے مشابہ ہو۔ ایسی ترکیب، کہ اگر میری ترکیب کو بدبختی سے تعبیر کیا جائے تو پھر وہ ممکنہ نئی ترکیب زیادہ بدبخت ہوگی۔ ایسا سوچنا تمام تجربے کے برعکس ہوگا۔ ہم تمام کتے عجیب و غریب مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے

مشاغل کہ جنھیں ماننے سے یکسر انکار کر دیا جائے اگر ان سے متعلق انتہائی معتبر ذرائع سے معلومات حاصل نہ ہوں۔

بہترین مثال میں منڈلاتے کتے کی دے سکتا ہوں۔ پہلی بار جب میں نے کسی سے ان کے بارے میں سنا تو میں ہنس دیا اور اسے ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ بھلا کیا؟ یہ مان لینے کو کہا جا رہا تھا کہ کتوں کی ایک بہت چھوٹی نسل موجود ہے۔ اتنا چھوٹا کتا جو مکمل نمو پانے کے بعد بھی میرے سر سے زیادہ حجم کا نہیں ہوتا، اور یہ کتا، جو یقیناً ایک ناتواں مخلوق ہوگی، ایک مصنوعی شے جیسا، ہر طرح سے اچھی طرح سنورے بالوں والا نک سک چھبیلا کتا ایک معمولی چھلانگ لگانے کے بھی نااہل۔ لیکن لوک روایات کے مطابق یہ ایسا کتا ہے جو زیادہ تر ہوا میں معلق رہتا ہے۔ بظاہر کچھ بھی نہیں کرتا بلکہ وہاں بیکار پڑا رہتا ہے۔ نہیں، میں نے خود سے کہا کہ مجھے ایسی بات کو مان لینے پر قائل کرنے کی کوشش کرنا، دراصل ایک نوجوان کتے کی سادہ فہمی کو شدت کے ساتھ مجروح کرنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن جلد ہی اس کے بعد میں نے کسی اور سے بھی منڈلانے والے کتے کے بارے میں سنا۔ کیا مجھے بیوقوف بنانے کی سازش کی جا رہی تھی؟ لیکن بعد ازاں میں نے اپنی آنکھوں سے موسیقار کتوں کو دیکھا اور اسی دن سے مجھے ہر بات ممکن معلوم ہونے لگی۔ کوئی تعصب میری قوت ادراک کو متزلزل نہ کر سکا اور میں نے انتہائی جھوٹی افواہوں کی بھی تحقیق کی، اس حد تک ان کی کھوج کی جہاں تک مجھ سے ہو سکا۔ اور اس بے حس دنیا میں مجھے انتہائی غیر معقول باتیں بھی معقول باتوں سے زیادہ ممکن اور خاص طور پر تحقیق کے لیے موزوں معلوم ہوئیں۔ یہی معاملہ منڈلاتے کتوں کا بھی تھا۔ میں نے ان کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں۔ یہ سچ ہے کہ میں آج تک ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دیکھ سکا۔ لیکن ان کی موجودگی کے بارے میں طویل عرصے تک میں پورے یقین سے قائل ہو چکا ہوں اور میرے لیے دنیا کی تصویر میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ حسب معمول بلاشبہ یہ ان کا وطیرہ نہیں تھا جس سے بنیادی طور پر مجھے سوچنے کی تحریک ملتی ہے۔ یہ حیرت انگیز ہے اور کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ وہ ہوا میں تیرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ میں اپنی تحیر زدہ تحسین سرائی میں اپنے ساتھی کتوں سے مختلف نہیں تھا لیکن میرے لیے کہیں زیادہ اچنبھے کی بات وہ غیر معقولیت ہے، ان کے وجود کی غیر معقولیت۔ ان کا ہمارے طبقے کی عمومی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ہوا میں منڈلاتے ہیں اور بس اتنا ہی، اور زندگی اسی انداز میں بسر ہوتی ہے۔ یہاں گاہے بگاہے فن اور

فنکاروں کا ذکر ہوتا ہے لیکن ان پر آ کر بات ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن کیوں، میرے اچھے رفیق کتے، آخر کیوں یہ زمین پر رہ کر ہوا میں تیرتے ہیں؟ ان کے اس مشغلے کی آخر کیا منطق ہے؟ آخر کوئی ان سے متعلق وضاحت میں ایک بھی لفظ نہیں کہہ پاتا؟

آخر کیوں وہ ہوا میں منڈلاتے ہیں، اپنی ٹانگوں کو لٹکائے ہوئے، جو کتوں کا امتیاز ہیں، بے کار ہی لٹکائے رکھتے ہیں، نمو دینے والی زمین سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے، کچھ بوئے بغیر ہی فصل کاٹتے ہیں، اور جیسا کہ میں نے سنا انھیں خوراک بھی خوب مل جاتی ہے، کتوں کی برادری کی قیمت پر۔ میں یہ بڑ مار سکتا ہوں کہ ان معاملات میں میری تحقیقات نے کچھ ہلچل پیدا کی۔ لوگوں نے ایک رواج کے طور پر تحقیقات کیں اور کوائف جمع کرنا شروع کیے۔ کم از کم انہوں نے اس کا آغاز کیا حالاں کہ وہ اس کام میں مزید آگے نہیں بڑھے۔ لیکن بہر حال کچھ تو ہوا۔ اور اگر چہ ان وسیلوں سے سچ کی یافت ممکن نہیں ہوگی، نہ ہی کبھی ایسا مرحلہ آسکتا تھا، لیکن پھر بھی ان سے فریب کی چند کارفرمائیاں بے نقاب ہوئیں۔ کیوں کہ ہمارے وجود کا تمام غیر معقول مظاہر اور ان سب سے بڑھ کر غیر معقول مظاہر تحقیقات کے موضوعات ہیں۔ بے شک مکمل طور پر نہ سہی کہ یہ ایک سنگین مذاق ہے، لیکن کافی حد تک فرد کو تکلیف دہ سوالوں سے بچا لیتا ہے۔

ایک بار پھر ہم منڈلاتے کتوں کی مثال دیں گے۔ جیسا کہ ان کے بارے میں فوراً محسوس ہوتا ہے، وہ اتنے مغرور نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے بجائے اپنے ساتھی کتوں پر انحصار کرتے ہیں۔ اگر کوئی خود کو ان کی جگہ کھڑا کر سکے تو ضرور اس بات کو سمجھ پائے گا۔ انہیں معافی کے حصول کے لیے ممکنہ حد تک کچھ بھی کرنا چاہئے۔ لیکن کھلم کھلا نہیں کیونکہ یہ خاموش رہنے کی ذمہ داری سے ان کا انحراف تصور ہوگا۔ انہیں اپنے مخصوص طرز حیات پر معذرت حاصل کرنے کے لیے ہر جتن کرنا چاہیے یا انھیں دوسروں کا دھیان بٹانا ہوگا تا کہ اسے بھلایا جا سکے۔ اور جیسا کہ سنا ہے، وہ نا قابل برداشت چرب زبانی کے ساتھ ایسا کر گزرتے ہیں۔ وہ مسلسل بولتے ہیں، کچھ تو اپنے فلسفیانہ خیالات کے بیان میں، اور اگر یہ پیش نظر رکھا جائے کہ انھوں نے جسمانی مشقت یکسر ترک کر رکھی ہے، تو سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ مسلسل خود کو اس شغل بیکار میں مصروف رکھ سکتے ہیں۔ اور کچھ اپنے ان مشاہدات کے بیان میں جو وہ اپنے معلق مقامات سے کرتے ہیں اور اگر چہ یہ ان کی ست الوجودی کے پیش نظر قابل فہم ہے، لیکن ان کی عقلی استعداد قابل ذکر نہیں ہے

اوران کا فلسفہ بھی اتنا ہی بے وقعت ہے، جتنے ان کے مشاہدات۔ علم سائنس کے لیے بھی ان کے بیانات سے استفادہ کرنا مشکل ہے۔ نہ ہی یہ اتنی گئی گزری ہے کہ ایسے غیر معتبر وسائل سے معاونت کی حاجت مند ہو۔ کیوں کہ جب اگر کوئی یہ سوال کرے گا کہ یہ منڈلانے والے کتے آخر کیا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں تو ہمیشہ کچھ ایسا جواب ملے گا کہ ''وہ علم میں گراں قدر اضافے کر رہے ہیں۔''

''یہ بالکل سچ ہے'' کوئی تبصرہ کرے گا ''لیکن ان کے اضافے بے مایہ اور خام ہیں'' ایسا جواب اظہار بے اعتنائی یا محض موضوع بدلنے کی ایک ترکیب یا برہمی کا اظہار یا ایک قہقہہ ہی ہوگا۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد جب آپ سوال دہرائیں گے تو آپ ایک کو بار پھر یہی بتایا جائے گا کہ وہ علم میں اضافہ کر رہے ہیں۔ آخر کار جب خود آپ سے یہی سوال کیا جائے گا تو اگر آپ نے احتیاط نہ برتی تو آپ کا جواب بھی یہی ہوگا۔

لیکن شاید بہتر یہی ہے کہ ڈھٹائی پن سے بچا جائے بلکہ عوامی احساسات سے جڑا جائے، ان قدیم منڈلاتے کتوں کو قبول کیا جائے اور ان کے ہونے کے حق کو تسلیم کیے بغیر جیسا کہ ممکن نہیں ہے، انہیں برداشت کیا جائے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بے جا ہوگا۔ لیکن پھر بھی مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ہمیں مسلسل کہا جاتا ہے کہ ان منڈلاتے کتوں کو مانا جائے جو ہمیشہ ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں سے آتے ہیں؟ کیا یہ کتے افزائش کے عمل سے بڑھتے جاتے ہیں؟ کیا واقعی ان میں اتنی قوت ہے؟ کیونکہ وہ تو بالوں کے ایک خوبصورت گچھے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اتنی سی چیز میں افزائش کی کتنی گنجائش ہو سکتی ہے؟ اور بالفرض ایسا ناقابل یقین اتفاق ممکن ہو تو سوال یہ ہے کہ یہ سب وہ کرتے کب ہوں گے؟ وہ ہمیشہ تنہا دکھائی دیتے ہیں۔ انتہائی خود اطمینانی کے ساتھ اوپر ہوا میں معلق، اور اگر کبھی انھیں نیچے اتر کر دوڑنے کی ضرورت پڑے تو ایسا ایک یا دو منٹ سے زیادہ کے لیے نہیں ہوتا۔ باوقار انداز میں چند قدم، اور وہ بھی مکمل تنہائی کے ساتھ، اور ایک طرح کے گہرے تفکر میں ڈوبے ہوئے، جس میں سے وہ انتہائی کوشش بھی کریں تو خود کو آزاد نہیں کر پاتے۔ کم از کم وہ ایسا ہی بتاتے ہیں۔

لیکن اگر واقعی وہ اپنی افزائش نسل نہیں کرتے تو کیا یہ غیر معمولی بات نہیں ہے کہ ایسے کتے بھی

ہیں جو رضا کارانہ طور پر سخت زمین کی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں، رضا کارانہ طور پر منڈلانے والے کتے بن جاتے ہیں، اور محض تساہل اور ایک خاص تکنیکی تسکین کی خاطر وہ اوپر نرم گدوں پر کھوکھلی زندگی منتخب کرتے ہیں؟ یہ ناقابل یقین ہے۔ نہ افزائش اور نہ ہی رضا کارانہ منتقلی ہی قابل یقین ہے۔ شواہد سے ثابت ہے کہ وہاں ہمیشہ نئے منڈلاتے کتے دکھائی دیتے ہیں جس سے اسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے باوجود، جو ہماری تفہیم کی راہ میں مستقل طور پر حائل ہیں، کتوں کی کوئی نسل چاہے وہ کتنی ہی عجیب کیوں نہ ہو، ایک بار وجود میں آنے کے بعد کبھی نہیں مرتی یا کم از کم ایک دشوار جدوجہد کے بغیر نہیں مرتی، نہ ہی وہ اس اہل ہوتی ہے کہ طویل عرصہ تک ایک کامیاب دفاع برقرار رکھ سکے۔

اگر یہ بات منڈلانے والے کتوں جیسی بعید از قیاس، ظاہراً عجیب الخلقت اور ناقص انواع کے لیے جائز ہے تو پھر کیوں نہ میں اسے اپنے لیے بھی جائز سمجھوں۔ مزید یہ کہ اپنی ظاہری ہیئت میں ذرا برابر بھی عجیب نہیں ہوں، ایک درمیانے درجے کا عام سا کتا جیسے کتے یہاں قرب و جوار میں عام پائے جاتے ہیں۔ نہ ہی میں کسی اعتبار سے غیر معمولی ہوں، نہ ہی ناگوار۔ نہ ہی نوجوانی اور کسی حد تک پختہ عمری میں بھی، جب تک کہ میری توجہ اپنی ظاہری ہیئت پر رہی، اور خوب ورزشیں کرتا تھا، میں حقیقتاً ایک جاذب نظر کتا سمجھا جاتا تھا۔

میرا سامنے کا حصہ خاص طور پر قابل تحسین تھا، میری پتلی ٹانگیں، میرا عمدہ سر، میری نقرئی سفید اور زرد جلد بھی جو بالوں کے سروں پر مڑی ہوئی ہے، بہت دل کش تھی۔ اس حلیے میں کوئی بھی عجیب بات نہیں تھی۔ مجھ میں سب عجیب بات یہی میرا مزاج ہے۔ لیکن جیسا کہ مجھے محتاط انداز میں ہمیشہ یاد رہتا ہے، یہ مزاج بھی کتوں کی کائناتی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ اب اگر منڈلانے والے کتے بھی تنہا نہیں رہتے بلکہ مسلسل کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اپنے ساتھی کتوں سے کتوں کی عظیم دنیا میں کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جائے، اور حتی کہ عدم سے نئی نسل پیدا کر لیتے ہیں، تو میں بھی اس اعتماد کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہوں کہ میں یکسر تنہا نہیں ہوں۔

بے شک میرے جیسے کتوں کی قسمت کچھ عجیب ہوتی ہے۔ نہ ہی میرے رفقاء کی موجودگی میرے لیے کسی واضح اعانت کا باعث بن سکتی ہے کیوں کہ اسی باعث میں شاید ہی کبھی انہیں شناخت کرنے کے اہل ہو پاؤں۔ ہم وہ کتے ہیں جن کو خاموشی نے تباہ کر دیا، جو اسے ختم کرنا چاہتے ہیں اور

واقعتاً تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتے ہیں۔ دوسرے تو اسی خاموشی پر نمو پاتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ایسا صرف ظاہراً ہی ہے جیسا موسیقار کتوں کا معاملہ تھا جو مظاہرے کے دوران نمائشی طور پر پرسکون ہوتے لیکن فی الحقیقت شدید جوش میں مبتلا۔ بہرکیف التباس بہت قوی ہوتا۔ آپ اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کریں، یہ ہر کوشش کو بے اثر کر دیتا۔

تو پھر میرے رفقا کیا مدد حاصل کر پاتے ہیں؟ ان سب باتوں کے باوجود زندگی کو مسلسل گزارنے کے لیے وہ کیا کوشش کرتے ہیں؟ ان کی مساعی مختلف النوع ہو سکتی ہے۔ نوجوانی میں خود مجھے بھی سوالات کا دورہ پڑتا تھا۔ تب میں نے سوچا اگر میں ان لوگوں سے وابستہ ہو جاؤں جو بہت سوال پوچھتے ہیں تو شاید حقیقی رفقاء تلاش کرلوں۔ خیر میں نے کچھ دیر ایسا کیا بھی، شدید ضبط نفس کے ساتھ۔ ایسا ضبط نفس اس برہمی کے پیش نظر ضروری تھا جو مجھے تب محسوس ہوتی جب کوئی مجھ سے مسلسل ایسے سوالات کرتا جن کے جواب میرے پاس نہ ہوتے۔ میرے لیے واحد پریشانی جوابات کا حصول ہوتا۔

پھر یہ بھی کہ چھوٹی عمر میں کسے سوال پوچھنے کی خواہش نہیں ہوتی اور جب اتنے بہت سے سوالات آپ کے سامنے ہوں تو ان میں سے درست سوالات کو کیسے چنا جائے؟ ہر سوال دوسرے سوال جیسا معلوم ہوتا ہے۔ یہ نیت ہی ہے جو سب سے اہم ہے لیکن یہ تو اکثر خود سوال پوچھنے والے سے بھی مخفی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ کتوں کی ایک عجیب صفت ہے کہ وہ ہمیشہ سوال پوچھتے ہیں، گو مکمل غائب الدماغی سے۔ یوں جیسے وہ حقیقی سوالات کے ہر نشان کو مٹا دینے پر اتاؤلے ہوں۔ نہیں، میرے حقیقی رفقا سوال پوچھنے والے نوجوانوں میں نہیں ہیں، اور ان بوڑھے اور خاموش ساتھیوں میں بھی ان کا امکان کم ہے جن سے میرا اب تعلق ہے۔

ان سوالات کا آخر فائدہ ہی کیا ہے؟ میں ان کا جواب دینے سے بالکل قاصر ہوں۔ بظاہر میرے رفقا مجھ سے زیادہ چالاک ہیں اور ان کے پاس دوسرے کئی ایسے شاندار طریقے ہیں جن کی مدد سے وہ یہ زندگی بسر کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ یہ طریقے، جو میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ہوسکتا ہے جب کوئی چارہ کار باقی نہ رہے تو یہ کسی طرح سے کچھ فائدہ پہنچا سکیں، آپ کو پرسکون کریں، نیند بھری تھپکی دیں، آپ کا دھیان بٹائیں، لیکن پھر بھی مجموعی طور پر اتنے بے اثر ہیں جتنے خود میرے اپنے طریقے، بھلے ہی میں کیسے ہی انھیں دیکھوں، ان کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

مجھے خدشہ ہے کہ وہ آخری معیار جس سے میں اپنے حقیقی رفقا کی شناخت کے اہل ہو سکتا ہوں، وہ ان کی کامیابی ہی ہے۔ آخر میرے حقیقی رفقا کہاں ہیں؟ ہاں، یہ میری شکایت کا بنیادی نقطہ ہے، اس کی اساس۔ وہ کہاں ہیں؟ ہر جگہ یا کہیں بھی نہیں؟ شاید میرا پڑوسی، محض تین چھلانگوں کے فاصلے پر، ان میں سے ایک ہے؟ ہم اکثر ایک دوسرے پر بھونکتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ مجھ سے ملنے آتا ہے۔ حالاں کہ میں اسے کبھی ملنے نہیں گیا۔ کیا واقعی وہ میرا حقیقی رفیق ہے؟ میں نہیں جانتا۔ مجھے تو اس میں سرے سے ایسی کوئی بات دکھائی نہیں دیتی لیکن ایسا ممکن بھی ہے۔ یہ ممکن ہے لیکن شاید ہی کوئی دوسری شے اس سے زیادہ غیر ممکن ہو۔ جب وہ دور ہوتا ہے تو میں محظوظ ہوتا ہوں۔ اپنے تخیل سے لطف لیتا ہوں اور اس میں بہت سی ایسی باتیں دریافت کرتا ہوں جو ہم دونوں میں مماثل ہیں۔ لیکن جونہی وہ میرے سامنے آتا ہے، میرے یہی تخیلات مضحکہ خیز بن جاتے ہیں۔ ایک بوڑھا کتا جو مجھ سے بھی چھوٹے قد کا ہے۔ جبکہ میں خود بمشکل درمیانے قد کا ہوں۔ بھورے، چھوٹے بال، تھکن سے نیچے ڈھلکا ہوا سر، پیر کو گھسٹ گھسٹ کر چلنے کی ادا؟ اس پر مستزاد یہ کہ وہ کسی مرض کے سبب اپنی پچھلی بائیں ٹانگ پیچھے گھسیٹ کر چلتا ہے۔

بہت عرصے سے میرا اس سے ایسا گہرا تعلق ہے جتنا کسی اور سے نہیں رہا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ہمارا تعلق آج بھی اس سے قابل برداشت حد تک اچھا ہے۔ جب وہ دور جاتا ہے تو میں دوستانہ انداز میں بھونکتا ہوں، اس سے محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ خود سے ناراضگی کے طور پر۔ کیونکہ اگر میں اس کے پیچھے جاؤں تو مجھے وہ کراہت انگیز دکھائی دے گا، گھسٹتی ٹانگ کے ساتھ رینگتا ہوا اور کہیں پست پچھلا حصہ۔ کبھی یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اسے اپنا رفیق کہہ کر میں اپنی اہانت کا سزاوار ہو رہا ہوں۔ نہ ہی ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو میں ہمارے خیالات کی مماثلت کا شائبہ کبھی دکھائی دیا۔ یہ سچ ہے کہ وہ چالاک اور اس ماحول کی مطابقت سے مہذب ہے۔ میں اس سے بہت کچھ سیکھ سکتا تھا۔ لیکن کیا چالاکی اور تہذیب یافتگی ہی ہے جس کی مجھے تلاش ہے؟ ہم عموماً مقامی سوالات پر گفتگو کرتے ہیں۔ جب کہ میری تنہائی نے ایسے معاملات میں میری بصیرت کو گہرا کر دیا ہے تو میں ششدر ہو جاتا ہوں کہ ایک عام سے کتے کو بھی اوسط درجے کے اور غیر موافق حالات میں کتنی زیادہ ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے، اگر وہ زندگی گزارنے اور خود کو زندگی کے بڑے روایتی سنگین خطرات سے بچانے کا خواہاں ہو۔

بے شک علم ایسے اصول فراہم کرتا ہے جن کی پیروی کی جائے، لیکن حتیٰ کہ انھیں خام انداز اور بے قاعدہ صورت میں سمجھنا بھی سہل نہیں ہے۔ بالفرض اگر ان پر قابو پا بھی لیا جائے تو حقیقی دشواری بدستور قائم رہتی ہے یعنی ان کا مقامی حالات میں اطلاق۔ یہاں کوئی آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ ہر گزرتا لمحہ نئی ذمہ داریوں اور ہر نیا زمینی راستہ نئی مشکلات کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے ہر معاملہ ہمیشہ کے لیے طے کر لیا ہے اور اس لیے اس کی باقی تمام زندگی، ایسے ہی گزرے گی۔ حتیٰ کہ میں بھی ایسا نہیں کہہ سکتا حالاں کہ میری خواہشات دن بدن سکڑ رہی ہیں۔ یہ ساری انتھک محنت، آخر کس لیے؟ کیا محض خود کو خاموشی کی قبر میں اندر ہی اندر دفن کرنے کے لیے، جو اتنی گہری معلوم ہوتی ہے کہ اس میں سے کسی کو واپس کھود نکالنا، ناممکن دکھائی دیتا ہے۔

لوگ زمانوں سے کتوں کی برادری کی عمومی ترقی کی مدح سرائی کرتے آئے ہیں۔ جب کہ اس ترقی سے ان کی مراد خاص طور پر علم کی ترقی ہے۔ بلاشبہ علم ترقی پذیر ہے۔ اس کا ارتقا ناقابل مزاحمت ہے۔ یہ اصل میں غیر معمولی رفتار سے ترقی کر رہا ہے، ہمیشہ تیز تر، لیکن اس میں ایسی کیا بڑی بات ہے؟ یہ بالکل ایسی بات ہے کہ کسی کی محض اس بناء پر تعریف کی جائے کہ وہ بوڑھا ہو رہا ہے اور نتیجتاً بہت تیزی سے موت کے نزدیک پہنچ رہا ہے۔ یہ تو ایک فطری بلکہ ایک بدنما عمل ہے جس میں مجھے تحسین کا کوئی پہلو دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے ہر طرف زوال دکھائی دیتا ہے۔

لیکن ایسا کہنے سے میری یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ پچھلی نسلیں لازمی طور پر ہم سے بہتر تھیں۔ بس ہم سے جوان تھیں۔ یہ ان کی بڑی خوبی تھی۔ ان کی یادداشت اس طرح بوجھ تلے پسی ہوئی نہیں تھی جیسی آج ہماری ہے۔ ان بولنے پر مائل کرنا نسبتاً آسان تھا۔ اور اگرچہ کسی کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہو پایا لیکن اس کا امکان بہرحال بہت زیادہ تھا اور یہ اسی انتہائی امکان کا احساس ہے جو تب ہمیں اندر سے ہلا دیتا ہے جب ہم پرانی اور حیرت انگیز حد تک سادہ حکایات کو سنتے ہیں۔

یہاں وہاں سے ہم کوئی عجیب انداز کی اہم بات سنتے ہیں اور اگر ہم پر صدیوں کا بوجھ نہ لدا ہو تو اپنے پیروں پر اچھل پڑیں۔ نہیں، مجھے اپنی نسل پر چاہے کیسے ہی اعتراضات ہوں، سابقہ نسلیں ہم سے بہتر نہیں تھیں، بلکہ ایک لحاظ سے ہم سے زیادہ بدتر، کہیں زیادہ کمزور تھیں۔ حتیٰ کہ ان زمانوں میں بھی حیرتیں یوں گلیوں میں آزادانہ مٹر گشت نہیں کرتی تھیں لیکن یہی کتے ہوتے تھے جن کے بارے میں اس

کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جو اتنے کتے نہیں بنے تھے جتنے یہ آج ہیں۔ کتوں کی سلطنت یونہی بے قاعدگی سے جڑی ہوئی تھی۔ سچا لفظ اس میں مداخلت کر سکتا تھا، ڈھانچے کی منصوبہ بندی یا از سرِ نو منصوبہ سازی کرتے ہوئے، مرضی سے اسے تبدیل کرتے ہوئے، اسکی مخالف صورت میں اسے منتقل کرتے ہوئے، اور لفظ تو وہاں موجود تھا، بلکہ بہت قریب، ہر کسی کی زبان کی نوک پر۔ کوئی بھی اسے ادا کر سکتا تھا۔

لیکن آج اس پر کیا بیتی؟ آج کوئی چاہے اپنا دل نوچ نکالے پھر بھی وہ اسے نہیں پا سکتا۔ ہماری نسل گم کردہ راہ ہو چکی۔ ہو سکتا ہے یہ درست ہو، لیکن پھر بھی یہ پچھلی نسلوں سے کہیں زیادہ قصور وار ہے۔ میں اپنی نسل کی ہچکچاہٹ کو محسوس کر سکتا ہوں۔ بلاشبہ یہ محض ہچکچاہٹ نہیں رہی۔ یہ اس خواب کو فراموش کرنے کی ہزارویں کوشش ہے جسے ہزاروں مرتبہ دیکھا اور ہزاروں مرتبہ بھلا دیا گیا۔ اور کون ہمیں اسے ہزاروں مرتبہ بھلانے پر برا بھلا کہے گا؟

لیکن میں تصور کرتا ہوں کہ میں اپنے آباؤ اجداد کی ہچکچاہٹ کو بھی سمجھتا ہوں۔ شاید ہم نے بالکل ویسے ہی زندگی گزاری جیسے انہوں نے گزاری۔ کم از کم میں یہ کہہ سکتا تھا کہ ہمارے معاملے میں یہ ہم نہیں ہیں جنھیں ہم پر احساس گناہ کا بوجھ لادنا تھا، اور یہ کہ اس کے بجائے دوسروں کی تاریک کی ہوئی دنیا میں احساس گناہ سے تقریباً پاک خاموشی میں تیزی سے موت کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ جب ہمارے اولین آباؤ اجداد راہ سے بھٹکے تو انہیں شاید اس بات کا گمان تک بھی نہیں تھا کہ ان کی یہ لغزش غیر مختتم ہو گی۔ وہ سامنے بہتے راستوں کو دیکھ سکتے تھے۔ حسب منشا واپس مڑنا آسان معلوم ہوتا تھا اور اگر وہ واپس ہیں مڑے تو صرف اس لیے کہ وہ کچھ دیر مزید ایک کتے کی زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔

گو یہ کوئی حقیقی کتے کی زندگی نہیں تھی لیکن پھر بھی یہ انہیں فسوں زدگی کی حد تک خوبصورت معلوم ہوتی۔ اس میں بھلا مختصر وقت میں کیا تبدیلی ہوتی، بہت مختصر وقفے میں اور یوں وہ مزید بھٹک گئے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ جس کے بارے میں ہم اب تاریخ کے عمل پر غور کرتے ہوئے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تبدیلی روح میں پیدا ہوتی ہے، عمومی وجود میں ظاہر ہونے سے پہلے، اور یہ کہ جب انہوں نے کتے کی زندگی سے حظ اٹھانا شروع کیا تو ضرور ان کے پاس پہلے سے حقیقی بوڑھے کتوں کی روحیں موجود ہوں گی، اور وہ کسی بھی اعتبار سے اپنے نقطہ آغاز کے اتنے قریب نہیں ہوں گے جتنا وہ سوچتے تھے یا جیسا کتوں کی لذتوں سے خود کو تازہ کرتی ان کی آنکھوں نے انھیں سمجھایا ہو گا۔ لیکن آج کون نوجوانی سے متعلق بات

کرسکتا ہے؟ وہ حقیقی نوجوان کتے تھے لیکن بدقسمتی سے ان کا واحد مقصد بڑھاپے کا حصول تھا، ایسی شے جسے پانے میں وہ ناکام نہیں ہوسکتے تھے، جیسا کہ آنے والی تمام نسلوں نے ثابت کیا۔

ظاہر ہے میں اپنے پڑوسی سے ان امور پر گفتگو نہیں کرتا لیکن اکثر اس مخصوص بوڑھے کتے کے سامنے بیٹھے ہوئے میں ان کے بارے میں سوچے بغیر نہیں رہ پاتا یا اپنی ناک اس کی کھال میں چھپا لیتا ہوں جس میں ناگوار پوشیدہ جگہوں کی بو کا بھبھکا بھرا ہوتا ہے۔ اس سے یا کسی بھی دوسرے سے ان معاملات پر بات کرنا بالکل بے فائدہ ہے۔ میں جانتا ہوں اس پر کس قسم کی گفتگو ہوگی۔ وہ کسی کسی بات پر معمولی اعتراض کی کوشش کرے گا لیکن آخر کار متفق ہو جائے گا۔ متفق ہو جانا بہترین دفاعی ہتھیار ہے۔ یوں معاملہ اپنے آپ دب جائے گا۔ تو پھر اس پر اتنی مغزماری کا فائدہ۔

اس کے باوجود میرے ہمسایہ دار اور مجھ میں گہری ہم آہنگی موجود ہے جو لفظوں کے سہارے کی محتاج نہیں ہے۔ میں ہمیشہ کہتا رہوں گا کہ اگرچہ میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور شاید میں فقط ایک عمومی التباس کا شکار ہوں جو اس باعث پیدا ہوا کہ ایک طویل عرصہ تک یہ کتا ہی مجھے دستیاب واحد فرد تھا جس سے میں تبادلہ خیالات کرسکتا تھا۔ اس لیے میں اس کے قریب رہنے پر مجبور ہوں۔

''کیا تم اپنے انداز میں میرے رفیق ہو؟ کیا شرمندہ ہو کہ ہر کسی نے تمہارے ساتھ زیادتی کی؟ دیکھو میری تقدیر تم سے مختلف نہیں ہے۔ میں تنہا ہوتا ہوں تو یہ خیال مجھے رلاتا ہے۔ آؤ اکیلے رونے سے بہتر ہے کہ مل کر آنسو بہائیں۔''

اکثر ایسے خیالات میرے ذہن میں در آتے ہیں۔ تب میں اس کو گہری نظر سے دیکھتا ہوں۔ وہ اپنی نظر نیچی نہیں کرتا۔ لیکن اس میں آپ کو کچھ بھی لکھا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ غائب الدماغی سے میری طرف دیکھتا ہے جیسے اس بات پر حیران ہو کہ میں خاموش کیوں ہوں اور کیوں میں نے سلسلہ کلام منقطع کردیا۔ لیکن شاید اس کی یہ نگاہ سوال کرنے کا ہی ایک انداز ہو۔ یوں میں اسے مایوس کرتا ہوں جیسے وہ مجھے کرتا ہے۔

جوانی میں اگر دیگر مسائل میرے لیے اس سے زیادہ اہم نہ ہوتے اور تب میں دوستوں کی صحبت سے پوری طرح مطمئن نہ ہوتا تو اسے ضرور یہ بات صاف کہہ دیتا اور وہ فوراً مجھ سے اتفاق کرلیتا، تو یہ صورتحال آج کی خاموشی سے کہیں زیادہ بدتر ہوتی۔ لیکن کیا سبھی اسی انداز میں خاموش نہیں ہوتے؟ آخر

کیا بات مجھے اس امر پر یقین کرنے سے مانع رکھتی ہے کہ ہر کوئی میرا رفیق ہے، بجائے یہ سوچنے کے کہ میرے صرف ایک یا دو رفیق محقق ہیں جو اپنی معمولی کامیابیوں کے ساتھ کہیں کھو گئے اور فراموش کر دیئے گئے ہیں کہ میں کسی بھی راستے پر چل کر صدیوں کی تاریکی یا لمحہ موجود کے منتشر اجتماع سے گزرتے ہوئے ان تک پہنچ جاؤں۔ میں کیوں نہیں مان لیتا کہ شروع سے تمام کتے میرے رفیق ہیں، سب اپنے انداز میں محتاط، اپنے انداز میں سب ناکام، اپنے انداز میں سبھی خاموش یا غلط، جیسی کہ ایک بے ثمر تحقیق کسی کو ثابت کر سکتی ہے۔

لیکن اس معاملے میں مجھے خود کو اپنے رفقاء سے علیحدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خاموشی سے ان کے درمیان رہ سکتا تھا۔ نہ ہی مجھے ہٹیلے بچے کی طرح بوڑھوں کے بند دائرے میں سے لڑتے ہوئے گزرنے کی ضرورت تھی، کہ وہ خود بھی میری طرح باہر نکلنے کے راستے کی کھوج میں تھے، اور جو اپنے اس علم کے سبب ناقابل فہم معلوم ہوتے تھے جو انہیں بتاتا تھا کہ کوئی فرار حاصل نہیں کر سکتا اور یہ کہ یہاں طاقت کا استعمال حماقت ہے۔

ایسے خیالات حتمی طور پر میرے پڑوسی کے اثر کی وجہ سے ہیں۔ وہ مجھے الجھا دیتا ہے۔ مجھے مایوسی سے بھر دیتا ہے۔ لیکن اپنے طور پر وہ بہت خوش ہے۔ کم از کم جب وہ اپنے گھر میں ہوتا ہے تو مجھے اکثر شور مچاتے اور گاتے ہوئے سنائی دیتا ہے۔ یہ بلاشبہ ناقابل برداشت ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس آخری تعلق سے بھی چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ مبہم خوابوں کے امکان کا خاتمہ کیا جائے جسے کتوں سے رابطہ راہ دیتا ہے۔ چاہے آپ خود کو کتنا ہی سخت تصور کریں، اور اس مختصر وقت کو جو میرے پاس بچ رہا ہے، مکمل طور پر اپنی تحقیقات کے لیے وقف کر دوں۔ اگلی بار وہ آیا تو میں کہیں کھسک جاؤں گا یا بہانہ کروں گا کہ سویا ہوا ہوں۔ اور تب تک یہ بہانہ جاری رکھوں گا جب تک وہ میری طرف آنا موقوف نہیں کر دیتا۔

میری تحقیقات بھی مسلسل نہیں رہیں۔ میں آرام کرتا ہوں، تھک جاتا ہوں، اور وہاں میکانکی انداز میں ہولے ہولے بھاگتا ہوں جہاں پہلے جوش و خروش سے دوڑتا تھا۔ وہ وقت یاد کرتا ہوں جب میں نے اس سوال پر تحقیق شروع کی تھی کہ ''زمین کہاں سے یہ خوراک حاصل کرتی ہے؟'' تب حقیقتاً میں لوگوں میں ہی رہتا تھا۔ جہاں گنجان مجمع دیکھتا، اس میں دھکے سے گھس جاتا۔ خواہش کرتا کہ ہر کوئی میرے کام کو جانے اور میرا سامع بنے۔ میرا سامع میرے لیے میرے کام سے کہیں زیادہ اہم ہوتا۔

میں توقع کرتا تھا کہ میرا کام فرق ڈالے گا، اور یہ بات قدرتی طور پر مجھے تقویت دیتی، لیکن یہ اب اس تنہا زندگی گزارنے والے کتے میں سے کافور ہو چکی۔

لیکن ان دنوں میں یوں توانائی سے بھرا رہتا جیسے میں نے کوئی بے مثال کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ کوئی ایسا کارنامہ جو ہمارے تمام قوانین سے مختلف ہو اور جسے ہر عینی شاہد ایک عجیب وغریب کارنامہ کے طور پر یاد رکھے۔ ہمارا سائنسی علم، جو عمومی طور پر انتہائی شعبہ جاتی مہارت پیدا کرتا ہے، ایک حوالے سے انتہائی غیر معمولی طور پر سادہ ہے یعنی جہاں یہ سکھاتا ہے کہ زمین ہماری خوراک پیدا کرتی ہے اور پھر یہ مفروضہ پیش کرنے کے بعد ہمیں ایسے طریقے بتاتا ہے جن کی مدد سے ہم مختلف غذائیں بہترین حالت اور انتہائی کثرت میں پیدا کر سکتے ہیں۔ اب یہ بات بے شک سچ ہے کہ ہر طرح کی غذا کا منبع زمین ہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن یہ معاملہ ایسا سادہ بھی نہیں ہے جتنا لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ کہ یہ ایک سادہ معاملہ ہے، مزید تحقیق کی راہ میں حائل ہے۔

ایک عام واقعہ کی مثال لیجئے جو روز روز ہوتا ہے۔ اگر ہم انتہائی کاہل ہوں جیسا کہ اب میں مکمل طور پر ہوں اور پھر عجلت میں کھرچنے اور زمین کو پانی دینے کے بعد لیٹ جائیں اور انتظار کریں کہ اب کیا ہوتا ہے تو پھر ہم حیران کن طور پر زمین پر خوراک موجود پائیں گے، ایسا نتیجہ جو ناگزیر ہے۔ بہرحال ایسا عام طور پر نہیں ہوتا۔ جنھیں سائنسی معاملات پر رائے دینے کی تھوڑی سی بھی آزادی حاصل ہے، اور جن کی تعداد مختصر ہے کیونکہ سائنس اپنے اردگرد ایک کہیں وسیع تر دائرہ کھینچتی دیتی ہے۔ تو وہ کوئی مخصوص تجربہ کیے بغیر آسانی دیکھ سکتے ہیں کہ ایسے معاملات میں زمین پر پائی جانے والی خوراک کا بڑا حصہ اوپر سے نازل ہے۔

بے شک دستور کے مطابق ہم اپنی پھرتی اور حرص سے خوراک کو زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی جھپٹ لیتے ہیں۔ لیکن ایسا کہتے ہوئے میں سائنس کے خلاف کچھ نہیں کہہ رہا۔ بلاشبہ زمین بھی اس قسم کی خوراک پیدا کرتی ہے۔ اور اس بات سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کہ زمین ایک طرح کی خوراک اپنے اندر سے پیدا کرتی اور دوسری قسم کو آسمانوں سے بلاتی ہے۔ سائنس، جو کہ ثابت کر چکی ہے کہ دونوں طرح کی صورتحال میں زمین کو تیار کرنا ضروری ہے، ایسے امتیازات سے خود کو ماورا رکھتی ہے۔ کیا آپ نے یہ قول نہیں سنا "اگر خوراک آپ کے جبڑوں میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے وقتی طور پر تمام

مسئلوں کو حل کر لیا۔''لیکن مجھے لگتا ہے کہ سائنس کسی نہ کسی حد تک پوشیدہ طور پر، کم از کم ایک حد تک ان معاملات میں دلچسپی لیتی ہے یعنی جہاں تک کہ خوراک پیدا کرنے کے دو طریقوں کی بات ہے۔ اول، زمین کی مکمل تیاری، دوم تکمیل میں معاون عوامل جیسے منتر، رقص اور موسیقی۔

مجھے یہاں ایک عنصر کے حوالے سے، جسے میں نے خود ہی بنایا ہے، ایک امتیاز کا تجربہ ہوا ہے۔کوئی حتمی امتیاز نہیں بلکہ شاید بہت مبہم سا۔ میرے خیال میں مٹی کو کھر چنا اور پانی دینا دونوں طرح کی خوراک پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے لہذا یہ ناگزیر ہیں۔ محدود معنوں میں منتر، رقص اور موسیقی کا تعلق زمین سے ظاہر ہوتی خوراک سے کم ہے اور اس کے بجائے اصولی طور پر اوپر سے آتی خوراک کو نیچے کھینچنے سے ہے۔

اس توضیح سے مجھے روایت روکتی ہے۔ عام کتے اس بارے میں جانے بغیر ہی سائنس کی اصلاح کرتے ہیں جب کہ سائنس کے پاس جواب میں کہنے کو ایک لفظ بھی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ سائنس دعوی کرتی ہے اگر یہ تقریبات مٹی پر، اسے زرخیزی دینے کے لیے غنی ہوا سے خوراک کو کھینچنے کے لیے کی جائیں تو منطقی طور پر انہیں کلیتاً مٹی کے لیے ہی مختص ہونا چاہیے۔ یہ مٹی ہی ہے جس میں منتروں کے ذریعے سرگوشیاں کی جاتی ہیں، اور اسی کے لیے رقص بھی۔ میرے اپنے علم کے مطابق سائنس اس کے علاوہ کچھ اور حکم صادر نہیں کرتی۔

لیکن اب ذرا ایک حیرت انگیز بات کی طرف آیئے کہ ان تمام تقریبات میں سبھی اوپر کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ سائنس کی تحقیر نہیں ہے۔ سائنس اس سے منع تو نہیں کرتی۔ بلکہ اس حوالے سے کسان کو مکمل آزادی دیتی ہے۔ اپنی تحقیقات میں یہ صرف مٹی سے معاملہ کرتی ہے۔

اور اگر کسان زمین کی تیاری سے متعلق اس کی ہدایات کے مطابق عمل کرتا ہے تو یہ مطمئن رہتی ہے۔ جبکہ میرے خیال میں اگر یہ واقعی منطقی ہے تو پھر اسے اس سے زیادہ نتائج کا متقاضی ہونا چاہیے۔ میں خود کبھی سائنس سے متاثر نہیں ہوا لیکن میں اس بات کا ادراک نہیں کر سکتا کہ علماء کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ ہم لوگ، جو غیر منظم اور پر جوش واقع ہوئے ہیں، چہروں کو اوپر اٹھائے منتر پڑھیں، ہمارے قدیم لوک گیت ہوا میں کو گا کر بین کریں اور رقص کرتے ہوئے زمین کو فراموش کر دیں اور اونچا اونچا اچھلیں، اس خواہش کے ساتھ کہ ممکن ہو تو ہمیشہ کے لیے اوپر ہی پرواز کر جائیں۔

اس تضاد کو میں نے نقطہ آغاز بنایا ہے اور جب کبھی سائنس کی تعلیمات کے مطابق فصل کی کٹائی کا وقت نزدیک آتا تو میں اپنی توجہ زمین پر مرکوز کرلیتا کہ یہ زمین ہی تو ہے جسے میں رقص کرتے ہوئے کھرچتا اور سر کو ممکنہ حد تک زمین سے قریب کرنے کے لیے گردن پر دھپہ مارتا۔ بعدازاں میں نے اپنی ناک کے لیے ایک گڑھا کھودا اور گیت گایا اور پورے جذبے سے بولا کہ صرف زمین ہی اسے سنے اور میرے قریب یا اوپر کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔

میرے تجربات کے نتائج کمزور تھے۔ بعض اوقات خوراک ظاہر نہیں ہوتی تھی لیکن جب اس ثبوت پر میں خوش ہو رہا ہوتا تو اچانک خوراک ظاہر ہو جاتی۔ یوں لگتا جیسے میری عجیب کارکردگی نے شروع میں الجھاؤ پیدا کیا لیکن پھر اس میں فائدے کی صورت پیدا ہوئی جیسے میرے معاملے میں عومی بھونکار، اور اچھل کود سے خلاصی مل سکتی تھی۔ اکثر خوراک پہلے کی نسبت زیادہ کثرت میں ظاہر ہوتی۔ لیکن پھر یہ دوبارہ ایک درجہ پر آ کر رک جاتی۔ ایسی تندہی کے ساتھ، جو ایک نوجوان کتے کے لیے اجنبی ہوتی ہے، میں نے اپنے تمام تجربات کی درست رپورٹیں لکھ لیں اور یہ خیال کیا کہ یہاں وہاں میں ایسی خوش بو کو دریافت کرنے کے قریب تھا جو مجھے اگلے درجے تک لے جائے گی۔ لیکن پھر یہ دھند کے پردے میں گم ہو گئی۔

سائنس سے متعلق میری ناکافی سمجھ بوجھ بھی میری راہ میں حائل ہوئی۔ مثال کے طور پر اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ خوراک کی غیر موجودگی زمین کی غیر سائنسی تیاری کے باعث نہیں تھی بلکہ میرے تجربات کے باعث تھی۔ اور اگر واقعی ایسا ہوتا تو پھر تمام نتائج غیر معتبر قرار پاتے۔ مخصوص حالات میں، میں نہایت محتاط انداز میں کامیاب تجربات کرلیتا جیسے میں ایک بار زمین کو تیار کیے بغیر بالائی سطح سے متعلقہ منتر پڑھنے سے خوراک کو نیچے لانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن پھر ایک موقع پر زمین سے جڑا منتر پڑھنے سے خوراک حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اور پھر میں نے بلاشبہ اس نوع کی متعدد کوششیں کیں، ان پر پورا یقین رکھے اور اس سے متعلقہ حتمی صورت حال کے بغیر۔ کیوں کہ یہ میری پختہ رائے ہے کہ ایک خاص حد تک زمین کی تیاری ہمیشہ ضروری ہوتی ہے اور بالفرض وہ بدعتی جو اس کا استرداد کرتے ہیں، درست بھی ہوں، ان کے نظریہ کو کبھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ایک طرح کی مجبوری کے تحت زمین کو پانی دیا جاتا ہے اور خاص حدود میں رہتے ہوئے جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دوسرا اگر اس سے کسی حد تک

مماثل تجربہ کامیاب رہااوراس نے عوام کی کچھ توجہ حاصل کی۔

روایتی طریقہ کار کے خلاف جس کے تحت خوراک کو تبھی جھپٹ لینا چاہیے جب وہ ہوا میں ہو، میں نے خوراک کو زمین پر گرنے کا موقع دینے اور اسے نہ چھونے کا فیصلہ کیا۔اصل میں جب خوراک ہوا میں ہوتی تو میں چھوٹی سی چھلانگ بھر کر اسے دبوچ لیتا لیکن ایسے وقت میں کرتا کہ یہ ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو پائے۔زیادہ تر مواقع پر اس سب کچھ کے باوجود خوراک سستی اور لاتعلقی سے زمین پر گر ہی جاتی۔میں اشتعال انگیز انداز میں اس پر کود پڑتا، ناکامی اور بھوک دونوں کے جنون کے ساتھ لیکن چند موقعوں پر اس سے مختلف بات ہوتی، بہت عجیب بات۔خوراک نیچے نہ گرتی بلکہ ہوا میں میرا تعاقب کرتی۔خوراک بھوکے کا تعاقب کرتی۔ایسا کبھی زیادہ دیر کے لیے نہ ہوتا۔ہمیشہ کچھ دیر کے لیے ہی ہوتا لیکن پھر آخر وہ گر ہی جاتی یا مکمل طور پر غائب ہو جاتی یا اکثر ایسا ہوتا کہ میری حرص اس تجربے کو وقت سے پہلے ہی ختم کر دیتی اور میں پُرترغیب چارے پر ٹوٹ پڑتا۔

لیکن میں ایسے وقت میں خوش بھی ہوتا۔میرے پڑوس میں تجسس کی لہر دوڑ جاتی۔دوسروں کی اذیت دہ توجہ مجھے پریشان کرتی۔میں اپنے واقف کاروں کو اپنے سوالوں سے زیادہ قریب پاتا۔ان کی آنکھوں میں مجھے ایسی چمک دکھائی دیتی جو مدد کی استدعا معلوم ہوتی۔اور اگر یہ میری ہی نگاہ کی عکس ہو، میں ان سے مزید کچھ نہ پوچھتا اور مطمئن ہو جاتا۔حتیٰ کہ آخر کار میں نے دریافت کیا اور جیسا سبھی نے بیک وقت یہ دریافت کیا کہ میرا تجربہ سائنس کا ایک عام اصول ہے اور دوسرے مجھ سے کہیں زیادہ شاندار انداز میں اس تجربہ میں کامیاب ہو چکے تھے اور اگرچہ ایک طویل عرصے تک مطلوبہ ضبط نفس کی وجہ سے اسے دہرایا نہیں گیا۔لیکن اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ سائنسی اعتبار سے اس تجربہ کی کوئی وقعت نہیں تھی۔اس سے بس وہی باتیں ثابت ہوتیں جو پہلے ہی سے معلوم تھیں کہ زمین نہ صرف اوپر سے عموداً خوراک کو اپنی طرف کھینچتی ہے بلکہ افقی طور پر اور کبھی کبھار مخروطی چکر کی صورت میں بھی۔سو مجھے میرے تجربے کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا گیا۔لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔میں اتنا کم عمر تھا کہ ایسی باتیں مجھ پر اثرانداز نہ ہوتی تھیں۔اس کے برعکس اس مایوسی نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی کامیابی کے لیے تحریک دی۔میں سائنس دانوں کی میرے تجربات سے متعلق تصریحات پر یقین نہیں رکھتا۔لیکن یہاں یقین کی کوئی وقعت نہیں تھی۔صرف ثبوت کی وقعت تھی۔

میں نے طے کرلیا کہ ثبوت حاصل کروں گا۔ اسی لیے اپنے تجربے کو اس کی ابتدائی لاتعلقی سے شعبہ تحقیق کے مرکز میں لے آیا۔ میری یہ ثابت کرنے کی خواہش تھی کہ جب میں نے خوراک کی موجودگی میں پیچھے مڑا، تو زمین کی کشش کے باعث نہیں بلکہ میری وجہ سے اس نے میرا تعاقب کیا۔ یہ سچ ہے کہ یہ پہلا تجربہ میں آگے نہیں بڑھا سکا۔ خوراک کو اپنے پیچھے آتے دیکھنا اور ساتھ ساتھ سائنسی روح کے ساتھ تجربے کو جاری رکھنا، بیک وقت ممکن نہیں تھا۔ اسے غیر متعینہ مدت تک جاری نہیں رکھا جا سکتا۔

میں نے کچھ مختلف کرنے کا تہیہ کیا۔ میں نے اتنے عرصے تک فاقہ کرنے کا تہیہ کیا جب تک کہ میں اسے برداشت کرسکوں۔ ساتھ ہی ساتھ خوراک کو دیکھنے اور ہر طرح کی ترغیب سے احتراز کرنے کا تہیہ بھی۔ اگر میں خود کو اس انداز میں ڈھال لوں، کہ دن رات اسی طرح بند آنکھوں کے ساتھ لیٹا رہوں، نہ ہوا میں سے خوراک پر جھپٹنے اور نہ زمین پر سے اسے اٹھانے کی خود کو تکلیف دوں، اور پھر بھی مبہم سی امید کروں، کہ جس کی میں توقع تو نہیں ہے لیکن یہ کہ کوئی روایتی تدابیر کیے بغیر اور محض زمین کو پانی دینے کے غیر معقول عمل اور منتروں اور گیتوں کی خاموش ادائیگی سے (یہاں میں رقص کو خارج کرنا چاہتا ہوں تا کہ کمزور نہ ہو جاؤں) خوراک خود بخود اوپر سے زمین پر آجائے اور پھر زمین سے ٹکرانے کے بجائے خود ہی میرے دانتوں کو کھٹکھٹا کر اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کرے۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو چاہے سائنس ناقص ثابت نہ ہو کہ اس میں غیر معمولی اور منفرد توقعات کو قبول کرنے کی خاصی گنجائش موجود ہے، لیکن پھر بھی میں خود سے ہی سوال کروں گا کہ دوسرے کتوں کے تاثرات کیا ہوں گے جو خوش قسمتی سے ایسی غیر معمولی لچک سے محروم ہیں۔

یہ ان جیسا غیر معمولی واقعہ نہیں ہے جن کی شہادت ہمیں تاریخ دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اس کتے کا واقعہ جو کسی جسمانی ضعف یا ذہنی عیب کے سبب اس بات کو ماننے سے انکاری تھا کہ زمین کو تیار کیا جانا، خود آگے بڑھ کر خوراک پر جھپٹنا اور اس حاصل کر لینا چاہئے، جس کے لیے کتوں کی قوم جادوئی منتر گاتی اور ان کی مدد سے خوراک کو اپنے روایتی راستے سے منحرف کر کے کسی ناجائز کتے کے جبڑے میں لانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اسکے برعکس میں پر تیقن ہوں اور میری توانائیاں پورے جوبن پر ہیں۔ میری اشتہا ایسی شاندار ہے کہ یہ تمام دن مجھے اپنے علاوہ کسی بھی موضوع پر سوچنے سے مانع رکھتی ہے۔ میں رضا کارانہ طور پر فاقہ کشی کے عرصے کی بات کرتا ہوں، چاہے یہ باعث اعزاز ہو یا نہ ہو، کہ میں اپنی

خوراک کی فراہمی کو قائم رکھنے کے مکمل اہل تھا اور میں نے ایسا چاہا بھی۔ اور اسی لیے میں نے کتوں کی قوم سے کبھی معاونت کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ بلاشبہ انتہائی واضح انداز میں اسے رد کیا۔

میں نے گھنی جھاڑیوں میں خود کو ایک مناسب جگہ پر بٹھا لیا جہاں خوراک کے بارے میں کوئی بات نہ ہوتی، نہ خوراک چباتے ہوئے جبڑوں اور ہڈیوں کے کھسوٹے جانے کی آواز آتی۔ میں نے آخری مرتبہ اپنی خوراک کو کھایا اور لیٹ گیا۔ جہاں تک ممکن تھا میں چاہتا تھا کہ سارا وقت آنکھیں بند کیے ہوئے گزاروں۔ جب تک خوارک نہ آئی میرے لیے مستقل رات ہی تھی۔ چاہے میری شب بیداری دنوں یا ہفتوں جاری رہے۔ اس دوران مجھ سے زیادہ سونے کی جرات نہ ہو سکی۔ بہتر تو یہی ہے کہ میں سرے سے سوؤں ہی نہ۔ اس نے ہر شے کئی گنا تکلیف دہ ہو گئی کیونکہ مجھے نہ صرف خوراک کو جادو سے نیچے بلانا تھا بلکہ اپنی نگرانی بھی کرنی تھی کہ جب خوراک پہنچے تو میں سو ہی نہ جاؤں۔ حالاں کہ نیند کو میں ہمیشہ خوش آمدید کہتا ہوں کیونکہ میں بیداری کی نسبت نیند میں فاقہ کشی کو زیادہ بہتر انداز میں جاری رکھ سکتا ہوں۔ ان وجوہات کی بناء پر میں نے فیصلہ کیا کہ اپنا وقت سمجھداری کے بتاؤں گا اور اسے زیادہ سے زیادہ سونے میں صرف کروں گا لیکن ہمیشہ مختصر وقفوں کے ساتھ۔ میں نے اس درجے کو پا لیا، ہمیشہ اپنے سر کو نیچے ٹکائے ہوئے کسی کمزور ٹہنی کے بل سو کر، جو جلد ہی ٹوٹ جاتی اور میں جاگ پڑتا۔ سو یہاں میں حالت نیند میں یا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے، خواب دیکھتے ہوئے یا خاموشی سے گنگناتے ہوئے لیٹا رہا۔

میری ابتدائی شب بیداری بے ثمر رہی۔ شاید اس جگہ سے، جہاں سے خوراک ظاہر ہوتی ہے، کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ میں وہاں معمول میں ہونے والے واقعات کے خلاف احتجاجاً لیٹا تھا اور اسی لیے وہاں کوئی آثار نہیں تھے۔ میں اس خوف سے قدرے منتشر الذہنی کا شکار تھا کہ شاید دوسرے کتے میری کمی کو محسوس کرتے ہوں۔ مجھے تلاش کرتے اور ایک دوسرے کو میرے خلاف بھڑکاتے ہوں۔ ایک اور خدشہ بھی تھا کہ معمولی سی نمی سے اس زمین سے، جو سائنس کی تحقیقات کے مطابق ایک بنجر زمین تھی، اتفاقاً خوراک ظاہر ہو جائے اور اس کی خوشبو سے مجھے ترغیب دے۔ لیکن ایک مدت تک ایسا کوئی واقعہ نہ ہوا اور میری فاقہ کشی جاری رہی۔ ان خدشات کے باوجود میں اس اولین درجے میں اتنا پرسکون تھا کہ مجھے یاد نہیں ہے کہ کبھی پہلے ایسا رہا ہوں گا۔

اگرچہ دراصل میں سائنسی تحقیقات کی تنسیخ کے لیے یہ مشقت کر رہا تھا، لیکن مجھے اپنے اندر

یقین کا احساس ہوا جو تقریباً ایک سائنسدان کا روایتی وقار تھی۔ اپنے خیالوں میں میں نے سائنس سے معافی کی استدعا کی۔ اس میں میری تحقیقات کے لیے بھی کچھ گنجائش ہوگی۔ تب میری تشفی کی خاطر میرے کانوں میں اس یقین دہی کی صدا گونجی کہ میری تحقیقات کے اثرات چاہے کتنے گہرے ہی کیوں نہ ہوں، اور درحقیقت یہ جتنے گہرے ہوں، اتنی ہی بہتر ہوں گے، میں ایک عام کتے کی زندگی نہیں گزاروں گا۔

سائنس نے میری کاوشوں کو خوش آمدید کہا اور یہ میری دریافتوں کی تصریح کرے گی۔ جب کہ یہ وعدہ پورا بھی ہو چکا ہے۔ تب سے اب تک میں اپنے دل کی گہرائیوں میں خود کو مجرم تصور کرتا رہا اور ایک وحشی کی طرح اپنی نسل کی روایتی دیوارں سے سر ٹکراتا رہا۔ اب مجھے تکریم کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ مدت سے میری خواہش کے محور کتوں کے اجتماع کی حرارت مجھے ہر طرف سے گھیر لے گی اور میں اپنے رفقاء کے کندھوں پر سوار ہو کر بلند جاؤں گا۔ میری ابتدائی بھوک کی کرشمہ سازیاں۔

اپنی یہ کامیابی مجھے اتنی وقیع معلوم ہوئی کہ میں فرطِ جذبات اور خود ترحمی کے احساس کے ساتھ خاموش جھاڑیوں کے درمیان آبدیدہ ہو گیا جب کہ مجھے اعتراف ہے کہ یہ بات میرے لیے قابل فہم نہیں تھی کیونکہ میں تو اس اعزاز کی توقع کر رہا تھا تو پھر کیوں آبدیدہ ہوا؟ شاید خالص مسرت کے باعث۔ یہ ہمیشہ تب ہوتا ہے جب خوشی مجھے اپنی گرفت میں لے لے، اور ایسا تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ میں رو دوں۔ بعد ازاں جلد ہی یہ جذبات کافور ہو گئے۔ شدید ہوتی بھوک نے میرے خوبصورت تخیلات کو ایک ایک کر کے تحلیل کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد تمام تخیلات اور ارفع خیالات کے غائب ہو جانے سے میں اپنی انتڑیوں میں جلتی بھوک کے ساتھ تنہا رہ گیا۔

''یہ میری بھوک ہے۔'' اس دور میں ان گنت بار میں نے خود سے کہا جیسے میں خود کو قائل کرنا چاہ رہا ہوں کہ میری بھوک اور میں دو الگ حقیقتیں تھیں اور میں ایک اکتائے ہوئے محبوب کی طرح آسانی سے اسے پرے جھٹک سکتا تھا۔ لیکن درحقیقت ہم اذیت دہ انداز میں یکجا تھے اور جب میں نے خود سے وضاحت کی کہ ''یہ میری بھوک ہے۔'' تو دراصل یہ میری بھوک ہی بول رہی اور میرا اٹھٹھہ اڑا رہی تھی۔ برا، بہت برا وقت۔ اس کے بارے میں سوچ کہ اب بھی کانپ جاتا ہوں۔ صرف اس کرب کی وجہ سے ہی نہیں جو میں نے تب برداشت کیا، بلکہ اس لیے کہ میں تب اسے مکمل کرنے کے قابل نہیں تھا اور نتیجتاً اگر میں کبھی کسی کامیابی کے حصول کا خواہاں تھا تو مجھے ایک مرتبہ پھر اسی اذیت سے گزرنا

ہوگا۔ کیونکہ آج بھی میں فاقہ کشی کو اپنی تحقیق کا حتمی اور سب سے کارآمد طریقہ مانتا ہوں۔ اعلی ترین مقام، اگر وہ قابل حصول ہے تو صرف اعلی ترین کوشش ہی سے ایسا ممکن ہے اور ہم میں اعلی ترین کوشش ،رضا کارانہ فاقہ کشی ہی ہے۔

میں جب ان زمانوں کے بارے میں سوچتا ہوں، جن کی یاد کے ساتھ میں بخوشی تمام زندگی گزار سکتا ہوں، تو فوراً مجھے اس زمانے کا بھی خیال آتا ہے جو ہنوز مجھے ڈراتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ایسی کاوش کے اثر سے آزاد ہونے میں پوری عمر گزر جاتی ہے۔ ایک بالغ فرد کے طور پر میری تمام زندگی میرے اور اس فاقہ کشی کے درمیان کھنچی ہوئی ہے اور میں ابھی تک اس سے بحال نہیں ہوا۔

اگلی فاقہ کشی کا آغاز کرتے ہوئے شاید مجھے پہلے کی نسبت زیادہ پختگی حاصل ہوگی جو میرے وسیع تر تجربے اور اس کوشش کی ضرورت سے متعلق میری گہری بصیرت کے باعث ہوگی۔ لیکن میری قوتیں اب بھی اس اولین مضمون کے اثر تلے کمزور ہیں اور اسی لیے شاید ان مانوس دہشتوں کی قربت ہی میری ہمت پست ہونے لگتی ہے۔ میری کمزور اشتہا میرے کسی کام نہیں آئے گی۔ یہ میری کاوش کی وقعت کو معمولی حد تک گھٹا دے گی اور شاید ہی مجھے اتنا عرصہ فاقہ کشی پر مجبور کر پائے جتنا پہلی کاوش کے وقت ضروری تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں اور اس کے علاوہ کئی ایک معاملات میں بھی کسی ابہام کا شکار نہیں ہوں۔ آزمائشی کاوشوں میں طویل وقفے کم نہیں ہوتے۔ اکثر میں بھوک کو اپنے دانتوں تلے دبا لینے میں کامیاب ہوا۔ لیکن میں پھر بھی حتمی کاوش کے لیے مکمل تیار نہیں اور اب تو جوانی کا جوش وجذبہ بھی باقی نہیں رہا۔ بلکہ یہ تو اسی پہلی فاقہ کشی کی محرومیوں کی نذر ہو گیا۔

ہر طرح کے خیالات میرے لیے جسمانی اذیت کے موجب ہوئے۔ میرے آباؤاجداد مجھے دھمکاتے ہوئے میرے سامنے ظاہر ہوئے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے انہیں ہر بات کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا۔ گو ایسا میں کھلم کھلا نہیں کہہ پایا لیکن وہی تھے جنہوں نے ہم کتوں کی زندگی کو احساس جرم میں مبتلا کیا۔ اور یوں میں نے ان کی دھمکیوں کا جواب دھمکیوں ہی کی صورت میں دیا۔ لیکن میں ان کے علم کا معترف بھی ہوں۔ جو ایسے منبعوں سے ان پر وارد ہوا ہے جن سے ہم مزید باخبر نہیں ہیں اور اسی وجہ سے چاہے میں ان کے خلاف کیسا ہی محسوس کروں لیکن میں کبھی ان کے قوانین سے انحراف کی کوشش نہیں کر پاؤں گا بلکہ راہ فرار ڈھونڈ کر نکل جاؤں گا جسے تلاش کرنے کے لیے مجھ میں عمدہ حس موجود ہے۔

فاقہ کشی کے معاملے پر میں نے کتوں کے ایک مشہور زمانہ مکالمہ سے رجوع کیا جس میں ہمارے داناؤں میں سے ایک نے فاقہ کشی پر ممانعت عائد کرنے کی ارادہ ظاہر کیا لیکن ایک دوسرے دانا نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روکا ''لیکن پھر کون آئندہ فاقہ کشی کا سوچے گا؟'' پہلے دانا نے خود کو اس بات سے متفق ہو جانے دیا اور ممانعت کے ارادے سے باز آیا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''کیا واقعی فاقہ کشی ممنوع نہیں؟''

مبصرین کی اکثریت اس امر کو رد کرتی اور فاقہ کشی کی کھلی اجازت دیتی ہے۔ اور وہ دوسرے دانا کے ہم خیال ہوتے ہوئے اس بات کو کسی خاطر میں نہیں لاتے کہ غلط توضیحات سے کیسے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

قدرتی طور پر میں نے فاقہ کشی کے آغاز سے پہلے ہی خود کو اس نقطے پر بالکل واضح کر لیا۔ لیکن جب میں بھوک کے دوروں سے تڑپ رہا تھا اور شدید ذہنی اذیت کی حالت میں اپنی پچھلی ٹانگوں سے حظ اٹھاتا ہوا مایوسی سے انہیں جوڑوں تک چاٹ اور نوچ رہا تھا، تو ایسا لگا کہ اس مکالمے کی عمومی تصریح مجھ پر مکمل کھلی اور میں نے مبصرین کی سائنس پر لعنت بھیجی اور خود پر بھی لعنت بھیجی کہ ان کے ہاتھوں گمراہ ہوا۔ کیوں کہ جیسا کہ ایک بچہ بھی جان سکتا تھا اس مکالمے میں فاقہ کشی کی ممانعت کے علاوہ بھی بہت کچھ شامل تھا۔

پہلا دانا فاقہ کشی کو ممنوع قرار دینا چاہتا تھا۔ جیسا وہ چاہتا تھا ویسا تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ لہٰذا فاقہ کشی ممنوع تھی۔ جبکہ دوسرا دانا نہ صرف پہلے دانا سے متفق ہو گیا بلکہ درحقیقت فاقہ کشی کو غیر ممکن تصور کرتا تھا، سو پہلی ممانعت پر ایک دوسری ممانعت کو لادا جو خود کتوں کی فطرت سے متعلق تھی۔ پہلے دانا نے اس بات کو جان لیا اور اسی لیے واضح ممانعت کو رد کیا جو بھی کتوں سے متعلق تھی۔ سو یوں تھا کہ یہ معاملہ اب حل ہو چکا کہ اس نے تمام کتوں پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ وہ خود کو جانیں اور فاقہ کشی سے متعلق خود سے ممانعت عائد کریں۔ لہٰذا ایک کے بجائے تین تین ممانعتیں تھیں جن سے میں نے انحراف کیا۔

چاہے سست روی سے ہی مگر اس موقع پر میں اس ممانعت کی کسی حد تک پابندی کر سکتا تھا۔ لیکن درد کے دورے میں فاقہ کشی کو دراز کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور میں نے ایسے حریصانہ انداز میں اس خواہش کی پیروی کی جیسے یہ کوئی عجیب کتا ہو۔ میں خود کو باز نہیں رکھ سکا۔ شاید اس لیے بھی کہ میں

اتنا لاغر ہو چکا تھا کہ کھڑا نہیں ہو سکتا اور جانے پہچانے منظروں میں اپنی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔

میں جنگل میں گرے ہوئے پتوں پر لیٹ جاتا، لیکن مزید سو نہیں سکتا تھا۔ مجھے ہر طرف سے آوازیں سنائی دیتیں۔ یہ دنیا جو مجھے اپنی سابقہ زندگی میں خوابیدہ معلوم ہوتی، اس فاقہ کشی سے بیدار نظر آنے لگی۔ میں اس خیال سے تکلیف میں رہا کہ میں کبھی کچھ کھانے کے قابل نہیں ہو پاؤں گا اور مجھے کچھ کھانا چاہئے تاکہ پھر سے اسی خاموشی کو پا سکوں جسے دنیا اتنے پُرشور انداز میں ختم کر رہی تھی۔ لیکن میں ایسا کرنے کے کبھی قابل نہیں ہو پاؤں گا کہ سب سے تیز آواز خود میرے پیٹ ہی سے سنائی دیتی۔ میں ششدر آنکھوں کے ساتھ اکثر اس سے اپنے کان لگا لیتا لیکن اس پر بمشکل یقین کر پاتا، میں جو سنتا۔

اب جبکہ اشیا ناقابل برداشت ہو رہی تھیں، مجھے لگا جیسے میری اپنی فطرت عمومی ہیجان کی زد میں ہو۔ میں نے اسے بچانے کی الٹی سیدھی کوششیں کیں۔ خوراک کی خوشبو نے مجھ پر حملہ کیا۔ لذیذ کھانے جنہیں میں کب کا فراموش کر چکا تھا، میرے بچپن کے ذائقے۔ ہاں میں اب بھی اپنی ماں کے سر پستان کی مہک محسوس کر سکتا تھا۔ ان خوشبوؤں کے خلاف مزاحمت کرنے کا عزم، میں فراموش کر بیٹھا یا شاید میں اسے بالکل نہ بھلا سکا۔ میں خود کو ادھر اُدھر گھسیٹتا پھرا، لیکن کبھی چند گز کے فاصلے سے زیادہ دور نہیں۔ اور ہر طرف سونگھتا جیسے یہ عمل میرے ارادے کے عین موافق ہو اور جیسے میں خوراک محض اس لیے تلاش کر رہا ہوں تاکہ اس سے اپنی حفاظت کر سکوں۔ لیکن اس بات نے کہ میں کچھ تلاش نہ کر سکا، مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ خوراک وہیں تھی، صرف یہ ہمیشہ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر رہی، اور اس تک پہنچنے سے پہلے ہی میری ٹانگیں جواب دے جاتیں۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا اور میں نے وہ کمزور پیش رفت صرف اس خوف کے مارے کی تھیں کہ کہیں میں اسی مقام پر ڈھے نہ جاؤں اور پھر کبھی اس سے باہر نہ جا سکوں۔ میری آخری امیدیں، میرے آخری خواب عنقا ہو گئے۔ میں یہیں بدحالی میں فنا ہو جاؤں گا۔ میری تحقیقات آخر کس کام کیں؟ طفلانہ کاوشیں جو طفلانہ اور کہیں زیادہ اچھے دنوں میں کی گئی تھیں۔ کبھی انتہائی سنجیدہ لمحات آتے جب میری تحقیقات کو اپنی افادیت ظاہر کرنے کا موقع مل سکتا تھا لیکن وہ غائب کہاں ہو گئی تھیں؟ بس ایک کتا بیچارگی سے لیٹا ہوا خالی ہوا میں منہ چلا رہا ہے۔ ایک کتا، جس نے ابھی ہیجانی عجلت کے ساتھ مختصر وقفوں سے اور اس عمل کی خبر ہوئے بغیر زمین کو پانی دیا تھا، اپنی یادداشت میں محفوظ ان گنت منتروں میں سے ایک مختصر ترین منتر بھی یاد نہیں کر پا رہا تھا۔ کوئی

مختصر نغمہ بھی نہیں جو ایک نوزائیدہ کتا اپنی ماں کے نیچے لیٹے ہوئے گنگناتا ہے۔ یوں لگا جیسے میں اپنے ساتھیوں سے کٹ گیا تھا، کوئی مختصر دوری نہیں بلکہ غیر محدود، اور یہ کہ میں بھوک کی وجہ سے نہیں بلکہ نظر انداز کیے جانے کی وجہ سے مرجاؤں گا۔ کیوں کہ یہ واضح ہے کہ کسی کو میری پرواہ نہیں ہے، نہ کوئی زمین کے نیچے، نہ اس کی سطح پر اور نہ اس کے اوپر۔

میں ان کی بے اعتنائی کی وجہ سے مرا جارہا تھا۔ وہ بے نیازی سے کہتے تھے، ''یہ مر رہا ہے''، اور ایسا واقعی ہو جائے گا۔ اور کیا میں خود بھی ایسا ہی تو نہیں چاہتا؟ کیا میں خود ایسا ہی تو نہیں کہتا؟ کیا میں نے ہی یوں بھلا دیا جانا نہیں چاہا تھا؟ ہاں بھائیو لیکن ایسے نہیں کہ اس جگہ فنا ہو جاؤں۔ بلکہ یوں کہ سچ کو پاؤں اور جھوٹ کی دنیا سے فرار ہو جاؤں جہاں کوئی ایسا نہیں ہے، حتیٰ کہ میں بھی نہیں کہ جس سے سچ حاصل ہو سکے۔ میں جو کہ اسی جھوٹ کی دنیا کا شہری ہوں۔ شاید سچائی اتنے فاصلہ پر نہیں تھی اور شاید مجھے بھی اتنا نظر انداز نہیں کیا گیا تھا جتنا مجھے لگا۔ یا ہو سکتا ہے کہ مجھے میرے ساتھیوں سے زیادہ خود میں نے ہی بھلا دیا ہو، کچھ حاصل کرنے اور مرجانے کے لیے۔

لیکن کوئی اتنی آسانی سے نہیں مرتا جتنا ایک اعصاب زدہ کتا تصور کرتا ہے۔ میں صرف بیہوش ہوا تھا اور جب ہوش میں آیا اور میں نے آنکھیں اوپر اٹھائیں تو ایک عجیب شکاری کتا مجھے اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ مجھے بھوک نہیں لگ رہی تھی بلکہ توانائی سے بھرا ہوا تھا اور یوں لگا میرے اعصاب ہلکے اور پتلے تھے حالاں کہ میں نے اس تبدیلی کو پرکھنے کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میری بصری حسیات معمول زیادہ بہتر نہیں تھیں۔ ایک خوبصورت شکاری کتا جو بے شک غیر معمولی نہیں تھا، میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں اسے صاف دیکھ سکتا تھا اور بس یہی کچھ تھا۔ لیکن پھر بھی یوں لگا کہ میں نے اس میں اس کے علاوہ بھی کچھ دیکھا تھا۔

میرے نیچے خون جمع تھا جسے پہلے میں غذا سمجھا۔ لیکن پھر فوراً اسے پہچان لیا کہ یہ وہی خون تھا جس کی میں نے قے کی تھی۔ میں نے اپنی نگاہیں پھیر کر عجیب شکاری کتے پر جمائیں۔ وہ دبلا پتلا، لمبی ٹانگوں والا کتا تھا جس کی بھوری کھال پر جا بجا سفید دھبے تھے اور اس کی نگاہ عمدہ، مضبوط اور چبھتی ہوئی تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔ ''فوراً یہاں سے چلے جاؤ''

’’میں ابھی نہیں جا سکتا‘‘ میں نے وضاحت کیے بغیر کہا۔ میں اسے ہر بات کیسے سمجھا سکتا تھا۔ یوں بھی وہ عجلت میں دکھائی دیتا تھا۔

’’مہربانی کرو، چلے جاؤ۔‘‘ اس نے بے چینی سے پیروں کو اوپر اٹھاتے اور زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

’’مجھے یہیں رہنے دو۔‘‘ میں نے کہا، ’’مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میری فکر مت کرو۔ دوسرے بھی نہیں کرتے۔‘‘

’’تمہارے ہی بھلے کے لیے جانے کو کہتا ہوں‘‘ اس نے کہا۔

’’تم اس کی کوئی بھی وجہ سمجھو۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’میں چاہوں بھی تو نہیں جا سکتا۔‘‘

’’تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے‘‘۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’تم آسانی سے جا سکتے ہو۔ تم کمزور لگتے ہو، اس لیے تمھیں جانے کو کہتا ہوں۔ چاہو تو آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جاؤ۔ اگر اب سستی کرو گے تو بعد میں اتنی ہی تیزی دکھانی پڑے گی۔‘‘

’’یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’یہ مسئلہ میرا بھی ہے‘‘ اس میرے روکھے پن سے گلوگیر ہوتے ہوئے کہا۔ تاہم وقتی طور پر مجھے وہیں لیٹے رہنے پر آمادہ بھی تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ مجھے خوش کرنے کا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں بخوشی ایسے خوبصورت جانور کی چکنی چپڑی باتوں کو مان لیتا۔ لیکن اس لمحے نہ معلوم کیوں اس پر یقین کرنے کے خیال نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔

’’دفع ہو جاؤ‘‘ میں چیخا۔ ایسی بلند بانگی سے گویا خود کو بچانے کا بس یہی ایک طریقہ باقی بچا تھا۔

’’ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں‘‘۔ اس نے آہستگی سے پسپا ہوتے ہوئے کہا۔ ’’تم حیرت انگیز کتے ہو۔ کیا تم مجھ سے خوش نہیں ہوئے۔‘‘

’’میں تبھی خوش ہوں گا اگر تم یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے سکون سے رہنے دو۔‘‘ میں نے کہا لیکن میں اب مزید اپنے بارے میں اتنا پر یقین نہیں تھا جتنا میں نے اسے سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ میری حسیات نے، جو فاقہ کشی سے تیز ہو گئی تھیں، معاً اس کے بارے میں کوئی بہت خاص بات دیکھی یا سنی۔ یہ تو

ابھی آغاز تھا۔ وہ بڑھ رہا تھا۔ وہ میرے قریب آیا اور میں جانتا تھا اس شکاری کتے میں مجھے پرے دھکیل دینے کی طاقت موجود تھی۔ حالاں کہ تب میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کیسے کبھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو پاؤں گا۔ میں نے اسے دیکھا۔ اس نے میرے کھردرے جواب پر صرف دکھ سے اپنا سر ہلایا، مسلسل بڑھتی خواہش کے ساتھ۔

''تم کون ہو''؟ میں نے پوچھا۔

''میں شکاری ہوں'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے یہاں لیٹنے کیوں نہیں دیتے''؟ میں نے پوچھا۔

''تم میرے کام میں مخل ہوتے ہو'' اس نے کہا ''تم یہاں ہو تو مجھ سے شکار نہیں ہو پائے گا۔''

''کوشش کرو'' میں نے کہا۔ شاید شکار کر لو۔''

''نہیں'' اس نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ تمہیں جانا ہی ہوگا۔''

''آج شکار نہ کرو'' میں نے منت سماجت کی۔

''نہیں' شکار تو کرنا ہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر مجھے جانا چاہیے۔ تا کہ تم شکار کر لو'' میں کہا۔ ''بس 'چاہیے' اور کچھ نہیں۔ کیا بتا سکتے ہو کہ 'چاہیے' کیوں ضروری ہے۔''

''نہیں'' اس نے جواب دیا، ''لیکن کوئی بات ایسی نہیں ہے جو قابل وضاحت ہو۔ یہ بالکل فطری اور خود بدیہی باتیں ہیں۔''

''اتنی خود بدیہی بھی نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔'' میں نے کہا، ''تمہیں افسوس بھی ہے کہ تم مجھے دھکیل رہے ہو۔ اور ایسا کر بھی رہے ہو۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہاں ایسا ہی ہے۔'' میں نے جواباً اسی کی بات کو دہرایا۔ ''یہ تو کوئی جواب نہیں۔ تو پھر کون سی شے قربان کرو گے۔ شکار چھوڑ دو گے یا مجھے پرے دھکیلنا۔''

''شکار چھوڑ دوں گا'' اس نے بلا توقف جواب دیا۔

''یہاں،'' میں نے کہا، ''کیا تمہیں نہیں لگتا کہ اپنی ہی بات کو رد کر رہے ہو؟''

''کیسے خود کو رد کر رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''میرے پیارے ننھے کتے، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم واقعی نہیں سمجھے کہ مجھے یہ کرنا چاہیے؟ کیا تم انتہائی خود بدیہی حقیقت کو نہیں سمجھے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیوں کہ میں نے دیکھا اور تبھی ایک نئی زندگی میرے اندر دوڑ گئی، جیسی زندگی خوف سے پیدا ہوتی ہے۔ تو میں نے ان دیکھے اشاروں سے دیکھا کہ جنھیں کوئی دوسرا نہیں بلکہ میں ہی دیکھ سکتا تھا، کہ اپنی چھاتی کی گہرائیوں میں وہ شکاری کتا ایک گیت پیدا کرنے کی تیاری میں تھا۔''

''تم گانے چاہ رہے ہو؟'' میں نے کہا۔

''ہاں گیت گاؤں گا۔ جلد ہی لیکن ابھی نہیں'' اس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''شروع تو تم کر ہی چکے ہو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، ابھی نہیں۔ لیکن تیار رہو۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم شروع کر چکے ہو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں ابھی نہیں۔ بس تیار ہو رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

''مجھے تو یہ سنائی بھی دے رہا ہے۔ چاہے نہ مانو۔'' میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش تھا اور پھر میرے خیال میں میں نے کچھ ایسی بات دیکھی جیسی کبھی کسی کتے نے نہیں دیکھی ہوگی۔ کم از کم ہماری تاریخ میں ایسی بات کا معمولی اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔ میں نے شدید خوف اور شرمندگی سے بسرعت اپنا سر سامنے پھیلے خون کے ڈھیر میں ڈبو لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شکاری کتا اس کے بارے میں بجانے بغیر ہی گا رہا تھا اور یہی نہیں بلکہ وہ دھن، اس سے علیحدہ، اپنے ہی قوانین کے تحت فضا میں تیر رہی تھی اور اس کے کوشش کے بغیر ہی میری طرف بڑھ رہی تھی، صرف میری طرف۔

آج بلاشبہ میں ایسے تمام ادراکات کی معقولیت کو جھٹلا دوں گا اور انہیں میں اس وقت کے میرے حد سے بڑھے ہوئے جوش و خروش سے تعبیر کروں گا۔ لیکن اگر یہ ایک سہو ہی تھی، اس کے باوجود یہ غیر معمولی تھی، اور چاہے التباس سہی، مگر واحد حقیقت تھی جسے میں اپنے فاقہ کشی کے زمانے سے اس دنیا

میں لایا تھا۔اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہی تھا کہ جب آپ خود سے ماورا ہوں تو کتنی دور جا سکتے ہیں۔ میں واقعی خود سے پرے کھڑا تھا۔

عام حالات میں میں بہت بیمار ہو جاتا، حرکت کرنے سے قاصر ہو جاتا۔لیکن یہ دھن جسے شکاری کتے نے بھی جلد ہی جان لیا کہ یہ اسی سے پھوٹ رہی تھی، نا قابل مزاحمت تھی۔ یہ زور آور ہوتی گئی۔اس کی بڑھتی قوتیں ہر حد سے ماورا تھیں اور میرے کان کے پردے بجنے لگے۔لیکن بدترین بات یہ تھی کہ یوں لگتا جیسے یہ صرف اور صرف میرے لیے ہی موجود تھیں۔ یہ آواز جس کے تلذذ کے آگے جنگل بھی دم سادھ لیتے ہیں، صرف میرے لیے موجود تھی۔ میری حیثیت ہی کیا تھی کہ میں یہاں رہنے کی جرات کر پاتا۔اپنے ہی خون اور غلاظت کے ڈھیر میں اس کے سامنے کھلم کھلا لیٹا ہوا۔

میں اپنے پیروں پر ڈگمگاتے ہوئے کھڑا ہوا اور اپنے آپ کو دیکھا۔ یہ بدبخت جسم کبھی نہیں بھاگ سکے گا۔میرے پاس ابھی سوچنے کو کچھ وقت تھا۔لیکن میں نغمے کی ترغیب پر پہلے ہی شاہانہ انداز میں آگے چل پڑا تھا۔میں نے اپنے رفقا سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔شاید میں وہاں پہنچنے پر انہیں سب کچھ بتا سکتا تھا لیکن میں بہت نحیف تھا اور بعد میں مجھے لگا کہ ایسی باتیں بتائی ہی نہیں جا سکتی تھیں۔وہ اشارے جنہیں میں گاہے بگاہے ظاہر ہونے سے نہیں روک پاتا تھا، عمومی گفتگو میں بالکل گم ہو جاتے۔ بہرکیف چند گھنٹوں میں ہی میری جسمانی حالت بہتر ہو گئی۔لیکن روحانی طور پر میں آج بھی اس تجربے کے اثرات میں مبتلا ہوں۔

تاہم اس کے بعد میں نے اپنی تحقیقات کا موضوع موسیقی کو بنایا۔یہ سچ تھا، سائنس میں اس شعبے میں بھی کم تحقیق نہیں ہوئی تھی، موسیقی کی سائنس۔اگر میری معلومات درست ہیں تو موسیقی کی سائنس افزائش کی سائنس سے کئی گنا جامع اور بہرکیف زیادہ ٹھوس بنیادوں پر استوار ہے۔اس بات کو یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ اس شعبے میں دوسرے کسی شعبے کی نسبت زیادہ معروضی تحقیقات کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کا علم کہیں زیادہ خالص مشاہدے اور تنظیم کا حامل ہوتا ہے۔جبکہ خوراک کے شعبے میں بنیادی مقصد عملی نتائج کا حصول ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موسیقی کی سائنس کو افزائش کی سائنس سے کہیں زیادہ اعتبار حاصل ہے اور اسی وجہ سے یہ ہماری زندگیوں میں کبھی گہرائی تک شامل نہیں ہو سکی۔ میں خود بھی جب تک جنگل میں یہ آواز نہ سن لوں، موسیقی کی نسبت دوسری باتوں کی طرف کہیں زیادہ مائل رہتا ہوں۔

بے شک موسیقار کتوں کا میرا تجربہ مجھے موسیقی کی طرف لایا لیکن تب میں بہت بچہ تھا۔ نہ ہی کسی اعتبار سے یہ آسان بات تھی کہ سائنس سے نمٹا جا سکے۔ اسے انتہائی غیر معمولی تصور کیا جاتا اور یہ شائستگی سے مجمع کو خیر آباد کہتی ہے۔ مزید یہ کہ اگرچہ ان کتوں سے متعلق جس چیز نے مجھے سب سے پہلے متاثر کیا، وہ ان کی موسیقی ہی تھی، لیکن ان کی خاموشی مجھے اب بھی زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہے۔ جہاں تک ان کی دہشت زدہ کر دینے والی موسیقی کا تعلق ہے، تو یہ ایسی منفرد شے تھی کہ اسے سمجھنا میرے بس سے باہر تھا۔ لیکن پھر ان کی خاموشی سے مجھے ہر جگہ اور ہر ملنے والے کتوں کی صورت میں دو چار ہونا پڑا۔

اس لیے کتوں کی اصل فطرت کا ادراک حاصل کرنے کے لیے مجھے مناسب ترین معلوم ہوا کہ خوراک کو اپنی تحقیقات کا موضوع بناؤں جو میرے اندازے کے مطابق مجھے بالکل سیدھے راستے پر لے جا کر اپنے مقصد تک پہنچا دے گا۔ شاید میں غلطی پر تھا۔ ان دونوں علوم کے درمیان موجود ایک انقطاعی خطے نے میری توجہ اپنی جانب منعطف کی۔ میری مراد منتر کاری کے نظریہ سے ہے جس کے ذریعے ہم خوراک کو نیچے لاتے ہیں۔ یہ بات بھی میرے خلاف ہی ہے کہ میں نے موسیقی کی سائنس پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا اور اس شعبے میں خود کو نیم خواندہ افراد میں شامل کرنے کے بھی لائق نہیں سمجھتا جنھیں سائنس سب سے زیادہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس خیال کو میں اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا۔ میں تو کبھی، اور میرے پاس بد قسمتی سے اس کا ثبوت بھی موجود ہے کہ میں کبھی اس شعبے کی کسی مقتدر اتھارٹی کی طے کردہ ابتدائی سائنسی آزمائش میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔

تاہم مذکورہ بالا حالات سے قطع نظر اس کی وجہ سائنسی تحقیقات کے لیے میری ناموزونیت، محدود فکری قوتوں، میری ناقص یادداشت اور سب سے بڑھ کر میری اس نااہلی میں تلاش کی جا سکتی ہے کہ میں اپنے سائنسی مقصد کو مسلسل آنکھوں کے سامنے قائم نہیں رکھ سکتا۔ میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں بلکہ ایک خاص طرح کی مسرت کے ساتھ۔ مجھے تو لگتا ہے کہ سائنس کے لیے میری نااہلی کی زیادہ گہری وجہ میری جبلت ہے جو بلاشبہ ایک جبلت بد نہیں ہے۔ میں شیخی بگھارنا چاہوں تو ضرور کہوں گا کہ یہی جبلت ہے جس نے میری سائنسی استعداد کو ختم کیا۔ کیونکہ یہ بہت غیر معمولی بات ہو گی کہ کوئی کتا زندگی کے روزمرہ معاملات نمٹانے میں قابل برداشت حد تک ذہانت کا اظہار کرے تو اسے آسان تو کسی صورت نہیں کہا جا سکتا، اور پھر کتا بھی ایسا جس کی تحقیقات، جہاں بھی ممکن ہو سکے، اور چاہے

سائنس کی طرف سے نہ سہی مگر سائنس دانوں کی طرف سے، جانچی اور پرکھی جاسکیں، تو وہ اپنے طور پر اتنا اہل بھی نہیں ہوگا کہ سائنس کی سیڑھی کے پہلے زینے پر ہی اپنا پنجہ رکھ سکے۔ یہ میری جبلت ہی ہے کہ جس نے شاید سائنس کے لیے ہی، اور وہ بھی آج کی سائنس جیسی کسی سائنس کے لیے نہیں بلکہ ایک مکمل سائنس کے لیے، مجھے آزادی کو کسی بھی دوسری شے سے کہیں وقیع قرار دینے پر قائل کیا۔ آزادی۔ بے شک جیسی آزادی آج ممکن ہے، وہ ایک غلیظ شے ہے۔ لیکن پھر بھی آزادی، پھر بھی ایک ملکیت۔

شکاری گریکس

دو لڑکے بندرگاہ کی دیوار پر بیٹھے سکے سے کھیل رہے تھے۔ ایک شخص مجسمے تک جاتی سیڑھیوں پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا اور ایک بہادر سپوت کے سائے تلے سستا رہا تھا جس نے اپنی تلوار فضا میں بلند کر رکھی تھی۔ ایک لڑکی چشمے سے بالٹی بھر رہی تھی۔ ایک سبزی فروش اپنے سامان کے برابر لیٹا جھیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک کیفے کی کھلی کھڑکی اور باہری دروازے سے دو افراد پرے کرسیوں پر بیٹھے شراب نوشی کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ کیفے کا مالک سامنے کاؤنٹر پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ایک کشتی خاموشی سے مختصر بندرگاہ کی طرف بڑھ رہی تھی جیسے کوئی ان دیکھی قوت اسے پانی پر اٹھائے ادھر لا رہی ہو۔ نیلی جیکٹ والا ملاح کشتی سے ساحل پر کودا اور کشتی کی رسی کو لوہے کے چھلے میں سے گزار کر کھینچا۔ ملاح کے عقب میں چاندی کے بٹنوں والے سیاہ کوٹ پہنے میں ملبوس دو افراد ایک تابوت اٹھائے ہوئے تھے جس میں پھولوں کے نقش کے جھالر والے ریشمی کپڑے کے نیچے ایک شخص بظاہر لیٹا ہوا تھا۔

بندرگاہ پر کسی نے ان نو واردوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ حتیٰ کہ جب دو اشخاص تابوت نیچے رکھ کر ملاح کا انتظار کرنے لگے جو ہنوز کشتی کی رسی کو لوہے کے چھلے میں باندھنے میں مصروف تھا، کوئی ان کے نزدیک گیا، نہ ان سے کوئی سوال پوچھا، نہ انھیں استفہامیہ نگاہ سے دیکھا۔

کشتی کا کپتان اس عورت کی وجہ سے وہیں رکا ہوا تھا جو ایک بچے کو چھاتی سے لپٹائے کھلے بالوں کے ساتھ کشتی کے عرشے پر ظاہر ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور ساحل سمندر کے بالکل ساتھ بائیں جانب ڈھلوان پر ایستادہ ایک دو منزلہ زرد رنگ کے گھر کی جانب اشارہ کیا۔ دونوں اشخاص نے اپنا بوجھ اٹھایا اور اس پستہ قد مگر خوبصورت ستونوں والے دروازے کی طرف چلنے لگے۔ ایک چھوٹے لڑکے نے اسی وقت کھڑکی کھول کر نوواردوں کی جماعت کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور پھر فوراً ہی کھڑکی بند کر دی۔

دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ یہ شاہ بلوط کی سیاہ لکڑی سے بنایا گیا ایک مضبوط دروازہ تھا۔ فاختاؤں کا ایک غول، جو دیر سے گرجا گھر کے مینار کے گرد چکر کاٹ رہا تھا، گلی میں اس گھر کے سامنے اترا۔ فاختائیں دروازے کے سامنے اکٹھی ہو گئیں جیسے ان کی خوراک گھر میں ذخیرہ کی گئی ہو۔ ان میں سے ایک فاختہ اڑتی ہوئی پہلی منزل تک گئی اور کھڑکی کے شیشے پر چونچ مارنے لگی۔ وہ چمک دار رنگوں والے صحت مند پر جوش پرندے تھے۔ کشتی پر کھڑی عورت نے خاصی جگہ پر ان کے لیے دانے پھینکے۔ وہ دانے چگ کر عورت سے دور اڑ گئیں۔

ایک شخص، ایک بڑی ٹوپی پہنے جس میں سیاہ کریب کا فیتہ لگا تھا، بندرگاہ کو جاتی ہوئی تنگ اور ڈھلوانی گلیوں میں سے ایک گلی میں سے گزرتا ہوا نیچے اترا۔ اس نے احتیاط سے اپنے اردگرد دیکھا۔ ہر شے اس میں بے زاریت پیدا کر رہی تھی۔ ایک موڑ پر پڑے فضلے کو دیکھ کر اس کا منہ سکڑ گیا۔ مجسمے کے نیچے سیڑھیوں پر پھلوں کے چھلکے پڑے تھے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے اس نے چھڑی سے انھیں صاف کیا اور گھر کے دروازے پر دستک دی۔ ساتھ ہی کالے دستانوں میں ملبوس اپنے دائیں ہاتھ سے بڑی ٹوپی سر سے اتار لی۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور تقریباً پچاس چھوٹے بچے دو قطاروں میں طویل ہال سے برآمد ہوئے اور انھوں نے اسے جھک کر سلام کیا۔

ملاح سیڑھیوں سے اترا۔ سیاہ لباس میں ملبوس شخص کو خوش آمدید کہا۔ اسے اپنے ساتھ پہلی منزل میں لے گیا، برآمدے کے گرداگرد عمدگی سے بنائی گئی روشن بالکونی تک اس کی رہنمائی کی۔ دونوں وہاں داخل ہو گئے جب کہ ان کے پیچھے لڑکے احتراماً خاص فاصلہ رکھے چل رہے تھے۔ پیچھے سے یہ ایک ٹھنڈا کشادہ کمرہ دکھائی دیتا تھا جس کی کھڑکی سے کوئی نفس نہیں بلکہ چمکدار سیاہی مائل بھورے پتھر کی سادہ دیوار کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ تابوت والے دونوں اشخاص تابوت کے اگلے سرے پر لمبی موم بتیوں کو جمانے اور جلانے میں مشغول تھے۔ تاہم ان سے بہت مدہم روشنی پیدا ہو رہی تھی جو ان سایوں کو پریشان کر رہی تھی جو اب تک قطعی غیر متحرک تھے اور اب وہ دیوار پر جھلملا رہے تھے۔ تابوت پر پڑے کپڑے کو لپیٹ کر الگ رکھ لیا گیا۔ اس میں لیٹے ہوئے مردے کے بال ایک طرف بری طرح گچھا ہو رہے تھے۔ وہ چہرے مہرے سے شکاری معلوم ہوتا تھا۔ وہ بے حرکت لیٹا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سانس نہیں لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ صرف اس کی مخصوص آراستگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ

غالباً مر چکا تھا۔

وہ معزز شخص تابوت کے پاس آیا۔ اپنا ہاتھ مردے کی پیشانی پر رکھا۔ پھر گھٹنوں کے بل جھک گیا اور دعا مانگی۔ ملاح نے دونوں اشخاص کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً چلے گئے اور اپنے ساتھ ان لڑکوں کو بھی لے گئے جو باہر ہجوم کر آئے تھے اور دروازہ بند کر دیا۔ لیکن شاید یہ اہتمام بھی معزز شخص کے لیے تسلی بخش نہیں تھا۔ اس نے ملاح کو دیکھا۔ ملاح اس کا اشارہ سمجھ گیا اور ایک ذیلی دروازے سے بغلی کمرے میں چلا گیا۔ فوراً ہی تابوت میں لیٹے ہوئے شخص نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ درد بھری مسکراہٹ کے ساتھ چہرے معزز شخص کی طرف موڑا اور پوچھا ''تم کون ہو؟''

کسی تحیر کے اظہار کے بغیر اس شخص نے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کے آسن سے دست بردار ہوتے ہوئے جواب دیا ''ریوا کا صدر بلدیہ''۔

تابوت میں لیٹے شخص نے سر ہلایا۔ بازو کی کمزور حرکت سے ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا اور جب صدر بلدیہ نے اس کی دعوت قبول کر لی تو کہا۔ ''بے شک میں جانتا تھا جناب صدر بلدیہ۔ لیکن شعور میں لوٹتے ہوئے اولین لمحوں میں ہمیشہ یہ بھول جاتا ہوں۔ ہر شے نظروں کے سامنے چکر کھا رہی ہوتی ہے۔ اس لیے سب سے بہتر یہ ہے کہ ہر شے کے بارے میں پوچھ لوں، چاہے اس کے بارے میں جانتا ہی کیوں نہ ہوں۔ غالباً آپ بھی جانتے ہیں کہ میں شکاری گریکس ہوں۔''

''بے شک'' صدر بدلیہ نے کہا ''گزشتہ رات کو ہی مجھے تمھاری آمد کے بارے میں بتایا گیا۔ ہم گہری نیند سو رہے تھے۔ آدھی رات کے قریب میری بیوی چلائی 'سیلواتور'۔ یہ تو میرا نام ہے۔ وہ دیکھو کھڑکی میں فاختہ'۔ وہ واقعی ایک فاختہ تھی لیکن مرغے جتنی بڑی۔ وہ اڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے کان میں بولی:

''کل مردہ شکاری گریکس آ رہا ہے۔ اپنے شہر کی طرف سے اس کا استقبال کرو''

شکاری نے اپنا سر ہلایا اور زبان کی نوک اپنے ہونٹوں پر پھیری۔

''ہاں یہاں فاختائیں میرے سامنے سے گزری تھیں۔ لیکن صدر بلدیہ کیا تمھیں یقین ہے کہ میں ریوا میں ہی رہوں گا۔''

''میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا'' صدر بلدیہ نے جواب دیا ''کیا تم مر چکے ہو؟''

''ہاں'' شکاری نے جواب دیا۔''جیسا کہ تم دیکھ سکتے ہو۔ بہت سال پہلے بلکہ بہت زیادہ سالوں پہلے کی بات ہوگی کہ میں سیاہ جنگل میں ایک پہاڑی سے گرا۔ یہ جرمنی میں ہوا تھا تب میں ایک سانبھر کا پیچھا کر رہا تھا۔تب سے میں مردہ ہوں۔''

''لیکن تم تو زندہ بھی ہو'' صدر بلدیہ نے کہا۔

''ہاں ایک لحاظ سے۔'' شکاری نے جواب دیا۔''ایک خاص حوالے سے زندہ ہوں۔ میری کشتی مرگ راستہ کھو بیٹھی تھی۔ پہیے کے ایک غلط موڑ، جہاز راں کی لمحہ بھر کی غیر حاضر دماغی، میرے پیارے آبائی قصبے کی طرف لوٹ جانے کی خواہش، پتہ نہیں یہ کیا تھا؟ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں زمین پر ہی رہا، اور تب سے میرا جہاز زمینی پانیوں میں بہ رہا ہے۔ سو میں کہ اپنے پہاڑوں کے درمیان زندگی گزارنے سے بڑھ کر میری کوئی خواہش نہیں تھی، اپنی موت کے بعد سے دنیا کے تمام خطوں میں سفر کر رہا ہوں۔''

''کیا دوسری دنیا میں کوئی جگہ نہیں ملی؟'' صدر بلدیہ نے اپنی پیشانی کو دباتے ہوئے کہا۔

''میں ہمیشہ سے اس عظیم زینے پر ہوں جو اسی کی طرف جاتا ہے۔'' شکاری نے جواب دیا،''اس لامتناہی طور پر کھلے اور کشادہ زینے پر، جس پر میں چڑھتا ہوں، کبھی اوپر چڑھتا، کبھی نیچے اترتا ہوں۔ کبھی بائیں جانب، کبھی دائیں جانب۔ ہمیشہ متحرک۔ایک شکاری تتلی بن کر رہ گیا ہے۔ مجھ پر مت ہنسو''

''میں ہنس نہیں رہا'' صدر بلدیہ نے اپنے دفاع میں کہا۔

''ہاں یوں ٹھیک ہے'' شکاری نے کہا''میں ہمیشہ سے حرکت میں ہوں۔لیکن جب میں لمبی چھلانگ لگاتا ہوں اور ایک دروازے کو چمکتے ہوئے اپنے سامنے پاتا ہوں تو فوراً اس پرانی کشتی میں میری آنکھ کھل جاتی ہے جو کسی زمینی یا کسی اور سمندر میں تنہا پڑی ہوتی ہے۔ میں اپنے کیبن میں لیٹا ہوتا ہوں تو میری ایک بار کی موت کا بنیادی نقص کھسیانی ہنسی ہنستا ہے۔ جہاز ران کی بیوی جولیا دروازے پر دستک دیتی ہے اور مجھے تابوت میں اس سرزمین کا صبح کا مشروب پلاتی ہے جس کے ساحل کے قریب سے ہم گزر رہے ہوتے ہیں۔ میں ایک لکڑی کے تابوت میں لیٹتا ہوں۔ ایک میلا کفن پہنے ہوئے کہ میرے سراپے کو دیکھنا کوئی خوش گوار تجربہ نہیں ہے، میرے سر اور داڑھی کے بال، بھورے مائل سیاہ، آپس میں بے انتہا الجھے ہوئے ہیں۔ میرے ہاتھ اور پیر پھولوں کے نقش اور لمبی جھالروں والی نسوانی شال سے

ڈھکے ہوئے ہیں۔ایک مقدس موم بتی میرے سر کے قریب روشن ہوتی اور مجھ پر روشنی ڈالتی ہے۔میرے سامنے کی دیوار پر ایک چھوٹی تصویر ٹنگی ہے واضح طور پر ایک جنگلی انسان کی جو مجھ پر نیزا تانے ہوئے ہے اور ایک خوبصورت نقش و نگار والی ڈھال سے خود کو ممکنہ حد تک بہترین انداز میں چھپائے ہوئے ہے۔ جہاز میں انسان اکثر مختلف احمقانہ تصویروں سے دوچار ہوتا ہے لیکن یہ تو ان میں سب سے زیادہ احمقانہ ہے۔اس کے علاوہ میرا چوبی پنجرہ خالی ہے۔ایک جانب دیوار کے سوراخ سے جنوبی علاقوں کی رات کی گرم ہوا مجھ تک آتی ہے اور میں پانی کی لہروں کو اپنی پرانی کشتی سے سر ٹکراتے ہوئے سنتا ہوں۔

''میں یہاں اس وقت سے لیٹا ہوں جب میں شکاری گریکس کی حیثیت سے سیاہ جنگل میں رہتا تھا اور ایک سانبھر کا پیچھا کرتے ہوئے ایک چٹان سے گر گیا تھا۔ ہر واقعہ ایک عمدہ ترتیب سے ہوا تھا۔ میں پیچھا کر رہا تھا اور گر گیا، ایک نالے میں میرا خون بہا اور میں مر گیا اور اس کشتی کو مجھے دوسری دنیا تک پہنچانا تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ میں پہلی مرتبہ کتنی خوشی سے اس صندوق میں خود کو پھیلا کے لیٹا تھا۔ پہاڑوں نے کبھی مجھ سے ایسے گیت نہ سنے ہوں گے جیسے ان سایہ دار دیواروں نے سنے ہیں۔

میں زندگی سے خوش رہا تھا اور میں مرنے پر بھی خوش تھا۔ یہاں سے دور جانے سے پہلے میں نے خوشی سے تمام کارتوس اور میرا تھیلا اور میری شکاری بندوق پھینک دی تھی جسے میں ہمیشہ فخر سے اٹھائے پھرتا تھا، اور اس ہوادار کفن میں ایسے گھس گیا جیسے لڑکی اپنا عروسی جوڑا پہنتی ہے۔میں لیٹ گیا اور انتظار کرنے لگا تبھی یہ حادثہ ہوا۔''

''ایک خوفناک واقعہ'' صدر بلدیہ نے احتجاجاً اپنے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا ''لیکن اس میں تمھاری کوئی غلطی نہیں۔''

''نہیں'' شکاری نے کہا، ''میں ایک شکاری تھا۔کیا اس میں کوئی گناہ ہے؟ میں نے اس سیاہ جنگل میں ایک شکاری کی حیثیت سے اپنی فطرت کی پیروی کی، جہاں تب بھیڑیئے ہوتے تھے۔میں گھات میں بیٹھ جاتا۔ گولی چلاتا، شکار کو مار گراتا اور اس کے جسم سے کھال نوچ لیتا۔کیا اس میں کوئی برائی تھی؟ میری محنتوں کا مجھے ثمر ملتا۔ مجھے یہ نام دیا گیا ''سیاہ جنگل کا عظیم شکاری'' کیا اس میں کوئی بری بات تھی؟''

''میں یہاں کسی بات کا فیصلہ کرنے نہیں آیا۔'' صدر بلدیہ نے کہا۔ ''لیکن میرے خیال میں بھی ان ساری باتوں میں کوئی بری بات نہیں ہے۔تو پھر اصل قصور کس کا ہے؟''

''ملاح کا۔'' شکاری نے کہا ''میں نے یہاں جو کچھ کہا اسے کوئی نہیں پڑھے گا۔ کوئی میری مدد کو نہیں آئے گا۔ حتیٰ کہ اگر لوگوں کو میری مدد کا حکم دیا جائے تو پھر بھی ہر دروازہ اور کھڑکی بند رہے گی۔ ہر شخص اپنے بستر میں گھس جائے گا اور سر پر لحاف اوڑھ لے گا۔ تمام دنیا رات کی سرائے بن جائے گی۔ یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے۔ کوئی مجھے نہیں جانتا اور اگر کوئی مجھے جانتا بھی ہے تو وہ یہ نہیں جانتا ہوگا کہ کہاں مجھے تلاش کرے۔ اور اگر کوئی یہ جانتا ہو تو وہ یہ نہیں جان پائے گا کہ میرے لیے کیا کرے، وہ نہیں جان پائے گا کہ کیسے میری مدد کرے؟ میری مدد کا خیال ہی ایسا روگ ہے جس کا علاج یہی ہے کہ انسان کو بستر تک لے جاتا جائے۔

میں یہ جانتا ہوں، اور اسی لیے مدد کی التجا نہیں کرتا حالاں کہ کبھی، جب خود پر قابو نہیں رکھ پاتا، جیسے مثال کے طور پر اب نہیں کر پا رہا، تو میں التجا کرنے پر سنجیدگی سے غور کرتا ہوں۔ لیکن ایسے خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کے لیے صرف اپنے اردگرد دیکھنا اور یہ یاد کرنا ہی کافی ہوتا ہے کہ میں کہاں ہوں اور یہ کہ یہ بات میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ صدیوں سے کہاں رہا۔''

''انتہائی عجیب'' صدر بلدیہ نے کہا ''انتہائی غیر معمولی۔ اور اب کیا تم ریوا میں ہمارے ساتھ رہنا چاہو گے؟''

''میرے خیال میں نہیں'' شکاری نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر عذر پیش کرتے ہوئے صدر بلدیہ کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا ''میں یہاں ہوں، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی اس سے زیادہ میں کچھ کر سکتا ہوں۔ میرے جہاز میں پتوار نہیں ہیں۔ یہ موت کے اندرونی خطوں سے آنے والی ہواؤں کے زور پر چلتی ہے۔''

ابطال

ہمارا مختصر گاؤں سرحد پر واقع نہیں ہے، نہ اس کے قرب و جوار میں ہے۔ دراصل یہ سرحد سے اتنا دور ہے کہ شاید ہی ہمارے گاؤں کا کوئی فرد کبھی وہاں پہنچا ہو۔ راستے میں ویران پہاڑی علاقوں اور وسیع و عریض زرخیز میدانوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ اس راستے کے ایک حصے کا تصور ہی انسان کو تھکا دیتا ہے جب کہ باقی حصے کا تصور تو سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔ اس راستے میں کئی بڑے دیہات بھی ہیں جن میں سے ہر ایک ہمارے دیہات سے بڑا ہے۔ ہمارے دیہات جیسے دس چھوٹے دیہات ساتھ ساتھ واقع ہوں اور دس مزید ان سے آگے پھیلے ہوئے ہوں، تب بھی یہ ان بے انتہا پر ہجوم قصبوں میں سے کسی ایک کے برابر بھی نہیں ہو پائیں گے، اور اپنے حجم کے اعتبار سے انھیں نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔

لیکن کون سی جگہ ہمارے گاؤں سے سرحد تک کی دوری سے بھی زیادہ دور ہے۔ اگر ایسے فاصلوں کا آپس میں موازنہ کیا جا سکے تو یہ کچھ ایسی بات ہے کہ تین سو سال عمر کا انسان دو سال کی عمر کے انسان سے زیادہ عمر رسیدہ ہے، تو سرحد تک کی دوری سے بھی دور واقع ہے ملک کا دارالخلافہ۔ ہمیں گاہے بگاہے سرحدی جنگوں کی اطلاعات موصول ہوتی ہیں، لیکن دارالخلافہ سے کبھی کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ ہم کہ معزز شہری ہیں، ہمارے سرکاری حکام کے دارالخلافہ سے خوشگوار مراسم قائم ہیں۔ انھیں بھی وہاں سے، جیسا کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کم از کم تین مہینے پرانی خبریں موصول ہوتی ہیں۔

یہ ایک حیرت انگیز بات ہے اور میں مسلسل اس پر حیرت محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے گاؤں میں دارالخلافہ سے جاری ہونے والے تمام احکامات کو انتہائی عجز و انکساری کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔ صدیوں سے ہم شہریوں نے کسی سیاسی تبدیلی کو ممکن نہیں بنایا۔ دارالخلافہ میں بڑے حکمران ایک دوسرے کو تخت سے ہٹا کر اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ پورا شاہی خاندان معزول یا فنا کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ نیا خاندان تخت نشین ہو جاتا ہے۔ گزشتہ صدی میں دارالخلافہ کو ہی نیست و نابود کر دیا گیا تھا۔ پھر اس سے کافی پرے ایک نیا دارالخلافہ تعمیر کیا گیا۔ بعد میں اسے بھی تباہ کر دیا گیا اور پھر پرانے کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔

لیکن ان تمام انقلابات کا ہمارے مختصر گاؤں پر کبھی کچھ اثر نہیں ہوا۔ ہمارے سرکاری حکام ہمیشہ اپنے عہدوں پر فائز رہتے ہیں۔ اعلیٰ ترین افسران دارالخلافہ سے نامزد ہو کر آتے ہیں۔ اس سے کم درجہ کے افسر دوسرے قصبوں سے، اور نچلے درجے کے افسران ہم میں سے منتخب ہوتے ہیں۔ ایسا صدیوں سے ہوتا آیا ہے اور یہ ہمارے مزاج کے مطابق ہے۔

ہمارا اعلیٰ ترین افسر محصول کنندہ ہے۔ اسے کرنل کا درجہ حاصل ہے اور وہ اسی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ موجودہ کرنل ایک بوڑھا شخص ہے۔ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں کیوں کہ یہ تب سے اس عہدے پر ہے جب میں بچہ تھا۔ پہلے پہل اس نے بہت تیزی سے ترقی کی لیکن پھر وہ اس عہدے پر آ کر ٹھہر سا گیا۔ دراصل ہمارے مختصر گاؤں کے حوالے سے اس کا موجودہ عہدہ کافی ہے۔ اس سے بڑا عہدہ یہاں غیر ضروری ہوگا جب میں اس کا خاکہ ذہن میں لانے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ مارکیٹ اسکوائر میں اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھا ہوتا ہے، کرسی کی پشت سے ٹکا اور پائپ پیتا ہوا۔ اس کے اوپر چھت پر شاہی جھنڈا لہراتا ہے۔ برآمدے کے گرد، جو اتنا بڑا ہے کہ بعض اوقات چھوٹے پیادہ دستے یہاں سما جاتے ہیں، گیلے کپڑے سوکھنے کے لیے ٹنگے ہوتے ہیں۔ اس کے بچوں کے بچے خوبصورت ریشمی کپڑوں میں ملبوس اس کے گرد کھیلتے ہیں۔ انھیں نیچے مارکیٹ اسکوائر میں کھیلنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیوں کہ وہاں موجود بچے ان سے کم حیثیت تصور کیے جاتے ہیں لیکن اس کے بچوں کے بچے نیچے اسکوائر میں جانے پر اتاؤلے رہتے ہیں لہٰذا وہ برآمدے کے بیرونی جنگلے میں سر دیے نیچے تکتے ہیں اور جب وہاں بچے آپس میں لڑنا شروع کرتے ہیں تو وہ بھی لڑنے لگتے ہیں۔

اس کرنل کا حکم سارے قصبے میں چلتا ہے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ اس نے کبھی کوئی ایسی دستاویز دکھائی ہو جس سے اس کا اس عہدے پر فائز ہونا ثابت ہوتا ہو۔ قرین قیاس بات یہ ہے کہ اس کے پاس ایسی کوئی شے ہے ہی نہیں۔ شاید وہ واقعی اعلیٰ ترین افسر محصول کنندہ ہے۔ لیکن کیا ساری بات بس اتنی ہے؟ کیا اس سے اسے انتظامیہ کے تمام دوسرے شعبوں پر حکمرانی کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے؟ یہ درست ہے کہ حکومت کے لیے یہ عہدہ بہت اہم ہے لیکن شہریوں کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ یہاں قصبے میں یہی تاثر عام ہے جیسے لوگ یہ کہہ رہے ہوں ''تم نے ہماری ہر چیز پر اپنی ملکیت جمالی، سو اب ہمیں بھی اپنی ملکیت میں لو۔'' اصل میں کرنل وہ شخص نہیں ہے جس کے قبضے میں تمام اختیارات ہے نہ ہی وہ کوئی آمر ہے بلکہ ان

تمام برسوں میں یہ بات خود بخود مان لی گئی ہے کہ اعلیٰ ترین افسر محصول کنندہ خود بخود افسر اعلیٰ بھی ہے۔ اور اس بات کو کرنل بھی ویسے ہی قبول کرتا ہے جیسے ہم۔

چوں کہ وہ اپنی سرکاری حیثیت پر بہت زیادہ غرور کیے بغیر ہمارے درمیان رہتا ہے، اس لیے وہ عام شہری سے بہت مختلف ہے۔ جب ہمارا وفد کوئی درخواست لے کر اس کے پاس جاتا ہے تو وہ دنیا کی دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے پیچھے محض عدمیت ہوتی ہے۔ بعضوں کو اس کے پس منظر میں مختلف سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ لیکن یہ شاید ان کا التباس ہوتا ہے۔ بہرحال وہ ہر شے کے اختتام کا نمائندہ ہے، کم از کم ہمارے لیے۔

بچپن میں میں بھی شہریوں کے ایک وفد میں شامل تھا جو کرنل سے حکومتی امداد کے بارے میں معلوم کرنے گئے تھے کہ تب قصبے کا مفلس ترین حصہ جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔ میرا باپ، ایک لوہار، علاقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور اس وفد کا رکن تھا۔ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس معاملے میں کوئی بات غیر معمولی نہیں تھی لیکن ہر کوئی یہ تماشہ دیکھنے وہاں بھاگا چلا آیا۔ حتیٰ مجمع اور حقیقی وفد میں امتیاز کرنا ممکن نہیں رہا۔ چوں کہ عام طور پر ایسی استقبالی تقریب برآمدے میں ہوتی تھی، اس لیے لوگ بھاگ سیڑھیاں لگا کر مارکیٹ اسکوائر اوپر چلے آئے اور جنگلے کے ستونوں سے لگے اس کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔

اس موقع پر برآمدے کا تقریباً چوتھائی حصہ کرنل کے لیے مخصوص تھا۔ باقی حصے میں مجمع موجود تھا۔ چند سپاہی نگرانی پر مامور تھے، چند ایک کرنل کے گرد نصف دائرے میں کھڑے تھے۔ جیسی کہ ہماری ڈرپوک طبیعت تھی، ہمارے لیے ایک ہی سپاہی کافی تھا۔ میں صحیح طور پر نہیں جانتا کہ یہ سپاہی کہاں سے آئے تھے؟ بہر صورت لمبی مسافت طے کر کے آئے تھے۔ وہ سبھی ایک جیسے لگتے تھے۔ انھیں وردی کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پستہ قد تھے۔ مضبوط نہیں لیکن چست۔ ان کے جسم میں نمایاں بات جو دیکھنے والوں کو متوجہ کرتی، ان کے بڑے دانت تھے جنھوں نے ان کے پورے منہ کو ڈھانپ لیا تھا یا پھر ان کی مختصر آنکھوں کا مضطرب تناؤ تھا۔ ان سے بچے خوفزدہ ہو جاتے لیکن وہ ان کی تفریح کا باعث بھی تھے۔ بچے بار بار ان کے دانتوں اور آنکھوں سے خوف زدہ ہونے کی خواہش میں لپکے چلے آتے تاکہ دہشت سے بھاگ سکیں۔

حتیٰ کہ قصبہ کے بزرگ بھی اس بچگانہ خوف سے مبرا نہیں تھے۔ کم از کم ان میں اس کا شائبہ ضرور

موجود تھا تاہم اس خوف کے کئی دوسرے اسباب بھی تھے۔ ان سپاہیوں کی بولی ہمارے لیے بالکل اجنبی تھی۔ نہ ہی وہ ہماری بولی سے مانوس ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ ان میں ایسی علیحدہ پسندانہ، ناقابل رسائی ہونے کی خصوصیت پیدا کرتا تھا جو ان کی شخصیت کے موافق تھی۔ اصل میں وہ خاموش طبع، سنجیدہ اور تلخ لوگ تھے۔

ان سے یوں تو کوئی برائی منسوب نہیں تھی لیکن وہ برائی کے معنوں میں تقریباً ناقابل برداشت تھے۔ مثال کے طور پر ایک سپاہی کسی دکان میں داخل ہوتا ہے۔ کوئی معمولی شے خریدتا ہے اور کاؤنٹر پر جھک کر کھڑا رہتا ہے۔ وہ ہماری بات چیت سنتا ہے۔ غالباً اسے کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا لیکن ایسا تاثر دیتا ہے جیسے سب سمجھ رہا ہو۔ خود وہ ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔ بس خالی آنکھوں سے بولنے والے کو تکتا ہے پھر سامعین کی طرف مڑ جاتا ہے جب کہ اس دوران میں اس کا ہاتھ برابر اپنی پیٹی میں لگے لمبے چاقو کی موٹھ پر جما رہتا ہے۔ انتہائی بے زار کن، کہ انسان بات کرنے کی خواہش ہی کھودے۔ گاہک دکان سے رخصت ہونے لگتے ہیں اور جب وہ بالکل خالی ہو جاتی ہے تو سپاہی بھی چلا جاتا ہے۔

لہٰذا جہاں کہیں کوئی سپاہی نمودار ہو، ہمارے زندہ دل لوگ خاموش ہو جاتے ہیں اور یہی کچھ تب بھی ہوا۔ جیسا کہ ایسے رسمی مواقع پر ہوتا ہے، کرنل مجمع کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اپنے سامنے دونوں ہاتھوں میں بانس کی چھڑیاں پکڑے ہوئے۔ یہ ہماری قدیم روایت ہے جس کا مطلب کم وبیش یہ ہے کہ وہ قانون کا رکھوالا ہے۔ بیشک سبھی جانتے ہیں کہ برآمدے میں کیا متوقع ہو سکتا ہے لیکن ہر مرتبہ لوگ اس سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر بھی درخواست پیش کرنے کے لیے منتخب کیا گیا شخص کچھ بول ہی نہیں سکا۔ وہ ابھی کرنل کے سامنے کھڑا ہی ہوا تھا کہ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ چند معذرتیں پیش کرنے کے بعد وہ تیزی سے مجمع میں سے راستہ بناتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس کام کے لیے کوئی بھی دوسرا موزوں شخص تلاش نہ کیا جا سکا جب کہ ناموزوں امیدواروں کی ایک بڑی تعداد نے اپنی خدمات پیش کیں۔ مجمع میں کھلبلی مچ گئی اور قاصدوں کو ایسے شہریوں کی تلاش میں روانہ کیا گیا جو اپنی چرب زبانی کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔

اس تمام دورانیہ میں کرنل وہاں بے حرکت کھڑا رہا۔ صرف اس کی چھاتی سانس کے زیر و بم سے پھول اور پچک رہی تھی۔ اس واسطے نہیں کہ وہ سانس لینے میں دشواری محسوس کر رہا ہے بلکہ وہ ایسے بین انداز میں سانس لے رہا ہے جیسے مینڈک سانس لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے لیے یہ سب معمول کا حصہ تھا

لیکن یہاں یہ غیر معمولی بات تھی۔ میں نے اپنے بڑوں کے درمیان خود کو گھسیڑ لیا اور دو سپاہیوں کے درمیان موجود خلا میں سے اسے دیکھا حتی کہ ان میں سے ایک نے اپنے گھٹنے سے ٹھوکر ماری۔

اسی اثناء میں درخواست گزاری کے لیے منتخب کیے گئے شخص نے اپنے حواس بحال کیے اور دو ساتھی شہریوں کے سہارے سیدھا کھڑا ہو کر وہ اپنی تقریر کرنے لگا۔ یہ دیکھنا ایک اذیت دہ بات ہے کہ وہ شہریوں کی المناک صورت حال کو بیان کرتے ہوئے اپنے رسمی خطاب کے دوران مسلسل مسکراتا رہا۔ ایسی انتہائی عاجزانہ مسکراہٹ جو کرنل کے چہرے پر معمولی ردعمل پیش کرنے میں بھی ناکام رہی۔ آخر کار اس نے درخواست پیش کی۔ میرے خیال میں وہ محض اس سال کے محصول ہی میں چھوٹ سے متعلق نہیں پوچھ رہا تھا بلکہ شاہی جنگلات کی عمدہ لکڑی کی ارزاں نرخوں پر دستیابی کی درخواست بھی کر رہا تھا۔ پھر وہ نیچے جھکا، کچھ دیر اسی حالت میں رہا جیسا کہ کرنل کے سوا ہر شخص نے کیا، سپاہی، اور پس منظر میں کھڑے چند افسر۔

ایک بچے کے لیے یہ بات بہت مضحکہ خیز تھی کہ سیڑھیوں پر موجود لوگوں کو صرف چند قدم نیچے اترنے کی ضرورت تھی تاکہ کسی اہم وقفے کے دوران کرنل کی نظروں میں نہ آئیں اور وقفے وقفے سے برآمدے کے فرش پر نگاہ ڈال لیا کریں۔ اس واقعہ کے کچھ دیر بعد ایک پست قد افسر کرنل تک آیا اور اپنے پنجوں پر اونچا ہوتے ہوئے اس کے قد کے برابر ہونے کی کوشش کی۔ کرنل جو اپنے گہرے کے سوا بالکل ساکت کھڑا تھا، نے اس کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ پستہ قد افسر نے ہاتھوں سے تالی بجائی اور تمام مجمع بلند ہو گیا۔ اس نے اعلان کیا ''آپ کی درخواست مسترد کر دی گئی ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔''

پورے مجمع میں طمانیت کی ناگزیر لہر دوڑ گئی۔ ہر فرد باہر چلا گیا، ان میں سے کوئی ایک بھی اب کرنل کی طرف متوجہ نہیں تھا جو اب پھر سے دوسرے انسانوں جیسا ہی ایک انسان بن چکا تھا۔ میں نے آخری بار اس کی ایک جھلک دیکھی۔ اس نے تھکاوٹ سے چور ہو کر دونوں چھڑیاں چھوڑ دیں جو زمین پر گر گئیں اور پھر خود ایک آرام کرسی میں دراز ہو گیا جسے ایک افسر نے اسے پیش کیا تھا، اور فوراً ہی پائپ منہ میں لے کر تمباکو پینے لگا۔

یہ تمام واقعہ ہمارے روزمرہ معمولات سے ہٹ کر نہیں ہے۔ یہ عمومی واقعات جیسا ہی ایک واقعہ ہے۔ بے شک کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ معمولی درخواستیں قبول کر لی جاتی ہیں لیکن تب واقعتاً ایسا لگتا ہے جیسے کرنل نے ایسا ایک طاقت نجی انسان کی حیثیت سے اپنی ذاتی ذمہ داری پر کیا ہو، اور اسے حکومت

سے صیغہ راز ہی رکھنا چاہیے۔ نہ ہی کھلم کھلا تذکرہ کیا جائے، بلکہ یہ سب ایسا ہے جیسا یہ محسوس ہوتا ہے۔ بے شک ہمارے چھوٹے قصبے میں کرنل کی آنکھیں، جیسا کہ ہمیں علم ہے، حکومت ہی کی آنکھیں ہیں لیکن پھر بھی ان میں کچھ ایسا فرق ہے جسے مکمل طور پر سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

تمام اہم امور میں ایسا ہوسکتا ہے کہ شہریوں کو انکار کر دیا جائے۔ اور اب ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس تردید کے بغیر کسی کے لیے آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم یہ سرکاری کارروائیاں، جنھیں اس تردید کے لیے بطور خاص ترتیب دیا جاتا ہے، ہمارے لیے محض رسمی کارروائیاں بن کر رہ گئی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہمارا وفد پوری توقع اور پوری سنجیدگی کے ساتھ وہاں جاتا ہے اور پھر لوٹ آتا ہے کہ جیسے صحیح طور پر مضبوط یا خوش ہوکر نہیں اور نہ ہی مایوسی یا تھکاوٹ کے ساتھ۔ ان باتوں سے متعلق مجھے کسی کی رائے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں انھیں اپنے اندر محسوس کرتا ہوں، جیسا کہ کوئی بھی دوسرا فرد محسوس کرتا ہوگا، نہ ہی مجھے کوئی شدید خواہش ہے یہ جاننے کی کہ یہ چیزیں کیوں کر باہم مربوط ہیں۔

میرے مشاہدے کے مطابق حقیقت امر یہ ہے کہ ایک مخصوص عمر کے لوگوں کا گروہ اس صورت حال سے مطمئن نہیں ہے۔ یہ بمشکل سترہ سے بیس برس کے نوجوان ہیں۔ بالکل ہی ناسمجھ نوجوان جو حتی کہ انتہائی کم اہم، قطعاً غیر انقلابی خیال کے نتائج کا بھی قبل از وقت ادراک کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ اور صرف انھی کے درمیان یہ بے اطمینانی اپنی جڑیں گہری کر رہی ہے۔

ڈولچی سوار

کوئلہ سبھی ختم ہوگیا۔ ڈولچی خالی ہے۔ بیلچہ بے کار۔ چولہا ٹھنڈ اُگل رہا ہے۔ کمرہ یخ ہورہا ہے۔ کھڑکی سے باہر درخت کھردرے، برف سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ آسمان، ہراس شخص کے لیے چاندی کی ایک ڈھال، جواس کی طرف مدد کے لیے دیکھتا ہے۔

میرے پاس کوئلے ہونے چاہئیں۔ میں سردی سے مرنا نہیں چاہتا۔ میرے پیچھے بے رحم چولہا ہے، میرے سامنے بے رحم آسمان۔ مجھے ان دونوں کے درمیان اس مشکل کا حل نکالنا اور کوئلے کے بیوپاری سے مدد مانگنے کے سفر پر روانہ ہونا ہے۔ لیکن وہ ہم جیسوں کی درخواست کو کسی خاطر میں نہیں لاتا۔ مجھے ناقابل تردید انداز میں اُسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ میرے پاس کوئلے کا ایک ٹکڑا بھی نہیں بچا اور یہ کہ وہ میرے لیے سورج پر چمکتا سورج ہے۔ مجھے وہاں ایک گداگر کی صورت جانا چاہیے جو اپنے گلے میں بلند ہوتے موت کے غرغرے کے ساتھ دروازے کی سیڑھیوں پر ہی مرجانا چاہے اور جسے امیر شخص کا خانسامہ تنگ آکر کافی کے برتن کی باقیات دینے کا فیصلہ کرلے۔ یوں ہوسکتا ہے کہ کوئلے کا بیوپاری طیش

میں آ کر اور اس مقدس حکم کا پاس کرتے ہوئے کہ 'کسی کو مت مارو' بیلچے میں کوئلے بھرے اور میری ڈولچی میں ڈال دے۔

میرے وہاں پہنچنے کا انداز ہی فیصلہ کن کردار ادا کرے گا لہٰذا میں ڈولچی پر سوار ہو کر جاؤں گا۔ ڈولچی پر بیٹھے ہوئے، میرے ہاتھ اس کے دستے پر ہوں گے، سادہ ترین قسم کی لگام۔ میں خود کو بدقت زینے سے نیچے دھکیلتا ہوں۔ لیکن ایک بار جب میری ڈولچی نیچے اترتی ہے، تو نہایت شان دار، نہایت شان دار۔ زمین پر عاجزی سے بیٹھا ہوا اونٹ ساربان کی چھڑی کھا کر اتنے وقار سے نہیں اٹھتا ہوگا جتنی متانت سے میری ڈولچی زمین سے بلند ہوتی ہے۔ برف سے ڈھکی ہوئی گلیوں میں ہم باقاعدہ رفتار سے اڑتے ہیں۔ اکثر میں اتنی اونچی جست کرتا ہوں کہ کسی مکان کی پہلی منزل تک جا پہنچتا ہوں۔ تاہم کبھی اتنا نیچے نہیں آتا کہ کسی گھر کے دروازے کو چھولوں۔ آخر کار میں غیر معمولی بلندی پر بہتا ہوا بیوپاری کے محراب دار تہہ خانے کے اوپر پہنچ جاتا ہوں جسے میں بہت نیچے اپنے میز پر جھکا ہوا دیکھتا ہوں۔ وہ کچھ لکھ رہا ہے۔ اس نے تہہ خانے کا دروازہ کھول رکھا ہے تاکہ اضافی حرارت باہر خارج ہو سکے۔

''کوئلے کے بیوپاری'' میں ایسی آواز میں چلاتا ہوں جو ٹھنڈ سے کھوکھلی اور میرے ہی سانسوں سے بننے والے بادل میں ضم ہو چکی ہے۔ ''براہ کرم، بیوپاری مجھے کچھ کوئلے دو۔ میری ڈولچی اتنی ہلکی ہے کہ میں اس پر سواری کر سکتا ہوں۔ مہربانی کرو۔ میرے پاس پیسے ہوں گے تو میں تمھیں ادا کر دوں گا۔''

بیوپاری اپنے ہاتھ کان پر رکھ لیتا ہے ''کیا میں نے کچھ سنا؟'' وہ اپنے کندھوں سے پیچھے اپنی بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کرتا ہے ''کیا میں نے کچھ سنا؟ کوئی گاہک؟''

''مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا'' اس کی بیوی سکون سے سانس لیتے ہوئے جواب دیتی ہے جبکہ سلائیوں سے بُنائی کرتے ہوئے اس کی پشت آتش دان کی حرارت سے خوب گرم ہے۔

''اوہ، ہاں۔ تمھیں میری بات سنی ہو گی''۔ میں چلایا ''یہ میں ہوں۔ تمھارا پرانا گاہک۔ قابل اعتماد اور مخلص۔ صرف اس وقت لاچار ہوں۔''

''بیگم'' بیوپاری کہتا ہے۔ ''ضرور کوئی ہے۔ میرے کان مجھے اتنا واضح دھوکا نہیں دے سکتے۔ یہ کوئی بہت پرانا گاہک ہے۔ جس کی بات کا میرے دل پر اثر ہوا ہے۔''

''تمھارا مسئلہ کیا ہے، بوڑھے آدمی''۔ اس کی بیوی فوری طور پر کام سے ہاتھ روکتے اور اون

سلائیوں کو اپنی چھاتی سے بھینچتے ہوئے کہتی ہے۔ ''کوئی نہیں ہے۔ گلی بالکل خالی ہے۔ ہمارے تمام گاہکوں کے پاس بہت کوئلے موجود ہیں۔ ہم چاہیں تو اگلے کئی دن اپنی دکان بند کر کے آرام کر سکتے ہیں۔''

''لیکن میں یہاں اوپر ڈولچی پر سوار ہوں۔'' میں چلاتا ہوں اور میرا جسم بے حس ہو چکا، جمے ہوئے آنسو میری آنکھوں کے سامنے منظر کو دھندلا رہے ہیں ''مہربانی کر کے اوپر دیکھو، صرف ایک مرتبہ۔ میں تمھیں صاف دکھائی دوں گا۔ میں التجا کرتا ہوں۔ صرف ایک بیلچہ بھر کوئلے۔ اور اگر تم مجھے اس سے بھی کچھ زیادہ دو تو میں اتنا خوش ہوں گا کہ معلوم نہیں پھر کیا کر بیٹھوں۔ باقی سبھی گاہکوں کے پاس کوئلے موجود ہیں۔ اوہ کاش میں اپنی ڈولچی بھی کوئلوں کے گرنے کا شور سن سکوں۔''

''میں آرہا ہوں'' بیوپاری کہتا ہے اور اپنی چھوٹی ٹانگوں سے تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھتا ہے۔ لیکن اس کی بیوی اس کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ اسے بازو سے پکڑ کر روکتی اور کہتی ہے ''یہیں ٹھہرو۔ تم اتنے وہمی ہو کہ مجھے خود ہی اوپر جانا پڑے گا۔ یاد نہیں، رات کتنی بری طرح کھانس رہے تھے۔ اب ایک گاہک کے لیے جو محض تمھارا واہمہ ہے، تم اپنی بیوی اور بچوں کو فراموش کرنے اور اپنے پھیپھڑوں کی قربانی دینے پر تیار ہو۔ میں خود اوپر جاؤں گی۔''

''تو پھر ضرور اسے ہمارے پاس موجود ہر قسم کے کوئلے کے بارے میں بتانا۔ پوچھتی رہنا، میں قیمت بتاتا رہوں گا۔''

''ٹھیک ہے''۔ اس کی بیوی جست لگا کر گلی میں آتے ہوئے کہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ پہلی ہی نظر میں مجھے دیکھ لیتی ہے۔ ''محترمہ کوئلہ فروش'' میں پکار کر کہتا ہوں، ''میرا اسلام قبول کیجئے۔ بس ایک بیلچہ بھر کوئلہ۔ ادھر میں ڈولچی میں۔ میں اسے خود ہی گھر لے جاؤں گا۔ ایک بیلچہ آپ کے پاس سب سے برے کوئلے کا۔ میں اس کی پوری قیمت ادا کروں گا۔ بے شک، لیکن ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔'' کیسی ماتمی جرس جیسی آواز تھی ان الفاظ ''لیکن ابھی نہیں'' کی، اور کیسے بری طرح یہ قریبی گرجا گھر کے مینار میں بجتے شام کے گھنٹے کی آواز میں ضم ہو گئے۔

''تو کیا چاہتا ہے وہ'' بیوپاری چلا کر پوچھتا ہے۔

''کچھ نہیں'' اس کی بیوی جواب میں چلاتی ہے۔ ''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ مجھے نہ تو کچھ دکھائی دے

رہا ہے۔ نہ کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ صرف چھ کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ اب ہمیں دکان بند کر دینی چاہیے۔ سردی بہت شدید ہے۔ کل بھی لگتا ہے بہت سا کام کرنے کو ہوگا۔''

اسے کچھ سنائی دیتا ہے، نہ کچھ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگلے لمحے وہ اپنے پیش بند کے فیتے کھولتی ہے اور پیش بند کو فضا میں جھٹکتے ہوئے مجھے ہشکارتی ہے۔ بدقسمتی سے وہ کامیاب ہو جاتی ہے۔ میری ڈولچی میں قوت مدافعت کے سوا ایک اچھے جنگلی گھوڑے کے جملہ اوصاف موجود ہیں۔ لیکن یہ قوت اس میں نہیں ہے۔ یہ قوت اتنی کم ہے، کہ محض ایک عورت کا پیش بند اسے فضا میں پرے اڑ جانے پر مجبور کر سکتا ہے۔

'تم مکار عورت''۔ میں گردن موڑ کر چلاتا ہوں۔ جب کہ وہ دکان میں داخل ہوتے ہوئے نیم حقارت، نیم اعتماد کے ساتھ اپنا گھونسہ فضا میں لہراتی ہے۔ ''تم مکار عورت۔ میں نے تم سے صرف ایک بیلچہ بھر چورا مانگا تھا اور تم سے یہ بھی نہ ہوا۔'' اور اس کے ساتھ میں برفیلے پہاڑوں کے خطے کی طرف بلند ہو جاتا اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا ہوں۔

ہمارے ضابطہ قانون کے اسقام

ہمارے ضابطہ قوانین کے بارے میں عمومی طور پر لوگ نہیں جانتے تھے۔ اسے ہم پر حکومت کرنے والا اشرافیہ کا مختصر گروہ ہم سے پوشیدہ رکھتا ہے۔ ہم قائل ہو چکے ہیں کہ یہ قدیم قوانین پورے حزم واحتشام سے نافذ العمل ہیں۔ لیکن یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ انسان ایسے قوانین کا پابند ہو جن سے اسے کچھ آگاہی نہ ہو۔ مجھے ان ممکنہ اختلافات کی فکر نہیں ہے جو قوانین کی مختلف وضاحتوں سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ نہ ہی ان قباحتوں کا ذکر کروں گا جو سب کی بجائے محض چند افراد کو ایسی وضاحت کا حق دینے میں مضمر ہیں۔ یہ قباحتیں شاید چنداں اہم نہیں ہیں۔ یہ قوانین بہت قدیم ہیں۔ ان کی توضیح وتصریح کرنا بجائے خود صدیوں کا عمل ہے اور بلاشبہ خود قانون کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

اور اگرچہ توضیح کرنے کی کچھ ممکنہ آزادی ابھی تک باقی ہے، لیکن اصل میں یہ بہت محدود ہو چکی ہے۔ مزید یہ کہ اس بات میں کوئی منطق دکھائی نہیں دیتی کہ اشرافیہ کا گروہ ان قوانین کی توضیح کرنے کے عمل میں ان ذاتی مفادات سے متاثر ہوں جو ہمارے لیے غیر دوستانہ ہیں۔ اصل میں یہ قوانین ابتدا سے اس طبقہ کی مراعات کے تحفظ کے لیے ہی وضع کیے گئے تھے۔ وہ خود ان قوانین سے ماورا ہیں اور اسی لیے لگتا ہے کہ کیوں ان قوانین کو کلیتاً انھی کی صوابدید پر چھوڑا گیا؟ بے شک اس میں حکمت موجود ہے کہ تو کون

ان قدیم قوانین کی حکمت سے انکار کرتا۔لیکن ان میں ہمارے لیے دشواری بھی ہے جو غالباً ناگزیر ہیں۔

ان قوانین کا وجود بجائے خود ایک مفروضہ ہی ہے۔ایک روایت کے مطابق یہ قوانین موجود ہیں اور یہ ایسا راز ہیں جسے اشرافیہ کو سونپا گیا ہے۔لیکن یہ محض ایک روایت نہیں ہے، اور نہ ہوسکتی ہے جسے قدیم ہونے کی وجہ سے قبولیت ملی ہو، کیوں کہ ایک خفیہ ضابطے کا جوہر یہ ہے کہ یہ راز ہی رہے۔ہم میں سے چند ایک نے ابتدائی دور سے ہی اشرافیہ کی حرکات وسکنات پر گہری نگاہ رکھی اور ان کے پاس ہمارے آباؤ اجداد کے تیار کردہ ریکارڈز موجود ہیں۔ایسے ریکارڈز جن میں ہم پوری ایمان داری کے ساتھ کام جاری رکھا ہے۔اور یہ لوگ ان بے شمار حقائق وشواہد کی بنیاد پر ایسے مخصوص بنیادی میلانات کی دریافت کا دعویٰ کرتے ہیں جو مختلف تاریخی مفروضوں کو تقویت دیتے ہیں۔لیکن جب کبھی ہم ان متدیّن انداز میں بنائے گئے اور منطقی انداز میں ترتیب دیے ہوئے نتائج کی مطابقت سے حال اور مستقبل میں اپنی صحیح ترین حالت کے تعین کی کوشش کرتے ہیں تو ہر شے بے یقینی پن کا شکار ہوجاتی ہے اور ہماری یہ سرگرمی ہمیں محض ایک ذہنی عیاشی معلوم ہوتی ہے۔کیوں کہ شاید یہ قوانین، جن کی ہم گتھیاں سلجھانے کی کوشش کررہے ہیں، سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔

ہم میں سے ایک گروہ حقیقتاً اسی رائے کا حامل ہے اور وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اگر واقعی کوئی قانون موجود ہے تو وہ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ 'قانون وہی ہے جو اشرافیہ کرتے ہیں'۔اس گروہ کو ہر طرف اشرافیہ کی استبدادی سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں اور وہ اس معروف روایت کا ابطال کرتا ہے جو ان کے مطابق مخصوص معمولی اور اتفاقی فوائد کی حامل ہے جو اس کے انتہائی مضر پہلوؤں کا مداوا نہیں کرتے۔ کیوں کہ یہ روایت درپیش ہونے والے متوقع حادثات کے خلاف عوام کو ایک جھوٹی، گمراہ کن اور بے جا پر اعتماد ضمانت فراہم کرتی ہے۔اس نقطہ نظر پر شک نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ عوام کی اکثریت اسے اس وجہ سے اہمیت دیتی ہے کہ یہ روایت ابھی بہت زیادہ ادھورے پن کا شکار ہے اور اس پر مکمل تحقیق ہونا ابھی باقی ہے، کہ دستیاب شدہ مواد، جو بظاہر ضخیم معلوم ہوتا ہے، اس حوالے سے نہایت ناکافی ہے اور یہ اس کے مناسب حد تک مکمل ہونے میں متعدد صدیاں بیت جائیں گی۔

یہ نقطہ نظر ہمارے 'حال' کی مناسبت سے تو انتہائی غیر تسلی بخش ہے، لیکن اس عقیدے نے اسے کچھ آرام دہ بنایا کہ آخر کار ایک ایسا وقت آئے گا جب یہ روایت اور اس سے متعلق ہماری تحقیق مشترکہ

طور پر ایک نتیجہ تک پہنچ جائے گی اور جب ہر حقیقت کے اظہر من الشمس ہو جانے کے بعد سکون کا وقفہ آئے گا تو قانون عوام کی تحویل میں آجائے گا اور اشرافیہ منظر سے غائب ہو جائے گی۔ یہ نظریہ قطعاً اشرافیہ سے کسی طرح کی نفرت کے سبب قائم نہیں کیا گیا، بالکل نہیں، اور کسی نے بھی ایسا نہیں سوچا۔

ہم اپنے آپ ہی سے نفرت کا شدید رجحان رکھتے ہیں کیوں کہ ہم ہنوز خود کو ان قوانین کی ملکیت کے اہل ثابت نہیں کر پائے۔ یہی اصل وجہ ہے کہ کیوں وہ گروہ، جس کا اعتقاد ہے کہ قانون کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے، اتنا محدود ہو گیا ہے۔ حالاں کہ اس کا نظریہ خاص اعتبار سے بہت دلچسپ ہے۔ کیوں کہ یہ واضح انداز میں اشرافیہ اور اس کے حق کے دوام کو تسلیم کرتا ہے۔

درحقیقت اس مسئلہ کو ایک مسئلہ تناقض کی صورت میں ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔ کوئی گروہ، جو نہ صرف ان قوانین پر تمام عقیدے کا، بلکہ بجائے خود اشرافیہ کا بھی ابطال کرے، فوراً تمام عوام کی پشت پناہی حاصل کر لے گا۔ لیکن ایسا کوئی گروہ کبھی وجود میں نہیں آسکتا کیوں کہ کوئی اشرافیہ کے ابطال کی جرأت نہیں کرے گا۔ ہم اس استرے کی دھار پر کھڑے ہیں۔ کسی مصنف نے اس معاملے کا لب لباب یوں بیان کیا تھا ''واحد صریحی اور مسلمہ قانون، جو ہم پر نافذ کیا گیا ہے، اشرافیہ ہی ہے۔ تو کیا ہم خود کو اس ایک قانون سے بھی محروم کر لیں؟''

حویلی کے دروازے پر دستک

یہ موسم گرما تھا، ایک گرم دن۔ اپنی بہن کے ساتھ میں گھر جاتے ہوئے ایک بہت بڑے گھر کے دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ اس نے دروازے پر دستک شرارتاً دی تھی یا غیر حاضر دماغی کی وجہ سے، یا محض اپنے گھونسے سے ایسا ارادہ ظاہر کیا تھا اور دروازہ کھٹکھٹایا نہیں تھا۔ اسی راستے پر سو قدموں کے فاصلے پر کہ جہاں یہ بائیں جانب مڑ جاتا تھا، گاؤں کی حدود شروع ہوتی تھیں۔

ہم اس گاؤں سے واقف نہیں تھے لیکن جونہی ہم پہلے گھر سے ذرا آگے بڑھے، اردگرد سے لوگ نمودار ہوئے اور دور سے ہی دوستانہ یا تنبیہی انداز میں ہمیں اشارے کرنے لگے۔ وہ خود بھی بری طرح خوفزدہ تھے اور خوف کے مارے دہرے ہوئے جاتے تھے۔ وہ سب ایک ساتھ جاگیردار کے گھر کی جانب اشارہ کر رہے تھے جس کے قریب سے ہم گزر کر آئے تھے اور ہمیں اس کے دروازے پر دی جانے والی دستک یاد دلا رہے تھے۔ حویلی کا مالک ہم پر اس دستک کا الزام دھرے گا اور فوراً ہی معاملے کی تحقیق شروع ہو جائے گی۔

میں بالکل پرسکون رہا اور اپنی بہن کو بھی متوقع خطرات کے مقابلے میں پرسکون رکھنے کی کوشش

کرتا رہا۔شاید اس نے سرے سے دستک ہی نہیں دی تھی اور اگر کوئی دستک ہوئی بھی تھی تو دنیا کے کسی قانون کے تحت اسے جرم ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اردگرد کھڑے لوگوں پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے بغور میری باتیں سنیں لیکن کوئی رائے دینے سے مکمل اجتناب کیا۔بعد میں انھوں نے بتایا کہ نہ صرف میری بہن بلکہ اس کا بھائی ہونے کے ناطے میں بھی اس جرم میں دھرلیا جاؤں گا۔میں نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

ہم سب حویلی کی جانب تکنے لگے جیسے فاصلے سے اٹھتے دھویں کے بادلوں کو دیکھا جائے اور پھر شعلے بلند ہونے کا انتظار کیا جائے۔عین اسی لمحے ہم سب نے واضح طور پر دیکھا کہ چند گھڑسوار حویلی کے دروازے میں داخل ہوئے۔گرد کا بادل اٹھا، ہر شے کو اپنی اوٹ میں لیتا ہوا، جب کہ صرف لمبے نیزوں کی انیاں دور سے چمک دکھا رہی تھیں۔حویلی کے صحن میں غائب ہوتے ہی جیسے انھوں نے گھوڑوں کا رخ پھیرا اور اب وہ ہماری طرف ہی بڑھ رہے تھے۔

میں نے اپنی بہن سے اصرار کیا کہ وہ گھر چلی جائے۔میں تنہا یہاں تمام معاملات کو سنبھال لوں گا لیکن وہ مجھے چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہ ہوئی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اسے کم از کم اپنا لباس ضرور تبدیل کر لینا چاہیے تا کہ ایک بہتر حلیے میں ان لوگوں کے سامنے پیش ہو۔آخر اس نے میری بات مان لی اور ہمارے گھر کی جانب طویل راستے پر روانہ ہو گئی۔اسی دوران میں وہ گھڑسوار ہم تک آ پہنچے تھے اور گھوڑوں سے اترے بغیر ہی انھوں نے میری بہن کے بارے میں سوال کیا۔

'وہ اس وقت یہاں نہیں ہے۔' یہ میرا واضح جواب تھا 'لیکن کچھ دیر میں آ جائے گی'' انھوں نے بے اعتنائی کے ساتھ میرا جواب سنا گویا ان کے لیے فی الوقت سب سے اہم بات یہی تھی کہ انھوں نے مجھے ڈھونڈ لیا۔

اس گروہ کے اہم اراکین میں معلوم ہوتا تھا کہ ایک تو خوش اخلاق نوجوان تھا جو ایک منصف تھا، اور دوسرا اس کا خاموش طبع معاون جس کا نام ایس مان تھا۔ مجھے حکم دیا گیا کہ فارم ہاؤس تک چلوں۔اپنے سر کو خفیف انداز میں حرکت دیتے اور اپنی پتلون کو اوپر کھینچتے ہوئے میں نے چلنا شروع کیا، جب کہ وہ گروہ تیز نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے اب بھی ایک حد تک یقین تھا کہ خود کو، شہر کے ایک معزز باشندے کو بے گناہ ثابت کرنے اور ان دیہاتی لوگوں سے باعزت رہائی پانے کے لیے بس بات چیت

ہی کافی ہوگی۔ لیکن جب میں سرائے کی دہلیز پر پہنچا، تو جج نے جو عجلت میں وہاں پہنچ گیا اور میری راہ دیکھ رہا تھا، بولا، ''اس شخص کا مجھے واقعی افسوس ہے''

اب صورت حال تمام تر شک وشبہ سے بالاتر تھی کہ اس بات سے اس کی مراد میری موجودہ حالت نہیں تھی، بلکہ اس کا اشارہ میرے ساتھ آئندہ ہونے والے متوقع واقعات کی طرف تھا۔

سرائے کا یہ خلوت خانہ اپنے اندرونی حلیے سے جیل کی کوٹھڑی معلوم ہوتا تھا۔ فرش پتھر کی بڑی بڑی سلوں سے بنایا گیا تھا۔ دیواریں ساہ اور برہنگی کی حد تک غیر آراستہ تھیں اور ان میں سے ایک میں ایک آہنی چھلا نصب کیا گیا تھا، ایک ایسی شے کے درمیان میں جو نصف بڑے گدے اور نصف آپریشن تھیٹر میں استعمال ہونے والی بڑی میز سے مشابہ تھی۔

کیا میں اب جیل کے علاوہ کسی بھی دوسرے ماحول میں رہ پاؤں گا؟ یہ ایک بڑا سوال ہے یا یہ ایسا ہوگا گر مجھے اب بھی اپنے رہا ہونے کی کچھ اُمید ہو۔

فوجیوں کی جبری بھرتی

فوجیوں کی جبری بھرتی، جو کبھی نہ ختم ہونے والی سرحدی جنگوں کے باعث اکثر ضروری ہو جاتی ہے، یوں عمل میں آتی ہے۔

احکامات جاری ہوتے ہیں کہ ایک خاص دن قصبے کے ایک خاص حصے کے تمام باشندے، مرد، عورتیں اور بچے بلا استثنا اپنے گھروں میں رہیں۔ عموماً دوپہر کے وقت جبری بھرتی کا مہتمم ایک نوجوان گاؤں کے اس حصے میں داخل ہوتا ہے جہاں پیدل اور سوار دونوں قسم کی فوج کے دستے صبح تڑکے سے اس کے منتظر ہوتے ہیں۔

وہ ایک نوجوان شخص ہے، چھریرا بدن، دراز قد نہیں، کمزور، بے پروائی سے کپڑے پہنے ہوئے، آنکھوں میں تھکن، بخار کی کپکپاہٹ کی طرح گہرے اضطراب کی لہریں ایک تسلسل سے اس کے جسم میں سے گزرتی معلوم ہوتیں۔ کسی کی طرف دیکھے بغیر وہ چابک سے اشارہ کرتا ہے جو اس کا واحد ہتھیار ہے۔ متعدد سپاہی اس کی سرکردگی میں آگے بڑھتے اور پہلے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔

ایک سپاہی، جو ذاتی طور پر گاؤں کے اس حصے کے باسیوں سے واقف ہے، گھر کے مکینوں کے ناموں کی فہرست پڑھتا ہے۔ حکم کے بموجب سب گھر پر موجود ہیں، کمرے میں ایک قطار میں کھڑے اور معزز افسر پر نظریں جمائے ہوئے جیسے وہ سب اس کے دستے میں شامل فوجی ہوں۔ تاہم ایسا ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھار وہاں کوئی فرد، جو ہمیشہ مرد ہوتا ہے، غیر حاضر ہو۔ اس صورت میں کوئی اس کے لیے عذر پیش کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ جھوٹ بولنا تو الگ۔ سب خاموش، سبھی نظریں جھکی ہوئیں، اس حکم

کا دبدبہ، جسے ماننے سے گھر کے کسی فرد نے انکار کیا، قریب قریب نا قابل برداشت ہے لیکن اس معزز افسر کی خاموش موجودگی وہاں ہر شخص کو اپنی جگہ بے حرکت کھڑے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔

معزز افسر ایک اشارہ کرتا ہے جو سر کی جُنبش نہیں ہوتی بلکہ اسے صرف اس کی آنکھوں سے پڑھا جا سکتا ہے۔ فوراً دو سپاہی غیر حاضر شخص کی کھوج شروع کر دیتے ہیں۔ یہ قطعاً مشکل کام نہیں ہے۔ وہ کبھی گھر سے باہر نہیں جاتا، نہ ہی کبھی فوجی ملازمت سے فرار کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یہ محض خوف ہے جو اسے ظاہر ہونے سے محترز رکھتا ہے، لیکن یہ بجائے خود فوجی ملازمت کا خوف نہیں ہوتا جو اسے چھپنے پر مجبور کرتا ہے بلکہ یہ خود کو ظاہر کرنے کی عمومی ہچکچاہٹ ہوتی ہے کیوں کہ سرکاری حکم اس کے لیے اس درجہ محترم، خوف ناک حد تک عظیم ہوتا ہے کہ وہ خود کو پیش کیے جانے کے اہل محسوس نہیں کرتا۔ اسی باعث وہ فرار نہیں ہوتا بلکہ محض چھپ جاتا ہے اور پھر یہ جاننے پر کہ معزز افسر گھر میں موجود ہے، وہ اپنی جگہ سے نکل آتا اور سرکتا ہوا کمرے کے دروازے تک پہنچ جاتا ہے جہاں وہ فوراً ہی اس کی تلاش میں نکلے ہوئے سپاہیوں کے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے۔

اسے معزز افسر کے سامنے لایا جاتا ہے جو دونوں ہاتھوں میں چابک پکڑے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ اس قدر نحیف ہے کہ اسے ایک ہاتھ سے نہیں پکڑ سکتا۔ وہ اس شخص کو چابک مارتا ہے۔ اسے تکلیف نہ پہنچتے دیکھ کر وہ چابک نیچے گرا دیتا ہے، کچھ تھکاوٹ اور کچھ نفرت سے۔ جب کہ چابک کھانے والا شخص چابک اٹھاتا اور اسے تھما دیتا ہے۔ صرف تبھی وہ دوسروں کے ساتھ قطار میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

یہ بات البتہ یقینی ہوتی ہے کہ اسے بطور رنگروٹ بھرتی نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ فہرست میں موجود لوگوں سے بہت زیادہ تعداد میں لوگ وہاں موجود ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہاں ایک انجان لڑکی معزز افسر پر ٹکٹکی باندھے کھڑی ہوتی ہے۔ وہ قصبے سے بلکہ صوبوں سے باہر کے علاقے کی رہنے والی ہے۔ فوجی بھرتی کے لالچ اسے یہاں کھینچ لائی۔ ایسی عورتیں بہت سی ہیں جو کسی دوسرے قصبے میں ہونے والی فوجی بھرتی کی ترغیب سے خود کو دور نہیں رکھ پاتیں۔ جب کہ اپنے گھر میں ہونے والی فوجی بھرتی ایک بالکل مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ اور عجیب طور پر ایک عورت کے لیے اس ترغیب کے آگے ہتھیار پھینک دینا ناشائستہ بات خیال نہیں کی جاتی۔ اس کے برعکس بعضوں کے خیال میں عورتوں کو اس عمل سے ضرور گزرنا چاہیے۔ یہ اس کی صنف کی طرف سے اس پر ایک قرض ہے

جسے اس نے چکانا ہوتا ہے۔

ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ کسی لڑکی یا عورت کو جب علم ہوتا ہے کہ کسی جگہ، غالباً کسی دور دراز علاقے میں، اس کے کسی رشتہ دار یا دوست کے گھر میں جبری بھرتی ہوگی، وہ اپنے خاندان سے سفر پر جانے کی اجازت طلب کرتی ہے جو اسے مل جاتی ہے۔ ایسی درخواست کو پوری طرح رد نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنا بہترین لباس پہنتی ہے۔ معمول کی نسبت زیادہ چنچل دکھائی دیتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ زیادہ ملنسار اور شادماں بھی، چاہے وہ عام حالات میں اس سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ لیکن اس تمام تر سکون اور دوستانہ پن کے پیچھے وہ ناقابل رسائی رہتی ہے جیسے ایک یکسر اجنبی جو اپنے گھر کی جانب محوِ سفر ہو اور اس کے سوا کوئی دوسرا خیال اس کے قریب نہ پھٹک پائے۔

اس خاندان میں، جہاں جبری بھرتی ہونا ہوتی ہے، اسے ایک عام مہمان کی نسبت مختلف انداز میں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ ہر کوئی اس کی چاپلوسی کرتا ہے۔ اسے گھر کے تمام کمروں میں چہل قدمی کرنے، کھڑکیوں سے باہر جھانکنے کی دعوت دی جاتی ہے اور اگر وہ کسی کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دے تو یہ عنایت اس فرد کے لیے اس کے باپ کی شفقت سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے۔ خاندان جبری بھرتی کے لیے تیار ہو رہا ہوتا ہے تو سب سے اچھی جگہ اسے دی جاتی ہے جو دروازے کے نزدیک ہوتی ہے جہاں معزز افسر کی نگاہ اس پر پڑنے کے سب سے زیادہ امکانات ہوتے ہیں اور جہاں وہ بھی افسر کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس طور اسے عزت دی جاتی ہے لیکن فقط معزز افسر کے آنے تک۔ اس کے بعد وہ توجہ کا مرکز نہیں رہتی۔

معزز افسر اسے ویسی ہی بے توجہی سے دیکھتا ہے جیسے دوسروں کو دیکھتا ہے اور حتیٰ کہ جب اس کی نگاہیں کسی پر آکر تھم جاتی ہیں تو اس شخص کو علم ہی نہیں ہو پاتا کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس کی توقع نہیں کر رہی ہوتی، یا پھر ضرور کرتی ہے کیوں کہ اس کے علاوہ کچھ اور ممکن ہی نہیں ہے۔ پھر بھی یہ اس کی توقع نہیں ہوتی جس کے لیے وہ عورت یہاں کھنچی چلی آتی ہے۔ یہ ایسی بات ہوتی ہے جو اب حتمی طور پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

وہ عورت اتنی شرمندگی محسوس کرتی ہے جتنی ہماری عورتیں کسی بھی دوسرے موقع پر محسوس نہیں کرتیں۔ صرف اسی وقت اسے مکمل احساس ہوتا ہے کہ اسے ایک اجنبی دیار میں ہونے والی فوجی بھرتی میں خوامخواہ گھسیٹا گیا۔ جب سپاہی گھر کے فہرست میں سے نام پڑھتا ہے اور اس کا نام اس میں نہیں ہوتا تو

لمحہ بھر کا سناٹا وہاں طاری ہوتا ہے، وہ سر جھکائے ہوئے بھاگتی اور کانپتے ہوئے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے جب کہ ایک فوجی اسے پشت پر مکے سے زوردار دھکا دیتا ہے۔

جس شخص کا نام فہرست میں موجود نہ ہو، اگر وہ مرد ہو تو اس کی واحد خواہش دوسروں کے ساتھ جبری طور پر بھرتی کیے جانا ہوتا ہے حالاں کہ اس گھر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بات بھی یکسر خارج از بحث ہے۔ اس قسم کے نو وارد کو کبھی جبری طور پر بھرتی نہیں کیا گیا اور نہ ہی کبھی آئندہ ایسا کوئی واقعہ ہوگا۔

شہر کا عوامی نشان

سب سے پہلے برج بابل کی تعمیر کے لیے تمام انتظامات کو ایک عمدہ ترتیب دی گئی۔ بے شک یہ ترتیب مکمل ترین تھی۔ سفری راہنماؤں، ترجمانوں، مزدوروں کی رہائش اور ذرائع ابلاغ کے راستوں کے بارے میں انھوں نے اس قدر غور و خوض کیا جیسے اصل تعمیر شاید سینکڑوں سال بعد ہی کہیں شروع ہو۔ اصل میں اس وقت عمومی رائے یہ تھی کہ اس سست رفتاری سے یہ برج کبھی تعمیر نہیں ہو سکتا۔ اس رائے کو اگر تھوڑی سی بھی اہمیت دی جاتی تو شاید وہ لوگ اس برج کی بنیاد رکھنے ہی میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے۔ لوگ یوں جواز پیش کرتے تھے: اس تمام منصوبے میں سب سے اہم شے ایسے مینار کی تعمیر کا خیال ہے جو آسمان تک بلند ہو۔ اس خیال کے مقابلے میں ہر خیال ثانوی ہے۔ جب یہ خیال اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ انسانی ذہن کو اپنی گرفت میں لے لے، تو پھر یہ کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس زمین پر انسان موجود ہے، اس برج کی تعمیر مکمل کرنے کی ناقابل تعرض خواہش بھی موجود رہے گی۔ ایسی صورت ہو تو پھر انسان کو

مستقبل کے بارے میں کوئی تشویش باقی نہیں رہتی۔ اس کے برعکس انسانی علم بتدریج بڑھ رہا ہے، فن تعمیرات مسلسل ارتقا پذیر ہے اور یہ عمل آئندہ بھی جاری رہے گا۔ جو کام آج ہم ایک سال میں مکمل کرتے ہیں، ہوسکتا ہے آئندہ سو سال کے بعد وہ اس سے نصف دورانیہ میں مکمل ہو جائے اور زیادہ بہتر انداز میں مکمل ہو، زیادہ پائیداری کے ساتھ۔ تو پھر کیوں خود کو اپنی موجودہ اہلیت کے انتہائی امکانات کے متعلق فکر مند کیا جائے؟

ایسا کرنا تبھی باجواز ہوگا اگر ایسا امکان ہو کہ مینار کو اسی نسل کے ہاتھوں تعمیر ہونا ہے۔ لیکن یہ بعید از قیاس بات ہے۔ ایسا البتہ اغلب ہے کہ اگلی نسل اپنے مکمل ترین علم کے ساتھ اپنے آباء کی تعمیر کو ناقص پائے اور وہ اسے نئے سرے سے بنانے کے لیے منہدم کردے گی۔ ایسے خیالات نے عوام کی قوت کو مفلوج کر دیا اور اسی لیے انھوں نے برج کی تعمیر سے کہیں زیادہ مزدوروں کے لیے ایک شہر کی تعمیر میں دلچسپی لی۔ ہر قوم وہاں اپنے لیے سب سے عمدہ خطہ اراضی مختص کرنے کی خواہش مند تھی۔ اس سے مختلف تنازعات پیدا ہوتے ہیں جو بڑھ کر خونی فسادات میں بدل گئے۔ یہ فسادات کبھی اپنے اختتام کو نہیں پہنچے۔

رہنماؤں کے لیے یہ صورت حال اس امر کا ایک نیا ثبوت تھی کہ عوام میں بنیادی اتحاد کی عدم موجودگی میں برج کی تعمیر بہت سست رفتاری سے ہوگی یا بلاشبہ بہتر یہ ہے کہ عالمگیر امن کے قیام تک اسے ملتوی کردی جائے۔ لیکن عوام کا وقت صرف انھی فسادات میں صرف نہیں ہوتا تھا۔ قصبے کو مختلف وقفوں سے آراستہ کیا جاتا اور بدقسمتی سے اس نے بھی نئی عداوتوں اور تازہ فسادات کو جنم دیا۔ اس انداز میں پہلی نسل کا دور گزرا لیکن اگلی کسی نسل نے اس سے مختلف رویئے کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ تیکنیکی مہارت بڑھی اور اس کے ساتھ ساتھ فسادات کے مواقع بھی۔ یہاں یہ بات بھی کہنی چاہئے کہ دوسری یا تیسری نسل نے آسمان تک بلند برج کی تعمیر کے منصوبے کی نامعقولیت کو محسوس کرلیا تھا لیکن اس وقت تک ہر شخص اس معاملہ میں اتنا مبتلا تھا کہ وہ اس سے دست بردار نہیں ہوسکتا تھا۔

وہ سارے نغمے اور حکایتیں جو اس شہر میں جنم پذیر ہوئیں، پیشین گوئی شدہ دن کی خواہش سے بھری ہوئی ہیں جب یہ شہر ایک دیوہیکل گھونسے کی پانچ مسلسل ضربوں سے تباہ کردیا جائے گا۔ یہی وجہ بھی ہے کہ ایک بھنچا ہوا گھونسا اس شہر کے فوجیوں کی وردی پر کندہ ہے۔

عدالت کی کھوج میں

میں اس بارے میں قطعی بے یقینی کا شکار ہوں کہ مجھے کچھ وکلا کی حمایت حاصل ہے۔ میں اپنی تمام کوششوں کے باوجود اس حوالے سے کچھ واضح معلومات حاصل نہیں کر پایا۔ ہر چہرہ غیر مخلص تھا۔ بیشتر افراد جو میری جانب آئے اور جن سے غلام گردشوں میں علیک سلیک ہوتی رہی، موٹی بوڑھی عورتوں جیسے دکھائی دیتے تھے۔ نیلے اور سفید رنگوں والے بڑے پیش بند میں ان کا تمام جسم ڈھنپا ہوا ہوتا تھا۔ وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ادھر ادھر مٹر گشت کرتے رہتے۔ میں تو یہ بھی نہیں جان سکا کہ کیا واقعی میں کسی عدالت میں ہوں۔

چند شواہد اس کی تصدیق کرتے تھے اور چند تردید۔ جو چیز مجھے باقی تمام تفصیلات میں سب سے زیادہ اس مقام کے عدالت ہونے پر قائل کرتی تھی، وہ مخصوص بھنبھناہٹ تھی جو مستقل طور پر کچھ فاصلے

سے سنائی دیتی۔ یہ جاننا ممکن نہیں تھا کہ یہ کس طرف سے آتی۔ یہ تمام کمروں میں اس طرح بھر جاتی کہ محسوس ہوتا جیسے ہر سمت سے آ رہی ہو یا تب یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی کہ اس کا اصل منبع وہی مقام تھا جہاں سننے والا کھڑا تھا۔ لیکن یہ خیال ایک التباس تھا۔ کیوں کہ بھنبھناہٹ واقعی کچھ فاصلے سے سنائی دیتی تھی۔ یہ تنگ اور محرابی غلام گردشیں، جو نہایت اہتمام سے آراستہ کیے گئے دروازوں کے ساتھ مخصوص وقفوں کے بعد گولائی میں مڑ جاتی تھیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ خاص طور پر اسی گہرے سناٹے کو قائم رکھنے کے لیے تعمیر کی گئی تھیں۔ یہ کسی کتب خانے یا عجائب گھر کی راہداریاں تھیں۔

اگر یہ عدالت نہیں تھی تو میں یہاں وکیل کی کھوج کیوں کر رہا تھا؟ شاید اس لیے کہ میں ہر جگہ وکیل کی کھوج کر رہا تھا۔ اس کی ہر جگہ ضرورت ہے۔ عدالت میں کم مگر باقی جگہوں پر زیادہ۔ عدالت کے بارے میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ یہ قانون کی پیروی میں فیصلے کرتی ہے۔ اگر کوئی یہ فرض کرے کہ یہاں تمام کارروائی غیر مناسب اور غیر قانونی انداز میں جاری تھی، تو زندگی وبال ہو جائے۔ ہر کسی کو اعتماد ہونا چاہیے کہ عدالت قانون کو اس کے تمام تر تقدس کے ساتھ ملحوظ خاطر رکھتی کیوں کہ یہی اس کی فرض بھی ہے۔ قانون میں ساری کارروائی الزام، وکالت اور فیصلہ کی تکون پر مشتمل ہے۔ اس میں کسی فرد کی دخل اندازی ایک جرم ہوگی۔ فیصلے کا معاملہ البتہ کچھ مختلف ہے۔ اس کا انحصار ان تحقیقات پر ہے جو یہاں وہاں قرابت داروں اور اجنبیوں میں، دوستوں اور دشمنوں، خاندان اور عوام، قصبے اور گاؤں میں کی جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر جگہ کی جاتی ہیں۔ اسی لیے یہاں وکلا کی اشد ضرورت ہے۔

وکلا جو بہت زیادہ ہوں، ممکنہ حد تک بہترین وکلا، ایک سے بڑھ کر، ایک زندہ دیوار کی مانند۔ کیوں کہ فطرتاً انھیں حرکت میں لانا مشکل ہوتا ہے۔ یہ مدعی، یہ ہوشیار لومڑیاں، یہ سرک جانے والے نیولے، چھوٹے چوہے، ننھے سوراخوں میں سے بھی کھسک جاتے ہیں۔ وکلا کی ٹانگوں میں سے نکل جاتے ہیں۔ تو سنو! میں اسی لیے یہاں ہوں۔ میں وکلا کو جمع کر رہا ہوں۔

لیکن تا حال مجھے کوئی ایک بھی وکیل نہیں ملا۔ فقط وہی بوڑھی عورتیں یہاں آتی جاتی ہیں۔ اگر میں کھوج میں مصروف نہ ہوتا تو ضرور سو جاتا۔ افسوس، میں درست جگہ پر نہیں ہوں۔ میں اسی احساس کی زد میں ہوں کہ درست مقام پر نہیں ہوں۔ مجھے ایسی جگہ ہونا چاہیے تھا جہاں ہر طرح کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے، قصبے کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے، ہر طبقے، ہر پیشے اور ہر عمر کے لوگ۔ مجھے اس مجمع میں

سے ان لوگوں کے انتخاب کا موقع حاصل ہونا چاہیے جو مہربان ہیں، جو قابل ہیں اور جو میرے لیے دل میں درد رکھتے ہیں۔ غالباً اس مقصد کے لیے بہترین جگہ میلے کا کوئی بڑا میدان ہے لیکن اس کے بجائے میں ان راہداریوں میں بھٹک رہا ہوں جہاں صرف یہی بوڑھی عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ بہت زیادہ نہیں ہیں۔ ہمیشہ وہی عورتیں بار بار۔ لیکن یہ چند عورتیں بھی کسی ایک طرف نہیں ہوتی ہیں بلکہ اپنی سست رفتاری کے باوجود یہ مجھ سے دور نکل جاتی ہیں۔ برسنے والے بادلوں کی طرح بہتی ہیں اور ہمیشہ غیر معلوم سرگرمیوں میں مصروف رہتی ہیں۔

آخر ایسا کیوں ہے کہ میں دروازے پر درج ہدایات کو پڑھے بغیر عاقبت نااندیشی سے اس گھر میں گھس گیا اور فوراً ہی خود کو ان راہداریوں میں پایا اور وہاں اس جنون کے ساتھ بھٹک رہا ہوں کہ میرے لیے یہ یاد رکھنا بھی ممکن نہیں ہے کہ میں کبھی گھر کے سامنے کھڑا تھا، کبھی اس کی سیڑھیاں چڑھا تھا۔ لیکن واپسی اب ممکن نہیں ہے۔ نرا وقت کا ضیاع، ایک غلط جگہ چلے آنا میرے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔ تو کیا؟ اس مختصر، عجلت پسند زندگی میں، جو اس مضطرب شور کے ہمراہ ہے، کیا تم سیڑھیاں اتر جاؤ گے؟ ناممکن۔ تمھیں تفویض کیا گیا وقت اتنا مختصر ہے کہ اگر تم اگر ایک سیکنڈ ضائع کر دو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے اپنی پوری زندگی تباہ کر دی۔ کیوں کہ یہ مزید باقی نہیں رہے گی، بلکہ یہ ہمیشہ اتنی ہی لمبی ہے جتنی وقت تم ضائع کرتے ہو۔ لہٰذا اگر تم سیر کے لیے چل پڑے ہو، تو پھر بڑھتے جاؤ، چاہے بھی کچھ ہو۔ تمھیں فائدہ ہی ہوگا۔ تمھیں کوئی خدشہ نہیں ہے۔ آخر میں ہو سکتا ہے تم کسی گھاٹی میں جا گرو۔ لیکن اگر تم چند قدم چلنے کے بعد مڑ جاتے ہو اور نیچے اترنے لگتے ہو تو فوراً ہی ڈھے جاؤ گے۔ ممکنہ طور پر نہیں بلکہ یقینی طور پر۔ سو اگر تمھیں غلام گردشوں میں کچھ نہ ملے تو دروازے کھولو۔ اگر دروازوں کے باہر بھی کچھ نہ پاؤ تو عمارت میں اوپر مزید منزلیں بھی ہیں۔ یہاں بھی کچھ ہاتھ نہ آئے تو مت گھبراؤ۔ محض اگلی سیڑھیوں تک پھلانگ جاؤ۔ جب تک اوپر چڑھتے جاؤ گے، سیڑھیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ تمھارے پیروں تلے یہ ہمیشہ آگے پھیلتی چلی جائیں گی۔

شادی شدہ جوڑا

کاروبار عام طور پر ایسی بری شے ہے کہ بعض اوقات جب کبھی مجھے دفتر کے کام سے کچھ فراغت ملتی ہے، تو میں نمونوں کا تھیلا اٹھا لیتا ہوں اور اپنے گاہکوں سے جا کر ملتا ہوں۔ بہت عرصہ پہلے میں نے دوسرے گاہکوں کے ساتھ ساتھ N سے بھی ملنے کا تہیہ کیا جس سے کبھی میرے مستقل کاروباری تعلقات تھے جو پچھلے سال کے دوران نامعلوم وجوہات کی بنا پر یکسر منقطع ہو گئے۔ تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ایسی سیاہ بختیوں کی ہمیشہ کچھ حقیقی وجوہات بھی ہوں۔ موجودہ غیر مستحکم حالات میں اکثر کچھ نہ ہو، یا مزاج سب کچھ بدل کر رکھ سکتا ہے اور اسی انداز میں کوئی بھی وجہ نہ ہو، یا ایک لفظ سب کچھ پھر سے ٹھیک کر سکتا ہے۔

N سے ملاقات کرنا بجائے خود ایک مشکل مرحلہ ہے۔ وہ ایک بوڑھا شخص ہے۔ وہ اگرچہ تمام کاروباری معاملات خود ہی نمٹانے پر اصرار کرتا ہے، لیکن اپنے دفتر میں وہ شاذ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اگر آپ کو اس سے ملنا مقصود ہو تو اس کے گھر جانا ہوگا۔ جب کہ کاروباری افراد ایسی ملاقاتوں سے احتراز ہی کرتے ہیں۔

پچھلی شام چھ بجے میں اس کے گھر کے لیے روانہ ہوا۔ ہر چند کہ یہ ملاقات کے لیے مناسب وقت نہیں تھا، لیکن یہ ملاقات کوئی سماجی علیک سلیک نہیں تھی بلکہ خاص کاروباری نوعیت کی تھی۔ لہٰذا اسے مختلف انداز سے سمجھنے کی ضرورت تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ N گھر پر موجود تھا۔ وہ کچھ ہی دیر پہلے اپنی بیوی کے ساتھ چہل قدمی کر کے لوٹا تھا۔ ملازم نے مجھے بتایا۔ اور اب وہ اپنے بیٹے کی خواب گاہ میں تھا جو بیمار تھا اور اپنے بستر تک محدود تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں اس کے بیٹے کی خواب گاہ میں چلا جاؤں۔ پہلے میں نے ہچکچاہٹ محسوس کی۔ لیکن پھر اس ملاقات کو جلد از جلد ختم کرنے کی خواہش مجھ پر اس قدر غالب آئی کہ میں نے اپنے اوورکوٹ، ٹوپی اور نمونوں کے تھیلے کے ساتھ اسی حالت میں ملازم کی رہنمائی میں جانے دیا۔ ایک تاریک کمرے سے گزر کر میں ایک نیم تاریک کمرے میں داخل ہوا جہاں چند لوگ بیٹھے تھے۔

شاید جبلی طور پر سب سے پہلے میری نظر وہاں بیٹھے ایجنٹ پر پڑی جسے میں اچھی طرح جانتا تھا، چند حوالوں سے میرا کاروباری حریف۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھ پر سبقت لینے کے چکر میں یہاں آیا تھا۔ وہ مریض کے بستر کے نزدیک ایسے سکون سے بیٹھا تھا جیسے وہی اس کا معالج ہو۔ وہ ڈھٹائی کے ساتھ اپنے خوبصورت اوورکوٹ میں ملبوس بیٹھا جس کے بٹن کھلے تھے۔ مریض غالباً اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اس کے رخسار بخار کی تمازت سے دہک رہے تھے۔ وہ وقفے سے اپنی عیادت کرنے والوں کو دیکھ لیتا۔ وہ اب مزید نوجوان نہیں رہا تھا، این کا بیٹا، تقریباً میری ہی عمر کا مرد، چہرے پر مختصر داڑھی تھی جسے بیماری کے سبب تراشا نہیں گیا تھا۔ بوڑھا این کشادہ کندھوں والا دراز قد شخص تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کسی غیر معلوم مہلک بیماری کی وجہ سے، بہت نحیف ہو گیا تھا۔ جھکا ہوا اور کمزور، اسی سمور کی کھال والے اوورکوٹ میں ملبوس جسے پہنے وہ باہر چہل قدمی کے لیے گیا ہوگا، اپنے بیٹے کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔ اس کی بیوی پستہ قد اور لاغر، لیکن نہایت زندہ دلی، حالاں کہ جیسے ہمیں اس نے دیکھا بھی نہ ہو، اپنے شوہر سے بات کر رہی اور اس کا اوورکوٹ اتارنے میں اس کی مدد کر رہی تھی جوان دونوں کی جسامت میں واضح فرق کے باعث، ایک دقت طلب کام تھا۔ لیکن آخر وہ اس میں کامیاب ہو گئی۔ اس معاملے میں شاید اصل مشکل این کی بے چینی سے پیدا ہوئی تھی۔ کیوں کہ اپنے مضطرب ہاتھوں سے وہ بیٹھنے کے لیے مسلسل کوئی کرسی تلاش کر رہا تھا جسے اس کی بیوی نے اور کوٹ اتارتے ہی اس کے قریب سرکا دیا۔ پھر اس نے سمور کا کوٹ ہاتھوں میں بلند کیا جس کے نیچے وہ تقریباً گم ہو گئی، اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

تب آخر کار مجھے محسوس ہوا کہ میرے لیے آگے بڑھنے کا وقت آ گیا تھا یا یہ کہ اگر یہ ابھی نہیں آیا تو پھر کبھی نہیں آئے گا۔ سو اگر میں کچھ کرنا چاہتا ہوں تو وہ فوراً کر لینا چاہیے۔ کیوں کہ مجھے احساس ہوا کہ یہاں کاروباری ملاقات کے لیے صورت حال آئندہ مزید ناسازگار ہوگی اور کسی جگہ ڈھٹائی سے جم جانا، جیسا ایجنٹ کا وطیرہ تھا، میرا طریقہ کار نہیں تھا۔ میں اسے کسی خاطر میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے کسی رسمی تمہید کے بغیر اصل کاروباری معاملے پر بات شروع کی۔ حالاں کہ میں دیکھ سکتا تھا کہ این اس وقت اپنے بیٹے سے گفتگو کا متمنی تھا۔ بدقسمتی سے میری عادت ہے کہ جب میں کاروباری معاملے پر گفت و شنید کرتا ہوں، جو عموماً بہت مختصر دورانیے کی ہوتی ہے اور یہاں بطور خاص یہ بہت مختصر ہونی تھی تو میں کھڑا ہو جاتا اور گفتگو کے دوران ادھر ادھر چکر کاٹتا ہوں۔ دفتر میں تو اس مقصد کے لیے اچھا اہتمام موجود ہے لیکن کسی اجنبی گھر میں اس سے خاصی ناگواری پیدا ہو سکتی ہے لیکن میں خود کو روک نہیں سکا۔ خاص طور پر مجھے اس وقت اپنے سگریٹ کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

خیر ہر کسی کی چند بری عادتیں بھی ہوتی ہیں۔ میں جب ایجنٹ کے بارے میں سوچتا ہوں تو اپنے آپ کو اپنی خوش بختی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ کیوں کہ اس کے رویئے کے بارے میں بھلا کیا بات کی جائے، حقیقت یہ ہے کہ مثال کے طور پر ہر تھوڑی دیر کے بعد وہ اچانک اور قطعی غیر متوقع طور پر اپنی ٹوپی سر پر پہننے کا عادی ہے۔ تب تک وہ ٹوپی کو اپنے گھٹنوں پر جمائے رکھے گا اور اسے اوپر اور نیچے دباتا رہے گا۔ یہ سچ ہے، وہ فوراً ہی اسے پھر سے سر سے اتار لے گا جیسے اس سے پہلے کوئی بڑی غلطی سرزد ہوئی ہو لیکن وہ اسے پھر بھی ایک دو سیکنڈ کے لیے سر پر ہی رہنے دے گا، اور ایسا سب کچھ وہ ہر چند منٹوں کے وقفے کے بعد دہرائے گا۔ بلاشبہ ایسی عادت ناقابل معافی ہے۔ اس سے کم از کم مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ میں اپنی کاروباری تجاویز کے اظہار میں مکمل منہمک ادھر ادھر چکر کاٹ رہا تھا اور وہ میرے ذہن سے یکسر محو تھا۔ لیکن چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں اس کی ٹوپی والی عادت بالکل بدحواس کر سکتی ہے۔

بہر کیف جب میں اپنے کام میں غرق ہوں تو ایسی ناخوش گوار باتیں بلکہ سبھی کچھ میرے لیے درخور اعتنا نہیں ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ یہ سب کچھ مجھے دکھائی دیتا ہے لیکن جب تک میں اپنا کام مکمل نہ کر لوں یا جب تک کوئی مجھ پر اعتراض نہ کرے، یہ میرے شعور کا حصہ نہیں بنتا۔ لہذا مثال کے طور پر میں نے صاف دیکھا کہ این کسی بھی لحاظ سے کوئی بات سمجھنے کی کیفیت میں نہیں تھا۔ کرسی کے دستے کو مضبوطی سے تھامے

ہوئے وہ بے چینی سے گھوما، ایک بار بھی میری جانب نہیں دیکھا بلکہ خالی آنکھوں سے خلا میں گھورتا رہا جیسے وہاں کوئی شے تلاش کر رہا ہو۔ اس کا چہرہ ہر طرح کے احساس سے قطعی عاری تھا کہ لگتا تھا جیسے اس نے میرا کہا ہوا کوئی ایک لفظ بھی نہ سنا ہو اور حتی کہ اسے میری موجودگی کی آگاہی بھی نہ ہو۔ ہاں، اس کی پوری شخصیت، ایک بیمار آدمی کی شخصیت، جو میرے لیے ناخوش گوار تھی، میں پوری طرح سمجھ گیا۔

میں بولتا رہا یا جیسے مجھے اُمید تھی کہ فقط اپنی گفتگو سے اور ان پر کشش رعائتوں سے جن کی میں نے اسے پیشکش کی، صورت حال کو اپنے حق میں کر لوں گا۔ پیش کی جانے والی رعائتیں جن کی مجھے بھی تشویش تھی، رعائتیں جن کا تقاضا بھی نہیں کیا گیا تھا۔

لیکن یہ دیکھ کر مجھے خاصا اطمینان ہوا کہ ایجنٹ، جسے میں چور آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، نے اپنی ٹوپی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور بازو چھاتی پر باندھ لیے۔ اس سے یہ حقیقت واضح تھی کہ میرے اس خطاب نے، جو مجھے اعتراف ہے کہ ایک حد تک اسی کے خلاف تھا، اس کے ارادوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اور اس نتیجے سے پیدا ہونے والی شادمانی و فرحت کے سبب میں یقیناً بہت دیر تک بولتا اگر این کا بیٹا، جسے میں اپنے منصوبوں میں ثانوی حیثیت دے چکا تھا، اچانک بستر پر اٹھ کر نہ بیٹھ جاتا اور اپنا گھونسا فضا میں لہراتے ہوئے مجھے خاموش ہو جانے کا اشارہ نہ کرتا۔ ظاہر تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، کسی طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا لیکن خود میں اتنی طاقت محسوس نہ کرتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ شاید اس کا دماغ چل گیا تھا لیکن پھر مڑ کر بوڑھے این کو دیکھنے پر سارا معاملہ میری سمجھ آ گیا۔

این اپنی ابھری، پتھرائی ہوئی کھلی آنکھوں کے ساتھ بیٹھا تھا جو بند ہونے کے قریب لگتی تھیں۔ وہ کانپ رہا تھا اور اس کا جسم آگے جھکا ہوا تھا جیسے کوئی اسے نیچے دبا رہا ہو یا اس کے کندھوں پر بوجھ ڈالے ہوئے ہو۔ اس کا زیریں لب، بلکہ زیریں جبڑا اپنے مسوڑھوں کے ساتھ بے بسی سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بدہیت ہو چکا تھا۔ وہ سانس تو لے رہا تھا لیکن دشواری سے۔ لیکن پھر جیسے وہ یک لخت کسی اذیت سے آزاد ہو کر کرسی کی پشت پر گر گیا، اپنی آنکھیں بند کیں، شدید کرب کا واضح احساس اس کے چہرے سے جھلکا اور گزر گیا۔

اس کا قصہ تمام ہو چکا تھا۔ میں تیزی سے اس کی جانب بڑھا اور اس کا بے جان ہاتھ پکڑا جو اتنا سرد تھا کہ اس سے میرے جسم میں خوف کی کپکپی دوڑ گئی۔ اس کی نبض تھم چکی تھی۔ واقعی اس کا قصہ تمام ہو چکا

تھا۔ وہ نہایت بوڑھا معلوم ہو رہا تھا۔ ہم خوش قسمت ہوں گے اگر ہمیں ایسی آسان موت نصیب ہو۔ لیکن اب ان حالات میں کیا کیا جانا چاہیے؟ مجھے سب سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے مدد کے لیے اپنے ارد گرد دیکھا۔ اس کا بیٹا چادر اوڑھے اوندھا لیٹا اور شدت سے آہ و زاری کر رہا تھا۔ ایجنٹ مچھلی کی طرح سرد، کرسی پر بے حرکت بیٹھا تھا، این سے دو قدم کے فاصلے پر، اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کا کچھ بھی کرنے کا ارادہ نہیں تھا، بس یہ انتظار کہ آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ یوں میں ہی، اور صرف میں ہی باقی بچا تھا جس نے کچھ کرنا تھا۔ اور اس وقت اگر پوچھا جائے کہ مشکل ترین کیا ہوسکتا تھا تو وہ یہی تھا کہ کیسے کسی قابل برداشت انداز میں اس کی بیوی کو اس سانحہ کی خبر دی جائے؟ ایسے انداز میں جو بالفاظ دیگر ممکن نہیں تھا۔ تبھی مجھے بغلی کمرے میں گھسٹتے پر جوش قدموں کی آواز آنے لگی تھی۔

وہ تا حال سیر کے لباس میں تھی جسے تبدیل کرنے کی غالباً اسے فرصت نہیں ملی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کے لیے شب خوابی کا لباس اٹھا رکھا تھا جسے وہ آتش دان میں گرم کر کے لائی تھی۔

''یہ سو گیا ہے۔'' اس نے مسکراتے اور اپنے سر کو ہلاتے ہوئے کہا اور ہمیں یوں بے حرکت بیٹھے ہوئے دیکھا۔ معصومیت کی لامحدود سچائی کے ساتھ اس نے این کا وہی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا جسے کچھ دیر پہلے میں نے خوف اور شدید کراہت کے ساتھ تھاما تھا، اور اسے ادا سے چوما کہ یہ منظر ہم تینوں مردوں کے لیے نہایت رقت انگیز تھا۔ جبھی این نے کروٹ بدلی، بلند آواز میں جماہی لی اور اسے خود کو شب خوابی کا لباس پہنانے دیا، شام کی طویل چہل قدمی سے خود کو تھکا لینے پر اپنی بیوی کی نازک فہمائشوں کو قدرے ناگواری اور مسکراہٹ کے ساتھ سنا اور پھر عجیب طور پر جواب میں کچھ کہا، کہ اس کے یوں نیند میں چلے جانے میں کوئی شک باقی نہ رہا، کچھ ایسی بات کہ وہ بوریت محسوس کر رہا تھا۔ پھر اس خیال سے کہ اپنی خواب گاہ تک جانے کے لیے سرد راہداری سے گزرتے ہوئے اسے ٹھنڈ نہ لگ جائے، وہیں اپنے بیٹے کے بستر ہی میں لیٹ گیا۔ اس کا سر اس کے بیٹے کے پیروں کے قریب دو نرم گدوں میں دھنسا ہوا تھا جو اس کی بیوی نے سرعت سے لا کر وہاں رکھ دیئے تھے۔

اس تمام واقعہ میں مجھے بظاہر کوئی بات عجیب دکھائی نہیں دی۔ تب اس نے شام کا اخبار اٹھایا اور اپنے مہمانوں پر کوئی توجہ دیے بغیر اسے کھول کر اپنے سامنے پھیلا لیا۔ لیکن اسے پڑھا نہیں بلکہ صفحے پر اِدھر اُدھر سرسری نگاہ دوڑانے لگا۔ پھر ہماری کاروباری پیشکشوں پر کئی غیر مناسب اعتراضات کیے جن

میں اس کی شاندار زیر کی جھلکتی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ تنفر سے اپنا بازو فضا میں جھٹکتا اور اپنی زبان کو چٹخاتے ہوئے اس نے اشارۃً بتایا کہ ہماری کاروباری گفتگو نے اس کے منہ کا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ ایجنٹ اس موقع پر چند غیر موزوں بیانات دینے سے خود کو روک نہ سکا۔ بے شک اس نے اپنے سرد انداز میں یہ محسوس کیا تھا کہ جو کچھ بھی یہاں ہوا، اس کے بعد اسے ازالے کے طور پر کچھ کہنا چاہیے۔ لیکن ایسا کرنے کا اس کا انداز، ایک غیر شائستہ ترین انداز تھا۔ میں نے موقع ملتے ہی ان سے اجازت لی۔ میں اس معاملے میں واقعتاً ایجنٹ کا شکر گزار تھا۔ اگر وہ وہاں موجود نہ ہوتا تو مجھے اتنی جلد وہاں سے نکل بھاگنے کا موقع نہ ملتا۔

برآمدے میں مجھے فراؤاین دوبارہ ملیں۔ ان کے غمناک سراپے کو دیکھ کر میں نے بے اختیار ان سے کہا کہ انھیں دیکھ کر مجھے اپنی والدہ یاد آتی ہیں۔ وہ خاموش رہیں تو میں نے پھر سے کہا ''لوگ چاہے کچھ بھی کہیں وہ حیرت انگیز کام کر سکتی تھیں۔ جن چیزوں کو ہم برباد کر دیتے تھے، وہ انھیں نئے سرے سے بنا سکتی تھیں۔ میں بچہ ہی تھا جب ان کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گیا۔''

میں احتیاطاً نرم اور واضح لہجہ میں گفتگو کر رہا تھا کیوں کہ مجھے لگا تھا کہ خاتون کی قوت سماعت میں ضعف تھا لیکن شاید وہ مکمل بہری تھیں کیوں کہ انھوں نے میری بات کا اثر لیے بغیر پوچھا۔ ''اور میرا خاوند تمھیں کیسا لگتا ہے؟''

اُن سے کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھے ایجنٹ سمجھ رہی تھیں۔

پھر میں سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ ان سے اترنا، ان پر چڑھنے کے نسبت زیادہ دقت طلب ثابت ہوا۔ آہ! کتنی کاروباری ملاقاتیں رائیگاں جاتی ہیں۔ لیکن انسان کو کوشش جاری رکھنی چاہیے۔''

آزمائش

میں ایک ملازم ہوں لیکن میرے لیے کرنے کو کوئی کام نہیں ہے۔ میں ایک بزدل انسان ہوں اور خود کو آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کرتا حتیٰ کہ میں خود کو دوسروں کے برابر لانے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔ لیکن یہ میری بے روزگاری کی صرف ایک وجہ ہے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ اس کا میری بے روزگاری سے یکسر کوئی تعلق نہ ہو۔ بہرطور اصل بات یہ ہے کہ مجھے کسی کام کے لیے بلایا نہیں جاتا۔ دوسروں کو طلب کرلیا جاتا ہے۔ حالاں کہ وہ مجھ سے زیادہ محنت نہیں کرتے۔ بلکہ شاید انھیں اپنے یوں بلائے جانے کی سرے سے کوئی خواہش بھی نہیں ہوتی جب کہ میں نے کم ازکم چند مواقع پر اس کی شدید ضرورت محسوس کی تھی۔

میں ملازموں کے ہال میں تختے پر لیٹ جاتا ہوں۔ چھت میں لگے شہتیروں کو تکتا، سوجاتا، جاگ اٹھتا اور فوراً ہی پھر سے سوجاتا ہوں۔ کبھی کبھار میں ایک شراب خانے میں جاتا ہوں جہاں وہ ترش بیئر بیچتے ہیں۔ کبھی کبھار میں نفرت سے گلاس الٹادیتا ہوں۔ لیکن کبھی میں اسے رغبت سے پی جاتا ہوں۔ مجھے وہاں بیٹھنا اچھا لگتا ہے کیوں کہ چھوٹی بند کھڑکی سے پیچھے سے اس خدشے کے بغیر کہ مجھے دیکھ لیا جائے گا،

میں کھڑکی سے پرے اپنے گھر کو دیکھ سکتا ہوں۔ایسا نہیں ہے کہ وہاں سے بہت کچھ دکھائی دیتا ہے۔ میرے علم کے مطابق گلی سے صرف غلام گردشوں کی کھڑکیاں ہی دکھائی دیتی ہیں، اور وہ راہداریاں بھی دکھائی نہیں دیتی جو میرے آجر کے کمروں تک جاتی ہیں۔

لیکن ایسا ممکن ہے کہ میں ہی غلطی پر ہوں۔کسی نے پوچھے جانے کے بغیر ہی ایک بار مجھ سے ایسا کہا تھا اور اس مکان کا سامنی حصہ اس بات کی تصدیق بھی کرتا تھا۔شاذ ہی اس گھر کی کھڑکیاں کھلتی تھیں اور جب کبھی ایسا ہوتا تو ایک نوکر ہی ایسا کرتا جو تب کچھ دیر کے لیے باہر جھانکتا تھا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہ راہداریاں ہیں جہاں وہ غیر متوقع طور پر نہیں لے جایا جاسکتا۔امر واقعی یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر ان نوکروں سے واقف نہیں ہوں۔جو نوکر اوپر کی منزل میں مستقل ملازم ہیں، وہ میرے کمرے میں نہیں، کہیں اور سوتے ہیں۔

ایک مرتبہ جب میں شراب خانے پہنچا تو ایک شخص میری مشاہدہ کرنے والے مقام پر بیٹھا تھا۔ مجھے اس کو قریب سے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور میں دروازے کی جانب مڑنے اور باہر جانے والا تھا جب اس نے میرا نام پکارا۔تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی ایک نوکر تھا جس سے میں ایک مرتبہ پہلے بھی کہیں ملا تھا۔لیکن تب میری اس سے بات نہیں ہوئی تھی۔

''تم کیوں بھاگنا چاہتے ہو۔یہاں بیٹھو۔شراب پیو۔پیسے میں دوں گا۔''

میں بیٹھ گیا۔اس نے مجھ سے مختلف باتیں پوچھیں۔میں ان میں سے کسی کا جواب نہیں دے سکا۔ بلکہ مجھے اس کے سوالات ہی سمجھ میں نہیں آئے۔

میں نے کہا۔''غالباً تمھیں افسوس ہو رہا ہوگا کہ تم نے بےکار ہی مجھے دعوت دی۔اب میرا چلے جانا ہی بہتر ہے۔''

میں اٹھنے لگا تھا جب اس نے میز پر اپنا بازو آگے پھیلایا اور مجھے واپس کھینچ لیا۔

''ٹھہرو''اس نے کہا۔''یہ تو بس ایک آزمائش تھی۔جو سوالوں کے جواب نہیں دیتا، وہ آزمائش میں کامیاب ٹھہرتا ہے۔''

میرے ہمسائے

میرے کاروبار کا تمام تر بار میرے کندھوں پر ہے۔ ٹائپ رائٹروں اور حساب کی کتابوں کے ساتھ استقبالی ہال میں بیٹھی دو کلرک لڑکیاں، لکھنے کی میز، الماری، استقبالیہ کی میز، آرام کرسی اور ٹیلی فون کے ساتھ میرا کمرہ۔ یہ میرے کاروبار کا کام میں آنے والا اثاثہ ہے۔ کتنا سادہ ہے انھیں سنبھالنا اور کتنا آسان ہے انھیں اپنی مرضی کے مطابق چلانا۔ میں جوان آدمی ہوں اور مجھے بہت زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن میں شکایت نہیں کرتا۔ میں کبھی شکایت نہیں کرتا۔

اس سال کے آغاز میں ایک نوجوان شخص میرے دفتر سے ملحق خالی جگہ میں آ گیا جسے کرایے پر لینے سے میں اپنی بیوقوفی کی وجہ سے ایک عرصہ سے احتراز کر رہا تھا۔ اس جگہ میں ایک بیرونی اور ایک اندرونی کمرا تھا۔ ایک باورچی خانہ بھی تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اندرونی اور بیرونی کمرے کا تو مجھے کچھ فائدہ ہو سکتا تھا۔ میری دونوں کلرک لڑکیاں کام کی زیادتی سے تھک جاتی تھیں۔ لیکن باورچی خانے کا مجھے

کیا فائدہ؟ محض یہ ایک الجھن ہی اصل وجہ تھی جس کی بنا پر یہ خالی جگہ میرے ہاتھوں کے نیچے سے نکل گئی۔ اب وہ نوجوان وہاں بیٹھتا ہے۔ اس کا نام ہیرس ہے۔ وہ وہاں کیا کرتا ہے، اس کا مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے۔ دروازے پر ایک تختی نصب ہے جس پر درج ہے ''ہیرس بیور''۔

میں نے اِدھر اُدھر سے سُن گُن لی تو معلوم ہوا کہ اس کا میری ہی طرح کا کچھ کاروبار ہے۔ میں لوگوں کو تنبیہ نہیں کر سکتا کہ وہ اسے ادھار نہ دیں۔ بہر حال وہ ایک نوجوان اور پر جوش انسان ہے جس کے سامنے ایک بھر پُور مستقبل ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں لوگوں کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس پر اعتبار کریں۔ کیوں کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی ذاتی اثاثہ نہیں ہے۔ جو لوگ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، وہ اس کے بارے میں یہی کچھ کہتے ہیں۔

کبھی کبھار سیڑھیوں میں ہیرس سے مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ غیر معمولی عجلت میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ میرے قریب سے زناٹے سے گزر جاتا ہے۔ میں نے اسے کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے دفتر کی چابی ہمیشہ اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ایک تیز کلک کے ساتھ وہ دفتر کا دروازہ کھولتا ہے۔ پھر ایک چوہے کی دم کی طرح وہ آن کی آن میں وہ اس میں کھسک کر غائب ہو جاتا ہے اور میں 'ہیرس بیورو' کے نام کی تختی کے سامنے کھڑا رہ جاتا ہوں جسے میں پہلے ہی اتنی بار پڑھ چکا تھا جتنی بار پڑھے جانے کی وہ حقدار نہ ہے۔

کراہت انگیز حد تک پتلی دیواروں میں ایک قابل اور معزز شخص عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے لیکن یہ بے ایمان شخص کے لیے ڈھال کا کام دیتی ہیں۔

میرا ٹیلی فون اس دیوار پر نصب ہے جو مجھے اپنے ہمسائے سے جدا کرتی ہے۔ میں نے اسے ایک خاص مضحکہ خیز اہتمام کے طور پر یہاں لگایا ہے۔ اگر یہ مخالف دیور پر بھی لگا ہوتا تو دوسرے کمرے میں ہر بات سنی جا سکتی تھی۔ میں نے خود کو یہ عادت ڈالی ہے کہ ٹیلی فون پر اپنے گاہکوں سے بات کرتے ہوئے ان کا نام نہیں پکارتا۔ تاہم گفتگو میں آنے والی موضوعاتی مگر ناگزیر تبدیلیوں سے دوسرے شخص کے نام کا پتا چلانے کے لیے بہت زیادہ اہلیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات میں کسی خدشے کے تحت ٹیلی فون کے گرد چکر کاٹنے لگتا ہوں، رسیور مضبوطی سے کان سے لگائے، اپنے راز کو افشاء ہونے سے باز نہیں رکھ پاتا۔

اس سب کچھ کے باعث میرے کاروباری فیصلے قدرتی طور پر غیر یقینی ہو چکے ہیں اور میری آواز میں کپکپاہٹ در آئی ہے۔ میں جب ٹیلی فون پر بات کر رہا ہوتا ہوں تو ہیرس کیا کر رہا ہوتا ہے؟ اگر میں اس صورت حال کو مبالغے سے بیان کرنے کی کوشش کروں جیسا اکثر اپنے ذہن کو زیادہ واضح کرنے کی خاطر کیا جاتا ہے تو میں کہوں گا کہ ہیرس کو ٹیلیفون رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرا ہی ٹیلیفون استعمال کرتا ہے۔ وہ صوفے کو کھینچ کر دیوار کے ساتھ لگا لیتا اور میری باتیں سنتا ہے جب کہ میں ٹیلیفون پر مغز کھپائی کرتا ہوں۔ اپنے گاہکوں کی درخواستیں سنتا ہوں۔ مشکل اور پیچیدہ فیصلے کرتا ہوں۔ لمبے حساب کتاب لگاتا ہوں۔ لیکن سب سے بدترین بات یہ ہے کہ اس دوران میں غیر ارادی طور پر ہیرس کو اس دیوار کے ذریعے قیمتی معلومات بہم پہنچاتا ہوں۔

غالباً وہ میری گفتگو ختم ہونے کا انتظار نہیں کرتا۔ بلکہ جونہی معاملہ اس پر واضح ہوتا ہے، وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اپنی مخصوص عجلت کے ساتھ قصبے میں نکل پڑتا ہے اور ریسیور کے کریڈل پر واپس رکھے جانے سے پہلے ہی پہلے وہ میرے گاہکوں تک جا پہنچتا ہے تاکہ انھیں میرے خلاف بھڑکا سکے۔

دو نسلی جانور

میرے پاس ایک عجیب جانور ہے۔ نصف بلی، نصف بھیڑ۔ یہ جانور مجھے اپنے باپ سے ورثہ میں ملا۔ لیکن یہ میرے ہاتھوں میں پلا بڑھا۔ پہلے اس میں بلی کی نسبت ایک بھیڑ کی خصلت زیادہ غالب تھی۔ اب یہ دونوں میں برابر تقسیم ہو گیا ہے۔ اس کا بلی والا حصہ اس کے سر اور پنجوں پر مشتمل ہے۔ اس کا جسم اور ساخت بالکل بھیڑ جیسی ہے۔ اس کی آنکھوں میں، جو جنگلی اور متحرک ہیں، اس کے بالوں میں، جو نرم ہیں اور اس کے جسم سے چمٹے ہوئے ہیں، اور اس کی حرکات میں، جو اچھلنے کودنے اور چپکے چپکے گھسٹنے پر مشتمل ہیں، ان دونوں کی خصوصیات موجود ہیں۔

دھوپ میں کھڑکی کی دہلیز میں لیٹ کر خود کو گیند کی صورت میں سمیٹ لیتا اور بلی کی طرح خرخر کرتا ہے۔ کسی چراہ گاہ میں یہ وحشیوں کی مانند بھاگتا اور بمشکل قابو میں آتا ہے۔ یہ بلیوں سے خوفزدہ ہے لیکن بھیڑ کے بچوں پر جھپٹتا ہے۔ چاندنی راتوں اس کا مرغوب مشغلہ چھت کے چھجے پر چہل قدمی کرنا ہوتا ہے۔ یہ بلی کی طرح میاؤں میاؤں نہیں کر سکتا اور چوہوں سے شدید نفرت کرتا ہے۔ یہ مرغیوں کے

ڈربے کے پاس گھنٹوں گھات لگا کر بیٹھا رہ سکتا ہے۔لیکن کبھی اس نے کسی مرغی کو مارا نہیں۔

میں اسے دودھ پلاتا ہوں۔لگتا ہے یہی اس کے لیے بہترین غذا ہے۔ یہ اپنے شکاری درندوں جیسے دانتوں سے اِسے غٹا غٹ پی لیتا ہے۔قدرتی طور پر یہ بچوں کے لیے تفریح کا بڑا ذریعہ ہے۔اتوار کی صبح مہمانوں کی آمد کے لیے مخصوص ہے۔ میں اسے گود میں لے کر کرسی میں بیٹھ جاتا ہوں اور تمام پڑوس کے بچے میرے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

مجھ سے عجیب وغریب سوالات پوچھے جاتے ہیں جن کا کوئی انسان جواب نہیں دے سکتا۔ایسا صرف ایک جانور ہی کیوں ہے؟ یہ جانور میرے علاوہ کسی دوسرے کی ملکیت کیوں نہیں ہے؟ کیا ایسا جانور پہلے بھی کبھی رہا ہے؟اگر یہ مرجائے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا یہ خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا؟ اسکے بچے کیوں نہیں ہیں؟اس کا نام کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کبھی ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ مزید کسی وضاحت کے بغیر انھیں اپنی ملکیت دکھانے پر اکتفا کرتا ہوں۔بعض اوقات بچے اپنے ساتھ بلیاں لے آتے ہیں۔ایک مرتبہ وہ دو بھیڑیں بھی اٹھا لائے لیکن ان کی توقعات کے برعکس کسی بھی جانور کی آنکھوں میں دوسرے کے لیے شناسائی کے تاثرات نہیں ابھرے۔ جانوروں نے نہایت سکون سے اپنی حیوانی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے کے وجود کو الہامی حقیقت کے طور پر قبول کر لیا۔

میرے گھٹنوں پر بیٹھ کر اس جانور کو نہ کسی کا خوف باقی رہتا اور نہ ہی کسی کے پیچھے بھاگنے کی حرص۔ مجھ سے چمٹ کر وہ بہت مسرور ہوتا ہے۔ یہ اس خاندان کا، جس میں اس نے پرورش پائی ہو، ہمیشہ وفادار رہتا ہے۔لیکن اس میں بے شک نمک حلالی کا دخل نہیں ہے، بلکہ یہ اس جانور کی حقیقی جبلت ہے جس سے ملتے جلتے لاتعداد جانور دنیا میں ہوں گے لیکن کوئی ایک بھی اس کا سگا رشتہ دار نہیں ہے اور اسی لیے ہم سے اسے جو تحفظ ملا ہے، وہ اسے اپنے لیے مقدس تصور کرتا ہے۔

بعض اوقات میں اپنی ہنسی روک نہیں پاتا، جب یہ سوں سوں کرتا میرے گرد چکر کاٹتا اور میری ٹانگوں کے بیچ خود کو رگڑتا اور کسی صورت مجھ سے جدا ہونے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ محض بلی یا بھیڑ ہونے پر قانع نہ ہوتے ہوئے یہ جیسے کتا بننے پر بھی اصرار کرتا ہے۔ایک مرتبہ ایسی صورت حال پیدا ہوئی جیسی کسی بھی انسان کے ساتھ پیدا ہو سکتی ہے کہ مجھے کاروباری مسائل اور ان سے متعلقہ معاملات سے چھٹکارا پانے کا

کوئی چارہ دکھائی نہ دیا، اور میں ہر شے تج دینے پر آمادہ تھا اور اسی مایوسی میں اپنے کمرے میں گھومنے والی کرسی میں دراز تھا، اسے اپنے گھٹنوں پر بٹھائے ہوئے کہ میری نظر اس کے چہرے پر پڑی اور میں نے اس کی بڑی مونچھوں پر آنسو اٹکے ہوئے دیکھے۔ کیا وہ میرے آنسو تھے یا اس جانور کے؟ کیا اس بھیڑ کی روح والی بلی میں انسانی احساسات بھی تھے؟ مجھے اپنے باپ سے وراثت میں بہت کچھ نہیں ملا۔ لیکن یہ ورثہ میرے لیے گراں قدر ہے۔

اس میں دونوں جانوروں کی، بلی کی اور بھیڑ کی بھی، بے چینی موجود ہے، حالاں کہ دونوں کی فطرت ایک دوسرے کے برعکس ہے۔ اسی باعث اس کی جلد اس کے جسم پر چست معلوم ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ چھلانگ لگا کر آرام کرسی پر میرے پہلو میں آن بیٹھتا ہے۔ اپنی اگلی ٹانگیں میرے کندھوں پر ٹکا لیتا اور اپنی تھوتھنی میرے کان پر جما لیتا ہے یعنی جیسے مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔ پھر واقعی یہ اپنا سر میری طرف موڑتا اور میرے چہرے کو تکتا ہے تاکہ اپنی بات کے جواب میں میرے تاثرات جان سکے۔ اس کا دل رکھنے کے لیے میں ایسا تاثر دیتا ہوں جیسے میں اس کی بات سمجھ گیا ہوں۔ میں اپنا سر ہلا دیتا ہوں۔ اس پر وہ نیچے فرش پر کود جاتا اور مسرت سے ناچنے لگتا ہے۔

غالباً قصاب کا چاقو اس جانور کی رہائی کی صورت بنے گا لیکن چوں کہ یہ میرے باپ کی میراث ہے لہٰذا مجھے ایسے خیال کو رد کر دینا چاہئے۔ مجھے انتظار چاہئے کہ اس کی روح خود ہی اس کے جسم سے پرواز کر جائے۔ تاہم بعض اوقات یہ مجھے ایسی نظروں سے تکتا ہے جن میں انسانی فہم جھلکتا ہے۔ جیسے مجھے للکار رہا ہو کہ وہی کچھ کر گزروں جو اس لمحہ ہم دونوں سوچ رہے ہیں۔

بوڑھا تاجر میسز

وہ ایک لحیم شحیم بوڑھا تاجر ہے۔ اس کے دونوں گھٹنے دائیں بائیں باہر کو نکلے ہوئے ہیں۔ وہ زینے کے کٹہرے کو مضبوطی سے تھامے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے تک آیا۔ پھر اپنے کمرے کے جالی دار شیشے دروازے کے سامنے پہنچ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تا کہ چابیوں کا گچھا نکال سکے۔ ایسا وہ ہمیشہ کرتا۔ جبھی ایک تاریک گوشے میں ایک نوجوان کو کھڑے دیکھا جو آگے جھک کر اسے سلام کر رہا تھا۔

''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' تاجر نے اس سے پوچھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے سے ابھی تک بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

''کیا تم تاجر میسر ہو؟'' نوجوان نے الٹا اس سے سوال کیا۔

''ہاں''۔ تاجر نے جواب دیا۔

''تمھارے لیے میرے پاس کچھ اہم معلومات ہیں۔ یہاں میرا تعارف غیر اہم ہے کیوں کہ اس تمام معاملے میں میری اپنی کوئی شمولیت نہیں ہے۔ میں فقط تمھیں ایک پیغام پہنچانے آیا ہوں۔ لیکن میں اپنا تعارف کروائے دیتا ہوں۔ میرا نام کیٹی ہے اور میں ایک طالب علم ہوں۔''

''ہونہہ''۔ میسنر نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا ''یہ بتاؤ تمھارے پاس میرے لیے کیا

پیغام ہے۔''
''ہم اس معاملے پر اندر کمرے میں بیٹھ کر زیادہ سکون سے بات کر سکتے ہیں۔'' نوجوان نے کہا۔''یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ یوں سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر اس پر بات نہیں ہوسکتی۔''
''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس وقت کسی پیغام کو وصول کرنے کی ضرورت نہیں ہے''۔
''لیکن یہ ایک ضروری پیغام ہے'' طالب علم نے کہا۔
''اب رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ یہاں کوئی ہماری بات نہیں سنے گا''۔میسز نے کہا۔
''نہیں میرے لیے ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں اس پیغام کو یہاں بیان نہیں کروں گا۔'' طالب علم نے جواب دیا۔
''میں رات کو مہمانوں کی آمد کو پسند نہیں کرتا ہوں''۔میسز نے کہا اور چابی کو اس شدت سے تالے میں گھسیڑا کہ چھلے میں ٹنگی چابیاں دیر تک آپس میں بجتی رہیں۔
''میں یہاں آٹھ بجے سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں یعنی مجھے یہاں کھڑے تین گھنٹے ہو گئے ہیں'' طالب علم نے کہا۔
''لیکن اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے یہ معاملہ تمھارے لیے اہم ہے۔ میں اس وقت کوئی پیغام وصول کرنا نہیں چاہتا۔ میں اگر اس کو نہ بھی سنوں تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔تم یہاں سے جاؤ''
اس نے طالب عم کے پتلے اوورکوٹ کو پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ پھر سُرعت سے دروازہ کھولا۔اندر کمرے سے گرم ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا''کیا یہ کوئی کاروباری پیغام ہے'' اس نے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھا۔
''میں نے تمھیں بتایا کہ میں یہاں کھڑے ہو کر اس بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتا''۔
''تو پھر شب بخیر''میسز نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔اس نے چابی سے دروازے کا تالا بند کیا اور ٹیبل لیمپ کا بلب جلایا۔ دیوار میں نصب ایک مختصر الماری میں ایک خاص محلول سے بھری کئی بوتلیں پڑی تھیں۔ اس نے اس محلول سے گلاس بھرا اور چٹخارے لیتے ہوئے اسے پی گیا۔ پھر اس نے اپنے کپڑے اتار دیے۔ وہ اپنے بڑے سرہانوں سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ وہ اخبار پڑھنے ہی لگا تھا

جب اسے لگا کہ دروازے پر ایک نرم دستک دی جا رہی تھی۔ اس نے اخبار اپنے پہلو میں رکھا۔ اپنے بازوؤں کو ایک دوسرے سے باندھا اور بغور آواز سننے لگا۔ دستک کی آواز دوبارہ ابھری۔ وہ بہت لطیف تھی۔ جیسے وہ نیچے کہیں دور آ رہی تھی۔

''یہ واقعی بدتمیز چھوکرا ہے''میسز نے ہنستے ہوئے سوچا۔ دستک کی آواز آنا بند ہوئی تو اس نے پھر سے اخبار اٹھا لیا لیکن اگلے ہی لمحے یہ دستک زیادہ شدت سے گونجی۔ باہر کوئی دروازے کو بے تحاشا پیٹ رہا تھا جیسے بچے کھیل کے دوران میں ہر جگہ ٹھوکریں مارتے جاتے ہیں اور جب ٹھوکر لکڑی پر پڑتی ہے تو آواز دب جاتی ہے لیکن جب شیشے پر پڑے تو زیادہ شور پیدا کرتی ہے۔

''مجھے اب اٹھنا ہی پڑے گا۔''میسز نے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔

ہمسائے کو بھی ٹیلی فون نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ ٹیلی فون ادھر برآمدے میں پڑا ہے۔ وہاں پہنچنے کے لیے پہلے مکان کی مالکہ کو جگانا پڑے گا۔ لہٰذا اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں باہر جاؤں اور لڑکے کو اٹھا کر سیڑھیوں سے نیچے پھینک دوں۔ اس نے سوچا اور ایک پچکی ہوئی ٹوپی سر پر رکھی۔ کمبل کو ہٹایا۔ اپنے ہاتھوں پر اپنا تمام بوجھ ڈالتے ہوئے خود کو بستر سے فرش تک کھسکایا۔ اپنے پیروں کو نیچے فرش پر رکھا اور نرم چپل پہنے۔ ؤ

''اس کی خبر لیتا ہوں'' اس نے سوچا اور اپنے بالائی ہونٹ چباتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ ''اب پھر خاموشی ہو گئی ہے۔ لیکن مجھے اس ٹنٹے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ہو گا'' اس نے الماری سے کسی جانور کے سینگ کی موٹھ والی چھڑی نکالی اور اسے درمیان میں سے پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھایا۔

''کیا باہر کوئی ہے؟'' اس نے بند دروازے کے پیچھے سے پوچھا۔

''ہاں''۔ دوسری طرف سے جواب آیا۔ ''خدا کے لیے دروازہ کھولا۔''

''ہاں ضرور دروازہ کھولوں گا''میسز نے کہا۔ اس نے دروازہ کھولا اور چھڑی پکڑے ہوئے ایک قدم باہر نکل آیا۔

''مجھے مت ماریئے۔'' طالب علم نے خوفزدہ لہجے میں کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

''تو پھر یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔''میسنر نے شہادت کی انگلی سے سیڑھیوں کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں جاسکتا'' طالب علم نے کہا اور پھر غیر متوقع طور پر میز پر جھپٹ پڑا۔

پوسائیڈن

پوسائیڈن اپنے میز پر بیٹھا حساب کتاب کے کھاتوں کی پڑتال کررہا تھا۔ تمام پانیوں کے انتظام کی مصروفیت اسے سر کھجانے کی مہلت نہیں دیتی۔ وہ اپنی معاونت کے لیے حسب خواہش نائب بھرتی کر سکتا تھا اور بلاشبہ ایسے معاونین کی ایک معقول تعداد اس کے ساتھ کام بھی کررہی تھی لیکن چوں کہ وہ اپنا کام نہایت ذمہ داری اور سنجیدگی سے کرتا تھا، لہٰذا وہ تمام حسابات کی خود ہی جانچ کرنے پر مصر رہتا۔ اس لیے اس کے معاونین اس کی بہت کم معاونت کرپاتے۔

یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے کام سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ وہ اسے محض اس واسطے کرتا کیوں کہ یہ اسے تفویض کیا گیا تھا۔ بے شک اس نے حکام بالا کو بار بار یہ درخواست پیش کی تھی کہ اسے اس سے خوش گوار کام دیا جائے۔ لیکن جب اسے مختلف تجاویز پیش کی جاتی تھیں تو آخر میں یہی مناسب معلوم ہوتا کہ موجودہ کام سے بہتر کوئی کام اس کے موافق نہیں تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے لیے کوئی دوسرا کام ڈھونڈنا بہت مشکل تھا۔

نہ ہی اسے کسی ایک سمندر کے انتظام کی ذمہ داری تک محدود کیا جاسکتا تھا۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ اس صورت میں بھی اس پر کام کا بوجھ کم نہیں ہوگا لیکن غیر اہم ہوجائے گا۔ عظیم پوسائیڈن کو فقط اعلیٰ

ترین انتظامی عہدے ہی زیب دیتے تھے۔

ایک مرتبہ جب اسے پانیوں کے انتظام سے غیر متعلق ایک ذمہ داری سونپی گئی تو وہ بہت بیمار ہو گیا۔اس کا الہامی سانس رک رک کر آتا اور اس کی پیتل کی سی چھاتی بری طرح پھولنے اور پچکنے لگی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے مسائل کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ جب کوئی عظیم شخص کوئی شکایت کرے تو ایسا ظاہر کرنا چاہیئے کہ اس کے مسئلے کو سمجھ لیا گیا تھا چاہے وہ مسئلہ کیسا ہی ناقابل حل کیوں نہ ہو۔ کسی نے کبھی پوسائیڈن کا عہدہ تبدیل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ اسے ازل سے سمندروں کا دیوتا مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور یہ سب کچھ یونہی رہنا تھا۔

جس بات پر اسے سب سے زیادہ کوفت ہوتی اور یہی بات فی الاصل اس کی اپنے کام سے بیزاری کی بنیادی وجہ تھی، وہ ایسی بے بنیاد افواہیں تھیں جو اس کے متعلق ہر طرف گردش کرتیں۔ مثال کے طور پر یہ افواہ کہ وہ اپنے ترشول کے ساتھ ہمہ وقت لہروں پر محوسفر رہتا۔ اس کے بجائے وہ وہ دنیا کے سمندر کی گہرائیوں میں بیٹھا حسابات کی نامختتم پڑتال کرتا رہتا جبکہ مشتری تک کا کبھی کبھار کا سفر اس شب و روز کی یکسانیت میں واحد خوش گوار تبدیلی ہوتا۔ لیکن اس سفر سے بھی وہ عموماً غیض وغضب کے عالم میں لوٹتا۔ نتیجتاً وہ سمندروں کو دیکھ ہی نہ پاتا، 'اولمپکس' کے پہاڑ پر عجلت میں تیز تیز چڑھتا چلا جاتا اور کبھی حقیقتاً ان میں سفر نہ کر پاتا۔ وہ کہا کرتا کہ وہ سمندروں کے سفر کو دنیا کے اختتام تک التواء میں رکھے گا۔ کیوں کہ تب ایک خاموش لمحہ ایسا آئے گا جب اختتام سے پہلے اور اپنے آخری حسابات کی جانچ پڑتال کے بعد ایک ہنگامی دورہ کر پائے گا۔

انوکھی عدالتی کارروائی

ایک انوکھی عدالتی کارروائی عمل میں آتی ہے۔ مجرم کو اس کے عقوبت خانے ہی میں چھرا مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ تب کمرے میں مجرم اور جلاد کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے میز کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ وہ ایک خط لکھ رہا ہے یا آخری مرتبہ کھانا کھا رہا ہے۔ دروازے پر دستک سنائی دیتی ہے۔ یقیناً یہ جلاد ہے۔

''کیا تم تیار ہو؟'' وہ پوچھتا ہے۔

اس کے افعال اوت سوالات کے تسلسل اور نوعیت کے متعلق تمام اصول طے شدہ ہیں۔ وہ ان سے انحراف نہیں کر سکتا۔ مجرم اسے دیکھ کر پہلے تو اچھل کر کھڑا ہو جاتا ہے پھر دوبارہ بیٹھتا اور اپنے سامنے ایک سیدھ میں تکنے لگتا ہے یا اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیتا ہے۔ کوئی جواب نہ پا کر جلاد اپنا اوزاروں کا تھیلا کھاٹ پر رکھتا اور اسے کھولتا ہے۔ چھرے کا انتخاب کرتا، اس کے کنارے پر ہاتھ پھیر کر دھار کی تیزی پرکھتا ہے اور اس میں شعلہ بھڑکاتا ہے۔ مجرم خاموشی سے اپنا سر جلاد کی طرف پھیرتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں چھرا دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ پھر سے واپس گردن پھیرتا ہے جیسے اب اسے مزید کچھ دیکھنے کی چاہ نہیں ہے۔

''تیار ہو'' جلاد کچھ توقف کے بعد کہتا ہے۔

''ہاں، تیار ہوں۔'' مجرم چلا کر کہتا ہے۔ پھر اچھل کر کھڑا ہو جاتا اور جلاد کی طرف تکتا ہے ''تم مجھے نہیں مارو گے۔ تم مجھے کھاٹ پر لٹا کر میرے پیٹ میں چھرا نہیں گھونپو گے۔ آخر تم بھی ایک انسان ہو۔ تم کسی کو صلیب پر چڑھا کر سزا دے سکتے ہو۔ تمھارے ارد گرد معاونین اور منصف ہوں گے۔ لیکن ایسا تم اس عقوبت خانے میں نہیں کر سکتے۔ کیا ایک انسان دوسرے کو قتل کرے گا؟'' جلاد اپنے تھیلے پر جھک جاتا ہے۔ وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ مجرم پھر سے کہتا ہے ''یہ انوکھی عدالتی کارروائی اس لیے وضع کی گئی ہے کیوں کہ یہ ناممکن ہے۔ اس کی ساخت کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن سزائے موت اب مزید کسی کو نہیں دی جائے گی۔ تم مجھے دوسرے عقوبت خانے میں لے جاؤ گے۔ شاید مجھے وہاں بہت دیر تک ٹھہرنا پڑے گا۔ تم مجھے قتل نہیں کر سکتے ہو۔''

جلاد سوتی کپڑے کی میان میں سے نیا چھرا نکالتا اور کہتا ہے ''تمھارے ذہن میں ضرور وہ بچوں کی کہانیاں ہیں جن میں جلاد کو ایک بچے کے قتل کا حکم دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس کی بجائے وہ اسے کسی موچی کی دکان پر کام پر بٹھا دیتا ہے۔ وہ محض کہانیاں تھیں۔ یہ کہانی نہیں ہے۔''

امیلیہ اور ہینز

قصاب کے بچے ہینز اور امیلیہ ایک بڑے گودام کی دیوار کے نزدیک 'بنٹوں' سے کھیل رہے تھے۔ یہ گودام پتھر کی بنی ہوئی بڑی قلعہ نما عمارت تھی جس کی بیرونی دیوار پر سلاخوں سے ڈھکی ہوئی بڑے حجم کی کھڑکیوں کی دو قطاریں بنی تھیں اور جو دریا کے کنارے تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہینز نے احتیاط سے نشانہ لیا۔ بنٹے کو اپنے سامنے سوراخ کے رخ پر بلند کیا جس میں اسے نشانہ باندھنا تھا۔ امیلیہ سوراخ کے نزدیک دوزانو بیٹھ گئی۔ وہ بے چینی سے زمین پر اپنے ننھے گھونسے مار رہی تھی۔ پھر یکبارگی انھوں نے کھیل چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے اور گودام کی کھڑکی میں سے تکنے لگے۔ پہلے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی کھڑکی کے ایک پٹ پر سے گرد جھاڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ جبھی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور ایک نحیف متبسم چہرہ کھڑکی کے عقب میں دکھائی دیا۔ وہ ایک مرد کا چہرہ تھا۔

وہ بولا ''ادھر آؤ بچو، ادھر آؤ بچو، ادھر آؤ۔ کیا تم نے کبھی گودام دیکھا ہے؟''

بچوں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ امیلیہ نے مسرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ہینز نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی مبادہ کوئی نزدیک کھڑا انھیں دیکھ رہا ہو۔ ایک طرف عرشے کے جنگلے کے ساتھ ایک شخص آگے جھکا لکڑی کی ایک بھاری ہتھ گاڑی کھینچ رہا تھا۔ وہ ان بچوں کی موجودگی سے بے خبر معلوم ہوتا تھا۔

''پھر تو یہ گودام تمھارے لیے ایک معمہ ہے۔ جلدی سے اندر آجاؤ ورنہ دیر ہو جائے گی۔'' اس شخص نے جوش کے ساتھ کہا جیسے اس جوش وجذبہ سے وہ اپنی کسی بدبختی کے غم کا مداوا چاہتا ہو جو اس باعث پیدا ہوئی تھی کہ وہ اس دیوار، سلاخوں اور کھڑکی کے باعث بچوں سے مل نہیں سکتا تھا۔

''ہم اندر کس راستے سے آئیں؟'' امیلیہ نے پوچھا

''میں تمھیں دروازے کا راستہ بتاتا ہوں'' اس آدمی نے کہا ''میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ میں دائیں طرف جاؤں گا اور ہر کھڑکی کو ہاتھ سے بجاتا رہوں گا''

امیلیہ نے سر ہلایا اور بھاگتی ہوئی اگلی کھڑکی تک گئی۔ وہاں کسی نے اندر سے دستک دی اور ہر اگلی کھڑکی پر وقفے وقفے سے یہی عمل دہرایا گیا۔ اس دوران میں امیلیہ دیوانگی سے ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی تک بھاگتی رہی لیکن اس کے برعکس ہنیز سست روی سے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ کچھ ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کسی گودام کو اندر سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک گودام کی سیر یقیناً ایک پُر تکلف تجربہ تھی۔ لیکن کسی اجنبی کا انھیں دعوت دینا ہرگز یہ ثابت نہیں کرتا تھا کہ وہ واقعی اندر جا سکتے تھے۔ اس نے سوچا کیا ان کا اندر جانا مناسب ہوگا۔ شاید اس کا باپ اسے پسند نہ کرے۔ اس کا باپ تو یہاں ارد گرد تمام لوگوں کو جانتا تھا جنھوں نے اسے اچھے دنوں میں عمدہ زندگی گزارتے دیکھا تھا اور جو اس کی عزت بھی کرتے تھے۔ یقیناً یہ اجنبی اس کے باپ کو جانتا ہوگا۔ یہ جاننے کے لیے وہ امیلیہ کے پیچھے بھاگا۔ وہ اجنبی پختہ لوہے کے مختصر پستہ دروازے کے قریب ٹھہر گیا۔ یہ گیس کے چولہے کا دھانہ معلوم ہوتا تھا۔

اس نے آخری کھڑکی کا شیشہ توڑا اور کہا ''یہ دروازہ ہے۔ کچھ دیر ٹھہرو میں پہلے اندر سے دروازہ کھولتا ہوں۔''

''کیا تم ہمارے باپ کو جانتے ہو''؟ ہنیز نے پوچھا لیکن اتنی دیر تک وہ چہرہ کھڑکی سے غائب ہو چکا تھا۔ ہنیز اپنے سوال کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ گودام کے اندرونی دروازوں کے کھلنے کی آواز آئی۔ انھیں چابی تالے میں گھمائے جانے کی آواز سنائی دی۔ جوں جوں دروازے کھلتے گئے یہ آواز بلند تر ہوئی۔ یوں لگتا عمارت کا یہ دھانہ بہت سارے دروازوں سے بھرا ہوا تھا۔ پھر آخری دروازہ کھلا۔ بچے اندر جھانکنے کے لیے زمین پر لیٹ گئے۔ وہاں اجنبی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

''تمام دروازے کھل گئے ہیں۔ جلدی سے اندر آ جاؤ'' اس نے تمام دروازوں کو اپنے بازو سے دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔

جبھی امیلیہ کو اچانک کچھ یاد آیا۔ وہ ہنیز کے پیچھے کھسک گئی۔ وہ اس سے پہلے اندر جانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اندر جانے کی بے تابی میں اس نے ہنیز وک اپنے ساتھ آگے دھکیلا۔ ہنیز دروازے کے قریب ہو گیا۔ وہ اندر جانے، اور بالخصوص اس اجنبی کے ساتھ اندر جانے سے احتراز کر رہا تھا۔ اسے اندر سے آتی مرچوں کی بو محسوس ہوئی۔ وہ دروازوں کی دوسری طرف نہیں جانا چاہتا تھا جو ایک ہی جھٹکے میں بند ہو جائیں گے۔ یہ بڑی بوڑھی سرد عمارت اسے وحشت زدہ کر رہی تھی۔ وہ دوزے کے بالکل سامنے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے اجنبی سے پچھا ''کیا تم ہمارے باپ کو جانتے ہو؟''

''نہیں'' اجنبی نے جواب دیا ''لیکن کیا تم اندر نہیں آ ؤ گے۔ مجھے دروازوں کو اتنی دیر کھلا رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''یہ ہمارے باپ کو نہیں جانتا'' ہنیز نے امیلیہ سے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ خود کو پر سکون محسوس کر رہا تھا۔ وہ اب کسی صورت اندر نہیں جائے گا۔

''ہاں! میں اسے جانتا ہوں'' اجنبی نے دہانے میں سے اپنا سر آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''بے شک میں قصاب کو جانتا ہوں جو دھر پل کے نزدیک بیٹھتا ہے چند ایک بار میں اس سے گوشت لایا ہوں۔ تم نے ایسا کیوں سوچا کہ میں تمھارے خاندان کو جانے بغیر تمھیں گودام کے اندر آنے کی دعوت دے سکتا ہوں۔''

''تم نے پہلے ایسا کیوں کہا کہ تم ہمارے باپ کو نہیں جانتے'' ہنیز نے شک کے ساتھ کہا۔ وہ اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ گھسیڑے گودام کی طرف پیٹھ کیے کھڑا تھا۔

''میں یہاں کھڑے کھڑے زیادہ دیر گفتگو نہیں کر سکتا۔ پہلے اندر آ ؤ پھر مجھ سے ہر بات پوچھنا۔ لڑکے تم اندر آنا نہیں چاہتے ہو۔ تمھارے برے رویئے کو دیکھتے ہوئے میں چاہوں گا کہ تم باہر ہی ٹھہرو۔ تمھاری بہن بہت باتمیز اور سمجھ دار ہے۔ وہ اندر آنا چاہے تو مجھے خوشی ہو گی۔'' اس نے امیلیہ کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''ہنیز'' امیلیہ نے اجنبی ہاتھ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''تم میرے ساتھ اندر کیوں

نہیں چلتے؟''

ہنیز اجنبی کی گفتگو کے بعد سے اپنے رویہ پر ندامت محسوس کت رہا تھا۔ وہ دھیمے لہجہ میں بولا ''یہ بولتے ہوئے منہ سے ہوا نکالتا ہے'' واقعتاً اجنبی بولتے ہوئے اور ایسی حالت میں بھی جب وہ خاموش کھڑا ہوتو بے وجہ پھونکیں مارتا رہتا۔

''تم ایسے کیوں ہو؟'' امیلیہ نے ہنیز اور اجنبی کے درمیان مفاہمت کرانے کے نیک ارادے سے کہا۔

''میں تمھیں ساری بات بتاؤں گا'' اجنبی نے کہا ''میرا سانس بہت بھاری ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے کہ میں اس مرطوب گودام میں اتنے عرصے سے رہ رہا ہوں۔ تمھیں بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ تم یہاں زیادہ دیر مت کھڑے رہو''۔

''میں ضرور جاؤں گی'' امیلیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ حتمی فیصلہ کر چکی تھی۔ ''لیکن'' اس نے مزید کہا ''ہنیز بھی میرے ساتھ جائے گا۔''

''بے شک'' اجنبی نے اپنے جسم کے بالائی حصے کو آگے جھکایا اور ہنیز کو پکڑ کر پوری قوت سے دروازے کے اندر کھینچا۔

''اس طرف سے اندر آؤ پیارے ہنیز'' اس نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے مزاحمت کرتے ہوئے ہنیز سے کہا۔ اس دھینگا مشتی میں ہنیز کی قمیض کی آستین دروازے کے کناروں سے رگڑ کھا کر بری طرح پھٹ گئی۔ ہنیز چیخ رہا تھا۔

''مالی'' ہنیز پوری قوت سے چیخا۔ اس کے پاؤں دروازے کے اندر غائب تھے۔ یہ سب کچھ انتہائی سرعت سے ہوا ''مالی ابو کو بلاؤ۔ ابو کو بلاؤ۔ میں باہر نہیں آسکتا۔ یہ مجھے گھسیٹ رہا ہے۔''

امیلیہ ندامت محسوس کر رہی تھا۔ اس واقعہ کے ہونے میں اس کی خاص ضد کا بہت دخل تھا۔ اس نے خود ہی سوچا کہ اس کی غلطی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ وہ اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور تھی۔ وہ اجنبی کے درشت رویے سے گویا صرف نظر کرتے ہوئے بے حرکت اپنی جگہ کھڑی رہی اور ہنیز کے پیروں کو دروازے کے اندر غائب ہوتے دیکھتی رہی۔

شکاری گریکس کا ایک جزو

شکاری گریکس کیا یہ درست ہے کہ تم سینکڑوں سالوں سے اس پرانی کشتی میں سمندری سفر کر رہے ہو؟

پندرہ سو برسوں سے۔

اور ہمیشہ سے اسی کشتی میں؟

ہمیشہ سے اسی سفینے میں۔ میرے خیال میں اسے سفینہ کہنا درست ہوگا۔ تمھیں جہاز رانی کے معاملات کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔

نہیں۔ میں نے آج تک کبھی ان میں دلچسپی نہیں لی جب تک کہ میں نے تمھارے بارے میں نہیں سنا، جب تک کہ میں تمھاری کشتی میں سوار نہیں ہوا۔

اس میں ندامت کی کوئی بات نہیں۔ میں بھی اندرونی علاقوں سے ہوں۔ کبھی ملاح نہیں رہا، نہ کبھی ایسا ہونے کی خواہش کی، پہاڑ اور جنگل میرے دوست تھے اور اب، ملاحوں میں سب سے قدیم، شکاری گریکس، ملاحوں کا سرپرست، شکاری گریکس۔ کشتی کے دیدبان میں جہاز کا ملازم لڑکا خوف سے میرے سامنے ہاتھ باندھے رحم کی التجا کرتا ہے۔ مجھ پر ہنسو مت!

میں ہنس رہا ہوں؟ بالکل نہیں۔ مجروح دل کے ساتھ میں تمھارے حجرے کے دروازے پر کھڑا تھا، ایک مجروح دل کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ تمھارے دوستانہ رویے نے میری ڈھارس بندھائی لیکن میں کبھی اس بات کو فراموش نہیں کروں گا کہ میں کس کا مہمان رہا۔

بلاشبہ تم درست کہتے ہو۔ کچھ بھی ہو آخر میں شکاری گریکس ہوں۔ کیا تم شراب پینا پسند کرو گے؟ مجھے اس کے برانڈ کا علم نہیں ہے لیکن یہ میٹھی اور بھاری ہے۔ مجھے اپنے مالک پر فخر ہے۔

ابھی نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ بعد میں شاید، اگر تم اتنی دیر تک میری صحبت کو برداشت کر پائے۔ میں تمھارے گلاس میں شراب پینے کی جسارت نہیں کروں گا۔ تمھارا آقا کون ہے؟

اس سفینے کا مالک۔ وہ بہترین لوگ ہیں، میرے آقا۔ بس مجھے وہ سمجھ میں نہیں آتے۔ میرا اشارہ ان کی زبان کی طرف نہیں ہے حالاں کہ وہ بھی اکثر مجھے سمجھ نہیں آتی۔ لیکن یہ اصل مسئلہ نہیں ہے۔ ان تمام صدیوں میں میں اتنی زبان سیکھ گیا ہوں کہ اس نسل اور اس کے آباؤ اجداد کے درمیان ترجمان کا کام کر پاؤں۔ جو بات میں نہیں سمجھ پایا، وہ یہ ہے کہ آقا کیا سوچتے ہیں؟ شاید تم اس کی وضاحت کر سکو۔

مجھے نہیں لگتا کہ ایسا کر پاؤں گا۔ میں تمھیں کیسے کسی ایسی بات کی وضاحت کر سکتا ہوں جس کے مقابلے میں میرا فہم انتہائی بچگانہ ہے۔

نہیں، ایسے مت سوچو۔ اگر تم کچھ زیادہ دلیر اور پراعتماد ہوتے تو میری کچھ مدد کرتے۔ مجھے بھلا ایک مہمان کے سایے سے کیا مطلب؟ میں اسے دیوار کے سوراخ سے اڑا کر باہر پھینک دوں گا۔ مجھے بہت سی توضیحات چاہئیں۔ تم جو دنیا بھر میں پھرتے ہو، یہ کام کر سکتے ہو۔ لیکن اگر تم یہاں میری میز کے پاس کانپتے ہوئے بیٹھے رہو گے اور خود فریبی سے وہ تھوڑا بہت بھی بھول جاؤ گے جو تمھیں معلوم ہے تو پھر تمھیں بھی فوراً یہاں سے جانا ہوگا۔ میں جو چاہتا ہوں، کہہ دیتا ہوں۔

تمھاری بات میں ایک نقطہ ہے۔ چند حوالوں سے میں تم سے برتر ہوں۔ لہٰذا میں خود پر قابو رکھنے کی کوشش کروں گا۔ سوال پوچھو۔

بہت خوب، اس سے بہت بہتر کہ تم اس اندز سے اپنے بارے میں مبالغہ کرو اور خود کو مجھ سے برتر سمجھو لیکن تمھیں میری بات کو مناسب طور پر سمجھنا چاہیے۔ میں تمھاری طرح کا ہی ایک انسان ہوں۔ میں تم سے جتنا عمر میں بڑا ہوں، اتنی ہی زیادہ صدیوں سے مضطرب بھی ہوں۔ خیر، چلو آقاؤں کے بارے

میں بات کرتے ہیں۔ سنو، اور شراب بھی پیو تا کہ تمھارا ذہن تیز ہو جائے۔ شرماؤ مت۔ بڑا جام لو۔ شراب کے کئی پیپے یہاں موجود ہیں۔

گریکس۔ یہ بہت عمدہ شراب ہے۔ تمھارے آقا لمبی عمر جئیں۔

افسوس کہ آج ہی اس کا انتقال ہوا۔ وہ ایک اچھا انسان تھا اور اس نے پر امن زندگی گزاری۔ جوان صحت مند بچے اس کے بستر مرگ کے پاس کھڑے تھے۔ اس کی بیوی بے ہوش ہو کر اس کے قدموں میں گر پڑی لیکن وہ آخری لمحوں میں بھی میرے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک اچھا انسان، ایک اچھا جہاز ران۔

اوپر آسمانوں میں، وہ جہاز ران! اور تم یہاں زمین پر، جنوب میں، کیا یہ جانتے ہو کہ وہ آج مر گیا؟

کیا؟ میں نہیں جانتا کب میرا آقا فوت ہوا؟ تم واقعی بہت سادہ ذہن انسان ہو۔

کیا تم میری توہین کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟

نہیں بالکل نہیں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا لیکن تمھیں اس بات پر اتنا متعجب نہیں ہونا چاہیے۔ مزید شراب پیو۔ جہاں تک آقاؤں کا معاملہ ہے، تو یہ ایسا ہی ہے۔ اصل میں اس کشتی کا کوئی مالک نہیں ہے۔

گریکس ایک درخواست۔ اول مجھے مختصراً لیکن جامع طور پر بتاؤ کہ تم کس حال میں ہو؟ سچ تو یہ ہے کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ بے شک تم ان باتوں کو اہمیت مت دو اور جیسی کہ تمھاری فطرت ہے، یوں سمجھو کہ ساری دنیا ان باتوں سے آگاہ ہے۔ لیکن اس مختصر زندگی میں کہ زندگی اصل میں مختصر ہی ہے، گریکس، سمجھنے کی کوشش کرو، تو اس مختصر زندگی میں انسان زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ اپنے خاندان اور خود کو اس میں سے کامیاب گزار دے۔ جیسا دلچسپ شکاری گریکس ہے، اور یہ خوشامد نہیں بلکہ پختہ یقین ہے، کہ اس کے بارے میں سوچنے، اس کے بارے میں کھوج لگانے کی بھی مہلت نہیں ہے، اس کے بارے میں پریشان ہونا تو پھر دور کی بات ہے۔ شاید اپنے بستر مرگ پر، تمھارے جہاز ران کی طرح، یہ میں نہیں جانتا۔ شاید ایک مصروف شخص مرتے ہوئے اتنی مہلت پائے گا کہ پہلی بار پسر کر لیٹ سکے اور سبز شکاری گریکس کے خیال کو اپنی بے سوچوں میں سے گزر جانے دے۔ لیکن اس کے علاوہ، وہی کچھ ہے جیسا میں کہہ چکا ہوں۔ میں تمھارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ کسی کام سے میں یہاں نیچے بندر

گاہ تک آیا تھا۔ یہاں میں نے یہ کشتی دیکھی۔ لنگر بھی نیچے گرا ہوا تھا۔ میں اندر چلا آیا لیکن اب میں تمھارے بارے میں کچھ تفصیلاً جاننا چاہتا ہوں۔

آہ، جامع بات۔ وہی پرانی، بہت پرانی کہانی۔ تمام کتابیں اس سے بھری ہوئی ہیں۔ استاد، ہر سکول میں اسے تختہ سیاہ پر لکھتے ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہوئے، اسی کے خواب دیکھتی ہیں۔ محبت کرنے والے ہم آغوشی کے دوران اسے سرگوشیوں میں سناتے ہیں۔ تاجر اسے اپنے گاہکوں کو، اور گاہک تاجروں کو بتاتے ہیں۔ فوجی اپنی قواعد میں اسے گاتے ہیں، مبلغین کلیسا میں خطبات میں اسے بیان کرتے ہیں، مؤرخین اپنے مطالعے کے دوران یہ جان کر کہ بہت پہلے کیا واقعہ ہوا تھا، حیرت زدہ رہ جاتے ہیں اور اسے لکھتے تھکتے نہیں۔ یہ اخباروں میں چھپتی ہے اور لوگ اسے ایک دوسرے کو منتقل کرتے ہیں۔ ٹیلیگراف اسی باعث ایجاد ہوا تاکہ اسے زیادہ تیزی سے دنیا بھر میں پھیلایا جاسکے۔ اسے تباہ شدہ شہروں سے کھود نکالا گیا اور لفٹیں اسے فلک بوس عمارتوں کی چوٹی کی طرف لے کر چڑھتی ہیں۔ ریل کے مسافر ہر اس قصبہ میں، جہاں ریل قیام کرتی ہے، کھڑکی سے بلند آواز میں لوگوں کو یہی کہانی سناتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی پہلے وحشیوں نے چیخ چیخ کر اسے بیان کیا۔ اسے ستاروں میں پڑھا جاسکتا ہے۔ اور جھیلوں میں یہ منعکس ہوتی ہے۔ ندیاں اسے پہاڑوں سے نیچے میدانوں میں لاتی ہیں اور برف اسے پھر سے خود میں سمیٹ لیتی ہے۔ اور تم یہاں بیٹھے ہو اور مجھ سے ایک مربوط کہانی سنانے کو کہتے ہو۔ تمھاری جوانی غیر معمولی طور پر تعیش پسند رہی ہوگی۔

ممکن ہے، جیسا کہ کسی بھی جوان کا معاملہ ہوسکتا ہے۔ لیکن تمھارے لیے یہ بہت فائدہ مند ہوگا کہ باہر جاؤ اور دنیا کو گھوم پھر کر دیکھو۔ یہ تمھیں بہت عجیب محسوس ہوگی بلکہ یہاں بیٹھ کر یہ مجھے بھی حیرت زدہ کرتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم اپنے قصبے کی ہر گفتگو میں شامل نہیں ہو۔ بہت سے موضوعات پر گفتگو ہوگی لیکن تم ان میں شامل نہیں ہوتے۔ دنیا اسی انداز میں آگے بڑھتی ہے اور تم اپنے سفر میں رہتے ہو۔ لیکن آج تک میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ تم دونوں کے راستے باہم ملے ہوں۔

میرے دوست یہ تمھارے مشاہدات ہیں، دوسرں کے مختلف ہوں گے۔ یہاں صرف دو باتیں ممکن ہیں۔ یا تو چھپا رہے ہو جو کچھ کہ تم میرے بارے میں جانتے ہو اور ایسا تم کسی خاص مقصد کے تحت کر رہے ہو۔ یا پھر تم واقعی ایسا سوچتے ہو کہ تم مجھے نہیں جانتے، کیوں کہ تم میری کہانی کو کسی اور کے ساتھ

الجھا رہے ہو۔اس صورت میں تمھیں اپنی کہانی سنا سکتا ہوں ۔میں، نہیں میں نہیں سنا سکتا۔ سبھی اسے جانتے ہیں اور ان تمام لوگوں میں میں ہی ہوں تمھیں یہ سنائے گا۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ جا کر مؤرخین سے پوچھو۔ان کے پاس جاؤ اور پھر میرے پاس آؤ۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ کیسے میں اسے اتنے پُرہجوم دماغ میں صاف صاف یاد رکھ سکتا ہوں۔

ٹھہرو گریکس، میں اسے تمھارے لیے آسان بنا دوں گا۔ میں تم سے چند سوال پوچھوں گا۔تم کہاں سے آئے ہو؟

ہر کوئی جانتا ہے، سیاہ جنگل سے۔

بے شک سیاہ جنگل سے۔اور کیا ایسا تبھی ہوا، لگ بھگ چوتھی صدی میں، جب تم وہاں شکار کھیلتے تھے۔

اے زندہ انسان، کیا تم سیاہ جنگل کے بارے میں جانتے ہو؟

نہیں!

تم واقعی کچھ نہیں جانتے۔ ملاح کا چھوٹا بچہ بھی شاید تم سے زیادہ جانتا ہوگا۔ کس زمینی طاقت نے تمھیں یہاں بھیجا؟ یہ سب قسمت کا چکر ہے۔تم میری تنہائی میں مخل ہوئے لیکن تمھاری ناخوش گوار عاجزی کا تمھارے پاس اچھا جواز ہے۔تم ایک فرضی وجود ہو جسے میں شراب کے ذریعے مجسم کر رہا ہوں۔تو تم سیاہ جنگل کو بھی نہیں جانتے۔ میں تو وہاں پیدا ہوا تھا۔پچیس برس تک وہاں شکار کھیلتا رہا۔ایک سانبھر مجھے راستے سے نہ بھٹکاتا، خیر یہ بات تم اب جانتے ہو کہ میں نے ایک طویل خوشگوار شکاری زندگی گزاری ہوتی۔لیکن سانبھر مجھے آگے لے گیا۔ میں ایک چٹان سے گرا اور پتھروں سے ٹکرا کر مارا گیا۔ بس اس سے زیادہ کچھ مت پوچھنا۔اب میں یہاں ہوں، مردہ، مردہ، مردہ۔نہیں جانتا کہ یہاں کیوں ہوں؟ مجھے اس موت کی کشتی میں لادا گیا جو ایک بد بخت مردہ انسان کے شایان شان ہے۔تین چار رسمیں بھی ادا کی گئیں۔جیسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔صرف شکاری گریکس کے لیے ہی کیوں خصوصی رعایت کی جاتی۔ ہر بات درست تھی، میں کشتی میں لیٹ گیا۔

اکادمی کو پیش کی گئی رپورٹ کا ایک جزو

ہم سب روٹپیٹر کو جانتے ہیں۔ ہم کیا، آدھی سے زیادہ دنیا اسے جانتی ہے۔ لیکن جب وہ ہمارے قصبے میں خصوصی مظاہرے کے لیے آیا تو میں نے اس سے بالمشافہ ملاقات کرنے کا ارادہ کیا۔ ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ بڑے شہروں میں معروف شخصیت وارد ہو تو ہر کوئی ممکنہ حد تک قریب ہو کر اسے سانس لیتے ہوئے دیکھنے پر اصرار کرتا ہے جس سے کئی قسم کی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ لیکن ہمارے قصبے میں لوگ تماشا گاہ کی سب سے پچھلی نشستوں میں بیٹھ کر انھیں سراہنے پر ہی قانع رہتے ہیں۔ چناں چہ میں ہوٹل میں پہنچا تو ملازم نے بتایا کہ میں قصبے کا واحد شخص ہوں جو روپیٹر سے ملنے آیا ہے۔ تماشاہ گاہ کے مہتمم جناب بوسیناؤ نے مجھے گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔ مجھے یہاں کچھ کچھ شرمیلے مگر اس قدر نفیس انسان سے ملاقات کی توقع نہیں تھی۔ وہ روپیٹر کے کمرے کے باہر استقبالی ہال میں بیٹھا آملیٹ کھا رہا

تھا۔ یہ صبح کا وقت تھا لیکن وہ اپنے رات کے لباس میں ہی تھا جسے پہن کر وہ رات تماشا گاہ میں گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہیں، میں جو ایک غیر معروف، غیر اہم مہمان، جب کہ وہ اعلیٰ امتیازی اعزازات کا حامل، تربیت کاروں کا بادشاہ، اعلیٰ یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں حاصل کرنے والا، اپنی جگہ سے اچھلا، دونوں ہاتھوں سے مجھ سے مصافحہ کیا، مجھے بیٹھنے پر اصرار کیا، اپنا چمچ میز کے او چھاڑ سے پونچھا، اور اسے خلوص سے مجھے پیش کیا تا کہ میں باقی شدہ آملیٹ کھاؤں۔ اس نے میرے عاجزانہ انکار کو قبول نہیں کیا اور فوراً ہی مجھے کھلانے کی کوشش کی۔ مجھے اس کو سمجھانے اور اسے اور اس کی پلیٹ اور چمچ کو دور رکھنے میں کچھ مشکل پیش آئی۔

''آپ کی نوازش ہے کہ یہاں تشریف لائے۔'' اس نے ایک واضح بدیسی لہجہ میں کہا ''بہت نوازش۔ آپ بہت مناسب وقت پر آئے۔ افسوس کہ محترم روٹپیٹر تمام وقت ملاقاتیوں سے نہیں ملتے۔ لوگوں سے ملنا اکثر انھیں بہت ناگوار گزرتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اس سے قطع نظر کہ ملاقاتی کون ہے، کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ملتی۔ میں آپ کو بتاؤں کہ حتیٰ کہ میں بھی صرف کام کے حوالے سے ہی سٹیج پر ان سے ملتا ہوں۔ پھر پروگرام کے اختتام پر میں منظر سے غائب ہو جاتا ہوں۔ وہ تنہا ہی گاڑی پر گھر واپس آتے ہیں۔ خود کو کمرے میں بند کر لیتے ہیں اور عموماً اگلی شام تک یونہی قید رہتے ہیں۔ ان کی خواب گاہ میں ہمیشہ پھلوں کا ایک بڑا ٹوکرہ موجود رہتا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ اسی پر گزر بسر کرتے ہیں لیکن چوں کہ میں انھیں اپنی نظروں سے اوجھل کرنے کی جرات نہیں کر سکتا، ہمیشہ میں ان کے اپارٹمنٹ کے سامنے ہی ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لیتا ہوں تا کہ پردوں کے پیچھے سے ان کی نگرانی کرتا ہوں۔''

''روٹپیٹر جب میں آپ کے سامنے یوں بیٹھتا ہوں، آپ کی گفتگو سنتا ہوں، آپ کی صحت مندی کے جام پیتا ہوں تو اسے چاہے اپنی مدح تصور کیجیے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں واقعتاً یہ بھول جاتا ہوں کہ آپ ایک چیمپینزی ہیں۔ پھر بتدریج میں خود کو خیالات کی دنیا سے حقیقت کی طرف واپس لاتا ہوں، تو مجھے دکھائی دیتا ہے کہ میں دراصل کس کا مہمان ہوں؟''

''ہاں''

''مجھے حیرت ہے کہ آپ کیوں اچانک بالکل خاموش ہو گئے۔ ابھی لمحہ بھر قبل آپ ہمارے قصبے

کے بارے میں حیرت انگیز طور پر درست رائے بیان فرما رہے تھے لیکن اب آپ یکسر خاموش ہیں''

''خاموش؟''

''کیا کوئی پریشانی ہے؟ کیا میں آپ کے استاد گرامی کو بلاؤں؟ شاید یہ آپ کی خوراک کا وقت ہے؟''

''نہیں۔۔۔ نہیں، کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ اصل بات کیا تھی۔ بعض اوقات مجھے انسانوں سے اس قدر تنفرت ہونے لگتی ہے کہ مجھے قے ہوتے ہوتے رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ نفرت کسی خاص انسان سے نہیں ہوتی، کم از کم تم جیسے نفسی انسان سے تو بالکل نہیں۔ اس کا تعلق پوری نوع انسانی سے ہے۔ یہ کیفیت یکسر غیر معمولی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ آپ کو مستقلاً بن مانسوں کے ساتھ رہنا پڑے تو شاید آپ پر بھی ایسی ہی کیفیت کا حملہ ہوگا، چاہے آپ کا ضبط نفس کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو۔ دراصل یہ انسانی کی بُو نہیں ہے جس سے مجھے کراہت محسوس ہوتی ہے، بلکہ یہ انسانی خوشبو ہے جس سے میں جڑا ہوا ہوں اور جو میری اپنی آبائی دھرتی کی خوشبو جیسی ہے۔ خود اپنی خوش بو۔ یہاں میری چھاتی پر، اپنا ناک میرے بالوں میں گھسیڑو۔ اور دبا کر دیکھو''

''مجھے افسوس ہے۔ مجھے تو کوئی خاص خوشبو محسوس نہیں ہوئی۔ بس ایک صحت مند جسم کی عام سی خوشبو۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ایک شہری باشندے کا ناک بلاشبہ کسی ایسی آزمائش کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔ آپ یقیناً ایسی ہزاروں خوشبوؤں کو واضح طور پر محسوس کر سکتے ہیں جنھیں ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔''

''ایک مرتبہ کا ذکر ہے، جناب، ایک مرتبہ کا ذکر۔ یہ ختم ہو جاتا ہے۔''

''آپ نے خود ہی یہ معاملہ اٹھایا ہے تو میں ایک سوال پوچھنے کی جسارت کروں گا۔ آپ کو ہمارے درمیان رہتے ہوئے کتنا عرصہ گزرا ہے؟''

''پانچ برس۔ اپریل کی پانچ کو پانچ سال پورے ہو جائیں گے''

''حیرت انگیز کامیابی۔ پانچ سالوں میں خود کو بندروں کی فطرت سے جدا کرنا اور انسانی ارتقاء کے عمل میں شامل ہونا۔ واقعی اس سے پہلے کسی نے ایسا نہیں کیا۔ اس دوڑ میں آپ کا کوئی حریف نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں یہ بڑی کامیابی ہے۔ بعض اوقات مجھے یہ سب کچھ اپنی سمجھ سے بالاتر محسوس

ہوتا ہے۔ میں فراغت کے لمحوں میں اس بارے میں زیادہ فکر مند نہیں ہوتا۔ کیا تمھیں علم ہے میں کیسے پکڑا گیا؟''

''میں نے آپ کے بارے میں چھپنے ولی ہر تحریر پڑھی ہے۔ آپ کو گولی ماری گئی اور پھر قید کر لیا گیا۔''

''ہاں مجھے دو گولیاں لگی تھیں، ایک یہاں رخسار پر۔ یہ زخم جتنا دکھائی دیتا ہے، اس سے کہیں بڑا ہے۔ اور دوسری یہاں کولھے کے نیچے۔ میں اپنا پاجامہ اتار لوں گا تا کہ آپ اس زخم کو دیکھ سکیں۔ گولی یہاں سے اندر گھسی تھی۔ یہ خاصا شدید اور مہلک زخم تھا۔ میں درخت سے نیچے گر گیا جب مجھے ہوش آیا تو میں جہاز کے عرشوں کے درمیان ایک پنجرے میں قید تھا۔''

''ایک پنجرے میں۔ جہاز کے عرشوں کے درمیان۔ تمھاری کہانی پڑھنا الگ تجربہ ہے، اور اسے سننا بالکل الگ۔''

''اور جناب اسے تجربہ کرنا سراسر الگ۔ جب تک کہ مجھے علم نہ ہوا تھا کہ کوئی راہ فرار نہ ہونے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ یہ کوئی چار دیواری پنجرہ نہیں تھا۔ اسکی تین اطراف تھیں جو ایک مقفل الماری میں میخوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ مقفل الماری چوتھی دیوار تھی۔ یہ ڈربہ اتنا پست قد تھا کہ میں سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اور اتنا تنگ تھا کہ نیچے بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بس یہی کر سکتا تھا کہ جھکے ہوئے گھٹنوں کے ساتھ ایڑیوں پر بیٹھا رہوں۔ نفرت کے شدید احساس کے ساتھ میں نے کسی سے بھی ملنے سے انکار کر دیا اور یوں الماری کے سامنے منہ کیے بیٹھا رہا۔ کئی دن اور کئی راتیں یونہی کانپتے ہوئے گھٹنوں کے ساتھ ایڑیوں پر بیٹھا رہا جب کہ میری پشت میں سلاخیں میرا گوشت کاٹتی رہیں۔ جنگلی جانوروں کو قید کے ابتدائی ایام میں اس انداز میں قید کرنا بہت فائدہ مند تصور کیا جاتا ہے۔ اپنے تجربے کی روشنی میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی نقطہ نگاہ سے معاملہ ایسا ہی ہے۔ لیکن تب مجھے انسانی نقطہ نگاہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے سامنے مقفل الماری تھی۔ تختوں کو چیر ڈالو، ان میں سوراخ بناؤ اور پھر اس سوراخ میں خود کو گھسیٹ دو جو بس اتنا بھی کھلا نہ ہو کہ تم اس میں جھانک سکو اور جب پہلی بار تم اسے دریافت کرتے ہو تو جہالت کی خوش کن چیخ سے اس کا استقبال کرتے ہو۔ تم اس میں سے باہر کہاں جانا چاہتے ہو؟ تختوں سے پرے جنگل شروع ہوتا ہے۔''

(ایک خط کا آغاز)

عظیم دیوارِ چین کی تعمیر کی خبر: ایک جزو

عظیم دیوارِ چین کی تعمیر کی خبر اب دنیا بھر میں پھیل چکی ہے، کافی دیر سے یعنی اس کے اعلان کے تیس سال بعد۔ یہ گرمیوں کی ایک شام تھی۔ تب میں، دس سال کا بچہ، اپنے باپ کے ساتھ دریا کے کنارے کھڑا تھا۔ اس بہت زیادہ زیرِ بحث آنے والے وقت کی اہمیت کے پیشِ نظر مجھے اس کی معمولی تفصیلات بھی صاف یاد ہیں۔ میرا باپ میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھا، جیسا وہ بہت شوق سے اپنے دنوں کے اختتام پر کرتا تھا جب کہ دوسرے ہاتھ سے وہ اپنا پتلا لمبا پائپ پکڑے کش لگاتا جیسے وہ کوئی بانسری ہو۔ ہوا میں لہرانے والی اپنی کھردری اور چھدری داڑھی کے ساتھ وہ سامنے دریا کے پار نظریں جمائے ہوئے اپنے پائپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ نتیجتاً اس کی چھوٹی چٹیا جس کی بچے بہت تعظیم کرتے تھے، نیچے گری ہوئی تھی اور آہستگی سے اس کے چھٹی کے دن پہنے جانے والے سنہری کشیدہ کاری والے دراز لبادے سے رگڑ کھا کر سرسرا رہی تھی۔

اس موقع پر ایک کشتی ہمارے سامنے آ کر رکی۔ ملاح نے میرے باپ کو اشارے سے کنارے سے نیچے اترنے کو کہا جب کہ وہ خود بھی اُچک کر اس کی طرف بڑھا۔ آدھے راستے میں وہ دونوں ملے۔ ملاح نے میرے باپ سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ اس کے بہت قریب ہونے کے لیے وہ اس سے بغل گیر ہوا۔ میں سمجھ سکا ان کے درمیان کیا بات ہوئی۔ میں نے اتنا دیکھا کہ میرا باپ اس خبر پر یقین نہیں

کر پار رہا تھا۔ ملاح نے اپنی بات کی سچائی پر اصرار کیا اور جب میرے باپ نے پھر بھی اس کی بات پر یقین کرنے سے انکار کیا تو اس نے جہاز رانوں کے مخصوص جوشیلے پن کے ساتھ اپنی چھاتی پر سے قمیص کو پھاڑ کر اپنی بات کی سچائی کو ثابت کیا۔ میرا باپ خاموش ہو گیا۔ ملاح تیزی سے واپس اپنی کشتی میں کودا اور کشتی لے کر چلا گیا۔

گہری سوچ میں غرق میرا باپ میری جانب مڑا۔ پائپ کو جھاڑا اور اسے اپنی پیٹی میں اڑس لیا، میرے گال کو تھپتھپایا اور میرے سر کو اپنے جسم کے ساتھ لگا لیا۔ مجھے اپنے باپ کی یہ ادا ہمیشہ بہت پسند تھی۔ اس سے مجھے بہت خوشی ملتی تھی اور یوں ہم واپس گھر آ گئے۔ وہاں چاولوں کی بھاپ دیتی کھچڑی میز پر پروس دی گئی تھی۔ بہت سے مہمان موجود تھے۔ شراب پیالوں میں انڈیلی جا رہی تھی۔ اس گہما گہمی پر کوئی توجہ دیئے بغیر اور دہلیز سے معمولی سا بھی آگے بڑھے بغیر اس نے بلند آواز سے مہمانوں کو وہ بات بتائی جو اس نے ملاح سے سنی تھی۔

اس کے تمام الفاظ صحیح طور پر مجھے یاد نہیں ہیں۔ لیکن غیر معمولی حالات نے جن سے ایک بچے پر بھی جادو آسا اثرات مرتب ہوئے تھے، بات مجھ پر اتنی واضح ہوئی کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو وہی کچھ بتاؤں جو میرے باپ نے کہا تھا۔ میں یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کیوں کہ یہ اس دور میں لوگوں کا عمومی نقطہ نظر تھا۔ میرے باپ نے کچھ اس طرح کہا، ''ایک غیر معلوم ملاح، میں یہاں دریا میں سے گزرنے والے تمام ملاحوں کو جانتا ہوں۔ لیکن وہ اجنبی تھا۔ اس نے بتایا کہ شہنشاہ کی حفاظت کے لیے ایک عظیم دیوار بنائی جائے گی۔ کیوں کہ ایسا لگتا ہے کہ ملحد قبائل، جن میں شیطانی اقوام بھی شامل ہیں، اکثر شاہی محل کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں اور شہنشاہ پر اپنے سیاہ تیروں سے حملے کرتے ہیں۔''

دوستی

ہم پانچ دوست ہیں۔ ایک روز ہم ایک گھر سے فرداً فرداً باہر نکلے۔ پہلا باہر آیا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دوسرا باہر آیا۔ یا پھر وہ سیماب کے ننھے قطرے کی طرح تھرکتا ہوا دروازے کے اوپر سے اڑتا ہوا باہر نکلا اور پہلے کے برابر کھڑا ہو گیا۔ پھر تیسرا آیا پھر چوتھا اور آخر میں پانچواں۔ ہم پانچوں ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ لوگ ہمیں دیکھنے لگے۔ انھوں نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ پانچوں ابھی اس گھر سے باہر آئے ہیں۔ تب سے ہم اکٹھے رہ رہے ہیں۔ یہ زندگی ایسے ہی پر سکون رہے اگر وہ چھٹا ان کا مسلسل پیچھا کرنا چھوڑ دے۔ وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتا لیکن وہ ہمیں بے زار کرتا ہے، اور اتنا نقصان بھی بہت ہے۔ وہ کیوں وہاں گھسنے کی کوشش کرتا ہے جہاں اسے بلایا نہیں جاتا؟ ہم اسے نہیں جانتے اور نہ ہی چاہتے ہیں کہ وہ ہم میں شامل ہو۔

ایسا وقت بھی تھا جب ہم پانچوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے، اور ایسا کہا جا سکتا تھا کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے لیکن جو کچھ ہم پانچوں کے لیے ممکن ہے اور ہم برداشت کر سکتے ہیں، وہ چھٹے کے لیے نہ ممکن ہے اور نہ وہ اسے برداشت کر سکتا ہے۔ قصہ مختصر، ہم پانچ ہیں اور چھ نہیں ہونا چاہتے۔

ہمارے مستقلاً ساتھ رہنے کی کیا منطق ہے؟ یہ سوال ہم پانچوں کے لیے غیر اہم ہے۔ ہم اکٹھے ہیں اور ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ ایک نیا اشتراک، ہم نہیں بنانا چاہتے، صرف اپنے گذشتہ تجربات کی وجہ

سے۔ لیکن اس بات کو چھٹے پر کیسے واضح کیا جائے؟ طویل مباحثے کا مطلب یہی ہوگا کہ اسے بالآخر اپنے گروہ میں شامل کرنے پر مجبور ہو جائیں، اس لیے ہم وضاحت نہ کرنے اور اسے قبول نہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ چاہے وہ کیسے ہی مایوسی سے اپنے ہونٹ لٹکائے، ہم اپنی کہنیوں کے زور سے اسے پرے دھکیل دیتے ہیں لیکن جتنا اسے پرے دھکیلتے ہیں، اتنا ہی وہ ہمارے قریب آ جاتا ہے۔

ملاّح

''کیا میں یہاں ملاح نہیں ہوں'' میں نے پکار کر کہا۔

''تم'' ایک دراز قد، سیاہ شخص نے کہا اور آنکھوں پر ہاتھ پھیرے جیسے نیند کے خمار کو دور کر رہا ہو۔

میں اندھیری رات میں سکان پر کھڑا تھا۔ میرے سر کے اوپر ایک مدہم لالٹین جل رہی تھی اور اب یہ شخص آیا اور اس نے مجھے ایک طرف دھکا دینے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اپنی جگہ سے دست بردار ہونے سے انکار کیا تو اس نے اپنا پیر میری چھاتی پر رکھا اور آہستگی سے مجھے مسلنے لگا جب کہ میں خود کو سکان پر پتوار سے چمٹائے ہوئے تھا اور گرنے سے بچنے کے لیے اسے گھما رہا تھا۔

لیکن اس شخص نے وہ مجھ سے چھین لیا اور واپس اپنی جگہ رکھ دیا اور مجھے پرے دھکیلا۔ میں نے فوراً خود کو سنبھالا، اور جہاز کے عرشوں کے درمیانی راستے پر بھاگا جدھر طعام گاہ کے کمرے تھے اور چیخا ''لوگو! ساتھیو! ادھر آؤ۔ فوراً۔ ایک آدمی نے مجھے سکان سے باہر دھکیل دیا ہے۔'' وہ آہستگی سے اوپر آئے، برابر کا زینہ چڑھتے ہوئے، تھکے ہوئے، جھولتے ہوئے، طاقت ور لوگ۔

''کیا میں ملاح ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

انھوں نے اپنے سر ہلائے، لیکن سب کی نظریں اجنبی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ پھر وہ اس کے گرد نصف دائرے میں کھڑے تھے اور جب تحکمانہ آواز میں اس نے کہا، ''مجھے پریشان مت کرو۔'' تو وہ اکٹھے ہو

گئے۔ میری طرف دیکھ کر سر ہلانے لگے اور برابر کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ یہ کس قسم کے لوگ ہیں؟ کیا یہ کبھی سوچتے ہیں یا محض بے مقصد زمین پر گھسٹ گھسٹ کر چلتے رہتے ہیں؟

دوسرا آدمی

آپ کسی گلی میں گزرتے ہیں۔ گلی ڈھلوانی ہے اور آپ کے سامنے اوپر چڑھتی جاتی ہے۔ آسمان پر پورا چاند ٹنگا ہے۔ آپ کو کچھ فاصلے پر ایک آدمی کا ہیولہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ بھاگتا ہوا آپ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ٹھیک ہے۔ آپ اسے نہیں پکڑیں گے۔ چاہے وہ کتنا ہی ضعیف اور ناتواں اور بے بس ہو اور چاہے کوئی دوسرا آدمی اسے پکارتا ہوا اس کا تعاقب کر رہا ہو، لیکن آپ اسے جانے دیں گے۔

کیوں کہ رات کا وقت ہے، یہ گلی آپ کے چاند کی روشنی تک پہنچنے سے قبل ہی بلند ہو سکتی ہے پھر آپ کچھ نہیں کر پائیں گے۔ ایسا ممکن ہے کہ دونوں محض تفریحاً ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہوں یا غالباً وہ دونوں کسی تیسرے کے تعاقب میں ہوں۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ایک شخص معصوم ہو اور دوسرا اسے قتل کرنا چاہتا ہو۔ اس صورت میں کیا تم دوسرے کے مددگار نہیں بن جاؤ گے؟ یہ امکان بھی موجود ہے کہ دو دونوں ایک دوسرے کو سرے سے جانتے ہی نہ ہوں۔ محض اپنے اپنے گھروں کی خواب گاہوں کی طرف بھاگ رہے ہوں۔ شاید وہ دونوں شب گرد ہیں۔ یا پھر پہلا شخص مسلح ہے۔

بہر طور آپ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ آپ اس واقعے کو نظر انداز کر دیں۔ کیا آپ نے بہت چڑھا رکھی ہے؟ اب آپ مسرود ہوتے ہیں کیوں کہ دوسرا آدمی آپ کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

ایک کتب فروش ''ولیم مینز''

کئی مہینوں سے ایک کتاب فروش ولیم مینز کے دل میں ایک لڑکی سے بات کرنے کی خواہش مچل رہی تھی۔ اس لڑکی سے وہ روزانہ صبح دفتر جاتے ہوئے باقاعدگی سے ایک طویل گلی میں ملتا تھا۔ کبھی ان کی مڈبھیڑ گلی کی ایک نکڑ پر ہوتی اور کبھی دوسری نکڑ پر۔ وہ اتنا جان چکا تھا کہ اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔ وہ خواتین کی موجودگی میں عموماً حواس باختہ اور کم اعتمادی کا شکار ہو جاتا۔ پھر صبح کا وقت کسی ایسی لڑکی سے گفتگو کرنے کے لیے بالکل مناسب نہیں تھا جو خود بھی بہت جلدی میں ہو۔ لیکن کرسمس کے دنوں میں ایک شام یوں ہوا کہ اس نے اسی لڑکی کو اپنے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا۔

اس نے یک بارگی کہا ''محترمہ''۔

وہ مڑی۔ اس نے فوراً اسے پہچان لیا کہ وہ دونوں صبح دفتر جاتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے تھے۔ لیکن اس نے کبھی اس آدمی پر توجہ نہیں دی۔ مینز اس سے مزید کچھ نہیں کہہ سکا اور مایوسی سے اپنے راستے پر ہولیا۔

ایک مرتبہ وہ ایک بہت روشن گلی میں لوگوں کے ایک بڑے ہجوم کے وسط میں کھڑا تھا۔ اس نے وہاں اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر اس کے بالکل قریب جا سکتا تھا لیکن اس فیصلے کے لمحے میں اس کے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں آرہی تھی جس سے وہ اسے مخاطب کرتا۔ تاہم وہ ارادہ کر چکا تھا کہ وہ اب مزید اس لڑکی کے لیے اجنبی نہیں رہے گا۔ وہ اس کے قریب گیا۔ تب ایک حتمی فیصلے کے نتیجے میں اس ذہن میں ایک سنجیدہ خیال پیدا ہوا۔ اس نے خود میں اتنی جرأت محسوس کی کہ آگے بڑھا اور لڑکی کی جیکٹ کے اندر پستانوں کو پکڑ کر جھٹکے سے کھینچا۔ لڑکی نے اس حرکت پر ایسے ظاہر کیا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

گدھ

ایک گدھ اپنی چونچ سے میرے پیروں سے گوشت نوچ رہا تھا۔ اس نے میرے جوتوں کو چیر پھاڑ دیا اور جرابوں کو کھسوٹ لیا تھا اور اب میرے پیروں کا گوشت نوچ رہا تھا۔ بار بار وہ پیروں پر چونچ مارتا، بے چینی سے بار بار میرے گرد چکر کاٹتا، اور پھر واپس اپنے کام میں جٹ جاتا۔ ایک معزز شخص میرے قریب سے گزرا۔ کچھ دیر یہ منظر دیکھا کیا، پھر مجھ سے پوچھا کہ میں کیوں اس گدھ کو برداشت کر رہا تھا۔

''میں بے بس ہوں'' میں نے کہا ''جب یہ آیا اور مجھ پر حملہ کرنے لگا تو میں نے واقعی اسے پرے دھکیلنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا گلا گھونٹنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن یہ بہت طاقتور جانور ہوتے ہیں۔ یہ میرے چہرے پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنے پیروں کی قربانی دینے کو ترجیح دی۔ اب تو قریب قریب یہ کٹ پھٹ ہی گئے۔''

''حیرت ہے تم گدھ کی زیادتی برداشت کر رہے ہو'' معزز شخص نے کہا ''ایک گولی، اور یہ گدھ ختم ہو جائے گا۔''

''کیا واقعی'' میں نے حیرت سے پوچھا ''کیا تم ایسا کرو گے؟''

''بخوشی'' معزز شخص بولا ''مجھے گھر تک جانا ہوگا تا کہ اپنی بندوق لے آؤں۔ کیا تم آدھا گھنٹہ انتظار کر سکتے ہو؟''

''میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا'' میں نے کہا اور کچھ دیر درد سے کراہتا رہا۔ پھر

بولا، ''براہ کرم پھر بھی جلدی آنے کی کوشش کرنا''

''بہت اچھا،'' معزز شخص بولا، ''ممکنہ حد تک جلدی آنے کی کوشش کروں گا''

گفتگو کے دوران میں گدھ نہایت اطمینان سے سن رہا تھا، نظریں میرے اور معزز شخص کے درمیان پھراتے ہوئے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ وہ ہر بات سمجھ گیا تھا۔ اس نے اپنے پر پھیلائے، طاقت حاصل کرنے کے لیے گردن پیچھے گرائی اور پھر نیزہ پھینکنے والے کی طرح اپنی چونچ میرے منہ میں گھسیڑ دی، میرے بہت اندر تک۔ پھر اس نے گردن پیچھے کھینچی تو اسے میرے خون میں غرق محسوس کر کے مجھے دلی طمانیت ہوئی، جو ہر گہرائی میں گر رہا، ہر ساحل کو بھگو رہا تھا۔

لٹو

ایک فلسفی کی عادت تھی کہ جہاں بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتا، وہاں کھڑا ہو جاتا۔اور جب وہ کسی لڑکے کو لٹو پکڑے ہوئے دیکھتا تو انتظار کرتا۔ جونہی لٹو زمین پر گھومتا، فلسفی آگے بڑھتا اور اسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ وہ بالکل باز نہ آتا جب بچے اس کی حرکت پر احتجاج کرتے اور اسے اپنے کھلونے سے روکنے کی کوشش کرتے۔ گھومتے ہوئے لٹو کو پکڑ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہتی لیکن یہ مسرت لمحہ بھر باقی رہتی۔ فوراً ہی وہ لٹو کو پھر سے زمین پر پھینک دیتا اور ایک طرف چل دیتا۔

اسے یقین تھا کہ کسی ایک تفصیل کا فہم، مثال کے طور پر ایک گھومتے ہوئے لٹو کا فہم ہر شے کے فہم کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اسی باعث اس نے خود کو بڑے مسائل میں الجھنے نہیں دیا جو اسے غیر ضروری معلوم ہوئے۔ ایک مرتبہ جب کوئی معمولی بات سمجھ میں آ گئی تو پھر ہر بات سمجھ میں آ جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے خود کو صرف گھومتے ہوئے لٹو تک محدود رکھا۔

جب کبھی لٹو گھمانے کی تیاری کی جاتی تو وہ امید کرتا کہ اس مرتبہ وہ ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ جونہی لٹو گھومتا، وہ بے تحاشا اس کی طرف لپکتا۔ امید یقینی ہو جاتی۔ لیکن جب وہ لکڑی کے بے کار ٹکڑے کو ہاتھ میں پکڑتا تو اس کی طبیعت مکدر ہونے لگتی۔ بچوں کی چیخم دھاڑ، جو اب تک اسے سنائی نہ دی ہوتی تھی، اب اچانک اس کے کان پھاڑنے کے درپے ہو جاتی۔ دور تک اس کا تعاقب کرتی اور وہ ایک بھونڈی رسی کے زور پر گھومتے ہوئے ایک لٹو کی طرح لڑکھڑتا۔

راہبی الیسٹر اور اس کا شاگرد

چار دوست اپنے بڑھاپے میں صیہونی فقہ کے بڑے عالم بن گئے۔ لیکن ہر ایک کا مقدر مختلف تھا۔ ایک پاگل ہو گیا، ایک مر گیا، راہبی الیسٹر چالیس برس کی عمر کے بعد دہریہ بن گیا۔ صرف ایک دوست ''ایکیو'' جس نے چالیس برس کی عمر کے بعد مطالعہ شروع کیا تھا، مکمل علم حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ راہبی الیسٹرز کا شاگرد ایک پارسا شخص تھا۔ اس کا نام راہبی ''میئر'' تھا۔ وہ اس قدر پارسا تھا کہ اس کی پارسائی اپنے استاد کے معتقدات سے بھی مجروح نہیں ہوئی۔ اس کے بقول وہ باداموں کی گری کھاتا تھا اور چھلکا پھینک دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ہفتہ کے روز الیسٹرز گھڑسواری کرتا ہوا قصبے سے باہر گیا۔ راہبی میئر اس کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صیہونی فقہ کی ایک کتاب تھی۔ وہ صرف دو ہزار قدم چلا۔ ہفتے کے روز اسے اس سے زیادہ چلنے کی اجازت نہیں تھی۔ جبھی اس سفر سے ایک علامتی تقاضا اور اس کا جواب جنم پذیر ہوا۔ چناں چہ راہبی میئر استاد سے بولا ''اپنے لوگوں میں واپس آجاؤ''

راہبی الیسٹرز نے ہنس کر اسے ٹال دیا۔

پُل

میں بے لوچ اور سرد تھا۔ میں ایک پل تھا۔ میں ایک پہاڑی نالے پر لیٹا تھا۔ میرے پنجے ایک کنارے پر ٹکے ہوئے تھے اور میرے ہاتھوں کی انگلیاں دوسرے کنارے پر۔ میں نے خود کو شکستہ گارے میں مضبوطی سے گاڑ دیا تھا۔ میرے کوٹ کے پلو میرے دونوں جانب پھڑ پھڑا رہے تھے۔ بہت نیچے مچھلیوں سے بھری سرد برفیلی ندی شور مچاتی بہہ رہی تھی۔ کوئی سیاح بھٹک کر اس دشوار گزار بلندی تک نہیں آتا تھا۔ ابھی کسی نقشے پر یہ پل نہیں بنا تھا۔ چناں چہ میں لیٹا اور انتظار کرتا رہتا۔ میں صرف انتظار کر سکتا تھا۔ بغیر منہدم ہوئے کوئی پُل جب ایک بار بن جائے تو پھر وہ قائم رہتا ہے۔

ایک دن شام ہو رہی تھی۔ یہ پہلی شام تھی یا ہزارویں۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے خیالات ہمیشہ الجھے ہوئے رہتے اور مستقلاً ایک دائرے میں گھومتے رہتے تھے۔ موسم گرما کی شام ہونے والی تھی، ندی کا شور زیادہ گہرا ہو گیا تھا، جب میں نے انسانی قدموں کی آہٹ سنی۔ میری طرف، میری طرف۔

اے پل! خود کو مضبوط بناؤ۔ اپنے بغیر جنگلے کے ستونوں کو درست کرو۔ تاکہ اس راہ گیر کو سنبھال سکو جو تم پر اعتماد کر کے آ رہا ہے۔ اگر اس کے قدموں میں بے یقینی پیدا ہو تو ان کی رفتار میں مخل ہوئے بغیر ان میں استحکام پیدا کرو۔ لیکن اگر وہ لڑکھڑائیں تو اسے دکھاؤ کہ تم کس شے سے بنے ہو اور پہاڑوں کے دیوتاؤں کی طرح اسے دور زمین پر اچھال دو۔''

وہ آگے آیا۔ اس نے اپنی چھڑی کی جستی نوک سے مجھے ٹھوکا دیا۔ اس نے نوک سے میرے کوٹ کے پلوؤں کو اٹھایا اور انھیں ترتیب سے مجھ پر رکھ دیا۔ پھر چھڑی کی نوک میرے الجھے ہوئے بالوں میں گھسیڑ دی اور دیر تک اسے وہیں رکھا۔ بے شک مجھے فراموش کرتے ہوئے اس نے جوش سے اپنے اردگرد دیکھا۔ میں تصور ہی میں اس کا وادی میں اور پہاڑ پر تعاقب کر رہا تھا۔ وہ اپنے دو پیروں پر اچھل کر میرے جسم کے درمیان میں آ گیا۔ میں یہ جانے بغیر کہ کیا ہوا تھا، شدید درد سے کراہا۔ یہ کون تھا؟ ایک بچہ؟ ایک خواب؟ ایک آوارہ گرد؟ خودکشی کرنے والا؟ ورغلانے والا؟ تباہ کرنے والا؟ اسے دیکھنے کے لیے میں مڑا۔ ایک پل مڑ گیا۔ ابھی مکمل طور پر مڑا نہیں تھا کہ میں نیچے گرنے لگا۔

میں گرا اور لمحہ بھر میں ان نوکیلے پتھروں نے مجھے توڑ پھوڑ دیا اور چھید ڈالا جو بھاگتے ہوئے پانی میں سے مجھے نہایت پرامن نگاہوں سے اوپر دیکھا کرتے تھے۔

مراجعت

میں لوٹ آیا ہوں۔ میں ایک محراب تلے سے گزرا ہوں اور اردگرد دیکھ رہا ہوں۔ یہ میرے باپ کے گھر کا پرانا صحن ہے۔ وسط میں غلیظ پانی کا جوہڑ ہے۔ پرانے، بے کار اوزار بے ترتیبی سے پڑے اور بالاخانے کو جاتی سیڑھیوں کے راستے میں حائل ہیں۔ ایک بلی جنگلے کے ساتھ لیٹی ہے۔ کپڑے کا ایک کٹا پھٹا ٹکڑا، جسے کبھی کسی کھیل میں ایک چھڑی سے باندھ کر استعمال کیا گیا، تیز ہوا میں پھڑ پھڑا رہا ہے۔ میں پہنچ گیا ہوں لیکن کون میرا استقبال کرے گا؟ باورچی خانہ کے دروازے کے عقب میں کون میرا انتظار کر رہا ہے؟

چمنی سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ رات کے کھانے کے لیے کافی تیار ہو رہی ہے۔ کیا تمھیں ایسا لگتا ہے کہ تمھارا اس گھر سے کوئی تعلق ہے؟ کیا تم خود کو پرسکون محسوس کرتے ہو؟ میں نہیں جانتا۔ میں غیر یقینی پن کا شکار ہوں۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے لیکن یہاں ہر شے ایک دوسرے سے بیگانہ معلوم ہوتی ہے جیسے اپنے اپنے معاملات میں الجھی ہوئی ہو، جن میں سے کچھ کو میں بھلا چکا ہوں اور کچھ کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔

مجھ سے انھیں فائدہ ہی کیا ہو سکتا ہے؟ میری ان کے نزدیک بھلا کیا حیثیت؟ حالاں کہ میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں جو ایک بوڑھا کسان ہے۔ لیکن مجھے باورچی خانے کے دروازے پر دستک دینے کی ہمت نہیں ہوتی۔ کچھ فاصلے پر کھڑا اندر سے آتی آوازیں سنتا ہوں۔ یہاں ایسے کھڑا ہوں کہ کوئی مجھے بے

اجازت اندر گھس آنے والے کے طور پر پکڑ نہیں سکتا۔ چوں کہ میں بہت فاصلے پر کھڑا سن رہا ہوں، مجھے گھر کے اندر لگے گھڑیال کی مدہم ٹک ٹک سنائی دیتی ہے جو میرے بچپن کی آوازوں میں شامل ہے۔ لیکن شاید یہ محض میرا خیال ہے کہ میں اسے سن رہا ہوں۔ باورچی خانے میں اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ وہاں بیٹھے افراد کا ایک راز ہے۔ ایسا راز جسے وہ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ آپ دروازے سے باہر کھڑے جتنی دیر ہچکچاہٹ محسوس کریں گے، اتنی ہی آپ اس سے بیگانگی محسوس کریں گے۔ کیا ہوا اگر کوئی دروازہ کھولے اور مجھ یوں کھڑے ہونے کا مقصد پوچھے تو کیا میں خود بھی اس شخص کی مانند اپنا راز چھپانے کی کوشش نہیں کروں گا؟

اسے بھول جاؤ

ابھی بہت سویر تھی۔ گلیاں صاف ستھری اور ویران تھیں۔ میں سٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ٹاور کے گھڑیال سے اپنی گھڑی کا وقت ملایا تو معلوم ہوا کہ مجھے میری توقع سے کہیں زیادہ دیر ہو چکی تھی اور یہ کہ مجھے تیز تیز چلنا چاہیے۔ اس نئی پریشانی سے مجھے اپنے راستے کی درستگی پر بھی شک پیدا ہوا۔ میں ابھی اس قصبے سے پوری طرح شناسا نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے قریب ہی مجھے ایک سپاہی کھڑا دکھائی دیا۔ میں لپک کر اس تک پہنچا اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اس سے سٹیشن کا راستہ معلوم کیا۔ وہ مسکرایا اور بولا ''تم مجھ سے راستہ پوچھ رہے ہو؟''

''ہاں'' میں نے جواب دیا ''میں خود اسے تلاش نہیں کر پا رہا۔''

''اسے رہنے دو' اسے بھول جاؤ'' وہ بولا، اور ایک فوری جھٹکے سے میری طرف اپنی پیٹھ پھیر لی جیسے کوئی اپنے قہقہے کے ساتھ اکیلا رہنے کا خواہش مند ہو۔

اس کا حصہ

وہ اسی لائق ہے کہ اسے ایک گمنام بوڑھی عورت دی جائے جس کی رانیں سکڑی ہوئی ہوں اور جو اس کے مردانہ جوہر کو فوراً ہی بہہ جانے پر مجبور کرے۔ پھر پیسے اپنی جیب میں ڈالے اور عجلت میں دوسرے کمرے میں چلی جائے جہاں دوسرا گاہک اس کا منتظر ہو۔

ایک مشترک الجھن

ایک مشترکہ تجربہ ایک مشترکہ الجھن کو جنم دیتا ہے۔

الف کو 'ج' مقام پر 'ب' سے ایک اہم معاملہ طے کرنا تھا۔ وہ ابتدائی گفتگو کے لیے 'ج' جاتا ہے۔ دس منٹ میں یہ سفر طے کرتا ہے اور اتنے ہی وقت میں لوٹ آتا ہے۔ گھر آ کر اہل خانہ سے اپنی اس مہم سے متعلق شیخیاں بگھارتا ہے۔

اگلے دن وہ پھر سے 'ج' جاتا ہے تاکہ معاملے کو حتمی صورت دی جا سکے۔ چوں کہ اس میں اندازے کے مطابق کئی گھنٹے لگ سکتے تھے، اس لیے الف صبح سویرے ہی نکل پڑتا ہے۔ اور اگرچہ اردگرد تمام صورت حال، کم از کم الف کی توقع کے مطابق، ویسی ہی رہتی ہے جیسی یہ ایک روز پہلے تھی، لیکن اس بار اسے 'ج' پہنچنے میں دس گھنٹے لگتے ہیں۔ وہ شام کو تھکن سے نڈھال وہاں پہنچتا ہے تو اسے بتایا جاتا ہے کہ 'ب' اس کی غیر موجودگی سے ناراض ہو کر آدھ ایک گھنٹہ پہلے ہی اس کے گاؤں کی طرف روانہ ہو چکا ہے اور ضرور وہ راستے میں ایک دوسرے کے قریب سے گزرے ہوں گے۔ 'الف' کو وہاں انتظار کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ لیکن اپنے کام کی بے چینی کی وجہ سے واپس گھر چل پڑتا ہے۔

اس بار وہ سفر پر قطعاً کچھ توجہ دیے بغیر محض لمحہ بھر میں اسے مکمل کر لیتا ہے۔ گھر پہنچنے پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ 'ب' صبح اس کی روانگی کے محض لمحہ بھر بعد ہی یہاں پہنچ گیا تھا۔ بلاشبہ دونوں کی ملاقات گھر کے دروازے کی دہلیز پر ہوئی تھی۔ 'ب' نے اس معاملے سے متعلق یاد دلایا تھا لیکن الف نے جواب دیا تھا کہ اس کے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ اسے فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔

'الف' کے اس غیر موافق رویے کے باوجود 'ب' اس کی واپسی کے انتظار میں وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ اب تک کتنی ہی بار گھر والوں سے پوچھ چکا تھا کہ 'الف' لوٹا تھا یا نہیں، اور اوپر 'الف' کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ 'ب' سے فوری ملاقات اور اسے تمام صورت حال کی وضاحت کرنے کا موقع ملنے کی خوشی میں 'الف' لپکتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا ہے۔ اوپر آخری سیڑھی پر پہنچ کر وہ لڑکھڑاتا ہے، اپنی ایک نس کو دبا کر مروڑتا اور شدت کرب سے نیم بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس کے گلے سے آواز نہیں نکل پاتی۔ محض اندھیرے میں نقاہت سے کراہتا ہے۔

تب نہیں جانتے ہوئے کہ آواز قریب سے آ رہی تھی یا بہت دور سے، وہ سنتا ہے کہ 'ب' شدید غصے میں تیز تیز قدموں سے سیڑھیوں سے نیچے اترتا اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔

روانگی

میں نے حکم دیا کہ اصطبل سے میرا گھوڑا لایا جائے۔ ملازم میرے حکم کو نہیں سمجھ سکا۔ لہذا میں خود ہی اصطبل تک گیا۔ اپنے گھوڑے پر زین کسی اور اس پر سوار ہو گیا۔ مجھے کچھ فاصلے سے بگل کی آواز سنائی دی۔ میں نے ملازم سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ وہ کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اس نے کچھ سنا تھا۔ دروازے پر اس نے مجھے روکا اور پوچھا ''میرا مالک کہاں جا رہا ہے؟''

''میں نہیں جانتا'' میں نے کہا ''بس یہاں سے دور۔ یہاں سے دور، اور اس کے علاوہ اور کہیں نہیں۔ صرف یہی راستہ ہے کہ میں اپنے مقصد کو پالوں۔''

''کیا آپ کو اپنے مقصد کا علم ہے؟''

''ہاں'' میں نے جواب دیا ''میں نے ابھی تمھیں بتایا کہ یہاں سے دور۔ یہی میری منزل ہے۔''

تنہا عورت

ایک عورت چرخے کے تکلے پر بیٹھی ہے۔ایک شخص اپنی تلوار جو اس کی میان میں ہے، کے جھٹکے سے دروازہ کھولتا ہے۔تلوار پر اس کے ہاتھ کی گرفت کمزور پڑ جاتی ہے۔

مرد۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ یہیں ہے۔

عورت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کون؟تم کیا چاہتے ہو؟

مرد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گھوڑوں کا چور۔وہ یہیں چھپا ہے۔مجھ سے جھوٹ مت بولو(وہ تلوار کو گھماتا ہے)

عورت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(اپنے بچاؤ کے لیے تکلے کو اپنے سامنے بلند کرتی ہے) یہاں کوئی نہیں تھا۔مجھے تنہا رہنے دو۔

ایک دیہاتی معالج

اکادمی کو پیش کی گئی ایک رپورٹ

معزز اراکین اکادمی!

آپ نے مجھے یہاں مدعو کر کے یہ اعزاز بخشا کہ میں اپنی سابقہ زندگی، جو میں نے ایک بن مانس کی حیثیت سے گزاری ہے، کا احوال اکادمی کے سامنے پیش کروں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی خواہش کو ایک حد سے زیادہ پورا نہیں کر سکوں گا۔ تقریباً پانچ برس ہو گئے جب میں صرف ایک بن مانس تھا۔ آپ کے کیلنڈر کے مطابق شاید ایک مختصر وقفہ، لیکن تیز تر رفتار سے بھاگنے کا لامحدود طویل وقفہ، جو میں نے بہترین اتالیقوں، اچھے مشوروں، عوام کی تعریف و تحسین اور آرکسٹرا کی موسیقی کی ہمراہی میں گزارا۔ لیکن اصلاً تنہائی میں، کہ جو لوگ میرے ساتھ تھے، انھوں نے تربیت کی غرض سے خود کو دور ہی رکھا۔ یہ کامیابی ناممکن ہوتی اگر میں ہٹ دھرمی سے اپنی اصل، نوجوانی کی یادوں سے جڑا رہنے کی ضد کرتا رہتا۔ اصل میں اسی ڈھٹائی کا ناش وہ اعلیٰ ترین حکم تھا جو میں نے اپنے آپ کو دیا۔ مجھ جیسے آزاد جانور نے خود ہی اپنی آزادی کے خاتمے کو اپنا منتہا تصور کر لیا۔ انتقام کے طور پر ماضی کی یادداشت نے زیادہ سے زیادہ مجھ پر اپنے دروازے بند کر لیے۔ اگر مجھے انسان ایسا کرنے دیتے تو شروع ہی میں میں لوٹ سکتا تھا اسی راستے سے اتنا کھلا ہے جتنا زمین پر پھیلا آسمان، لیکن جب میں نے جبراً خود کو اپنے خودساختہ انسانی مستقبل میں جھونک لیا تو یہ راستہ تنگ ہوتا ہوا سکڑ کر فنا ہو گیا۔

میں خود کو انسانی دنیا میں زیادہ آرام دہ محسوس کرتا اور اسے اپنے لیے زیادہ موافق پایا۔ میرے

ماضی سے جو تیز ہوا آتی تھی، آہستہ آہستہ دھیمی پڑتی گئی۔ آج یہ یاد محض ہوا کے ایک نرم جھونکے جیسی ہے جو میری ایڑی کے گرد چکر کھاتی ہے اور فاصلے پر موجود وہ سوراخ جس سے یہ جھونکا آتا ہے اور جس سے ایک روز میں خود بھی برآمد ہوا تھا، اتنا مختصر ہو چکا ہے کہ اگر میری طاقت اور قوت ارادی مجھے واپس لے جانے کے لیے کافی ہو، تب بھی میں اس میں سے رینگتے ہوئے اپنی کھال نچوا بیٹھوں گا۔ آسان الفاظ میں بیان کروں گا جیسے میں خود کو علامتوں کی صورت میں بیان کرنا پسند کرتا ہوں، کہ اس کا سادہ بیان یہ ہے کہ معزز حضرات بن مانس کے طور پر آپ کا زندگی کا تجربہ یعنی جس حد تک ایسی کوئی شے آپ کے ماضی کا حصہ ہے، وہ آپ کی ذات سے اتنا زیادہ ختم نہیں کیا جا سکتا، جتنا یہ مجھ میں ختم ہوا۔ لیکن پھر دنیا میں ہر کوئی اپنی ایڑی پر گدگداہٹ محسوس کرتا ہے چاہے وہ کوئی چھوٹا چمپینزی ہو یا ہرکیولیس۔

لیکن کسی نہ کسی حد تک میں آپ کا مطالبہ پورا کر سکتا ہوں اور بلاشبہ میں ایسا بہت خوشی کے ساتھ کروں گا۔ پہلی بات جو میں نے سیکھی وہ ہاتھ ملانا تھی۔ ہاتھ ملانے سے بے تکلفی کا اظہار ہوتا ہے۔ آج جب کہ میں اپنے کیریئر کی بلندی پر کھڑا ہو، تو امید کرتا ہوں کہ اس پہلے مصافحے کی بے تکلفی کو بیان کرتے ہوئے الفاظ میں بے تکلفی اضافہ کروں۔ اکادمی کو جو معلومات میں فراہم کروں گا، ان میں کوئی بات نئی نہیں ہوگی۔ اور نہ ہی ان کا دور کا بھی تعلق اس سوال سے ہوگا جو آپ نے مجھ سے پوچھا ہے اور جو چاہے بہترین ہی کیوں نہ ہو، میں انھیں بیان نہیں کر پاؤں گا۔ تاہم اسے اس سیدھی لکیر کے بارے میں ضرور بتانا چاہیے جس پر چلنا انسانوں کی دنیا میں داخل ہونے اور خود کو وہاں مستحکم کرنے کے لیے ایک قدیم بن مانس کے لیے ضروری ہے۔ پھر بھی میں ایسی اہم معلومات جو کہ میں آپ کو دینے جا رہا ہوں، لفظوں میں بیان کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکا جیسے میں اپنے بارے ہی میں پر یقین نہیں تھا اور جیسے ابھی تک مہذب دنیا کے عظیم ورائٹی سٹیجوں پر میری حیثیت ناقابل تنقید نہ ہوئی ہو۔

میرا تعلق گولڈ گوسٹ سے ہے۔ اپنی گرفتاری کی کہانی بیان کرنے کے لیے مجھے دوسروں کے بیانات پر اعتبار ہوگا۔ ایک ادارے ہیگن بیک طرف سے ایک شکاری مہم جاری کی گئی۔ اب تک اس مہم کے سربراہ کے ساتھ میں اچھی سرخ وائن کے کتنے ہی جام پی چکا ہوں۔ شکاری ساحل کے قریب جھاڑیوں میں گھات لگائے بیٹھے تھے جب میں بن مانسوں کے ایک ٹولے کے ساتھ شام کو پانی پینے نکلا۔ انھوں نے ہم پر گولی چلائی۔ صرف مجھے ہی گولی لگی۔ مجھے دو گولیاں لگیں۔

ایک زخم میرے رخسار پر آیا۔ معمولی سا زخم لیکن یہ میرے گال پر ایک بڑا ''ننگا'' سرخ نشان چھوڑ گیا جس کی وجہ سے مجھے ''سرخ پیٹر'' کا نام دیا گیا۔ ایک بہت برا نام، قطعی غیر مناسب نام جو چند ہی بن مانسوں کے دماغ میں آسکتا ہے، لیکن میرے رخسار پر یہ نشان میرے اور تماشا گر بن مانس پیٹر کے درمیان واحد فرق ہے، جسے فوت ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور جس کی آس پاس کافی شہرت تھی۔ خیر یہ بات بر سبیل تذکرہ ہوئی ہے۔

دوسری گولی میرے کولھوں کے نیچے لگی۔ یہ بہت سنگین زخم تھا۔ اسی کی وجہ سے میں آج بھی کچھ لنگڑا کر چلتا ہوں۔ حال ہی میں مجھے ایک مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا، جسے ان دس ہزار باتونی افراد میں سے ایک نے لکھا تھا جنھوں نے میرے بارے میں اخبارات میں مختلف طرح کے بیانات دیے ہیں کہ میری بندروں کی فطرت ہنوز میرے قابو میں نہیں ہے، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب لوگ میری خیریت دریافت کرنے آتے ہیں، تو میں فوراً اپنا پاجامہ نیچے ڈھلکا کر انھیں زخم کا نشان دکھاتا ہوں۔

وہ ہاتھ، جس نے یہ مغلظات لکھی ہیں، اس کی انگلیوں کو ایک ایک کر کے گولی مار کر اڑا دینا چاہئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں جس کے سامنے چاہوں، اپنا پاجامہ اتار سکتا ہوں۔ آپ کو وہاں زخم کے نشان اور خوب ابھری ہوئی کھال کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ مجھے یہاں ایک خاص مقصد کے لیے ایک خاص لفظ کا انتخاب کرنے کی اجازت دیجئے تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ ''یہ زخم ایک شوخ و چنچل گولی نے لگایا۔''

ہر بات واضح اور جائز ہے۔ کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب واضح حقیقتیں زیر بحث ہوں تو اعلیٰ اذہان ان معمولی تکلفات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ مضمون نگار خود اپنے کسی ملنے والے کے سامنے اپنا پاجامہ اتار دے تو پھر یہ ایک دوسری کہانی ہوگی اور میں اسے اس کا اعزاز سمجھوں گا اگر وہ ایسا نہ کرے۔ اس کے بدلے میں وہ اپنی نفیس حساسیت کو مجھ پر ٹھونسنے کی کوشش نہ کرے۔

ان دو گولیوں کے بعد جب مجھے ہوش آیا، اور یہیں سے میری اپنی یادداشت بتدریج شروع ہوئی، ہیگن بیک کے بحری جہاز میں عرشوں کے درمیان ایک پنجرے میں۔ یہ پنجرہ سلاخوں کی چار دیواروں والا ڈربہ نہیں تھا۔ یہ تین دیواروں والا پنجرہ تھا جسے ایک مقفل الماری کے ساتھ جوڑا گیا تھا۔ یہ الماری اس

کی چوتھی دیوار تھی۔ ڈربے کی چھت اتنی پست تھی کہ میرے لیے کھڑے ہونا ممکن نہیں تھا، اور اتنی تنگ تھی کہ میں بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ چناں چہ مجھے تمام وقت جھکے ہوئے گھٹنوں کے ساتھ دو زانو بیٹھنا پڑا، مسلسل کانپتے ہوئے۔ اور چوں کہ غالباً کچھ وقت کے لیے مجھے کسی کو دیکھنے کی خواہش نہیں تھی، مجھے گہری تاریکی میں رہنا پڑا۔ میرا چہرہ الماری کی طرف مڑا ہوتا جب کہ میرے عقب میں پنجرے کی سلاخیں میری پیٹھ کا گوشت کاٹتیں۔ جنگلی جانوروں کو ان کے ابتدائی ایام اسیری میں اس انداز سے قید رکھنے کے بہت سے فائدے تصور کیے جاتے ہیں اور اپنے تجربات کے پیش نظر میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی نقطۂ نگاہ سے یہ معاملہ واقعتاً ایسا ہی ہے۔

لیکن تب میں نے ایسا نہیں سوچا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کوئی راہ فرار دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کم از کم کوئی براہ راست فرار کا راستہ۔ میرے بالکل سامنے الماری تھی۔ ہر طرف تختے سے تختہ جڑا ہوا تھا۔ یہ سچ ہے، یہ سچ تھا کہ وہاں تختوں کے درمیان ایک مختصر سی درز تھی جسے پہلی بار دریافت کرنے پر میں نے جوش مسرت سے احمقانہ قہقہہ لگایا تھا۔ لیکن وہ درز اتنی تنگ تھی کہ اس میں سے دُم بھی نہیں گزر سکتی تھی اور نہ ہی ایک بن مانس اپنی تمام تر قوت کے ساتھ اسے مزید چوڑا کر سکتا تھا۔

یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ وہاں مجھے غیر معمولی طور پر کم گو جانور تصور کیا گیا جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ یا تو میں جلد ہی مر جاؤں گا اور اگر بچ گیا تو میری تربیت کا ابتدائی مرحلہ یقینا بہت سہل ہوگا۔ میں بچ گیا۔ مایوسی سے آہیں بھرتے، کرب کے ساتھ مکھیاں شکار کرتے، بے پرواہی سے ناریل کو چاٹتے، اپنا سر الماری کی دیوار سے پٹختے، اپنے نزدیک آنے والے ہر شخص کو زبان نکال کر منہ چڑاتے ہوئے۔ یوں میں نے اپنی نئی زندگی کا ابتدائی دور گزارہ۔ لیکن ان سب سے ماورا بس ایک ہی احساس کارفرما تھا کہ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بے شک تب میں نے ایک بن مانس کے طور پر جو محسوس کیا، اسے صرف انسانی الفاظ ہی میں بیان کر سکتا ہوں اور اسی لیے انھیں صحیح طور پر پیش نہیں کر پاتا۔ لیکن اگر چہ میں اُس قدیم بن مانس کے سچ تک واپس نہیں پہنچ سکتا، اس لیے اس میں شک نہیں ہے کہ یہ کہیں اسی سمت میں موجود ہے جس طرف میں نے اشارہ کیا۔

تب تک میرے پاس ہر طرح کی راہ فرار موجود تھی۔ لیکن اب کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ مجھے جکڑ لیا گیا۔ اگر مجھے کیلوں سے ٹھونک دیا جاتا تب بھی بھاگ جانے کا میرا حق ذرا بھی کم نہ ہوتا۔ آخر کیوں؟

اپنے پنجوں کے درمیان سے گوشت نوچئے، تب بھی آپ کو جواب نہیں ملے گا۔ خود کو اپنے پیچھے کھڑی سلاخوں میں اتنے زور سے دبایئے کہ وہ آپ کو دو حصوں میں کاٹ دیں، تب بھی آپ کو جواب نہیں ملے گا۔ میرے لیے کوئی راہ فرار نہیں تھی لیکن مجھے کوئی تدبیر بہر طور کرنی تھی۔ کیوں کہ اسی سے میری زندگی کی ضمانت ممکن تھی۔ اس لکڑی کی دیوار کے سامنے بیٹھے ہوئے اس عرصے میں مر چکا ہوتا۔ جہاں تک ہیگن بیک کا تعلق ہے، بن مانسوں کے لیے جگہ یہی مقفل الماری کے سامنے ہی تھی۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے ایک بن مانس کی حیثیت سے خود کو ختم کرنا ہوگا۔ سوچ کا ایک عمدہ اور واضح بہاؤ جسے مجھ کو کسی طرح اپنے پیٹ کی مدد سے قائم کرنا تھا، کہ بن مانس اپنے پیٹ سے ہی سوچتے ہیں۔

مجھے خدشہ ہے کہ غالباً آپ بالکل ہی نہیں سمجھ پائے کہ 'راہ فرار' سے میری کیا مراد ہے۔ میں نے یہ لفظ اس کے مکمل اور انتہائی معروف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ میں جان بوجھ کر لفظ ''آزادی'' کے استعمال سے گریز کرتا ہوں۔ اس سے میری مراد ہر سمت میں آزادی کا کشادہ احساس نہیں ہے۔ ایک بندر کی حیثیت سے غالباً میں ان معنوں کو جانتا تھا اور میں ایسے لوگوں سے ملا ہوں جو ایسی آزادی کے خواہاں تھے۔ لیکن اپنے معاملے میں ایسی آزادی کی خواہش نہ میں نے تب کی اور نہ ہی اب ہے۔

برسبیل تذکرہ بتاتا چلوں کہ اکثر و بیشتر افراد آزادی کے لفظ سے غلط مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ چوں کہ آزادی نفیس انسانی احساسات میں سے شمار ہوتی ہے، اسی لیے اس سے متعلق مایوسی بھی معمولی نہیں ہوتی۔ ورائٹی تھیئٹروں میں اپنی باری شروع ہونے سے پہلے میں نے اکثر قلابازوں کے ایک جوڑے کو چھت سے لٹکے جھولوں پر کرتب دکھاتے دیکھا۔ وہ خود کو جھلاتے ہیں۔ ادھر اُدھر گھومتے ہیں، ہوا میں چھلانگیں لگاتے ہیں، ایک دوسرے کے بازوؤں میں جھولتے ہیں، ایک کے بال دوسرے کے دانتوں کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ بھی انسانی آزادی ہے۔ ضبط نفس کے ساتھ کی جانے والے حرکات'۔ مقدس مادرانہ فطرت کی سراسر تضحیک۔ کیا یہ تماشا بن مانسوں کو دکھایا جائے گا؟ شاید ہی کسی تھیٹر کی دیواریں ان کے بلند و آہنگ قہقہوں کو سہار سکیں۔

نہیں، آزادی وہ شے نہیں ہے جس کی میں نے خواہش کی۔ صرف ایک راہ فرار، دائیں بائیں یا کسی بھی سمت میں۔ میرا اور کوئی مطالبہ نہیں تھا۔ چاہے وہ راہ فرار بعد میں میرا واہمہ ہی ثابت ہوتا۔ مطالبہ بہت چھوٹا تھا۔ اس سے جڑی مایوسی بھی بڑی نہیں تھی۔ کہیں باہر نکل جانے کی خواہش، صرف کہیں

باہر۔ صرف اٹھے ہوئے بازوؤں کے ساتھ بے حرکت نہ بیٹھے رہنے، لکڑی کی دیوار سے سر نہ ٹکراتے رہنے کے لیے۔

آج میں صاف صاف سمجھ سکتا ہوں کہ اپنی ذات میں گہرا تحمل پیدا کیے بغیر میں کوئی راہ فرار حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اور بے شک جو کچھ بھی میں نے حاصل کیا، وہ اس تحمل کی وجہ سے ہے جو میں نے جہاز پر اپنی اسیری کے ابتدائی دنوں کے گزر جانے کے بعد ہی حاصل کر لیا۔ اور اس تحمل کے لیے بھی میں جہاز کے ملاحوں کا شکر گزار ہوں۔

باقی سب باتوں کے باوجود اچھے لوگ تھے۔ میں آج بھی ان کے قدموں کی بھاری چاپ کو یاد کر کے لطف اندوز ہوتا ہوں جو تب میرے نیم خوابیدہ سر میں گونجتی تھی۔ وہ ہر کام ممکنہ حد تک کاہلی سے کرنے کے عادی تھے۔ اگر ان میں سے کوئی اپنی آنکھیں ملنا چاہتا تھا تو وہ اپنا ہاتھ یوں اٹھاتا جیسے کوئی بڑا وزن اٹھا رہا ہو۔ ان کے قہقہے کھردرے مگر بھرپور ہوتے۔ ان کے قہقہوں میں ایک تُند چیخ بھی شامل ہوتی جو بظاہر خوفناک معلوم ہوتی لیکن اس کے کچھ معنی نہ ہوتے۔ ہر وقت ان کے منہ میں کچھ ایسا ہوتا جسے تھوکا جائے اور وہ کبھی پرواہ نہ کرتے کہ کہاں تھوک رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ غصے میں مجھ پر گرجتے کہ میری مکھیاں ان سے بھی چمٹی رہتی تھیں۔ لیکن اس بات کو انھوں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ وہ جانتے تھے کہ میری نرم کھال مکھیوں کو پسند ہے اور وہ اس میں اچھلتی کودتی ہیں۔ ان کے لیے یہ سادہ سی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر ان میں سے چند ایک میرے گرد نیم دائرے میں بیٹھ جاتے۔ وہ کم ہی بات چیت کرتے۔ بس ایک دوسرے پر چیختے اور تمباکو والا پائپ پیتے، ڈربوں پر ٹانگیں پسار کر لیٹ جاتے۔ جب کبھی میں کوئی معمولی سی حرکت کرتا تو اپنے گھٹنے آپس میں بجاتے، یا کبھی کبھی ان میں سے کوئی ایک چھڑی اٹھاتا اور میرے جسم پر جہاں میں چاہتا، گدگدی کرتا۔ اگر آج مجھے اس جہاز کی سیر کی دعوت دی جائے تو یقیناً یہ دعوت رد کر دوں گا لیکن جہاں تک خاص طور پر ان یادوں کا تعلق ہے جو عرشوں کے درمیان اس جگہ سے وابستہ ہیں تو وہ قطعاً ناخوشگوار نہیں ہیں۔

وہ داخلی اطمینان و سکون جو مجھے ان لوگوں کے درمیان حاصل ہوا، اس نے مجھے فرار کی کوشش سے گریزاں رکھا۔ اب ماضی کے دریچے میں جھانکتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ تب میں نے یہ جان ہوگا کہ اگر

میں زندہ رہنا چاہتا تھا تو مجھے کوئی راہ فرار تلاش کرنی ہوگی اور یہ کہ میری راہ فرار وہاں سے بھاگ کر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ میں اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ تب میرے لیے فرار ممکن تھا یا نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تب ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ ایک بن مانس کے لیے فرار ہمیشہ ممکن ہونا چاہیے۔ اپنے دانتوں کے ساتھ کہ آج میں بادام توڑتے ہوئے بھی محتاط ہو جاتا ہوں، لیکن تب میں ایسا کر سکتا تھا کہ پنجرے کے تالے کو بتدریج کاٹ کر توڑ دیتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ آخر اس سے مجھے کیا فائدہ ہوتا؟ جونہی میں باہر نکلتا، میں پھر سے گرفتار کر لیا جاتا اور پہلے سے کہیں بدتر پنجرے میں قید کر دیا جاتا۔ یا میں نظر میں آئے بغیر دوسرے جانوروں میں چلا جاتا۔ مثلاً پائی فنز (بڑے دیومالائی سانپوں) کے درمیان، جو میرے دشمن تھے اور یوں ان کے کلاوے میں اپنی جان دے دیتا، یا فرض کیجیے میں جہاز کے عرشے سے فرار ہونے اور سمندر میں کود جانے میں کامیاب ہو جاتا، تو کچھ دیر گہرے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا لیکن پھر ڈوب کر مر جاتا۔ مایوس کن تدابیر۔ میں انسانی انداز میں نہیں سوچا، بلکہ تب اپنے مخصوص حالات کے تحت میں نے جیسا سوچا، ویسا ہی کیا۔

میں نے کچھ بھی کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ خاموشی کے ساتھ ہر شے کا مشاہدہ کیا۔ ان لوگوں کو ادھر اُدھر آتے جاتے دیکھا۔ ہمیشہ ایک جیسے چہرے، ایک سی حرکات۔ اکثر محسوس ہوتا جیسے یہ سب ایک ہی آدمی ہیں۔ یوں ایک آدمی یا کئی ایک آدمی بلا تکلف مسلسل ادھر اُدھر گھومتے۔ تب ایک اعلی مقصد مدھم سا میرے سامنے ظاہر ہوا۔ کسی نے مجھ سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ اگر میں ان جیسا بن جاؤں تو مجھ پر سے ان سلاخوں کی بندش اٹھالی جائے گی۔ ایسی واضح ناممکن باتوں کے لیے وعدے نہیں کیے جاتے۔ لیکن اگر کوئی ایسی ناممکن بات ممکن بنالے تو پھر یہ وعدے وہاں خود بخود واضح اور ممکن ہو جاتے ہیں جہاں یہ پہلے ناممکن معلوم ہوتے۔

مجھے اُن لوگوں میں چنداں دلچسپی نہیں تھی۔ اگر مجھے گزشتہ سطور میں بیان کیے گئے تصوّر آزادی سے لگاؤ ہوتا تو ضرور میں راہ فرار پر گہرے سمندر کو ترجیح دیتا جس کا اشارہ ان کے بھاری چہروں سے بھی ملتا تھا۔ بہر حال میں نے ایسی کسی شے کے بارے میں سوچنے سے پہلے طویل عرصہ تک ان کا بغور مشاہدہ کیا۔ دراصل یہ میرے مسلسل مشاہدے کا حجم ہی تھا جس نے بعد ازاں مجھے صحیح سمت میں سوچنے پر مجبور کیا۔

ان لوگوں کی نقل کرنا میرے لیے بہت آسان تھا۔ میں نے اشروع کے دنوں میں ہی تھوکنا سیکھ لیا۔ ہم اکثر ایک دوسرے کے چہروں پر تھوکا کرتے۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں بعد میں زبان سے تھوک چاٹ کر چہرہ صاف کر لیتا لیکن وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ میں جلد ہی ایک تجربہ کار تمبا کونوش کی طرح پائپ پینے لگا۔ جب میں اپنا انگوٹھا پائپ کے پیالے میں رکھ کر دباتا تو عرشوں کے درمیان کھڑے لوگ میری تحسین میں شور مچا کر دیتے۔ یہ بات البتہ مجھے خاصے عرصے بعد سمجھ میں آئی کہ ایک بھرے ہوئے اور خالی پائپ میں کیا فرق ہوتا ہے؟

شراب کی بوتل میرے لیے سب سے سنگین مسئلہ تھی۔ اس کی خوشبو مجھے بے زار کرتی۔ میں نے ممکنہ حد تک خود کو اس کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اپنی کراہت انگیزی پر قابو پانے میں مجھے ہفتوں لگے۔ عجیب طور پر ملاحوں نے میری اس داخلی کشمکش میں میری کسی بھی دوسری شے سے زیادہ دلچسپی لی۔ آج اپنی یادداشت میں میں انھیں فرداً فرداً شناخت نہیں کر سکتا۔ لیکن ان میں سے ایک ملاح بار بار میرے پاس آتا تھا، کبھی اکیلا اور کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ، دن کو، رات کو، غرض کہ کسی بھی وقت۔ وہ بوتل لے کر میرے سامنے بیٹھ جاتا۔ مجھے ہدایات دیتا۔ وہ مجھے سمجھ نہیں سکتا تھا۔ وہ میری ذات کے معمے کو حل کرنا چاہتا تھا۔ وہ آہستگی سے بوتل کا ڈھکنا کھولتا اور پھر میری طرف دیکھتا کہ میں اسے دیکھ بھی رہا ہوں یا نہیں۔

میں مانتا ہوں کہ ہمیشہ ایک طرح کی جنگلی اشتہا کے ساتھ میں اسے دیکھتا۔ اتنی اشتہا کے ساتھ کہ اس کرۂ ارض پر شاید ہی کسی انسانی استاد نے انسانیت کا ایسا شاگرد دیکھا ہو۔ کارک کھولنے کے بعد وہ بوتل منہ سے لگا لیتا۔ میں نظروں سے اس کا تعاقب کرتا اس کے جبڑوں کو اندر تک دیکھتا۔ وہ سر ہلاتا، مجھ سے خوش ہوتا اور بوتل کو کھلے منہ سے لگا لیتا۔ میں اپنی مسلسل بڑھتی بصیرت سے مسرور، پوری قوت سے چیختا اور خود کو کھرچتا۔ وہ خوش ہوتا، بوتل کو ہونٹوں سے لگاتا اور ایک گھونٹ بھرتا۔ میں بے تابی اور اضطراب کے ساتھ اس کی تقلید کرتا۔ اپنے پنجرے میں لوٹ پوٹ ہو جاتا جس سے اسے اور زیادہ مسرت ہوتی۔ پھر بوتل کو بازو کے فاصلے پر رکھتا اور پھر اسے جھلاتا ہوا اوپر لے جاتا، اور ایک ہی سانس میں اسے خالی کر دیتا۔ ایک غیر معمولی زاویے میں پیچھے جھک جاتا میری بہتر تربیت کے لیے۔ لیکن میں اس صبر آزما مشقت سے تھکا ہارا، مزید اطاعت کیشی سے انکار کر دیتا اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر پنجرے کی سلاخوں سے

لگ جاتا۔ وہ بھی اس نظری تربیت کو ختم کر کے اپنے پیٹ پر کھجاتا اور دانت نکال کر کھسیانی ہنسی ہنستا۔

نظری تعلیم کے بعد عملی ریاضت کا دور آیا لیکن کیا میں نظری تربیت سے ہی بہت تھک نہیں گیا تھا؟ ہاں بے شک، تھکن سے چور تھا۔ یہ تھکن ہی میرا مقدر تھی۔ میں پیش کردہ بوتل ممکنہ حد تک عمدگی سے پکڑتا، اس کا کارک کھولتا، کانپتے ہوئے۔ یہ کامیاب عمل مجھے بتدریج نئی طاقت دیتا۔ میں بوتل ہوا میں بلند کرتا، اسے اپنے ہونٹوں سے لگالیتا، اور پھر نفرت سے اسے پرے پھینک دیتا۔ شدید نفرت سے، حالاں کہ وہ خالی ہوتی اور صرف سپرٹ کی خاص بُو ہی اس میں بھری ہوتی، اسے نفرت سے فرش پر اچھال دیتا۔ میرے استاد کی مایوسی کے نام، اور خود اپنی شدید مایوسی کے نام۔ لیکن ہم میں سے کوئی بھی اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ میں نے خوب مزے سے پیٹ پر کھجانا اور دانت نکال کر ہنسنا تب بھی فراموش نہیں کیا، حالاں کہ میں بوتل پرے اچھال چکا ہوتا تھا۔

کتنی ہی بار میرا سبق یونہی ختم ہوا۔ یہ میرے استاد کی خوبی تھی کہ وہ مجھ سے کبھی ناراض نہیں ہوا۔ کبھی کبھار البتہ وہ اپنے جلتے ہوئے پائپ کو غصے سے کسی ایسی جگہ میری کھال سے لگا دیتا جہاں تک میں آسانی سے نہ پہنچ پاتا۔ حتیٰ کہ میری کھال جلنے لگتی۔ لیکن پھر وہ خود ہی اپنے بڑے بڑے مہربان ہاتھوں سے بالوں کی راکھ جھاڑ دیتا۔ وہ مجھ سے خفا نہیں ہوتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ ہم دونوں ہی ایک ساتھ بندروں کی فطرت کے خلاف نبرد آزما تھے۔ لیکن اس جنگ میں میرا کردار زیادہ مشکل تھا۔

یہ اس کے اور میرے لیے کیسی بڑی کامیابی تھی جب ایک شام تماشائیوں کے بڑے ہجوم کے سامنے، کہ وہاں شاید کسی بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گراموفون بج رہا تھا۔ ایک آفیسر ملاحوں کے بیچ اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہا تھا۔ جب اس شام جب کوئی بھی مجھے نہیں دیکھ رہا تھا، میں نے وہ شنیپس کی بوتل اٹھالی جسے کسی نے بے دھیانی میں میرے پنجرے کے سامنے رکھ دیا تھا۔ بہترین انداز میں اس کا کارک کھولا، جب کہ سبھی لوگ غیر معمولی توجہ سے مجھے دیکھنے لگے، میں بلا تکلف بوتل کو ہونٹوں سے لگا گیا، کسی بناوٹ کے بغیر، ایک عادی شرابی کی طرح گھومتی ہوئی آنکھوں اور کھلے گلے کے ساتھ واقعتاً اور حقیقی طور پر الکوحل کو حلق سے اندر انڈیل کر خالی کیا اور پھر اسے پرے اچھال دیا، لیکن اس مرتبہ کسی مایوسی کے ساتھ نہیں بلکہ ایک فن کارانہ ادا سے۔ البتہ میں پیٹ کھجانا بھول گیا۔ لیکن اس کے بجائے اس لیے کہ مجھ سے کچھ اور ممکن ہی نہیں تھا، کہ میرے حواس بے قابو ہو رہے تھے، میں نے مختصر اور نپے تلے لہجے میں ''ہیلو'' کہا۔ انسانی آواز میں

شامل ہوتے ہوئے، اور یوں انسانی برادری کا ایک حصہ بنتے ہوئے، جب کہ مجھے اس لفظ کی گونج یوں سنائی دی ''سنو۔ یہ بولتا ہے'' جیسے کوئی میرے پسینے میں شرابور جسم کو چھو لے۔

میں یہ بات دہراتا ہوں۔ انسانوں کی نقل کرنے میں مجھے ذرہ برابر دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے یہ تقلید کی کیوں کہ مجھے راہ فرار چاہیے تھی اور اس کے سوا کوئی دوسری وجہ نہیں تھی۔ لیکن یہ کامیابی زیادہ دیر میرے ساتھ نہیں رہی۔ جلد ہی میری انسانی آواز غائب ہو گئی اور مہینوں تک واپس نہیں آئی۔ شنیپس شراب سے میری کراہت کہیں زیادہ شدت سے لوٹ آئی۔ لیکن جن خطوط پر مجھے آگے بڑھنا تھا، وہ طے ہو چکے تھے، ہمیشہ کے لیے۔

جب ہیمبرگ میں مجھے اپنے پہلے اتالیق کے سپرد کیا گیا تو جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ میرے سامنے دو ہی متبادل ہیں۔ چڑیا گھر یا ورائٹی سٹیج۔ میں زیادہ تردّد نہیں کیا۔ میں نے خود سے کہا ''ورائٹی سٹیج تک پہنچنے میں اپنی جان لڑا دو۔ چڑیا گھر مطلب ایک نیا پنجرہ ہے۔ ایک بار وہاں گئے، تو پھر کبھی واپسی نہیں ہو گی۔''

سو یوں معزز اراکین کرام میں نے ہر شے سیکھی۔ بندہ تبھی سیکھتا ہے، جب اسے سیکھنا پڑتا ہے۔ وہ سیکھتا ہے جب اس کے پاس کوئی دوسرا راہ فرار نہ رہے۔ پھر وہ ہر قیمت پر سیکھتا ہے۔ وہ ایک درّے کے ساتھ اپنی نگرانی کرتا ہے اور معمولی مزاحمت پر اپنی کھال ادھیڑ دیتا ہے۔ میری بندروں کی فطرت مجھ میں سے پرواز کر گئی۔ سر سے ایڑی تک۔ حتیٰ کہ میرا پہلا استاد اس کے زیر اثر خود بندر بن گیا، جلد ہی اس نے اتالیقی چھوڑ دی اور ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ لیکن خوش قسمتی سے جلد صحت یاب ہو گیا۔

میں نے کئی اساتذہ سے اکتساب فیض کیا، بیک وقت ایک سے زیادہ کی شاگردی۔ جوں جوں میرا اپنی صلاحیتوں پر اعتماد بڑھا، لوگوں نے بھی میری پیش رفت میں دلچسپی لینی شروع کی اور میرے بہتر مستقبل کے امکانات روشن ہوئے، میں اپنی مرضی سے اپنے اساتذہ کا انتخاب کرنے لگا۔ انھیں پانچ مختلف کمروں میں بٹھا دیتا اور ایک کمرے سے دوسرے میں چھلانگیں لگاتے ہوئے ایک ہی وقت میں ان سے درس لیتا۔

یہ تھی میری پیش رفت۔ کیسے علم اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ ہر طرف سے میرے بیدار ہوتے ہوئے دماغ میں ورود کر رہا تھا۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میں اس سے بے حد خوش تھا۔ لیکن میں یہ

اعتراف بھی کروں گا کہ میں اس وقت بھی اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھا، نہ آج ہوں۔ ایسی شدید لگن کے ساتھ جواب تک کبھی نہیں دہرائی گئی، میں ایک عام یورپی باشندے کی تہذیبی سطح تک تربیت پا گیا۔ اپنے طور پر یہ کوئی ایسی قابل ذکر بات ہرگز نہیں ہے۔ میرے لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے کہ اس نے مجھے اپنے پنجرے سے باہر نکلنے میں مدد دی اور میرے لیے ایک خصوصی راہ فراروا کی، انسانیت کی راہ۔ ایک بہت شان دار مقولہ ہے کہ جھاڑیوں میں سے اپنا راستہ بنانا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے جھاڑیوں میں سے اپنے لیے راستہ بنایا۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ بشرطیکہ اگر آزادی ہمیشہ سے میرا انتخاب نہ ہوتی۔

پیچھے مڑ کر اپنی ترقی پر نگاہ دوڑاتا ہوں اور جائزہ لیتا کہ میں نے اب تک کیا پایا، تو مجھے کسی بات پر افسوس نہیں ہوتا، گو میں مطمئن بھی نہیں ہوں۔ اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ گھسیڑے جب کہ شراب کی بوتل سامنے میز پر دھری ہے، میں اپنی گھومنے والی کرسی پر نیم دراز ہوتا ہوں اور کھڑکی میں سے باہر دیکھتا ہوں۔ ایسے میں اگر کوئی مجھ سے ملنے آئے تو میں اس سے خوش دلی سے ملتا ہوں۔ میرا منیجر بغلی کمرے میں بیٹھا ہوتا ہے۔ میں گھنٹی بجاتا ہوں تو فوراً بھاگا آتا اور جو ہدایت اسے دوں، اسے غور سے سنتا ہے۔

تقریباً ہر شام کو میں سٹیج پر مظاہرہ کرتا ہوں۔ مجھے اس میں ایسی کامیابی حاصل ہو چکی ہے جس میں اب شاید ہی کچھ اضافہ ہو سکے۔ جب میں دعوتوں، سائنسی استقبالی اجلاسوں یا سماجی تقریبوں سے رات کو دیر سے گھر لوٹتا ہوں تو ایک نیم تربیت یافتہ ننھی چیمپینزی میرا انتظار کر رہی ہوتی ہے اور میں اس سے ویسے ہی لطف لیتا ہوں، جیسے کوئی بن مانس لیتا ہے۔ دن کے وقت میں اس کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اس کی آنکھوں میں ایک نیم شکستہ پریشان حال حیوان کا جنون جھلکتا ہے۔ کسی کو سب کچھ دکھائی نہیں دیتا لیکن میں دیکھتا ہوں اور میں اسے برداشت نہیں کر پاتا۔

مجموعی طور پر بہر طور میں نے وہ سب کچھ حاصل کیا جو میرا مقصد تھا، لیکن مجھے مت بتائیے کہ یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ کسی بھی صورت میں مجھے کسی انسانی رائے کی حاجت نہیں ہے۔ میں صرف آپ کو بتا رہا ہوں، میں فقط ایک رپورٹ پیش کر رہا ہوں۔ آپ کو معزز اراکین اکادمی، میں صرف ایک رپورٹ پیش کر رہا ہوں۔

اگلا گاؤں

میرے دادا کہا کرتے تھے ''زندگی حیرت انگیز طور پر مختصر ہے۔ مجھے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے، زندگی اصل سے بھی اتنی زیادہ مختصر معلوم ہوتی ہے کہ میں مثال کے طور پر نہیں سمجھ پاتا کیسے ایک نوجوان اس بات سے خوف زدہ ہوئے بغیر اگلے گاؤں تک کے سفر کی منصوبہ بندی کر سکتا ہے کہ حادثات کا تو ذکر ہی رہنے دیجیے، کہ جس سفر کے لیے ایک عام خوش و خرم زندگی کا دورانیہ بھی اس سے کہیں زیادہ کم پڑ سکتا ہے، جو اس سفر کے لیے درکار ہوتا ہے۔''

میرے گیارہ بیٹے

میرے گیارہ بیٹے ہیں۔

پہلا بیٹا بظاہر بہت سیدھا، مگر سنجیدہ اور چالاک ہے۔ اگرچہ میں اسے اپنے دوسرے بچوں کی طرح ہی پیار کرتا ہوں۔ لیکن میں اسے شخصی اعتبار سے اعلیٰ درجہ نہیں دیتا۔ اس کی سوچ کا عمل مجھے بہت سادہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ نہ دائیں طرف دیکھتا ہے نہ بائیں، اور نہ ہی کچھ گہرائی میں۔ وہ ہر وقت بھاگتا رہتا ہے یا بس ایک ہی نقطے کے گرد گھومتا ہے، اپنی ہی سوچ کے ننھے دائروں میں۔

دوسرا بیٹا خوش شکل، پتلا دبلا اور خوب صورت جسم والا ہے۔ اسے تیغ زنی کی مشق کرتے ہوئے دیکھنا ایک سانس روک دینے والا منظر ہے۔ وہ چالاک بھی ہے، لیکن جہاں دیدہ بھی ہے۔ اس نے بہت زیادہ سیاحت کی ہے، اور اسی لیے حتیٰ کہ ہمارا قصبہ بھی اس کے سامنے اتنے راز اگلتا معلوم ہوتا ہے جتنے رازوں سے یہاں رہنے والے بھی آگاہ نہیں ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی یہ خوبی صرف اس کی سیاحتوں یا لازمی طور پر صرف انھی کے باعث نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس کی اپنی قابل تقلید فطرت کا ایک جوہر ہے جس کی توصیف مثال کے طور پر ہر وہ شخص کرتا ہے جس نے کبھی اس کی نقل اتارنے کی کوشش کی۔ یوں کہیے کہ جیسے وہ پانی میں نہایت شان دار اونچی چھلانگ لگاتا ہے۔ اور حیرت انگیز ضبط نفس کے ساتھ ہوا

میں بار بار قلابازیاں بھی لگاتا ہے۔ اس کے حریف اس کی نقل کی خواہش کو دل میں لیے چھلانگ لگانے کے تختے کے آخری سرے پر کھڑے ہو جاتے اور اپنی جرأتوں کو سمیٹتے ہیں۔ لیکن اس مقام پر ہوا میں چھلانگ لگانے کے بجائے اچانک نیچے بیٹھ جاتے اور معذرت کے انداز میں بازو ہوا میں پھیلا لیتے ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود (کہ مجھے ایسے بیٹے کا باپ ہونے پر خوشی محسوس ہونی چاہئے۔) اس کے ساتھ میرا تعلق خوشگوار نہیں ہے۔

اس کی بائیں آنکھ داہنی آنکھ سے کچھ چھوٹی ہے اور مسلسل جھپکتی رہتی ہے۔ یقیناً ایک معمولی نقص۔ لیکن اس سے اس کے چہرے پر دلیری کا تاثر پیدا کرتا ہے جو کسی اور طرح سے ممکن نہیں تھا۔ نہ ہی خود پر انحصار کرنے کی اس کی ناقابل تقلید کے پیش نظر کسی نے کبھی اس کی چھوٹی آنکھ اور اس کے جھپکنے کے انداز کو دیکھا یا اس پر غور کیا ہے۔ لیکن میں، اس کا باپ، اس عیب کو شدت سے محسوس کرتا ہوں۔ لیکن میری پریشانی کا سبب اس کا جسمانی عیب نہیں ہے بلکہ روح میں در آنے والا اس سے جڑا انتشار ہے۔ خون میں شامل ہو جانے والا زہر، اپنی فطری اہلیتوں کی معراج حاصل کرنے کی نااہلیت جسے صرف میں محسوس کر سکتا ہوں۔ لیکن یہی بات اسے پھر سے میرا بیٹا ثابت کرتی ہے۔ کیوں کہ اس کا یہ عیب ہمارا خاندانی عیب ہے۔ بس اس میں یہ بہت نمایاں ہے۔

میرا تیسرا بیٹا بھی خوبصورت ہے لیکن اس کی خوبصورتی میرے معیار کے مطابق نہیں۔ وہ کسی گلوکار کی طرح حسین ہے۔ خمدار ہونٹ، خواب ناک آنکھیں، ایک متناسب سر جو مؤثر ہونے کے لیے پس منظر میں سٹیج کے پردے کا متقاضی ہوتا ہے، بہت گہری محرابی چھاتی، ہاتھ جو تیزی سے اوپر اٹھائے اور کہیں زیادہ تیزی سے نیچے گرائے جا سکیں، ٹانگیں جو نفاست سے حرکت کرتی کیوں کہ وہ بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں اس کی آواز کا زیروبم جو مکمل اور گونج دار نہیں ہے۔ یہ فوری آپ کو اپنے اثر میں لیتا ہے۔ ماہر فن اسے بغور سنتا ہے۔ لیکن پھر اچانک ہی اس کا سانس ٹوٹ جاتا ہے۔ اگرچہ عمومی طور پر مجھے پر بات ترغیب دیتی ہے کہ اپنے اس بیٹے کو شہرت کی دنیا میں لاؤں۔ لیکن میں اسے پس منظر میں رکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ وہ خود بھی اپنی حالت پر قانع ہے، اپنے نقائص کے ادراک کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی معصومیت کے باعث۔ وہ ہمارے دور سے مطمئن بھی نہیں ہے۔ جیسے اگرچہ وہ مانتا ہے کہ وہ ہمارے خاندان کا ایک فرد ہے، لیکن پھر بھی جانتا ہے کہ وہ کسی دوسرے خاندان سے بھی وابستہ تھا جسے وہ ہمیشہ کے

لیے کھو چکا ہے۔ وہ اکثر اداس رہتا ہے اور کوئی بات اسے خوش نہیں کر سکتی۔

میرا چوتھا بیٹا شاید سب سے زیادہ یار باش آدمی ہے۔ اپنے دور کا صحیح ترین نمائندہ۔ وہ ہر کسی کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ وہ عام درجے پر کھڑا ہو کر آسانی سے عام لوگوں سے مکالمہ کر سکتا ہے اور ہر کوئی اس سے متفق ہو جانے کی ترغیب محسوس کرتا ہے۔ غالباً اس عمومی قبولیت نے اس کی فطرت کو بہت ہلکا بنا دیا ہے۔ اس کی حرکات آزادانہ ہیں اور اس کے فیصلے بے بنیاد ہوتے ہیں۔ اس کے بہت سے مقولے بار بار دہرائے جانے کے لائق ہوتے ہیں، لیکن کسی بھی اعتبار سے سبھی نہیں۔ کیوں کہ زیادہ تر اس کی نہایت سادگی ناگوارہ خاطر بن جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو حیرت انگیز انداز میں زمین سے بلند ہوتا ہے، ایک چڑیا کی طرح ہوا کو چیرتا جاتا ہے۔ لیکن اس سب کچھ کے بعد کسی بے کار شے کی مانند کسی ویرانے میں واپس آگرتا ہے۔ ایسے ہی خیالات مجھے دق کرتے ہیں جب میں اس کی طرف دیکھتا ہوں۔

میرا پانچواں بیٹا مہربان اور نرم گو ہے۔ جتنا ہونہار ہے، اس سے زیادہ ہی اس نے کیا۔ کبھی اتنا منکسر المزاج ہوتا تھا کہ اس کی موجودگی میں دوسرا شخص خواہ مخواہ خود کو تنہا محسوس کرتا۔ لیکن معاشرے میں اس نے کچھ شہرت بھی کمائی۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ یہ کیسے ممکن ہوا تو میں کوئی واضح جواب نہیں دے پاؤں گا۔ شاید معصومیت نے اس دنیا کے بنیادی انتشار میں اپنے لیے راہ ہموار کی۔ جب کہ معصوم تو وہ ہے۔ غالباً حد سے زیادہ معصوم۔ ہر کسی کا دوست۔ شاید حد سے زیادہ دوست۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اچھا نہیں لگتا جب اس کی تعریف کی جارہی ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تعریف کرنا شاید دنیا کا گھٹیا ترین مشغلہ ہے کہ اس سے کسی کو بھی سرفراز کیا جاسکتا ہے جو اتنا ہی تعریف کے قابل ہو جتنا میرا یہ بیٹا ہے۔

میرا چھٹا بیٹا پہلی نظر میں بظاہر سب بیٹوں سے زیادہ سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔ وہ بہت باتونی بھی ہے۔ اسی لیے اسے سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اگر اسے نظر انداز کیا جائے تو وہ ناقابل فہم اداسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر وہ مرکز توجہ رہے تو اپنی بے تکان باتوں سے اس کا خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اس میں خود فراموشی کا گہرا رجحان موجود ہے۔ دن کی پوری روشنی میں وہ اکثر اپنے خیالات کے الجھاؤ سے لڑتا ہے جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ بیمار ہوئے بغیر، اگرچہ اس کی صحت بہت اچھی ہے، وہ کبھی کبھار خاص طور پر شام کے جھٹ پٹے میں ڈگمگا جاتا ہے۔ لیکن اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ کبھی نہیں گرتا۔ شاید اس کی جسمانی افزائش اس مظہر کی وجہ ہے۔

وہ اپنی عمر کی نسبت دراز قد ہے۔ یوں وہ دیکھنے میں عام طور پر بہت بے ڈھنگا معلوم ہوتا ہے۔ حالاں کہ اس کے مثال کے طور پر ہاتھ اور پیر غیر معمولی طور پر خوب صورت ہیں۔ اس کی پیشانی بھی بد ہیئت ہے۔ اس کی جلد اور ہڈیوں کی ساخت اپنی نمو میں کہیں نامکمل رہ گئی ہے۔

میرا ساتوں بیٹا غالباً باقی بیٹوں میں میرے سب سے قریب ہے۔ لوگوں کو اس کی قدر کرنی نہیں آتی۔ وہ میرے بیٹے کی حس مزاح کا فہم نہیں رکھتے۔ میں اس کی بے جا تعریف نہیں کر رہا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بہت اہم شخص نہیں ہے۔ لیکن اگر دنیا میں اس کی بے قدری کرنے کے سوا اور کوئی خامی نہ ہوتو وہ بے قصور ہے۔ اپنے خاندانی حلقے میں مجھے اس کے بغیر رہنے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ وہ روایتوں کے لیے ایک طرح کی بے چینی اور عقیدت محسوس کرتا ہے اور ان دونوں جذبوں کو جیسا کہ کم از کم مجھے محسوس ہوتا ہے، وہ ایک نا قابل تردید اکائی میں یکجا کر دیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ کسی بھی عام انسان کی نسبت کم جانتا ہے کہ اس کامیابی کو کیسے استعمال کرے۔ مستقبل کا پہیہ کبھی اس سے گردش میں نہیں آئے گا۔ لیکن اس کی طبیعت میں تحریک بہت زیادہ ہے اور وہ امید سے بھری رہتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ وہ عیال دار ہو۔ اس کے بچوں کے بچے ہوں لیکن بدقسمتی سے اس کے طرز زندگی سے لگتا ہے کہ وہ شاید کبھی میری خواہش پوری نہیں کرے گا۔ خود اطمینانی کے ساتھ جسے میں جانتا اور اس بات پر کف افسوس بھی ملتا ہوں، اور جو لوگوں کی اس کے بارے میں رائے سے غیر معمولی طور پر مختلف ہے، وہ ہر جگہ اکیلا ہی جاتا ہے۔ لڑکیوں پر بالکل توجہ نہیں دیتا اور یوں اس کا عمدہ مزاج کبھی مجروح نہیں ہوگا۔

میرا آٹھوں بیٹا غم کا پروردہ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں؟ ہمیشہ مجھ سے دور دور رہتا ہے۔ لیکن میری پدرانہ محبت مجھے اس سے باندھے رکھتی ہے۔ اس کے دکھ میں وقت کے گزران سے کافی تخفیف ہوئی ہے۔ لیکن کبھی اس کے بارے میں سوچ کر ہی مجھے کپکپی چھوٹ جاتی تھی۔ وہ ایک بہت مختلف انداز میں زندگی گزارتا ہے۔ اس نے مجھ سے اپنا ہر تعلق منقطع کر رکھا ہے۔ اور خاص طور پر اپنے سخت سر، چھوٹے کسرتی جسم کے ساتھ، کہ اس کی ٹانگیں بچپن میں بہت نحیف تھیں جو شاید اس دوران میں بہتر ہو چکی ہیں، وہ زندگی کے جس میدان میں جائے گا، کامیاب ہوگا۔ کئی موقعوں پر میں نے اسے واپس بلانے کا سوچا، تا کہ پوچھوں کہ اس کی زندگی کیسے گزر رہی تھی، کیوں اس نے خود کو اپنے باپ سے مکمل جدا کر رکھا ہے اور زندگی میں اس کا مقصد کیا ہے؟ لیکن وہ اتنا دور جا چکا ہے اور اس دوران میں اتنا وقت گزر

چکا ہے کہ جیسا سب کچھ ہے، ویسا ہی رہے تو بہتر ہے۔ میں سنتا ہوں کہ میرے بیٹوں میں صرف اسی کی پوری داڑھی ہے جو بلاشبہ اس جیسے چھوٹے قد کے آدمی پر نہیں جچ سکتی۔

میرا نواں بیٹا بہت باوقار ہے اور جنھیں عورتیں محبت آمیز آنکھیں کہتی ہیں، ویسی آنکھیں اس کی ہیں۔ اتنی محبت آمیز کہ ایسے مواقع آتے ہیں جب وہ مجھے بھی اپنا اسیر کر لیتی ہیں۔ حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ ایک گیلا اسفنج اس غیر زمینی عظمت کو دھوڈالنے کے لیے کافی ہوگا۔ لیکن اس لڑکے کے متعلق عجیب بات یہ ہے کہ وہ کبھی کسی کو جھانسہ دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ صوفے پر لیٹے ہوئے اور بیکار ہی اپنی نظروں کو چھت پر جمائے یا انھیں اپنی پلکوں کے نیچے چھپا کر رکھے ہوئے ساری عمر یوں ہی بسر کر دینے پر آمادہ ہوگا۔ جب وہ اپنے مرغوب انداز میں لیٹتا ہے تو وہ بولنے میں لطف محسوس کرتا ہے اور خوب بولتا ہے، جامع اور پر مغز۔ لیکن ایک محدود دائرے میں رہتے ہوئے۔ ایک بار جب وہ اس دائروں کو عبور کرتا ہے جو کہ ناگزیر بھی ہے کہ یہ بہت محدود ہوتے ہیں تو پھر جو کچھ بھی وہ کہتا ہے، وہ بے مغز ہوتا ہے۔ سننے والا ضرور اسے خاموش ہو جانے کا اشارہ کرے، اگر اسے امید ہو کہ ایسی خوابیدہ آنکھیں اس اشارے کو پالیں گی۔

میرے دسویں بیٹے کا ایک خودغرض شخصیت تصور کی جاتی ہے۔ میں اس مفروضے کو یکسر رد یا قبول نہیں کروں گا۔ خاص طور پر جو کوئی اسے خود سے دگنی عمر کے شخص کے تکلف کے ساتھ آتا دیکھتا ہے، ہمیشہ احتیاط سے بندھے بٹنوں والا فراک کوٹ، ایک پرانی مگر برش کی ہوئی سیاہ ٹوپی، بے تاثر چہرہ، معمولی سی آگے کو نکلی ہوئی ٹھوڑی، آنکھوں کے چوڑے پپوٹے جو روشنی کو ڈھک لیتے ہیں، اور ہونٹوں پر اکثر و بیشتر جمی ہوئی اس کی دو انگلیاں۔ اسے یوں دیکھ کر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ تو کوئی پکا فریبی ہے۔ لیکن ذرا اس کی گفتگو سنئے۔ فہم و فراست، اعلیٰ بصیرت اور پاکیزہ صاف گوئی، طنزیہ گرمجوشی کے ساتھ واضح سوالات، کائنات سے مکمل ہم آہنگ، ایسی ہم آہنگی جو حیران کن، فطری اور خوشگوار ہے، ایسی موافقت جو ناگزیر طور پر گردن کو اکڑا دیتی اور جسم کو غرور سے بھر دیتی ہے۔ بیشتر لوگ جو خود کو چالاک سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اپنے تصور میں اس کے اس ظاہری حلیے کو ناپسند کرتے ہیں، صرف اس کی گفتگو کی وجہ سے شدت سے اس سے متفق ہو جاتے ہیں۔ تاہم کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کے حلیے سے قطعاً متاثر نہیں ہوتے، بلکہ انھیں اس کی گفتگو ریاکارانہ لگتی ہے۔ میں جو اس کا باپ ہوں، اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں

دوں گا۔ لیکن مجھے تسلیم کرنا چاہئے کہ موخر الذکر نقادوں کو اول الذکر نقادوں کی نسبت زیادہ سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے۔

میرا گیارھواں بیٹا ایک نفیس الطبع انسان ہے، شاید میرے بیٹوں میں سب سے زیادہ نحیف۔ لیکن اس کی کمزوری پر فریب ہے۔ کیوں کہ کبھی کبھار وہ بہت مضبوط اور متحرک ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ تب بھی اس میں پوشیدہ کمزوری موجود ہوتی ہے۔ لیکن یہ کوئی قابل ندامت کمزوری نہیں ہوتی، بلکہ یہ کچھ ایسی شے جو ہماری ٹھوس زمین پر ہی کمزوری سمجھی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر کیا اڑنے کے لیے آمادگی ایک طرح کی کمزوری نہیں ہے کہ یہ پیروں کی ڈگمگاہٹ، غیر استحکام پذیری اور کپکپاہٹ یا لرزہ پر مشتمل ہوتی ہے؟ اس قسم کی کوئی شے میرے بیٹے کی شخصیت کا جزو ہے۔ بہر حال یہ ایسی خصوصیات نہیں ہیں جو ایک باپ کے دل کو راحت دیں۔ یہ خاندانوں کو تباہ کرنے کے درپے ہوتی ہیں۔ بعض اوقات وہ مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے کہنا چاہ رہا ہو، ''ابو میں آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا''۔

تب میں سوچتا ہوں ''تم آخری شخص ہو گے جس پر میں کبھی اعتماد کروں گا۔''

یہ میرے گیارہ بیٹے ہیں۔

دو عالموں کا مسئلہ

''تلمود'' کے ایک عالم نے اپنی زندگی کا ایک اصول بنایا تھا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا، حتیٰ کہ پانی کا گلاس بھی نہیں۔ اس طور وہ خدا کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اس دور کے ''تلمود'' کے سب سے بڑے عالم نے اس سے واقفیت بڑھانے کی خاطر اسے اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ اتنے بڑے عالم کی دعوت کو ٹھکرانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ چناں چہ وہ افسردگی کے ساتھ سفر پر روانہ ہوا لیکن چوں کہ اس کا کسی سے کچھ نہ لینے کا اصول بہت طاقتور تھا، ایک بڑا پہاڑ ان دونوں عالموں کے بیچ ابھر آیا۔

ایک دیہاتی معالج

میں بہت پریشان تھا۔ مجھے ایک نہایت ضروری سفر پر روانہ ہونا تھا۔ ایک بہت بیمار مریض دس میل دور ایک قصبے میں شدت سے میرا انتظار کھینچ رہا تھا۔ لیکن برف کی ایک گہری تہہ نے میرے اور اس کے درمیان تمام راستوں کو مسدود کر دیا تھا۔ میرے پاس ایک بگھی تھی، ایک چھوٹی بگھی، بڑے پہیوں والی، ہماری قصباتی سڑکوں کے انتہائی موافق۔

سمور کی کھال والے کوٹ میں لپٹے اور ہاتھ میں طبّی سامان کا تھیلا پکڑے میں سفر کی پوری تیاری کے ساتھ اپنے گھر کے صحن میں کھڑا تھا۔ لیکن بگھی میں جوتنے کے لیے کوئی گھوڑا نہیں تھا۔ کوئی بھی گھوڑا نہیں۔ میرا اپنا گھوڑا گزشتہ رات سردی کی شدت کو نہ سہارتے ہوئے چل بسا تھا۔ میری ملازمہ میرے لیے قصبے میں سے گھوڑا مستعار لینے کے لیے خوار ہو رہی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ ایک بے کار کوشش کر رہی تھی۔ میں لاچار وہاں کھڑا تھا، جسم پر ہر لحظہ گہری ہوتی برف کی تہہ کے ساتھ، حرکت کرنے سے زیادہ سے زیادہ عاجز۔

میری ملازمہ دروازے پر اکیلی نمودار ہوئی اور لالٹین کو فضا میں لہرایا۔ ظاہر ہے اس وقت ایسے سفر

کے لیے کون اسے اپنا گھوڑا ادھار دے گا؟ میں نے پھر سے صحن کا ایک چکر کاٹا۔ کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے الجھن بھری مایوسی کے عالم میں سال بھر سے استعمال میں نہ آنے والے سورخانہ کے دروازے پر پیر سے ٹھوکر ماری۔ وہ کھل گیا اور اپنے قبضوں پر جھولنے لگا۔ گھوڑوں کے جسم کی مہک اور بھاپ اس میں سے باہر آ رہی تھی۔ دھندلی ٹھہری ہوئی روشنی والی لالٹین اندر ایک رسی سے بندھی ہوئی لٹک رہی تھی۔ ایک آدمی نیلی آنکھوں والے چوڑے چہرے کے ساتھ گھٹنوں پر جھکا ہوا اس تنگ جگہ سے ظاہر ہوا۔

''کیا میں گھوڑے جوت دوں'' اس نے اپنے پورے قد پر کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ محض کچھ جھک کر اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا کہ دیکھوں سور خانے میں اور کیا کچھ تھا۔

ملازمہ میرے برابر ہی کھڑی تھی۔ وہ بولی ''آپ کبھی نہیں جان پاتے کہ آپ کے اپنے گھر میں کیا خزانے دفن ہیں۔'' ہم دونوں نے قہقہہ لگایا۔

اس شخص نے عاجزی سے کہا ''میرے بھائی اور میری بہن آپ دونوں کو سلام پہنچے۔''

دو گھوڑے، مضبوط پٹھوں والے دو قدآور جانور، ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے باہر نکلے جب کہ مضبوط ٹانگیں پیٹ سے چمٹی ہوئیں، اونٹوں کی طرح عمدگی سے بنے اپنے سر جھکائے، بہت چوڑی پیٹھ کی وجہ سے دروازے کے دھانے میں سے مشکل سے گزرے جسے انھوں نے پورا بھر دیا تھا۔ لیکن جونھی باہر آ کر سیدھے کھڑے ہوئے، ان کی ٹانگیں لمبی ہو گئیں اور جسموں سے گہری بھاپ اٹھنے لگی۔

''اس کا ہاتھ بٹاؤ'' میں نے خادمہ سے کہا اور میرے حکم کی منتظر لڑکی سُرعت سے سائیس کی جانب بڑھی تا کہ زین کسنے میں سائیس کی مدد کرے۔ لیکن سائیس کے پاس پہنچی ہی ہو گی کہ اس نے لڑکی کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا اور اس کے چہرے کو اپنے چہرے سے لگایا۔ ملازمہ چیخی اور میری طرف بھاگی۔ اس کے رخسار پر دانتوں کے دو لمبے سُرخ نشان اُبھر آئے تھے۔

''وحشی درندے'' میں غصے میں چیخا ''دُرے سے تمھاری کھال کھینچوں'' لیکن ساتھ ہی میں نے سوچا کہ وہ محض ایک اجنبی تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آیا، اور یہ کہ وہ ایسے وقت میں اپنی مرضی سے میری مدد کر رہا تھا جب میں ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ پھر جیسے اس نے میرے خیالات پڑھ لیے

ہوں، اس نے میری دھمکی کا کچھ اثر نہیں لیا، گھوڑوں کے ساتھ مصروف رہا، صرف ایک بار میری طرف مڑا اور پھر بولا ''سوار ہو جایئے۔''

بے شک سفر کی تیاری مکمل تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ گھوڑوں کی جوڑی بہت عمدہ تھی، جیسی جوڑی پر میں نے کبھی سواری نہیں کی تھی۔ میں خوشی سے گاڑی میں سوار ہو گیا۔

''گاڑی میں خود چلاؤں گا۔ تمھیں راستے کا علم نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''بے شک گاڑی آپ ہی چلایئے۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہا۔ میں یہاں روزا کے ساتھ ٹھہروں گا۔''

''نہیں''۔ روزا چیخی اور اس جائز خدشے کے ساتھ گھر کی طرف بھاگی کہ اس بدقسمتی سے فرار ممکن نہیں تھا۔

مجھے دروازے کی چٹخنی چڑھائے جانے کی آواز سنائی دی۔ پھر تالے میں چابی گھمائے جانے کی آواز آئی۔ میں دیکھ سکتی تھی کہ کیسے اس نے ہال میں بتیاں بجھا دیں اور پھر تمام کمروں میں بتیاں بجھاتی چلی گئی تاکہ تلاش نہ کی جا سکے۔

''تم میرے ساتھ چلو گے'' میں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا، ''ورنہ میں بھی نہیں جاؤں گا۔ چاہے یہ سفر کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو۔ میں اس سفر کے بدلے اپنی لڑکی تمھارے حوالے نہیں کر سکتا۔''

اس نے ہاتھوں سے تالی بجاتے ہوئے کہا ''بھاگو۔''

گھوڑا گاڑی دریا کی طغیانی میں بہتے لکڑی کے ٹکڑے کی طرح سرپٹ بھاگی۔ مجھے سائیس کے ہاتھوں میرے گھر کے دروازے کے دھڑ دھڑ بجنے اور پھر اس کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی، اور پھر میں گھوڑوں کی تیز رفتاری سے شکست کھا گیا اور اندھا ہو گیا کہ اس نے میرے حواس کو مفلوج کر دیا۔ لیکن ایسا بس چند ہی لمحوں کے لیے تھا کہ جیسے مریض کی حویلی کا احاطہ میرے صحن کے دروازے کے برابر ہی واقع ہو، میں اگلے ہی لمحے وہاں تھا۔ گھوڑے خاموشی سے ایک جگہ رک گئے۔ برف کا طوفان تھم گیا تھا۔ آسمان پر چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر مریض کے والدین تیزی سے گھر سے باہر لپکے۔ ان کی بیٹی پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ مجھے ایک طور سے انھوں نے بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی سے باہر نکالا۔ ان کی منتشر گفتگو کا ایک لفظ بھی مجھے سمجھ میں نہ آیا۔

مریض کے کمرے میں فضا بہت زیادہ گھٹن ذدہ تھی۔ ایک طرف بے کار پڑے چولہے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھولنے کے بارے میں سوچا لیکن پہلے مریض کو دیکھنا ضروری تھا۔ ایک نحیف ونزار نوجوان، بخار کے بغیر، جسم نہ گرم، نہ سرد، خالی آنکھوں کے ساتھ بغیر قمیص کے کمبل کے نیچے سے خود کو بلند کیا، میری گردن میں بازو حمائل کئے اور میرے کان میں سرگوشی کی ''ڈاکٹر مجھے مرنے دو۔''

میں نے گھبرا کر کمرے میں ادھر اُدھر دیکھا۔ کسی نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ اس کے والدین ایک طرف میری رائے کے منتظر جھکے کھڑے تھے۔ اس کی بہن نے میرے بیگ کے لیے ایک کرسی میرے قریب سرکا دی۔ میں نے اپنا بیگ کھولا اور آلات کو کھنگالا۔ نوجوان مریض اپنے بستر میں بدستور مجھے پکڑے ہوئے تھا اپنی درخواست یاد دلانے کے لیے۔ میں نے بیگ میں سے موچنے کا ایک جوڑا نکالا، موم بتی کی روشنی میں اسے جانچا اور پھر اسے نیچے رکھ دیا۔

''ہاں ایسی صورت میں دیوتا ہی مدد کرتے ہیں۔'' میں نے مرتدانہ طنزیہ انداز میں سوچا۔ ''گم شدہ گھوڑا بھیجتے ہیں۔ بلکہ ضرورت کے تحت ایک گھوڑے کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔ اور اس سب کچھ سے بڑھ کر ایک سائیس بھی فراہم کر دیتے ہیں۔''

تبھی مجھے روز کا خیال آیا۔ میں بھلا کیا کر سکتا تھا؟ کیسے اسے بچا سکتا تھا؟ دس میل دور اس سائیس کے بوجھ سے اسے کیسے باہر کھینچ سکتا تھا، گھوڑوں کی ایسی جوڑی کے ساتھ جو میرے قابو سے باہر تھے؟ دونوں گھوڑے اپنی باگوں کو کسی طرح کچھ ڈھیلا کر کے آگے بڑھ آئے اور باہر سے زور لگا کر کھڑکیاں کھولنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں نہیں جانتا کیسے؟ ان میں سے ہر ایک کھڑکی میں منہ دیے ہوئے اور گھر والوں کی چیخ وپکار کو خاطر میں لائے بغیر مریض کو تک رہا تھا۔

''بہتر ہے ابھی واپس چلا جاؤں۔'' میں نے سوچا جیسے گھوڑے مجھے واپسی کے سفر کے لیے کہہ رہے ہوں۔ پھر بھی میں مریض کی بہن، جو شاید سمجھ رہی تھی کہ میں گرمی کی وجہ سے پریشان تھا، کو میرا سمور کا کوٹ اتارنے کی اجازت دیتا ہوں۔ میرے لیے رم کا ایک گلاس تیار کیا جاتا ہے۔ مریض کے بوڑھے باپ نے میرا کندھا تھپتھپایا یہ بے تکلفی اپنے خزانے میں اس پیشکش کے بعد باجواز تھی۔ میں جواباً اپنا سر ہلایا۔ بوڑھے کی سوچ کے محدود دائرے میں مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ رم پینے سے انکار کی میری یہی

وجہ تھی۔ مریض کی ماں بستر کے برابر کھڑی اور مجھے وہاں آنے پر پھسلا رہی تھی۔ میں آگے بڑھا اور جونہی گھوڑا بلند آواز میں ہنہنایا، میں نے اپنا سر نوجوان کی چھاتی پر رکھ لیا جو میری گیلی داڑھی کے تلے کپکپائی۔ مجھے اس بات پر یقین ہو گیا جو میں پہلے ہی جانتا تھا۔ نوجوان بالکل تندرست تھا۔ اس کے بلڈ پریشر میں البتہ کچھ خرابی تھی جو اس کی پریشان حال ماں کی طرف سے پلائی جانے والی کافی کی وجہ سے تھی لیکن بس ایک ہی جھٹکے سے اسے بہترین حالت میں بھلا چنگا بستر سے اٹھایا جا سکتا تھا۔

میں نے دنیا کو بہتر بنانے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ اس لیے میں نے اسے وہیں پڑا رہنے دیا۔ میں اس قصبے کا ڈاکٹر ہوں اور میں نے اپنی حد تک مکمل فرض سرانجام دیا، اس حد تک کہ جو بہت زیادہ تھا۔ مجھے کم فیس دی جاتی تھی لیکن پھر بھی میں فیاض اور غریبوں کا مددگار رہوں۔

مجھے ابھی یہ بھی دیکھنا تھا کہ روز بخیر ہے۔ تب یہ نوجوان اپنا راستہ تلاش کر سکتا تھا اور میں بھی مرنا چاہتا تھا۔ اس لامختتم سردی میں میں یہاں کیا کر رہا تھا؟ میرا گھوڑا مر چکا تھا اور قصبے میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو مجھے گھوڑا مستعار دے۔ مجھے گھوڑوں کی ٹیم کو سور خانے سے باہر نکالنا تھا۔ اگر یہ گھوڑے نہ ہوتے تب مجھے شاید سوروں پر ہی سواری کرنا پڑتی۔ تو سارا معاملہ یوں تھا۔ میں اس خاندان سے اتفاق کا اظہار کیا۔ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور اگر انھیں کچھ علم بھی ہوتا، تو وہ اس پر یقین نہ کر پاتے۔

ایک نسخہ لکھ دینا آسان ہے لیکن لوگوں کو سمجھنا بہت مشکل۔ بہر کیف اس موقع پر مجھے یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ مجھے اس بار پھر بے ضرورت ہی بلایا گیا تھا۔ میں ان زیادتیوں کا عادی تھا۔ اس قصبے نے رات کی گھنٹی کے ساتھ میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ مجھے اس مرتبہ روز کی قربانی بھی دینا پڑی تھی۔ یہ قربانی بہت بڑی تھی۔ وہ پیاری لڑکی، جو سالوں سے میرے گھر میں ہے اور میں نے کبھی اس پر توجہ ہی نہیں کی۔ اس کی قربانی ایک بہت مہنگا سودا تھا اور مجھے کسی طرح جیسی بھی وجوہات تلاش کروں، اس واقعہ کو باجواز قرار دینا ہوگا، ورنہ یہ خاندان میرے غصے کا شکار ہو جائے گا جو اپنی تمام تر نیک نیتی کے باوجود روز کو میرے پاس واپس نہیں لا سکتا۔

میں اپنا تھیلا بند کرتا اور اپنا سمور کی کھال والا کوٹ ان سے مانگتا ہوں تو اکٹھے کھڑے رہتے ہیں۔ مریض کا باپ ہاتھ میں رم کا گلاس پکڑے ناک سڑ کا رہا ہے۔ اس کی ماں شاید مجھ سے مایوس ہو چکی ہے۔

یہ لوگ آخر مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔اور اپنی پرنم آنکھوں کے ساتھ ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتی ہوئی اس کی بہن خون میں تر ایک رومال ہوا میں پھڑپھڑا رہی ہے۔ان حالات میں کسی حد تک میں یہ ماننے کو تیار ہو چکا تھا کہ شاید نوجوان واقعی بیمار تھا۔میں اس کی طرف بڑھا۔اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا جیسے میں اس کے لیے آب حیات لا رہا تھا۔

آہ، اب دونوں گھوڑے ایک ساتھ زور سے ہنہنا رہے تھے۔ان کی ہنہناہٹ جو میں فرض کرتا ہوں کہ آسمانوں سے آرہی تھی تاکہ میری تشخیص میں معاونت کر سکے اور اس بار مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ نوجوان واقعی بیمار تھا۔اس کے کولہے کے قریب دائیں جانب میری ہتھیلی کے برابر ایک کھلا زخم تھا۔گلاب جیسا سرخ، مختلف رنگ دار لہریوں سے سجا، پیندے میں سیاہ، کنارے پر ہلکا، خون کے بے قاعدہ دھبوں سے داغ دار، اور کھلا ایسا جیسے روشنی کے رخ پر کسی غار کا دھانہ۔ایسا وہ فاصلے سے دکھائی دیتا تھا۔لیکن قریب سے دیکھنے پر ایک اور پیچیدگی عیاں ہوئی۔دھیمے سُروں میں سیٹی سی میرے منہ سے نکلی۔کیڑے میری چھوٹی انگلی کے برابر موٹے اور لمبے، گلاب ہی کے رنگ کے اور خون میں تر بتر، اپنے ننھے سروں اور بہت سی ننھی ٹانگوں کے ساتھ زخم کے پیندے سے تیزی سے باہر روشنی کی طرف آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بے چارہ نوجوان، تمھارے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے تمھارا یہ ہولناک زخم ڈھونڈ لیا۔تمھارے جسم میں اگا یہ پھول تمھیں تباہ کر رہا تھا۔خاندان بہت خوش تھا۔انھوں نے مجھے علاج کرتے دیکھ لیا تھا۔مریض کی بہن نے اپنی ماں کو بتایا، ماں نے اپنے خاوند کو اور خاوند نے ان متعدد مہمانوں کو جو چاندنی میں بھیگے کھلے راستے سے دبے پاؤں چلتے، کھلے بازوؤں کے ساتھ توازن قائم رکھتے ہوئے، کمرے میں جمع ہو رہے تھے۔

''کیا آپ مجھے بچا لیں گے'' نوجوان نے آہ بھرتے ہوئے سرگوشی کی۔وہ اپنے زخم میں رینگتے کیڑوں سے یکسر بے خبر تھا۔میرے قصبے کے لوگ ایسے عجیب الذہن ہیں۔ ہمیشہ ڈاکٹر سے کسی ناممکن بات کی توقع کرتے ہیں۔قدیم عقائد پر ان کا کچھ اعتقاد باقی نہیں رہا۔ پادری گھر بیٹھا رہتا اور اپنا ایک کے بعد ایک لباس اتارتا ہے۔لیکن ڈاکٹر سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ہمدرد جراح ہاتھوں سے سب کچھ کر دکھائے۔تو پھر جیسا وہ پسند کریں۔میں نے اپنی خدمات ان پر مسلط تو نہیں کیں۔اگر وہ مجھے مقدس

مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، تو میں انھیں ایسا کرنے دوں گا۔ میں جو ایک بوڑھا قصباتی ڈاکٹر ہوں، اس سے زیادہ اور کیا چاہوں گا۔ میری ملازمہ مجھ سے چھین لی گئی۔

اور یوں وہ آئے، مریض کے اہل خانہ اور گاؤں کے بزرگ، اور بزور میرے کپڑے اتارے۔ گھر کے سامنے کسی سکول کے بچوں کی سرود خوانوں کی ٹولی اپنے استاد کے ساتھ ایک بالکل سادہ دھن میں یہ شعر پڑھنے لگی۔

''اس کے کپڑے اتار دو

تب یہ ہمیں صحت دے گا،

اور اگر یہ ایسا نہیں کرتا

تو اسے جان سے مار دو۔

یہ ایک ڈاکٹر ہی تو ہے

یہ ایک ڈاکٹر ہی تو ہے۔

میرے کپڑے مجھ سے چھین لیے گئے اور میں نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتا ہوا اور سر ایک طرف جھکائے ہوئے، خاموشی سے ان لوگوں کو دیکھا۔ میں اپنے حواس بحال کر چکا اور صورت حال کو سمجھ چکا تھا اور پھر ایسا ہی رہا، یونہی رہتا ہوں، حالاں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑا کیوں کہ وہ اب مجھے سر اور پیروں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بستر کی طرف لے گئے اور مجھے زخم کی جانب دیوار کے برابر لٹا دیا۔ پھر وہ سب کمرے سے باہر چلے گئے۔ دروازہ بھیڑ دیا گیا۔ سرود خوانی رک گئی۔ بادلوں نے چاند کو اوٹ میں کر لیا۔ میرے گرد چادریں گرم تھیں۔ کھڑکیوں میں گھوڑوں کے متحرک سر سایوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

کوئی میرے کان میں کہتا ہے ''کیا آپ جانتے ہیں، مجھے آپ پر ذرہ برابر اعتماد نہیں ہے۔ کیوں کہ آپ کو اڑا کر یہاں لایا گیا ہے، آپ اپنے قدموں پر چل کر یہاں نہیں پہنچے۔ میری مدد کے بجائے آپ میرے بستر مرگ پر میرے لیے جگہ تنگ کر رہے ہیں۔ میرا جی یہی چاہتا ہے آپ کی آنکھیں نوچ لوں۔''

''درست'' میں نے جواب دیا ''قابل شرم بات ہے۔ لیکن میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میں اور کیا

کرتا۔ میرا یقین کرو۔ میرے لیے اس کے علاوہ اور کچھ ممکن نہیں تھا۔''

''تم کیا سمجھتے ہو میں تمھاری معذرت قبول کرلوں گا۔ اوہ! کاش میں ایسا کر سکتا۔ لیکن مجھے ایسا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ اس خوب صورت زخم کے ساتھ دنیا میں آیا۔ یہ میری ذات کا زیور ہے۔''

''میرے نوجوان دوست'' میں نے اس سے کہا ''تمھاری غلطی یہ ہے کہ تمھاری سوچ بہت محدود ہے۔ میں نے زندگی میں دور اور نزدیک سبھی مریض خانوں میں کام کیا ہے۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ تمھارا زخم ناقابل علاج نہیں ہے۔ اسے تیشے کی دو ضربوں سے تمھاری پشت پر بنایا گیا ہے۔ اکثر لوگ اپنا پہلو پیش کرتے ہیں اور انھیں جنگل میں چلائے جانے والے تیشے کی آواز بمشکل سنائی دیتی ہے، اس سے بھی کم جوان کے نزدیک سے آرہی ہوتی ہے۔''

''کیا واقعی ایسا ہے۔ یا مجھے بخار کی حالت میں دھوکہ دے رہے ہو؟''

''واقعی یہ ایسا ہی ہے۔ ایک سرکاری ڈاکٹر کی بات کا یقین کرو۔''

اس نے یقین کرلیا اور ساکت لیٹ گیا۔ اب مجھے یہاں سے فرار ہونے کی تدبیر کرنی چاہیے تھی۔ گھوڑے ابھی تک وفاداری کے ساتھ کھڑکی سے باہر کھڑے تھے۔ میں نے عجلت میں اپنے کپڑے، سمور کا کوٹ اور طبی سامان کا تھیلا اٹھایا۔ میں کپڑے پہننے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے گھوڑے اگر اسی رفتار سے واپس جائیں جس رفتار سے یہاں آئے تھے تو مجھے اس بستر سے اپنے بستر تک جانے تک کا ہی وقت درکار ہوگا۔ فرماں برداری کے ساتھ ایک گھوڑا کھڑکی سے پیچھے مڑ گیا۔ میں نے سامان کی گٹھڑی گاڑی میں اچھالی۔ سمور کا کوٹ وہاں تک نہیں پہنچ سکا اور اس کی آستین گاڑی کی ہک میں اٹکی رہ گئی۔ اتنا بھی بہت تھا۔ میں چھلانگ لگا کر گھوڑے سے چمٹ گیا۔ باگیں ڈھیلے انداز میں پیچھے گھسٹ رہی تھی، کہ گھوڑے بس ایسے ہی ایک دوسرے سے بندھے تھے، گاڑی پیچھے جھول رہی تھی جب کہ سب سے آخر میں برف پر میرا سمور کا کوٹ تھا۔

میں نے چیخ کر کہا ''بھاگو'' لیکن ان میں کوئی تیزی نہیں آئی، ایک بوڑھے کی طرح بہت آہستگی سے ہم برف کے صحرا میں رینگتے رہے۔ دیر تک میرے عقب میں سکول کے بچوں کی سرود خوانوں کی ٹولی کا ایک نیا مگر غیر مناسب گیت گونجتا رہا۔

''اے مریضو! خوشیاں مناؤ

ڈاکٹر تمھارے ساتھ بستر پر لیٹا ہوا ہے۔''

اس رفتار سے یہ گھوڑے کبھی میرے گھر نہیں پہنچ پائیں گے۔ میرا چلتا ہوا کام اب ٹھپ ہو جائے گا۔ میرے بعد آنے والا میری ساکھ تباہ کرنے کے درپے ہے۔ لیکن بے سود، وہ کبھی میری جگہ نہیں لے سکتا۔ میرے گھر میں بدکار سائیس دندناتا پھر رہا ہے، ۔ روز اس کی ہوس کا شکار ہے۔ میں اس بارے میں ابھی کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا۔ برہنہ، ناخوش زمانوں میں سے ایک زمانے کی یخ بستگی میں، ایک زمینی بگھی اور غیر زمینی گھوڑوں کے ساتھ، میں کہ ایک بوڑھا آدمی میں بھٹک رہا ہوں۔ سمور کا کوٹ گاڑی کے عقب میں گھسٹ رہا ہے جس تک میں نہیں پہنچ سکتا۔ غدار، غدار۔ رات کے گھڑیال پر ایک غلط تنبیہ نے جواب دیا۔ اس کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں، کبھی نہیں۔

اونچا بولنے کی سزا

اس دنیا میں ایک مرتبہ پھر میں اپنے گلے کی پوری قوت سے چیخا۔ انھوں نے کپڑے کا گولا میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ میرے ہاتھوں اور پیروں کو باندھا اور میری آنکھوں پر پٹی چڑھا دی۔ مجھے کتنی ہی بار پیچھے اور آگے لڑھکایا گیا۔ کبھی مجھے اوپر اچھالا جاتا، کبھی نیچے پٹخا جاتا۔ انھوں نے میری ٹانگوں میں ٹھڈے مارے۔ میں درد سے کراہ اٹھا۔ مجھے کچھ دیر کے لیے خاموش پڑا رہنے دیا گیا اور پھر غیر متوقع طور پر ایک تیز دھار آلے کو میرے جسم میں ہر جگہ گھونپا جانے لگا۔

ایک بھائی کا قتل

شواہد سے ظاہر ہے کہ قتل یوں ہوا تھا۔

شمر، ایک قاتل ایک رات نو بجے کے قریب خوب چٹکی ہوئی چاندنی میں ایک کونے میں گھات لگا کر کھڑا ہو گیا جہاں ویس، اس کا شکار روزانہ اس گلی سے جس میں اس کا دفتر تھا، دوسری گلی میں مڑتا تھا، جہاں اس کا گھر تھا۔

رات کی ہوا میں کپکپا دینے والی سردی تھی۔ لیکن شمر نے ایک پتلا نیلا لباس پہن رکھا تھا۔ جیکٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اسے سردی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ تمام وقت وہ گھومتا رہا تھا۔ اس ہتھیار جو نصف تلوار اور نصف گھریلو چاقو سے مشابہہ تھا، اس نے یوں پکڑا ہوا تھا کہ ہر کسی کو واضح دکھائی دے سکتا تھا۔ اس نے چاند کی روشنی میں چاقو کو دیکھا۔ اس کے پھل میں چمک پیدا ہوئی لیکن شمر کے لیے اتنا کافی نہیں تھا۔ اس نے چاقو کے پھل کو فٹ پاتھ کی اینٹوں سے رگڑا حتیٰ کہ شرارے پیدا ہوئے۔ شاید اسے اس بات پر افسوس ہوا اور خرابی دور کرنے کے لیے پھل کو آگے جھکتے ہوئے جوتے کے تلے سے وائلن کے گز کی طرح پھیرا، ایک ٹانگ پر کھڑے اور اپنے جوتے پر چاقو کی رگڑ اور گلی میں سے آتی ہوئی ہر آواز کو سنتے ہوئے۔

کیوں پیلاس جیسے معزز شہری نے جو قریب ہی دوسری منزل میں اپنی کھڑکی سے یہ سارا منظر دیکھ

رہا تھا، یہ سب کچھ ہونے دیا؟ انسانی فطرت کے اسرار لاینحل ہیں۔ اپنی اٹھی ہوئی کالر اور اپنے بھاری بھر کم جسم سے لپٹے گاؤن میں وہ یہ تماشا دیکھتا اور خاموشی سے سر ہلاتا رہا۔

ادھر گلی کی مخالف سمت میں مزید پانچ گھروں کے فاصلے پر ویس کی بیوی نے اپنے شب خوابی کے لباس پر لومڑی کی کھال والا کوٹ پہنے اپنے خاوند کے انتظار میں گھر کی کھڑکی سے باہر جھانکا جو رات زیادہ گزر جانے کے باوجود خلاف معمول گھر نہیں پہنچا تھا۔

آخر کار ویس کے دفتر کے سامنے دروازے کی گھنٹی بجی، اتنی اونچی آواز میں کہ جیسی گھنٹی کی نہیں ہوتی، یہ آواز پورے قصبے میں پھیلتی آسمان تک گئی، اور ویس، رات گئے تک کام کرنے والا جفاکش، دفتر کی عمارت سے باہر نکلا۔ وہ ابھی تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف گھنٹی کی آواز ہی اس کے لیے روانگی کا ثبوت تھی۔ تب فوراً ہی فٹ پاتھ پر اس کے قدموں کی چاپ گونجی۔

پیلاس کھڑکی میں آگے جھک آیا۔ وہ اس واقعہ کی کوئی تفصیل چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مسز ویس کو گھنٹی کی آواز سے اپنے شوہر کے آنے کی اُمید ہوئی تو اس نے کھٹ سے کھڑکی بند کی۔ لیکن شمر نیچے جھکا ہوا تھا۔ چوں کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ ننگا نہیں تھا، اس نے اپنے چہرے اور ہاتھوں کو فٹ پاتھ سے لگا دیا۔ جہاں باقی ہر شے یخ تھی۔ شمر اندر سے دہک رہا تھا۔

نکڑ پر جو دو گلیوں کو تقسیم کرتی تھی، ویس ٹھٹھکا، صرف اس چھڑی کی نوک اگلی میں سہارے کے لیے ظاہر ہوئی۔ ایک فوری احساس۔ تاریک آسمان نے اپنی نیلی تاریکی اور سنہرے پن کے ساتھ اسے مسحور کیا۔ اس نے اوپر آسمان کی جانب دیکھا اور بے دھیانی میں سر سے ٹوپی اتار کر بالوں پر ہاتھ پھیرو وہاں اوپر کوئی شے ایسی نہیں تھی جو اس کے فوری مستقبل کو اس پر واضح کرتی۔ وہاں ہر شے اپنی بے معنی، ناقابل فہم جگہ پر موجود تھی۔ اپنے طور پر یہ نہایت معقول اقدام تھا کہ وہ چلنا جاری رکھے لیکن وہ تو شمر کے چاقو کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''ویس'' شمر چیخا، اپنے پیروں کے پنجوں پر کھڑے ہوتے، اپنے پھیلے ہوئے بازو کے ساتھ جب کہ چاقو بہت نیچے اندھیرے میں تھا۔

''ویس۔۔۔۔۔۔۔۔۔تم کبھی جولیا کو نہیں دیکھ پاؤ گے۔'' اور دائیں طرف سے گلے میں، اور پھر بائیں جانب سے گلے میں چاقو کی دھار پھیری اور پھر تیسری مرتبہ چاقو اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ پانی کے چوہے جنھیں کاٹ دیا جائے، ایسی نکالتے ہیں جیسے ویس نے نکالی۔

''قتل کر دیا''، سکیمر نے اپنے آپ سے کہا اور خون میں لتھڑے ہوئے چاقو کو قریبی گھر کے سامنے اچھال دیا۔ ''قتل کا حظ۔ راحت، دوسرے انسان کے بہتے ہوئے خون سے پیدا ہونے والی مستی۔ ویس، بوڑھے اُلّو، دوست، شراب خانے کے ساتھی۔ تم رات کے اندھیرے میں نیچے گلی کے فرش پر بہہ رہے ہو۔ کاش تم صرف خون کا ایک بلبلہ ہوتے تو میں تم میں سوراخ کرتا اور تمھارے وجود کو عدم میں بدل دیتا۔ انسان جیسا چاہتا ہے، وہ حقیقت نہیں بنتا، ہمیشہ سارے خواب تعبیر کی صورت نہیں دیکھ پاتے، تمھاری لاش یہاں پڑی ہے۔ ہر ٹھوکر سے بے نیاز۔ ان بے کار سوالوں کا جو تم پوچھ رہے ہو، اب کیا فائدہ؟''

پیلاس اپنے جسم میں پھیلتے زہر سے ہچکی لیتا ہوا، اپنے گھر کا دوہرے پٹ کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا ''شمر، شمر! میں نے سب کچھ دیکھا ہے۔ پورا واقعہ دیکھا ہے۔'' پیلاس اور شمر نے ایک دوسرے کو استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ اپنی تشخیص سے پیلاس مطمئن ہو گیا لیکن سکیمر فی الفور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا۔

مسز ویس ہر طرف سے آتے لوگوں کے ایک ہجوم کے ساتھ بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کا چہرہ صدمے سے مزید بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کا سمور کا کوٹ کھل کر ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وہ مردہ ویس پر ڈھے گئی۔ شب خوابی کے لباس میں لپٹا ہوا جسم ویس کی ملکیت تھا۔ سمور کے کوٹ نے ایک ہموار قبر کی صورت میں دونوں کو ڈھانپ لیا جو مجمع کی ملکیت تھی۔

شمر نے قے روکنے کی دشوار کوشش کرتے ہوئے اپنا منہ سپاہی کے کندھے پر جما دیا جو آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسے دور لے گیا۔

ریل کا سفر

ریل گاڑی میں بیٹھو اور پھر یہ بھول جاؤ تم کہاں ہو؟ یہی سمجھو کہ یہ تمھارا گھر ہے تم یہیں رہتے ہو۔ اچانک تمھیں یاد آئے گا کہ یہ کونسی جگہ ہے۔ آگے بھاگتی ہوئی ریل کو محسوس کرو۔ اب تم ایک مسافر ہو۔ اپنے تھیلے میں سے ٹوپی نکالو، اپنے ساتھی مسافروں سے بے تکلفی سے ملو، تم اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو لیکن کوشش کرو کہ اس میں تمھاری کسی شعوری کاوش کا دخل نہ ہو۔ ایک بچے کی طرح سفر سے حظ اٹھاؤ۔ کسی عورت کے محبوب بن جاؤ۔ تمھیں کھڑکی میں کشش محسوس ہوگی۔ اپنا ایک ہاتھ ہمیشہ کھڑکی کی دہلیز پر رکھو۔

ایک پرانا مسودہ

یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے دفاعی نظام میں بہت کچھ نظر انداز کیا گیا تھا۔ ہم نے اب تک اس پر توجہ نہیں کی اور اپنے معمولاتِ زندگی میں الجھے رہے لیکن حالیہ واقعات نے ہمارے لیے یک بارگی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔

بادشاہ کے محل کے سامنے بازار میں میری جوتوں کی دکان ہے۔ طلوعِ آفتاب کے اوّلین آثار نمودار ہونے پر میں نے ابھی دکان کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ مجھے بازار سے منسلک ہر گلی کے سرے پر مسلح فوجی تعینات دکھائی دیے۔ لیکن وہ ہمارے ملک کے فوجی نہیں ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ شمال کی جانب سے آئے ہوئے خانہ بدوش وحشی ہیں۔ ایک اعتبار سے میرے لیے یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ وہ کس طرح سیدھے ملک کے دارالحکومت میں آن گھسے حالاں کہ یہ سرحد سے بہت دور ہے۔ بہرکیف وہ یہاں موجود ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہر روز ان کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

جیسی ان کی فطرت ہے کہ وہ کھلے آسمان کے نیچے خیمے لگا کر رہتے ہیں، کیوں کہ دیواروں سے گھری جگہوں سے انھیں وحشت ہوتی ہے۔ وہ خود کو تلواریں چمکانے، تیروں کو تیز کرنے اور گھڑ سواری کی مشق میں مصروف رکھتے ہیں۔ یہ پرامن بازار جسے ہمیشہ غیر معمولی طور پر صاف رکھا جاتا تھا، انھوں نے اسے صریحاً ایک اصطبل بنا دیا ہے۔ ہم کبھی کبھار اپنی دکانوں سے باہر نکلنے اور کم از کم وہاں پڑی بدترین غلاظت کو صاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اب ایسا کم ہی ہو پاتا ہے کیوں کہ ہماری ہر کوشش رائیگاں ہے بلکہ ہمیں اس خطرے میں مبتلا کرتی ہے کہ ہم ان خانہ بدوشوں کے گھوڑوں کے سموں تلے آ کر کچلے جائیں یا ان کے دُرّوں کی مار سے ہاتھ پیر تڑوا بیٹھیں۔

ان خانہ بدوشوں سے گفتگو ممکن نہیں ہے۔ یہ ہماری زبان سے نابلد ہیں۔ بلکہ ان کی تو اپنی کوئی

زبان ہی نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے سے یونہی گفتگو کرتے ہیں جیسے کوّے باتیں کرتے ہیں۔ چھوٹے کوّوں جیسی کائیں کائیں سارا وقت ہماری سماعت پر خراشیں ڈالتی ہے۔ ہماری طرز معاشرت اور رسوم و رواج سے وہ نہ صرف ناواقف ہیں بلکہ انھیں ان میں کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ انھیں ہمارے اشاروں سے بھی کوئی مطلب اخذ کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔

آپ انھیں اشاروں کنایوں میں کوئی بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، حتی کہ آپ کی کلائیاں اور جبڑے دکھنے لگتے ہیں، لیکن وہ آپ کی بات نہیں سمجھیں گے، اور کبھی نہیں سمجھیں گے۔ وہ اکثر اپنے چہرے مضحکہ خیز بنا لیتے۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ جاتی ہیں اور ان کے منہ سے کف بہنے لگتا ہے۔ لیکن ایسا وہ کسی مقصد کے تحت نہیں کرتے، نہ آپ کو دھمکی دینے کے لیے۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے کیوں کہ یہ ان کی فطرت ہے۔ جو چیز انھیں پسند آتی ہے، وہ اسے چھین لیتے۔ آپ اسے بدمعاشی بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ کسی شے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور آپ محض ایک جانب کھڑے ہو جاتے اور انھیں اپنی من مانی کرنے دیتے ہیں۔

میرے جوتوں کے ذخیرے سے بھی انھوں نے کئی اچھے نمونے ہتھیا لیے۔ لیکن میں شکایت نہیں کرتا کیوں کہ، مثال کے طور پر میں دیکھتا ہوں کہ گلی کے قصاب کی انھوں نے کیا درگت بنائی۔ جونہی وہ گوشت لاتا ہے، وہ جانوروں کی طرح اس پر جھپٹ پڑتے اور چشم زدن میں اسے ہڑپ کر جاتے۔ حتی کہ ان کے گھوڑوں کی بھی یہی مرغوب غذا ہے۔ اکثر و بیشتر گھڑسوار اور اس کا گھوڑا پہلو بہ پہلو لیٹ جاتے ہیں۔ دونوں ہی جانور کے کسی ایک حصے کو چبا رہے ہوتے ہیں، ایک ایک سرے کو تو دوسرا دوسرے سرے کو۔ قصاب اس صورتحال سے بہت خوفزدہ ہے اور گوشت کی فراہمی میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا۔ ہم اس بات کو سمجھتے ہیں اور خاموشی سے اسے سرمایہ فراہم کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی سرگرمی میں تعطل نہ آنے دے۔ اگر ان وحشیوں کو گوشت نہ ملے تو کیا معلوم یہ کیا کر بیٹھیں؟ لیکن یہ بھی کون جانتا ہے کہ اگر انھیں روزانہ گوشت ملتا رہے، تب بھی وہ کر بیٹھیں۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ قصاب نے سوچا کہ وہ روز روز جانور ذبح کرنے کے جھنجھٹ سے چھٹکارا پا لے۔ چناں چہ ایک روز اس نے ایک زندہ بیل ان کے آگے ڈال دیا لیکن آئندہ وہ کبھی ایسی غلطی دہرانے کی جرات نہیں کرے گا۔ مجھے پورا ایک گھنٹہ اپنی ورکشاپ کے عقب میں کپڑوں، سرہانوں اور

غالیچوں میں سر منہ لپیٹے فرش پر چت لیٹے رہنا پڑا تا کہ بیل کے ڈکارنے کی دہشت ناک آواز سننے سے بچ سکوں، جس پر خانہ بدوش ہر طرف سے جھپٹ پڑے، اور دانتوں سے اس کے زندہ گوشت کی بوٹیاں نوچ رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی ہو جانے کے کافی دیر بعد ہی میں باہر آنے کی ہمت کر سکا۔ وہ سیر ہو کر بیل کی باقیات کے گرد بے سُدھ لیٹے تھے جیسے شرابی نشے میں دھت شراب کے کٹوروں کے گرد ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

یہی وہ موقع تھا جب مجھے گمان ہوا کہ میں نے واقعی بادشاہ کو محل کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ عام طور پر وہ ان بیرونی کمروں میں نہیں آتا تھا بلکہ سارا وقت داخلی باغ ہی میں گزارتا ہے۔ لیکن اس موقع پر وہ وہاں کھڑا تھا یا کم از کم مجھے ایسا ہی گمان ہوا کہ وہ ایک کھڑکی میں سے سر جھکائے اپنی رہائش گاہ کے سامنے ہونے والے اس واقعہ کو ملاحظہ کر رہا تھا۔

"کیا ہونے والا ہے؟" ہم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں۔ "کب تک ہم اس اذیت کے اس بوجھ کو ڈھوئیں گے؟ بادشاہ کے محل کی لالچ ان وحشیوں کو یہاں کھینچ لائی ہے۔ لیکن اب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے پھر سے واپس بھیجا جائے۔ محل کا صدر دروازہ بند رہتا ہے اور اس پر پہرہ دینے والے شاہی محافظ، جو ہمیشہ ایک خاص قاعدے سے اندر اور باہر آتے جاتے تھے، سلاخ دار کھڑکیوں کے پیچھے رہتے ہیں۔ یہ ہم تاجروں اور کاریگروں کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے کہ ہم ملک کی حفاظت کریں۔ ہم اس ذمہ داری کے اہل نہیں ہیں اور نہ ہی ہم نے کبھی ایسا دعویٰ کیا ہے۔ یہ ایک سنگین غلط فہمی ہے جو ہم سب کی تباہی کا سبب بنے گی۔"

قیدی کی منتقلی

ہمارا بادشاہ جاہ وحشمت سے عاری ہے۔ جس کسی نے بادشاہ کی تصویر نہیں دیکھی، وہ اسے دیکھ کر کبھی نہیں پہچان سکتا کہ وہی ہمارا بادشاہ ہے۔ اس کا لباس ناقص انداز میں سیا گیا ہوتا ہے۔ کپڑا گھٹیا اور کوٹ کے بٹن ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اس کے پلو ہر طرف لہراتے ہیں اور وہ ہمیشہ بوسیدہ حالت میں رہتا ہے۔ اس کی ٹوپی مڑی ہوئی، میلی اور کناروں سے کٹی پھٹی ہوتی ہے۔ جوتے بھاری، بازو بے ڈھنگے انداز میں ادھر اُدھر جھولتے ہوئے۔ اس کے بڑے کھدرے چہرے پر موٹی ناک چسپاں ہوتی ہے، مختصر مونچھ، سیاہ اور چمکدار آنکھیں اور سخت مگر خوبصورت گردن۔ ایک بار بازار سے گزرتے ہوئے وہ ہماری دکان کے دروزے کے سامنے کھڑا ہو گیا، اپنا دایاں ہاتھ دروازے کی چوکھٹ ہر جمایا اور بولا ''کیا فرانز یہاں ہے؟'' وہ ہر کسی کو اس کے نام سے جانتا ہے۔ میں ایک تاریک گھر سے نکل کر باہر آیا۔

''میرے ساتھ آؤ'' اس نے گہری نظر مجھ پر ڈال کر کہا ''اسے قلعہ میں منتقل کیا جا رہا ہے'' اس نے میرے مالک سے کہا۔

ایک کان کی سیر

آج چیف انجینئر ز صاحبان کان میں نیچے ہمارے کام کرنے والے حصے تک آئے ہیں۔ انتظامیہ نے نئے پچھوں کی کھدائی سے متعلق چند ہدایات جاری کی ہیں۔ لہٰذا انجینئر صاحبان ابتدائی معائنے کے لیے آئے ہیں۔ کتنے نوجوان ہیں یہ سب، اور پھر بھی ایک دوسرے سے کتنے مختلف بھی۔ یہ سب ایک آزاد ماحول میں پلے بڑھے اور نوجوانی میں بھی کسی خود شعوری کے منفی احساس کے بغیر واضح شخصی صفات کے حامل ہیں۔

ان میں پہلا انجینئر متحرک شخص، سیاہ بالوں والا، ایسی آنکھوں کا حامل ہے ہر شے پر مرتکز رہتی ہیں۔

دوسرے شخص ہاتھوں میں کاپی تھامے ہوئے چلتے چلتے ماحول کا جائزہ لیتا اور اس میں کچھ لکھتا ہے۔

تیسرا شخص اپنے کوٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ گھسیٹرے، کہ جیسے ہر شے اس کے لیے تناؤ کا باعث ہے، تن کر چل رہا ہے، پروقار لگتا ہے۔ صرف یہ بات کہ اسے ہونٹ چبانے کی عادت ہے، اس کی مضطرب، قابو سے باہر جوانی کو ظاہر کرتی ہے۔

چوتھا شخص تیسرے شخص کو مسلسل وضاحتیں پیش کرتا ہے جس کے لیے اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ عہدے میں اس سے کمتر وہ بے تکلف دوست کی طرح ڈلکی چال میں اس شخص کے پہلو میں چل رہا ہے۔ اس کی شہادت کی انگلی مسلسل فضا میں کھڑی رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے وہ ہر شے پر جو اسے دکھائی دیتی ہے، رواں تبصرہ کر رہا ہو۔

پانچوں شخص غالباً عہدے میں سب سے بڑا ہے۔ کسی کی قربت کی اذیت سے بچا ہوا ہے۔ کبھی وہ آگے نکل جاتا اور کبھی پیچھے ہو کر چلنے لگتا۔ انجینئروں کا گروہ ارادتاً اس سے کچھ فاصلہ برقرار رکھے ہوئے ہے۔ وہ نحیف اور زرد رو ہے۔ ذمہ داریوں کے بوجھ نے اس کی آنکھوں کو بے کیف کر دیا ہے۔ وہ اکثر

متفکرانہ انداز میں اپنے ہاتھوں کو پیشانی پر رگڑتا ہے۔

چھٹا اور ساتواں دونوں انجینئر کچھ آگے جھکے ہوئے سروں کو آپس میں جوڑے بازوؤں میں بازو ڈالے، رازداری کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے چل رہے ہیں۔ اگر یہ ناقابل تردید انداز میں ہماری سب سے گہری کوئلوں کی کان اور کام کی جگہ نہ ہوتی تو انھیں دیکھ کر آسانی سے یقین کیا جا سکتا تھا کہ یہ ہڈیالے، کلین شیو اور گانٹھ دار ناک والے اشخاص نوجوان پادری ہیں۔ ان میں ایک اکثر اپنی ہی کسی بات پر بلی جیسی خرخراہٹ کے ساتھ ہنستا ہے جب کہ دوسرا بھی مسکراتے ہوئے گفتگو جاری رکھتا ہے اور اپنے آزاد ہاتھ کو ساتھ ساتھ حرکت دیتا جاتا ہے۔

یہ دونوں اپنے عہدوں کے بارے میں کتنے پر یقین ہوں گے۔ ہاں، اپنی نوجوانی کے باوجود انھیں ہماری کان کے لیے کس قسم کی خدمات سرانجام دینی چاہئے تھیں، کہ وہ اس قابل ہو پاتے کہ اس انتہائی اہم معائنے کے دوران، چیف کی موجودگی میں، خود کو اپنے ذاتی معاملات میں یا ایسے معاملات میں جن کا موجودہ کام سے سرے سے کوئی تعلق نہ ہو، مصروف رکھیں؟ یا کیا ایسا ممکن تھا کہ اپنے ہنسی ٹھٹھے اور ظاہری بے توجہی کے باوجود وہ خوب جانتے ہوں کہ کیا ضروری تھا؟ ان جیسے احباب کے بارے میں کوئی فیصلہ کن رائے دینے سے انسان احتراز ہی کرتا ہے۔

دوسری طرف اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آٹھواں شخص مثال کے طور پر ان دونوں غافلوں کی نسبت اپنے کام سے کہیں زیادہ مخلص ہے۔ بلکہ باقی سب لوگوں سے بھی۔ وہ ہر شے کو چھوتا اور اپنی چھوٹی سی ہتھوڑی سے اسے ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے جسے وہ بوقت ضرورت جیب سے نکال لیتا اور پھر سے واپس وہیں ٹھونس لیتا ہے۔ وہ اکثر بہترین پوشاک کے باوجود گھٹنوں کے بل گرد آلود فرش پر بیٹھ جاتا اور زمین کو بجا کر دیکھتا ہے۔ پھر دوبارہ سے دیواروں کے قریب سے گزرتے ہوئے انھیں یا سر کے اوپر چھت کا ٹھوک بجا کر معائنہ کرتا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے خود کو پوری طرح پھیلایا اور لیٹ گیا۔ ہم نے یہی سمجھا کہ شاید وہ کسی مسئلے سے دوچار تھا۔ لیکن پھر جسم کے فوری جھٹکے سے وہ اچھل کر پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ تحقیق ہی کر رہا تھا۔ ہم گمان کرتے ہیں کہ اپنے کام اور کان کی پتھریلی ساخت کے بارے میں ہمیں سب علم ہے۔ لیکن یہ انجینئر تمام عرصے میں اس عجیب انداز سے ٹھوک بجا کر معائنہ کر رہا ہے، یہ ہماری فہم سے بالا تر ہے۔

نواں شخص ایک بچہ گاڑی کی طرح کا ٹھیلا دھکیل رہا ہے جس میں معائنے کے اوزار پڑے ہیں۔ نہایت قیمتی اوزار نرم سفید اون میں لپیٹ کر رکھے گئے ہیں۔ اصولاً دفتر کے قلی کو یہ ٹھیلا دھکیلنا چاہئے۔ لیکن شاید اس پر اعتبار نہیں کیا گیا۔ ایک انجینئر کو یہ کام کرنا پڑ رہا ہے اور صاف دکھائی دیتا ہے کہ وہ ایسا نیک نیتی کے ساتھ کر رہا تھا۔ وہ شاید سب سے کم عمر ہے۔ شاید وہ ابھی اس تمام سامان کی افادیت کو سمجھنے کے بھی صحیح طور پر اہل نہیں ہے لیکن وہ ہر وقت اپنی نگاہ ٹھیلے پر جمائے رکھتا ہے جس سے اکثر یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بے دھیانی میں ٹھیلے کو دیوار سے ہی نہ دے مارے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور انجینئر بھی چل رہا ہے جو اس تصادم کو ہونے سے روکتا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سامان کی افادیت سے مکمل طور پر آگاہ ہے اور یوں لگتا ہے کہ وہی اس تمام سرگرمی کا سربراہ ہے۔ وقفے وقفے سے وہ ٹھیلے کو روکے بغیر کسی اوزار کے ایک حصے کو اٹھاتا ہے۔ اسے غور سے دیکھتا ہے۔ پیچ کش سے اسے کھولتا اور بند کرتا ہے۔ اسے ہلاتا جلاتا اور ٹھوک بجا کر دیکھتا ہے، اسے اپنے کان کے قریب لے جاتا اور کچھ سنتا ہے اور آخر جب ٹھیلا دھکیلنے والا شخص رک جاتا ہے تو وہ اوزار کے اس حصے کو، جو دور سے بہت زیادہ چھوٹا دکھائی دیتا ہے، انتہائی احتیاط سے واپس اس کی جگہ لپیٹ کر رکھ دیتا ہے۔ انجینئر کا انداز تحکمانہ ہے لیکن صرف ان اوزاروں کے معاملے میں۔ ٹھیلے سے دس قدم کے فاصلے پر ہی اس کی انگلی کے بے لفظ اشارے پر ہمیں ٹھیلے کے لیے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے، حتیٰ کہ وہاں بھی جہاں ہماری پاس پیچھے ہٹنے کی کوئی گنجائش موجود نہ ہو۔

ان دونوں اشخاص کے پیچھے دفتر کا قلی بغیر کسی بھی کام کے چل رہا ہے۔ یہ احباب جیسا کہ اعلیٰ علم کے حامل احباب سے توقع کی جاتی ہے، اپنے رویے میں موجود تکبر کو کب کا پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے وہ سارا تکبر گویا قلی نے اپنی ذات میں سمیٹ لیا اور اسے سنبھالے ہوئے ہے۔ ایک ہاتھ پیچھے کمر پر جمائے ہوئے، دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی وردی کے چمک دار بٹنوں یا صاف دھلے ہوئے رومال کو مروڑتے ہوئے، وہ وقفے وقفے سے دائیں اور بائیں ایسے جھکتا ہے جیسے ہم اسے کورنش بجالا رہے ہوں اور وہ اس کا جواب دے رہا ہو، یا جیسے وہ فرض کیے ہوئے ہو کہ ہم نے اسے سلام کیا تھا، جب کہ وہ ایسا ذی قدر اور عالی شان ہے کہ ہمارے سلام کو خاطر میں نہیں لاتا۔ بلاشبہ ہم نے اس سلام نہیں کیا لیکن اس کے چلنے کے انداز کو دیکھ کر یقین کیا جا سکتا تھا کہ کسی کان کے مرکزی دفتر میں قلی ہونا ایک بڑے

اعزاز کی بات تھی۔ اس کی پیٹھ پیچھے ہم بے تحاشا قہقہے لگاتے ہیں۔ لیکن اسے تو جیسے کوئی تیز جھکڑ بھی شاید پیچھے مڑکر دیکھنے پر مجبور نہ کر پائے۔ وہ احترام کے معاملے میں ہمارے لیے ایک لاینحل معمہ ہے۔

آج ہم زیادہ کام نہیں کریں گے۔ یہ دخل اندازی بہت دلچسپ ہے۔ اس طرح کے مہمانوں کی آمد ذہنوں سے کام کے خیال کو بالکل جھٹک دیتی ہے۔ یہ بات بہت ترغیب کی حامل ہے کہ ان احباب کو پیچھے کھڑے ہو کر دیکھا جائے حتی کہ وہ کان کی آزمائشی راہداری کے اندھیرے میں غائب ہو جائیں۔ مزید یہ کہ جلد ہی کان میں ہماری شفٹ کا وقت ختم ہو جائیگا۔ ہم یہاں نہیں ہوں گے کہ انھیں واپس آتا دیکھ سکیں۔

عرب اور گیدڑ

ہم نے ایک نخلستان میں خیمے لگا رکھے تھے۔ میرے رفقاء گہری نیند میں مدہوش تھے۔ میرے قریب سے ایک لمبا تڑنگا سفید چمڑی والا عرب گزرا۔ وہ اونٹوں کی دیکھ ریکھ کرتا رہا تھا اور اب اپنی خواب گاہ کی طرف لوٹ رہا تھا۔

میں نے خود کو پشت کے بل گھاس پر گرا لیا۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک گیدڑ چیخا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جو منظر مجھ سے بہت دور تھا، وہ پلک جھپکتے ہیں میرے نزدیک آ گیا۔ بہت سے گیدڑ میرے گرد جمع ہو رہے تھے۔ آنکھیں ماند پڑے سونے کی طرح چمکتی اور پھر بجھ جاتیں۔ لچکدار جسم ایک تسلسل کے ساتھ تیزی سے حرکت کرتے ہوئے جیسے کوئی انھیں چابک کے زور پر ایسا کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔

میرے عقب سے ایک گیدڑ میرے قریب آیا، میرے بازو کے نیچے ٹہوکا دیتے، خود کو مجھ سے رگڑتے ہوئے جیسے میرے جسم کی گرمی چاہتا ہو۔ پھر وہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مخاطب ہوا ''میلوں تک پھیلے اس علاقے کا میں عمر رسیدہ ترین گیدڑ ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ یہاں آخر کار آپ سے ملاقات ہوئی۔ میں تو امید جیسے چھوڑ ہی چکا تھا، کیوں کہ ہم بے شمار سالوں سے آپ کا انتظار کھینچ رہے تھے۔ میری ماں کو بھی آپ کا انتظار تھا، اور اس کی ماں کو بھی اور ہماری تمام ماؤں کو، تمام گیدڑوں کی ماں تک۔ یہ حقیقت ہے، آپ میرا یقین کیجیے۔''

''حیرت انگیز،'' میں نے کہا اور شدید حیرت میں اپنے سامنے تیار پڑے لکڑیوں کے ڈھیر میں آگ بھڑکانا ہی بھول گیا جس کا دھواں گیدڑوں کو دور بھگا دیتا۔ ''مجھے آپ کی بات سن کر بہت حیرت ہوئی۔ یہ تو محض ایک اتفاق ہی ہے کہ میں شمال بعید سے اس طرف نکل آیا ہوں اور میں آپ کے ملک میں میرا قیام بہت مختصر رہے۔ تو آپ گیدڑ کیا چاہتے ہیں؟''

جیسے میرے اس نہایت دوستانہ استفسار سے غالباً ان گیدڑوں کا حوصلہ بڑھا۔ گیدڑوں کا دائرہ میرے گرد اور تنگ ہو گیا۔ سبھی ہانپ رہے اور منہ کھولے ہوئے تھے۔

''ہم جانتے ہیں''، بوڑھا گیدڑ بولا ''کہ آپ شمالی علاقے سے تشریف لائے ہیں۔ اسی نقطے پر ہماری امیدیں قائم ہیں۔ آپ شمالی علاقے میں رہنے والوں کی ایسی ذہانت ودیعت کی گئی ہے جو عربوں میں عنقا ہے۔ ذہانت کی ایک چنگاری بھی، میں آپ سے عرض کروں، آپ ان کے یخ تکبر میں سے نہیں نکال پائیں گے۔ یہ اپنی غذا کے لیے جانوروں کو مارتے ہیں اور مردار گوشت سے نفرت کرتے ہیں۔''

''اونچا مت بولو۔'' میں نے کہا، ''پاس ہی عرب سو رہے ہیں۔''

''آپ تم واقعی یہاں اجنبی ہیں۔'' گیدڑ بولا، ''ورنہ آپ کو علم ہوتا کہ دنیا کی تاریخ میں کبھی کوئی گیدڑ کسی عرب سے خوف زدہ نہیں ہوا۔ ہم ان سے کیوں خوف زدہ ہوں؟ ہمارے لیے کیا اتنی ہی بدقسمتی کافی نہیں ہے کہ ہمیں اس جیسی مخلوق کے درمیان جلاوطن کیا گیا۔''

''ہوسکتا ہے، ہوسکتا ہے،'' میں نے کہا، ''ایسے معاملات جن کا مجھ سے دور کا بھی تعلق نہ ہو، میں ان پر رائے دینے کا استحقاق نہیں رکھتا۔ لگتا ہے یہ کوئی دیرینہ تنازعہ ہے۔ میرے خیال میں یہ خون میں شامل ہے، اور خون بہنے پر ہی ختم ہوگا۔''

''آپ بہت زیرک ہیں،'' بوڑھے گیدڑ نے مسرت سے کہا۔ سبھی گیدڑ زیادہ شدت سے ہانپنے لگے۔ ہوا ان کے پھیپھڑوں سے باہر خارج ہو رہی تھی حالاں کہ وہ ساکت کھڑے تھے۔ انتہائی بری بُو جسے برداشت کرنے کے لیے بعض اوقات مجھے اپنے دانت بھینچنے پڑتے تھے، ان کے کھلے جبڑوں سے بھبھکوں کی صورت خارج ہو رہی تھی، ''آپ واقعی ایک زیرک انسان ہیں۔ آپ نے ابھی جو کچھ کہا، وہ ہماری قدیم روایات کے عین مطابق ہے۔ اس لیے ہم ان کا خون نکالیں گے اور ہمارا جھگڑا ختم ہو جائے گا؟''

''اوہ'' میں نے اپنی توقع سے کہیں زیادہ جوش سے کہا۔''وہ ضرور اپنا دفاع کریں گے۔ وہ اپنی بندوقوں سے آپ کو ڈھیروں کی صورت ہلاک کر دیں گے۔''

''آپ ہمیں نہیں سمجھے۔'' گیدڑ نے کہا،''ایک انسانی کمزوری جو ظاہری طور پر شمالی بعید میں بھی باقی ہے۔ ہم انھیں قتل کرنے کی تجویز نہیں دے رہے۔ دریائے نیل کا سارا پانی بھی ہمیں ان کی غلاظت سے پاک نہیں کر سکے گا۔ کیوں کہ ان کے زندہ جسموں کی جھلک ہی ہمیں دم دبانے اور تازہ ہوا کی طرف بھاگ جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ صحرا میں، جو اسی باعث ہمارا گھر ہے۔''

میرے اردگرد تمام گیدڑوں نے، دور دور سے آئے ہوئے نو واردوں سمیت، اپنی تھوتھنیاں اگلی ٹانگوں میں پھنسالیں اور انھیں اپنے پنجوں سے پونچھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنی نفرت کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے جو اتنی شدید تھی کہ میرا جی کیا کہ ان کے سروں کو پھلانگتا ہوا بھاگ نکلوں۔

''تو آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' میں نے بوڑھے گیدڑ سے پوچھا، اور کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میرے عقب میں دونوجوان گیدڑ میرے کوٹ اور قمیص میں اپنے دانت گاڑھے ہوئے تھے۔ میں مجبوراً بیٹھا رہا۔

''یہ آپ کے خادم ہیں۔'' بوڑھے گیدڑ نے وضاحت کی بہت سنجیدگی کے ساتھ،''عزت کے نشان۔''

''ان سے کہیں مجھے جانے دیں'' میں نے چیخ کر کہا، کبھی بوڑھے گیدڑ اور کبھی نوجوان گیدڑوں کی طرف بھاگتے ہوئے۔

''یہ ضرور ایسا ہی کریں گے۔'' بوڑھا گیدڑ بولا،''اگر یہی آپ کی خواہش ہے تو۔ لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔ کیوں کہ انھوں نے ہمارے رواج کے مطابق اپنے دانت مضبوطی سے گاڑ رکھے ہیں اور اب تھوڑا تھوڑا کر کے ہی اپنے جبڑوں کو ڈھیلا کر پائیں گے۔ اس دوران میں تم ہماری عرضداشت پر توجہ فرمائیے۔''

''آپ کا رویہ ایسا نہیں ہے کہ میں آپ کی درخواست قبول کروں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔

''ہم پر بدتہذیبی کا الزام مت لگائیے۔'' وہ بولا اور پہلی مرتبہ اپنی آواز کے فطری سوز کے ساتھ بات کی۔''ہم بے بس مخلوق ہیں۔ ہمارے پاس ان دانتوں کے سوا اور ہے ہی کیا۔ جو کچھ بھی ہم کرنا

چاہتے ہیں، اچھا یا برا، وہ انھی دانتوں سے کرتے ہیں۔''

''کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا، ان سے الجھے بغیر۔

''جناب'' اس نے پکار کر کہا اور اس کے ساتھ ہی تمام گیدڑ مشترکہ طور پر چیخے جیسے یہ ان کا کوئی روایتی گیت ہو۔ ''جناب ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ اس تنازعے کا کوئی حل نکالیں جس نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ آپ ہی وہ شخص ہیں جس کے بارے میں ہمارے آباؤ اجداد نے پیشین گوئی کی تھی کہ جو ہمیں نجات دینے کے لیے پیدا ہوگا۔ ہم عربوں کے مظالم کا مزید شکار نہیں ہونا چاہتے۔ سانس لینے کی جگہ چاہتے ہیں۔ ایسا افق جو ان کے وجود سے پاک ہو۔ نہ مزید کسی بھیڑ کی چیخیں، جسے عرب چاقو سے ذبح کرتے ہیں۔ ہر جانور اپنی قدرتی موت سے دوچار ہو۔ کوئی مداخلت نہ ہو، جب تک کہ ہم لاش کو اندر سے خالی اور اس کی ہڈیاں صاف نہ کر لیں۔ صفائی، اور بس یہی صفائی، ہم چاہتے ہیں۔'' اب وہ تمام زار و قطار رو اور سسکاریاں بھر رہے تھے۔

''کیسے آپ اس قسم کی دنیا میں رہنا برداشت کر سکتے ہیں؟ اے نیک دل اور اے نیک سیرت انسان۔ نجاست ہی ان کا سفید اور نجاست ہی ان کا سیاہ ہے۔ ان کی داڑھیاں دہشت ناک ہیں۔ ان کی آنکھوں کے حلقوں کو دیکھتے ہی آپ کا تھوکنے کو جی کرتا ہے۔ اور جب وہ اپنے بازو بلند کرتے ہیں تو ان کی بغلوں سے جہنم کی بُو اٹھتی ہے۔ اور اسی لیے جناب، اسی لیے آپ اپنے طاقت ور ہاتھوں سے اس قینچی سے ان کے نرخرے کاٹ ڈالیں'' اور گیدڑ کے سر کے ایک جھٹکے کے جواب میں ایک گیدڑ لپک کر عام استعمال کی ایک چھوٹی قینچی اٹھا لایا، برسوں کی زنگ آلودہ، اس کے ایک نوکیلے دانت میں جھولتی ہوئی۔

''اچھا تو قینچی آ ہی گئی۔ یہی وقت ہے ان کا منہ بند کرنے کا۔'' ہمارے قافلے کے سردار نے پکار کر کہا جو ہوا کی سمت میں چلتا ہوا ہماری طرف آیا تھا اور اپنا بھاری بھرکم درّہ جھٹک رہا تھا۔

تمام گیدڑ تیزی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن کچھ فاصلے پر ایک مجمع کی صورت میں ٹھہر گئے۔ سبھی جانور ایک دوسرے سے سختی سے یوں چمٹے ہوئے اور تنے ہوئے تھے جیسے اس ویران علاقے میں پھیلی روشنی کے جادو نے انھیں مختصر دائرے میں کیل دیا ہو۔

''سو جناب آپ کو بھی یہ تماشا دکھایا جا رہا تھا۔'' عرب نے کہا، اپنی قوم کی مخصوص احتیاط پسندی کے تحت گھٹا ہوا قہقہہ لگاتے ہوئے۔

’’کیا آپ جانتے ہیں یہ جانور چاہتے کیا ہیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بے شک۔‘‘ وہ بولا، ’’عام سی بات ہے۔ جب تک عرب دنیا میں موجود ہیں، یہ قینچی بھی صحرا میں گھومتی رہے گی اور ہمارے اختتام تک یہ اسی طرح خجل ہوگی۔ ہر یورپی شخص کو یہ قینچی پیش کی جاتی ہے اس عظیم کام کے لیے۔ ان کے لیے ہر یورپی ایسا شخص ہے جسے قسمت نے ان کے چنا۔ ان کی نہایت غیر معقول امیدیں ہیں، درندے۔ یہ نرے احمق ہیں، مکمل احمق۔ اسی لیے تو یہ ہمیں پسند ہیں۔ یہ ہمارے کتے ہیں۔ آپ کے کسی قسم کے کتوں سے کہیں بہتر۔ اب ذرا تماشا دیکھئے۔ کل رات ایک اونٹ مر گیا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ اٹھوالایا ہوں۔‘‘

چار آدمی اونٹ کی بھاری بھر کم لاش اٹھائے نمودار ہوئے اور اسے ہمارے سامنے ریت پر پٹخ دیا۔ لاش ریت پر گری ہی تھی کہ گیدڑوں کی چیخ و پکار بلند ہوئی۔ جیسے ڈوریوں سے بندھے زبردستی کھینچے جا رہے ہوں، ان میں سے ہر گیدڑ ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھا، اپنے پیٹ کے بل رینگتا ہوا۔ وہ عربوں کو بھول چکے تھے، ان سے اپنی نفرت کو بھول چکے تھے۔ متعفن لاش کی حواس پر چھا جانے والی شدید موجودگی نے انھیں مسحور کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک تو اونٹ کی گردن پر لپک بھی چکا تھا، اس کی شہ رگ میں اپنے دانت گاڑے ہوئے۔ تیز پچکاری والے چھوٹے پمپ کی طرح جو پر امید عزم کے ساتھ تیز بھڑکتی آگ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو، اس کی جسم کا ہر عضو کھنچ گیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے کوشاں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سبھی لاش پر جھپٹ پڑے، مل کر محنت کرتے ہوئے، پہاڑ کی صورت میں ڈھیر بنے۔

قافلے کا امیر اپنا تیز دُرّا گھما گھما کر جانوروں کی پشت پر برسانے لگا۔ انھوں نے اپنے سر اٹھائے، مستی بھری کیفیت میں مدہوش، اور سامنے کھڑے عرب کی طرف دیکھا۔ اپنی تھوتھنیوں پر درّے کی ضرب محسوس کی، اچھل کر پرے ہٹے اور بھاگ کر کچھ دور چلے گئے۔ تب تک اونٹ کا خون بہتا ہوا جوہڑ کی صورت میں اکٹھا ہونے لگا تھا، آسمان کی طرف بُو کے بھبکے اچھالتی لاش کئی جگہوں سے کٹ پھٹ چکی تھی۔ ان سے رہا نہیں گیا اور پھر سے وہاں اکٹھے ہو گئے۔ ایک بار پھر سے امیر نے اپنا دُرّا ہوا میں لہرایا لیکن میں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

’’شاید آپ درست کہتے ہیں جناب‘‘ امیر نے کہا ’’ہمیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔

یوں بھی کوچ کا وقت ہو چلا لیکن اچھا ہے آپ نے یہ سب تماشا دیکھا۔ شاندار مخلوق ہیں، ہیں کہ نہیں۔ اور کتنی نفرت ہم سے کرتے ہیں یہ۔''

مرے ہوئے شہنشاہ کا پیغام

اس حکایت کے مطابق شہنشاہ نے تمھیں ایک پیغام بھیجا ہے، تم ایک عاجز شہری، شاہی سورج کے سامنے کوسوں دور دُبکا ہوا ایک غیر اہم سایہ۔ شہنشاہ نے اپنے بستر مرگ سے صرف تمھیں ایک پیغام بھیجا ہے۔

اس نے پیغامبر کو بستر کے برابر گھٹنوں کے بل جھکنے کا حکم دیا اور سرگوشی میں اسے اپنا پیغام سنایا۔ اس کے لیے یہ پیغام اس قدر اہم تھا کہ اس نے پیغامبر کو حکم دیا کہ اب وہ بھی واپس اس کے کان میں یہ پیغام دہرائے۔ پھر اس نے سر کی جنبش سے تصدیق کی کہ پیغامبر نے درست سنا تھا۔ ہاں، اپنی موت کا تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھے ہونے والوں کے سامنے، جب کہ منظر کی راہ میں حائل ہونے والی سبھی دیواریں ڈھا دی گئی تھیں، اور ادھر اوپر چڑھتے کشادہ اور بلند زینوں میں دائرے میں کھڑے شہنشاہ کے عظیم شہزادوں، ان سب کے سامنے ان اپنا پیغام اسے سونپا۔

پیغامبر فوراً ہی اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ہٹا کٹا، جفاکش شخص، کبھی اپنے دائیں بازو کے زور سے، تو کبھی اپنے بائیں بازو کے زور سے وہ مجمع میں اپنا راستہ بناتا ہوا گزرا۔ اسے مزاحمت کا سامنا ہوتا تو فوراً اپنی چھاتی کی طرف اشارہ کرتا جہاں سورج کا نشان چمکتا دکھائی دیتا۔ وہ اتنی آسانی سے مجمع میں سے گزرا

کہ کسی دوسرے کے لیے ایسا ممکن نہیں تھا۔لیکن مجمع بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ان کی تعداد کا شمار ممکن نہیں ہے۔اگر وہ کھلے میدانوں تک پہنچ سکے تو کتنی تیزی سے اڑتا چلا جائے گا اور تھوڑی ہی دیر میں بلاشبہ تم اپنے گھر پر اس کے خوشگوار گھونسوں کی بوچھاڑ سنو گے۔

لیکن اس کے بجائے وہ بے کار ہی جان توڑ محنت کر رہا تھا۔پھر بھی وہ صرف اندرونی محلات کی خلوت گاہوں میں ہی پہنچا تھا۔وہ کبھی ان کے اختتام تک نہیں پہنچ سکے گا۔بالفرض اگر وہ ان میں سے گزر جاتا ہے، تب بھی اس کی سعی لا حاصل ہوگی۔ان سے آگے اسے سیڑھیاں اترنے کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی۔اگر وہ انھیں بھی طے کر جاتا ہے، تب بھی اس کی محنت رائیگاں جائے گی۔صحنوں سے بھی تو اسے گزرنا ہوگا۔صحنوں سے آگے دوسرا بیرونی محل ہے، اور اس کے بعد پھر سے سیڑھیاں اور صحن، اور ایک بار پھر اگلا محل، اور یہی سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہے گا۔

اگر کسی طور پر وہ بیرونی دروازے تک پہنچ ہی جائے، جو کہ کبھی، کبھی نہیں ہوگا، تو شاہی دارالخلافہ، دنیا کا مرکز اس کے سامنے موجود ہوگا، پھٹنے کی حد تک اپنے آپ سے ٹھنسا ہوا۔کسی کی مجال نہیں کہ یہاں سے اپنا راستہ بنا کر نکل پائے بھلے ہی اس نے کسی مردہ شخص کا پیغام ہی کیوں نہ ساتھ رکھا ہو۔

لیکن تم اپنی کھڑکی میں بیٹھتے ہو جب شام نیچے اتر رہی ہوتی ہے اور ایسا سب کچھ ہو جانے کا خواب دیکھتے ہو۔

قانون کی دہلیز پر

قانون کے آگے ایک دربان کھڑا ہوا ہے۔ اس دربان کے پاس ایک دیہاتی شخص آتا ہے اور اندر جانے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ دربان اسے بتاتا ہے کہ اس وقت وہ اسے اندر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ آدمی اس جواب پر غور کرتا ہے اور پوچھتا ہے ''کیا بعد میں اسے اجازت مل سکتی ہے۔''

''ہاں ایسا ممکن ہے۔ لیکن اس وقت نہیں'' دربان اسے جواب دیتا ہے۔ چوں کہ حسب معمول دروازہ کھلا رہتا ہے، اور دربان ایک جانب کھڑا ہو جاتا ہے، وہ شخص آگے جھک کر دروازے سے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ دیکھ کر دربان قہقہہ لگاتا اور کہتا ہے۔ ''اگر تم اتنے ہی بے چین ہو تو میری اجازت کے بغیر اندر جانے کی کوشش کرو۔ لیکن یاد رکھو کہ میں طاقتور ہوں۔ لیکن تمام دربانوں میں کمترین ہوں۔ آگے ہر ہال کے باہر ایک دربان کھڑا ہے، ہر دربان پہلے سے زیادہ طاقتور۔ تیسرا دربان تو ایسا خوفناک ہے کہ مجھ میں بھی اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں۔''

یہ ایسی مشکلات ہیں جن کے بارے میں اس دیہاتی نے یہاں آنے سے پیشتر کبھی نہیں سوچا۔ وہ سوچتا ہے کہ قانون ہر فرد کے لیے اور ہر وقت قابل حصول ہونا چاہیے لیکن اب وہ سمور کی کھال والے کوٹ میں ملبوس بڑی نوکدار ناک اور تاتاریوں جیسی لمبی پتلی سیاہ داڑھی والے دربان کو غور سے دیکھتا ہے تو فیصلہ کرتا ہے کہ یہی بہتر ہے کہ وہ اجازت ملنے تک یہاں انتظار کرے۔ دربان اسے ایک پیڑھی دیتا اور اسے دروازے کے ایک جانب بیٹھنے کو کہتا ہے۔

وہاں وہ دنوں اور سالوں تک وہاں بیٹھا انتظار کھینچتا ہے۔ وہ اجازت حاصل کرنے کی کئی کوششیں کرتا ہے اور اپنے مسلسل اصرار سے دربان کو بیزار کیے رکھتا ہے۔ دربان اکثر و بیشتر اس سے مکالمہ کرتا، اس سے اس کے گھر اور دیگر معاملات سے متعلق سوالات پوچھتا ہے۔ لیکن یہ سوالات بے نیازی کے انداز میں کیے جاتے ہیں جیسا کہ بڑے جاگیرداروں کا انداز ہوتا ہے۔ وہ اپنی گفتگو ہمیشہ اس بیان پر ختم کرتا ہے کہ اسے اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

وہ شخص، جس نے سفر کے لیے بہت ساز ادراہ ہمراہ باندھ رکھا ہے، وہ سب کا سب چاہے وہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو، رشوت کے طور پر دربان کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ دربان ہر رشوت قبول کر لیتا ہے لیکن ہمیشہ اس حجت کے ساتھ کہ "میں یہ سب کچھ محض اس لیے لے رہا ہوں تا کہ تم یہ نہ سوچو کہ تم سے کوئی کسر باقی رہ گئی تھی۔"

ان تمام سالوں میں وہ دیہاتی اپنی توجہ تقریباً مکمل طور پر اسی دربان پر مرکوز رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ دیگر دربانوں کا خیال اس کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے، یہی پہلا دربان، اسے لگتا ہے کہ قانون تک پہنچنے میں واحد رکاوٹ ہے۔ وہ اپنی سیاہ بختی کو شروع کے برسوں میں جارحانہ طور پر اور با آوازِ بلند کوستا ہے۔ بعدازاں جوں جوں وہ عمر رسیدہ ہوتا ہے، وہ محض بڑبڑاتا رہتا ہے۔ اس کے مزاج میں بچپنا آجاتا ہے۔ اور چوں کہ سال ہا سال دربان پر نظریں جمائے رکھنے سے وہ اس کی سمور کے کوٹ کی کالر میں موجود پسوؤں سے بھی واقف ہو جاتا ہے، وہ ان پسوؤں سے بھی درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کی مدد کریں اور دربان کا ذہن بدلیں۔

آخر کار اس کی بینائی ضعیف ہونے لگتی ہے اور وہ نہیں جان پاتا کہ آیا یہ دنیا ہی تاریک ہے یا اس کی آنکھیں اسے دھوکہ دے رہی ہیں۔ لیکن اس اندھیرے میں وہ اب ایسی چمک کا ادراک کر لیتا ہے جو

قانون کے دروازے سے مسلسل بہتی ہے۔ وہ اب تھوڑے ہی عرصے کا مہمان ہے۔ مرنے سے پہلے اس کی زندگی کے تمام تجربات اس کے ذہن میں ایک نقطے پر یکجا ہو جاتے ہیں، ایک سوال جسے اس نے اب تک دربان سے نہیں پوچھا۔ وہ اشارے سے دربان کو اپنے قریب بلاتا ہے کیوں کہ اس میں اپنے جسم کو بلند کرنے کی سکت باقی نہیں ہے۔ دربان کو نیچے تک جھکنا پڑتا ہے کیوں کہ ان دونوں کے درمیان قد کا فرق اس شخص کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہو چکا ہے۔

''اب کیا جاننا چاہتے ہو تم۔'' دربان پوچھتا ہے، ''تمھاری جاننے کی حس کبھی ختم نہیں ہوگی۔''

''ہر شخص قانون تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔'' وہ شخص کہتا ہے، ''لیکن کیا ماجرا ہے کہ ان تمام برسوں میں کوئی ایک شخص بھی یہاں اندر جانے کے لیے نہیں آیا۔''

دربان جان لیتا ہے کہ دیہاتی اپنے اختتام کے قریب پہنچ چکا ہے، اور اس لیے کہ اس کی مرتی ہوئی حسیات اس کے الفاظ سن لیں، وہ اس کے کان میں چیختی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔ ''یہاں کسی اور فرد کو اجازت مل ہی نہیں سکتی۔ کیوں کہ یہ دروازہ صرف تمھارے لیے بنایا گیا تھا اور اب میں اسے بند کر رہا ہوں۔''

فانی انسان کے مسائل

بعض افراد کا خیال ہے کہ آڈریڈک سلاوک زبان کا لفظ ہے۔ وہ اسے اسی طور بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعضوں کی رائے میں اس لفظ کا ماخذ جرمن زبان ہے صرف سلاوک زبان کے اس پر اثرات ہیں۔ ان دونوں بیانات کی غیر حتمیت ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ درحقیقت ان میں سے کوئی ایک بھی درست نہیں ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک بیان بھی اس لفظ کا کوئی معقول مفہوم فراہم کرنے سے قاصر ہے۔

بلاشبہ ان تحقیقات میں الجھنے کی ضرورت کسی کو محسوس ہی نہ ہوتی اگر آڈریڈک نامی ایک مخلوق واقعتا موجود نہ ہوتی۔ پہلی نظر میں وہ ستارے کی شکل کی دھاگوں والی پچکی ہوئی ریل معلوم پڑتی ہے اور بلاشبہ ایسا گمان ہوتا ہے جیسے اس پر دھاگوں کے جوڑ لگے ہوئے ہیں۔ اصل میں یہ کئی قسموں اور رنگوں کے چند پرانے ٹوٹے ہوئے دھاگوں کے سرے ہیں جو ایک دوسرے سے بندھے اور آپس میں گڈمڈ ہیں۔ لیکن یہ صرف دھاگے کی ریل ہی نہیں ہے، کہ ستارے کے عین وسط میں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی لکڑیوں کی چھوٹی صلیب ہے اور ایک پتلی سلاخ بھی داہنی طرف سے اس میں پیوست ہے۔ یوں ایک طرف یہ

سلاخ اور دوسری طرف ستارے کے کونوں میں سے ایک کونے کی مدد سے یہ مخلوق سیدھی کھڑی ہو پاتی ہے جیسے یہ اس کی دو ٹانگیں ہوں۔

یہ یقین کرنے کو جی کرتا ہے کہ کبھی اس کی صورت خاصی معقول رہی ہوگی لیکن اب یہ محض اس کی شکستہ باقیات ہیں۔ تاہم اصل معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کم از کم اس کے کوئی اثرات کہیں نہیں ملتے۔ کہیں بھی کوئی ایسی غیر مکمل یا شکستہ سطح نہیں ہے جس سے ایسی کسی بات کی طرف اشارہ ملے۔

یہ شے بالکل بدہیت لگتی ہے لیکن اپنے انداز میں یہ مکمل ترین بھی ہے۔ بہر صورت اس مخلوق کا قریبی معائنہ کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ اوڈریڈک غیر معمولی طور پر پھرتیلا ہے اور کبھی خود کو قابو میں نہیں آنے دیتا۔

یہ بالائی منزل کے کمروں، سیڑھیوں، راہ داریوں یا داخلی ہال کے کونوں کھدروں سے جھانکتی ہے۔ اکثر یہ مہینوں دکھائی نہیں دیتی۔ قیاس ہے کہ اس دوران میں یہ دوسرے گھروں میں ڈیرے جمائے رکھتی ہے لیکن پھر آخر کار وفاداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھر لوٹ آتی ہے۔ اکثر اوقات جب آپ باہر دروازے تک جائیں اور یہ آپ کے نیچے جنگلے سے لگی کھڑی ہو تو آپ کا جی چاہے گا کہ اس سے بات کی جائے۔

بے شک آپ اس سے مشکل سوالات نہیں کرتے۔ یہ اتنی چھوٹی ہے کہ آپ خود کو اس سے ایک بچے کی طرح برتاؤ کرنے پر مائل پاتے ہیں۔

''سنو۔۔۔۔ تمھارا نام کیا ہے۔'' آپ اس سے پوچھتے ہیں۔

''آڈریڈک'' وہ جواب دیتی ہے۔

''تم کہاں رہتی ہو؟''

''کوئی ایک ٹھکانہ نہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے کہتی ہے۔ اس کی یہ ہنسی ایک ایسے جانور کی ہنسی معلوم ہوتی ہے جس کے پھیپھڑے نہ ہوں۔ یہ آواز پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے مشابہ ہے۔ یہ عام طور پر ہماری گفتگو کا اختتام ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ جوابات بھی ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ دیئے جائیں۔ اکثر وہ دیر تک خاموش رہے گی، بظاہر لکڑی کی بنی ہوئی مورت جیسی۔

بغیر کسی واضح مقصد کے میں خود سے پوچھتا ہوں آخر اس کا کیا بنے گا؟ کیا یہ کبھی مر سکتی ہے؟ ہر ختم

ہونے والی شے کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ کچھ خاص حرکات ہوتی ہیں جو کمزور ہو جاتی ہیں۔ لیکن آڈریڈک کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ تو کیا میں تصور کروں کہ یہ ہمیشہ سیڑھیوں سے نیچے لڑھکتی ہوئی میرے بچوں یا اُن کے بچوں کے پیروں میں آ کر گرے گی، ٹوٹے ہوئے دھاگوں کے کنارے پیچھے گھسٹتے ہوئے۔ اس سے کسی کو کبھی ایسا نقصان نہیں پہنچا جو دکھائی دے۔ لیکن یہی خیال کہ یہ میرے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہے گی، میرے لیے کافی حد تک تکلیف دہ ہے۔

سرکس کی بالکونی سے ایک منظر

اگر سرکس میں کوئی نحیف تپ دق زدہ گھڑسوار خاتون ایک سفاک کوڑا بردار رنگ ماسٹر حریص کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہ وہ تماشائیوں کے سامنے ایک اتھرے گھوڑے پر بغیر رکے مہینوں دائرے میں چکر لگائے، اس پر تیز زناٹے بھرتی سواری کرے، بوسے اچھالتی، اپنی کمر پر جھولتی ہوئی، اور اگر یہ کرتب سازندوں کے نا مختتم شور اور روشن دانوں سے آتی گنگناہٹوں کے غوغا کے درمیان بور کن مستقبل کے لامحدود سلسلے میں بھی جاری رہنا ہو جب کہ تماشائیوں کی تالیوں، جو بھاپ سے چلنے والے ہتھوڑوں سے مشابہ ہوں، کے کبھی کم ہوتا اور کبھی بڑھتا شور بھی جاری رہے، تب غالباً اوپر بالکونی میں بیٹھا ایک نوجوان تماشائی تمام قطاروں کے لمبے زینوں سے نیچے بھاگتا ہوا آئے، پنڈال کی طرف لپکے، اور آرکسٹرا کے شور وغوغا میں، جو ابھی تک کوئی موزوں دھن بجا رہا ہو، چیخ کر کہے، 'بند کرو'

لیکن چوں کہ یہ ایسا نہیں ہے، ایک خوب صورت دوشیزہ سفید و سرخ، پردوں کے درمیان میں سے نمودار ہوتی ہے جنھیں پرتمکنت وردی پوش اس کے سامنے کھولتے ہیں، اور رنگ ماسٹر اس کی نظر میں آتے ہی احترام سے حیوانی عقیدت کے سانس بھرتا ہوا اس کی طرف آتا ہے، نرمی سے اسے اٹھا

کر چتکبرے گھوڑے پر بٹھاتا ہے، جیسے وہ اس کی اپنی عزیز ترین نواسی ہو جو کسی خطرناک سفر روانہ ہو رہی ہو۔ تو وہ چابک سے اشارہ دینے کا فیصلہ نہیں کر پاتا لیکن پھر خود کو سنبھالتا ہے، چابک ہوا میں لہرا کر آواز پیدا کرتا ہے۔ کھلے منہ کے ساتھ گھوڑے کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہے، تیز نگاہوں سے دوشیزہ کی لی جانے والی جست کا جائزہ لیتا ہے اور اس کی فن کارانہ مہارت کو ناقابل یقین پاتا ہے، انگریزی میں تنبیہ کرتا ہوا اسے پکارتا ہے، سائیسوں کو، جو گھوڑے کے لوہے کے چھلوں کو پکڑے ہوئے ہیں، غصے میں اپنے کام پر زیادہ دھیان دینے کی تلقین کرتا ہے۔ دوشیزہ کی سب سے بڑی جست سے پہلے بازوؤں کو بلند کرتا اور سازندوں کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کرتا ہے، آخر چھوٹی لڑکی کو کانپتے ہوئے گھوڑے پر سے نیچے اتارتا ہے، اس کے دونوں رخساروں پر بوسہ لیتا ہے، اور دیکھتا ہے کہ اسے تماشائیوں سے جو داد و تحسین مل رہی ہے، وہ اتنی نہیں جتنا اس کا حق بنتا ہے۔ جب کہ وہ لڑکی اس کی مدد سے اپنے پنجوں کے کناروں پر اونچی کھڑی، گرد کے غبار میں گم پھیلے ہوئے بازوؤں اور پیچھے گرائے ہوئے ننھے سر کے ساتھ تمام سرکس کو اپنی کامیابی کا جشن منانے کی دعوت دیتی ہے۔ چوں کہ یہ سب ایسا ہی ہے، گیلری والا تماشائی اپنے سامنے جنگلے پر اپنا چہرہ ٹکا لیتا ہے، اور اختتامی موسیقی میں غرق، جیسے کسی گہرے خواب میں ہو، بنا اس بارے میں کچھ جانے ہی زار و قطار رونے لگتا ہے۔

نیا وکیل

ہمارے درمیان ایک نئے وکیل ''ڈاکٹر بیوس فیلس'' کا اضافہ ہوا ہے۔ ان کو دیکھ کر آپ کو شاذ ہی کبھی یہ یاد آئے گا کہ آپ کبھی مقدونیہ کے سکندر اعظم کے گھوڑے تھے۔ بلاشبہ اگر آپ اس کہانی سے واقف ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کچھ جانتے ہیں۔ حتیٰ کہ سادہ طبع دربان جسے میں نے اگلے روز عدالت کی سامنی سیڑھیوں پر دیکھا تھا، جو ریس کورس میں باقاعدگی سے بازیاں لگانے کی پیشہ وارانہ حیثیت رکھتا ہے، نئے وکیل کو پر تحسین نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جب وہ تیز تیز قدم اٹھاتے سنگ مرمر کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، تو ان کے پیروں تلے بج رہی تھیں۔

عام طور پر وکلا کی مجلس بیوس فیلس کو رکنیت پر خوش ہے۔ حیران کن بصیرت کے ساتھ لوگوں ایک دوسرے کو بتاتے ہیں کہ جدید معاشرہ جیسا بھی یہ ہے، بیوس فیلس اس میں مشکل صورت حال میں ہے، اور دنیا کی تاریخ میں اس کی اہمیت کے پیش نظر ہمیں کم از کم اسے دوستانہ انداز میں خوش آمدید کہنا چاہئے۔ آج کل اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سکندر اعظم موجود نہیں ہے، لیکن ایسے افراد کثرت سے ہیں جو قتل کرنے کے ہر گر سے واقف ہیں۔ کسی کھانے کی میز تک جانے اور اپنے دوست کی کمر میں برچھا گھونپنے کے لیے جس مہارت کی ضرورت ہے، اس کی موجودہ انسان میں کمی نہیں ہے۔ اور بہت سوں کی نظر میں مقدونیہ بہت محدود علاقہ ہے۔ اس لیے وہ سکندر کے باپ فلپ کو ملامت کرتے ہیں لیکن ان میں

سے کوئی ایک، کوئی ایک بھی کسی کو خود بھارت جانے کی جرأت نہیں ہوتی۔ حتی کہ اس کے دور میں بھی بھارت کے دروازے رسائی سے باہر تھے۔ لیکن بادشاہ کی تلوار نے لوگوں کے لیے راستہ بنایا۔ آج بھارت کے دروازے دور دراز اور بلند جگہوں تک پیچھے ہٹ چکے ہیں۔ کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے۔ بہت سوں کے پاس تلواریں ہیں لیکن وہ ایک ہی جگہ کھڑے انھیں ہاتھ میں گھماتے رہتے ہیں اور ان کا تعاقب کرنے والی نظر الجھ جاتی ہے۔

شاید ایسے حالات میں غالباً وہی بہتر ہے جو بیوس فیلس نے کیا اور خود کو قانون کی کتابوں میں منہمک کر لیا۔ لیمپ کی خاموش روشنی میں اس کی اطراف کسی سوار کی رانوں کی بندش سے آزاد ہیں۔ جنگ کے شور و غوغا سے دور اور آزاد، وہ پڑھتا ہے اور ہماری قدیم ضخیم کتب کے اوراق پلٹتا ہے۔

ایک خواب

جوزف "K" ایک خواب دیکھ رہا تھا۔

یہ ایک سہانا دن تھا اور K کو لگا کہ اسے سیر کے لیے باہر جانا چاہئے۔ لیکن اس نے بمشکل چند قدم اٹھائے ہوں گے کہ وہ ایک قبرستان میں موجود تھا۔ وہاں روشیں ٹیڑھی میڑھی تھیں مشاقی سے بنی ہوئی اور غیر عملی۔ وہ ان میں سے ایک پر اچھلتا ہے جیسے کسی تیزی سے بہتی ندی پر مکمل توازن اور مہارت کے ساتھ۔ دور ایک تازہ ابھری ہوئی قبر اسے دکھائی دیتی ہے جسے رک کر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس ابھرے ہوئے تودے نے اسے مسحور کر دیا اور اسے لگا وہ تیز رفتاری سے کبھی اس قبر تک نہیں پہنچ پائے گا۔ اکثر وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے کیوں کہ اس کے ارد گرد نصب بڑے بڑے بینرز نے، جو ایک دوسرے کے مقابل رُخ کیے ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے، قبر اور اس کی نگاہ کے درمیان حائل ہوتے۔ وہاں خبر دینے والے دکھائی نہیں دیتے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کوئی جشن جاری تھا۔

چوں کہ وہ فاصلے سے ہی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، دفعتاً اسے وہ قبر اپنے بہت قریب دکھائی دی۔ بلکہ وہ اس کے قریب سے گزر جانے والا تھا۔ اس نے گھاس میں تیز چلنا شروع کیا۔ لیکن چوں کہ پگڈنڈی اس کے قدموں کے نیچے سرپٹ بھاگ رہی تھی، وہ لڑکھڑا کر قبر کے بالکل سامنے گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔ دو آدمی قبر کے پیچھے کھڑے تھے اور انھوں نے ہوا میں ایک کتبہ اٹھا رکھا تھا۔ "k" وہاں پہنچا ہی تھا

کہ انھوں نے وہ کتبہ زمین میں گاڑ دیا، اور اسے یوں عمدگی سے وہاں جما دیا جیسے اسے باقاعدہ پلستر کیا گیا ہو۔ عین اسی لمحے قریب ہی جھاڑیوں میں سے ایک تیسرا شخص نمودار ہوا۔ K اسے پہچانتا تھا۔ وہ ایک آرٹسٹ تھا۔ اس نے ایک پتلون اور ادھ کھلے بٹنوں والی قمیص اور سر پر مخمل ایک ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک عام پنسل تھی جس سے وہ وہاں آتے ہوئے فضا میں مختلف خطوط کھینچ رہا تھا۔

اپنی پنسل سے اس نے کتبے پر سب سے اوپر ایک کونے میں اپنا نام لکھا۔ کتبہ بہت قدآور تھا۔ اس لیے وہ پنجوں کے بل کھڑا ہوا اور کتبے کی ہموار سطح پر اپنا بایاں ہاتھ رکھے خود کو سنبھالا دیا۔ غیر معمولی فنکاری کا حیرت انگیز مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اپنی عام پنسل سے کتبہ پر سنہری حروف لکھے۔ اس نے لکھا ''یہاں مدفون ہے''۔ ہر لفظ نہایت واضح اور انتہائی نفاست سے لکھا گیا اور خالص سونے سے اندر تک کھدا ہوا تھا۔ یہ تین الفاظ لکھنے کے بعد اس نے مڑ کر اپنے کندھوں کے اوپر سے K کی طرف دیکھا۔ k نے عبارت کا ابتدائی حصہ پڑھنے کے شدید اشتیاق میں فنکار کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ ساری توجہ بس کتبے پر مرکوز رکھی۔ تب وہ شخص واقعتاً عبارت مکمل کرنے کے لیے مڑا لیکن مزید کوئی لفظ نہ لکھ سکا۔ کوئی خیال اسے روک رہا تھا۔ اس نے پنسل کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور ایک مرتبہ پھر k کی جانب دیکھا۔ اس دفعہ k نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانکا اور دیکھا کہ وہ پریشان تھا اور اسے بیان کرنے کے اہل نہیں تھا۔ اس کے چہرے سے شدید اشتیاق کی گہما گہمی کافور ہو چکی تھی۔ فنکار کی الجھن سے وہ خود بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں نے لاچارگی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اِن کے درمیان ایک سنگین غلط فہمی پیدا ہو چکی تھی جس کا حل کسی ایک سے ممکن نہیں تھا۔

قبرستان کے گرجا گھر میں ایک چھوٹی گھنٹی ناوقت بجنے لگی۔ فنکار نے فضا میں ہاتھ لہرا کر اشارہ کیا جس کے فوراً بعد گھنٹی کی آواز تھم گئی۔ چند لمحوں بعد وہ پھر سے بجی لیکن اس مرتبہ زیادہ نرمی سے اور کسی تسلسل کے بغیر، بار بار تھم جاتی تھی گویا وہ اپنی ہی آواز کا معائنہ کر رہی ہو۔ فنکار کے اضطراب سے K شدید ناگوار احساس میں مبتلا تھا اور وہ رونے لگا اور اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں چہرہ دیر تک سسکیاں بھرتا رہا۔ فنکار نے اس کے چپ ہونے کا انتظار کیا اور پھر فیصلہ کیا کیوں کہ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ عبارت لکھے۔ پہلا حرف جو اس نے لکھا اس سے K کو اطمینان ہوا لیکن فنکار اپنا قلم چلانے میں شدید ہچکچا رہا تھا۔ تحریر میں پہلی سی عمدگی اور نفاست نہیں تھی۔ مزید یہ کہ خطوط بھی کم سنہری اور زرد تھے۔ قلم

بے یقینی کے ساتھ نیچے پھسلتا ہوا ایک بڑا حرف لکھتا گیا۔ یہ حرف ج تھا اور تقریباً مکمل ہو چکا تھا اور اسی لمحے فنکار نے غصے میں اپنا پیر قبر کے تودے پر مارا کہ گرد کا بادل فضا میں نمودار ہوا۔ تب آخر سارا معاملہ K پر کھل گیا۔ اب کسی معذرت کی مہلت نہیں رہی تھی۔ اپنی تمام انگلیاں اس نے زمین پر گاڑ دیں جنھیں کوئی مزاحمت درپیش نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ تمام انتظامات پہلے سے مکمل تھے۔ اوپر مٹی کی باریک تہہ اوپر بچھائی گئی تھی جس سے وہ ہموار زمین معلوم ہوتی۔ فوراً ہی اس کے نیچے ایک بڑا سوراخ نمودار ہوا گہری اطراف والا، جس میں K تیزی سے ڈوب گیا۔ نرم لہر کے ساتھ چت لیٹا ہوا۔ اور جب کہ وہ تاریک گہرائی میں اگر رہا تھا، اس کا سر اس کی گردن پر اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر کتبے پر لکھا اس کا نام نمایاں انداز میں لکھا تھا۔ اس منظر سے خوف زدہ ہوتے ہوئے وہ بیدار ہو گیا۔

فاقہ کش فن کار

گلوکارہ جوزیفائن یا چوہوں کی لوک کہانی

ہماری گلوکارہ کا نام جوزیفائن ہے۔جس کسی نے اس گلوکارہ کو نہیں سنا وہ نغمے کی طاقت کو جان ہی نہیں سکتا۔کوئی انسان اس کی گلوکاری کے سحر سے بچ نہیں سکتا۔ یہ اس کا اعزاز اس لیے بھی اہم ہے کہ ہم موسیقی کا فہم رکھنے والی قوم نہیں ہیں۔ پرسکون امن ہی وہ موسیقی ہے جسے ہم سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ہماری زندگی کٹھن ہے۔ہم اس قابل نہیں ہیں کہ ان مواقع پر بھی جب ہم زندگی کی روزمرہ کی پریشانیوں سے چھٹکارہ پانے کی کوشش کرتے ہیں، ہم خود کو اپنے روزمرہ کے معمول سے بلند کر کے کسی اعلیٰ ترشے سے حظ اٹھائیں جیسے موسیقی۔لیکن ہمیں اپنی اس محرومی پر تاسف نہیں ہے۔ہم اس کی تصیح کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ایک مخصوص عملی مکاری کو، جس کی حقیقتاً ہمیں بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے، ہم اپنا اعلیٰ اعزاز سمجھتے ہیں، اور ایسی مکاری کی وجہ سے پیدا ہونے والی مسکراہٹ کے ساتھ ہم اپنی محرومیوں پر خود کو تشفی دینے کے عادی ہو چکے ہیں۔حتیٰ کہ یہ فرض کرنے کے بھی کہ اگرچہ ایسا ہوتا نہیں ہے کہ کبھی ہم اس انبساط کے واقعی شدید متمنی تھے جو موسیقی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جوزیفائن اس حوالے سے ایک استثناء ہے۔ وہ موسیقی سے محبت کرتی ہے اور جانتی ہے کہ اسے کس طرح پیش کیا جائے۔وہ اپنی طرز کی اکیلی ہے۔اگر وہ کبھی مر جائے اور کون جانتا ہے کہ کب ایسا ہو، تو موسیقی بھی ہماری زندگیوں سے یکسر خارج ہو جائے گی۔

میں نے بارہا سوچا کہ اس کی موسیقی کا آخر کیا مفہوم ہے؟ ہم خود اس فن سے قطعی نابلد ہیں۔ یہ کیسے ہوتا ہے کہ ہم جوزیفائن کی گلوکاری کو سمجھ پائیں یا جیسا جوزیفائن بھی اس امر کی تردید کرتی ہے کہ ہم ایسا سوچتے ہیں کہ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں؟ اس سوال کا آسان ترین جواب یہ ہوگا کہ اس کی گلوکاری اس درجہ عظیم ہے کہ ایک انتہائی بے ذوق شخص بھی اس کے فن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ جواب قابل اطمینان نہیں ہے کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کی گلوکاری اپنے سننے والوں کو غیر معمولی ہونے کا فوری اور دائمی احساس عطا کرتی۔ ایسا احساس کہ اس کے گلے سے ایسی آواز برآمد ہو رہی ہے جسے ہم نے پہلے کبھی نہیں سنا اور جس کو سننے کے ہم اہل بھی نہیں ہیں، ایسی آواز جسے صرف اور صرف جوزیفائن ہی ہمیں سنانے کے اہل ہے۔ لیکن میری رائے میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ میں ایسا محسوس نہیں کرتا اور نہ ہی کبھی یہ دیکھا کہ کسی دوسرے کو بھی ایسا محسوس ہوا ہو۔ قریبی دوستوں میں ہم بے تکلفی سے اعتراف کرتے ہیں کہ جوزیفائن کی گلوکاری، بطور فن بالکل بھی غیر معمولی نہیں ہے۔

کیا واقعی یہ موسیقی ہے؟ اگرچہ ہم میں موسیقی کا ذوق نہیں ہے لیکن ہمارے پاس کی اس کی روایت ضرور موجود ہے۔ قدیم زمانے میں ہمارے آباؤ اجداد گایا کرتے تھے۔ اس کا تذکرہ ہماری روایتی داستانوں میں موجود ہے اور اس دور کے چند نغمے بھی آج محفوظ ہیں جنھیں، یہ سچ ہے کہ اب کوئی نہیں گا سکتا۔ یوں ہمیں موسیقی کی کچھ سوجھ بوجھ ہے اور جوزیفائن کا فن یقیناً اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ چناں چہ کیا اسے گلوکاری کہا جائے گا؟ کیا یہ محض گنگناہٹ نہیں ہے؟ جب کہ گنگناہٹ کو تو ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ ہنر ہم لوگوں کا واحد فن کارانہ جوہر ہے، یا پھر محض جوہر نہیں بلکہ یہ ہماری زندگیوں کا واحد خصوصی اظہار ہے۔ ہم سب گنگناتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ کوئی یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ گنگناہٹ فن کا درجہ رکھتی ہے۔ ہم اس بارے میں سوچے بغیر ہی گنگناتے ہیں، شعوری طور پر اسے جانے بغیر ہی۔ اور ہم سے کئی ایسے بھی ہیں جو حقیقتاً نہیں جانتے کہ گنگنانا ہماری زندگی کے بنیادی اوصاف میں سے شامل ہے۔ لہٰذا اگر یہ سچ ہے کہ جوزیفائن گلوکاری نہیں کرتی بلکہ محض گنگناتی ہے، اور جیسا کہ کم از کم مجھے لگتا ہے کہ اس کی گنگناہٹ ہماری عمومی گنگناہٹ کے درجے سے بڑھ کر نہیں ہے۔ بلکہ اس کی گنگناہٹ کی طاقت ہماری عمومی گنگناہٹ کی طاقت سے بھی کم ہے کہ ہمارا ایک عام مزدور تمام دن اپنے کام کے ساتھ ساتھ کسی اضافی کوشش کی بغیر ایسا کرسکتا ہے۔ اگر واقعی یہ بات درست ہے تو پھر جوزیفائن کا تمام مبینہ فن گلوکاری

بے وقعت قرار پاتا ہے لیکن یہ نتیجہ اس حقیقی معمے کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے جسے حل کرنے کی ضرورت ہے کہ اس نے کس طرح ہم سب کو اس درجہ متاثر کیا؟

یہ طے ہے کہ اس کا فن گنگناہٹ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اگر آپ خود کو اس سے کچھ فاصلے پر رکھیں اور سنیں یا زیادہ بہتر ہے کہ اپنی رائے کی آزمائش کریں۔ جب وہ دوسرے گلوکاروں کے ساتھ گاتی ہے تو اس کی آواز کو شناخت کرنے کے لیے آپ بلا شبہ ایک معمولی گنگناہٹ کے سوا اور کچھ شناخت نہیں کر پائیں گے جو محض دوسروں سے زیادہ شائستہ یا زیادہ کمزور ہونے کی وجہ سے ہی کچھ مختلف ہوگی۔

لیکن اگر آپ اس کے سامنے بیٹھیں تو یہ محض گنگناہٹ نہیں ہے۔ اس کے فن کو سمجھنے کے لیے اسے سننا ہی نہیں بلکہ اس کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ اگر اس کی آواز محض ہماری عمومی روزمرہ گنگناہٹ ہی ہے تب بھی اس میں سب سے پہلے یہی عجیب بات قابل توجہ ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک عام بات کو بہت یادگار انداز میں پیش کر رہا ہے۔ مثلاً اخروٹ توڑنا کوئی خاص کارنامہ نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اخروٹ توڑنے کا مظاہرہ کرنے کے لیے تماشائی اکٹھے کرنے کی کوشش نہیں کرے گا لیکن اگر کوئی شخص واقعی ایسا کرتا ہے اور اس میں لوگوں کی دلچسپی کا سامان پیدا کر لیتا ہے تو پھر یہ عام اخروٹ توڑنے والی بات نہیں رہتی۔ یا یوں دیکھیے کہ اخروٹ توڑنے کا عام معاملہ ہے لیکن چوں کہ ہم اس کام میں انتہا درجہ ماہر ہیں، اس لیے ہم اس فن سے صرف نظر کرتے ہیں اور اس نو وارد نے ہمیں اس کی اصل ماہیت سے روشناس کرایا ہے۔ حتیٰ کہ ہم میں سے بیشتر کی اخروٹ توڑنے کی مہارت سے بھی کم اثرات پیدا کرنے میں فائدہ مند ہونے کا انکشاف بھی۔

غالباً جوزیفائن کی گلوکاری کا معاملہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ ہم اس میں ان خوبیوں کی تعریف کرتے ہیں جنھیں ہم خود اپنی ذات میں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس حوالے سے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہم جیسی ہی ہے۔ ایک بار میں وہاں موجود تھا کہ ایک شخص نے، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، جوزیفائن کی توجہ ہر طرف موجود روایتی گنگناہٹ کی جانب دلائی۔ حالاں کہ سرسری سا ہی ذکر کیا لیکن جوزیفائن کے لیے یہ بات سرسری نہیں تھی۔ ایسی طنزیہ اور متکبرانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جو عورت سراپا شائستگی ہے، ہم لوگوں میں بھی بہت نمایاں جو ایسی نسوانی شخصیتوں کی کثرت کے حامل ہیں، اس موقع پر بہت بے ہودہ معلوم ہوئی۔ لیکن اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے اس

بات کو فوراً محسوس بھی کر گئی اور خود کو سنبھالا۔

بہر کیف وہ اپنے فن اور عمومی لوک گنگناہٹ میں کوئی تعلق تسلیم کرنے پر قطعی آمادہ نہیں۔ جو اس سے مختلف رائے رکھتے ہیں، ان سے وہ بدظن ہے اور غالباً بغیر تسلیم کیے ہوئے نفرت بھی۔ یہ کوئی معمولی ناپسندیدگی نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے مخالفین، جن کے ساتھ میری بھی نصف ہمدردیاں ہیں، بے شک اس کے فن کے دیگر شائقین سے کم معترف نہیں ہیں۔ لیکن وہ محض تعریف کی خواہاں نہیں ہے۔ وہ عین مین اپنے طے شدہ معیار کے مطابق ہی اپنی توصیف چاہتی ہے، نری تعریف اس کے مزاج کو سرد کر دیتی ہے۔ جب آپ اس کے سامنے نشست پر بیٹھتے ہیں تو پھر آپ کی سمجھ میں آتا ہے کہ اس سے مخالفت صرف دور رہ کر ہی ممکن ہے۔ آپ اس کے سامنے بیٹھنے ہیں تبھی یہ جان پاتے ہیں کہ اس کی گنگناہٹ محض گنگناہٹ نہیں ہے۔

چوں کہ گنگناہٹ ہماری ایک بے سوچی سمجھی عادت ہے، اس لیے ایسا سوچا جا سکتا ہے کہ سامعین بھی جوزیفائن کے مظاہرے کے دوران گنگناتے ہیں۔ اس کا فن ہمیں مسرور کرتا ہے اور جب ہم خوش ہوتے ہیں تو گنگناتے ہیں۔ لیکن اس کا سامع کبھی نہیں گنگناتا۔ وہ چوہے کی سی خاموشی کے ساتھ بیٹھا رہتا ہے۔ جیسے ہم اس امن کا حصہ بن گئے ہوں جس کی ہم نے ہمیشہ خواہش کی اور جس سے ہماری گنگناہٹ اس لمحے ہمیں محروم کر سکتی تھی۔ ہم کوئی آواز نہیں نکالتے۔ لیکن کیا واقعی یہ اس کی گنگناہٹ ہے جو ہم پر جادو کر دیتی ہے؟ یا پھر یہ گہرا سکوت ہے جو اس کی کمزور چھوٹی آواز کو گھیرے ہوتا ہے؟

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جوزیفائن گا رہی تھی کہ ایک چھوٹا بے وقوف بچہ اپنی سادگی میں گنگنانے لگا۔ اس کی آواز بالکل ویسی ہی تھی جیسی ہم جوزیفائن سے سن رہے تھے۔ ہمارے سامنے سٹیج پر پیش کی جانے والی گنگناہٹ اپنی تمام ریاضت کے باوجود محض آزمائشی معلوم ہوئی جب کہ سامعین میں وہ بے وقوف چھوٹا بچہ غیر شعوری طور پر گنگنا رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان امتیاز کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی ہم نے فوراً سیٹیاں بجا کر اسے شُشکارا اور سیٹیاں مار کر اسے خاموش کرا دیا۔ حالاں کہ یہ بالکل ضروری نہیں تھا۔ کیوں کہ کچھ ہی دیر بعد وہ خود ہی شرمندگی اور خوف سے رینگتا ہوا دور چلا گیا۔ جب کہ جوزیفائن نے اپنے بہترین فتح مندانہ سر لگائے اور خود سے ماورا ہو گئی، اپنے بازو فضا میں پھیلائے ہو اور اپنے گلے میں سے ممکنہ حد تک اونچی آواز نکالتے ہوئے۔

وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ ہر معمولی بات، ہر عام واقعہ، ہر ناگوار بات، لکڑی کے تختے میں کوئی چرچراہٹ، دانت کچکچانے کی آواز یا سٹیج پر روشنی میں قابل احتراز نقص، اسے اپنے نغمے کے تاثر کو انتہائی شدید کرنے کی ترغیب دیتا۔ اُسے یقین ہوتا ہے کہ وہ بہروں کے سامنے گا رہی ہے۔ سامعین میں جوش و جذبہ اور انہماک کی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن وہ کسی حقیقی ادارک کی توقع نہ رکھنا سیکھ گئی اور اب یہی فرض کرتی ہے۔ اس لیے ہر مداخلت کا وہ خیر مقدم کرتی ہے۔ باہر سے جو کچھ بھی اس کے نغمے کی پاکیزگی کو مجروح کرتا ہے، جس پر معمولی کوشش سے قابو پایا جا سکتا ہو، حتی کہ کسی کوشش کے بغیر ہی، صرف اس کا سامنا کرنے سے ہی قابو پانا ممکن ہے، لیکن وہ سامعین کو بیدار کرنے اور ان میں ادارک نہیں بلکہ انتہائی تکریم پیدا کرنے میں مدد کر سکتا ہے۔

اور اگر معمولی باتیں اس کے لیے اتنی فائدہ مند ہیں تو بڑے واقعات کیا کچھ نہیں کر پائیں گے۔ ہماری زندگیاں بہت بے سکون ہیں۔ ہر دن ہمارے لیے نئی حیرتوں، دریافتوں، اُمیدوں اور خوفوں کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اس لیے ایک فرد کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دن اور رات اپنے رفقا کی مدد کے بغیر یہ سب کچھ برداشت کر پائے۔ اس کے باوجود صورت حال اکثر ابتر رہتی ہے۔ اکثر و بیشتر ہزاروں کندھے اس بوجھ تلے کپکپا رہے ہوتے ہیں جو حقیقتاً صرف ایک جوڑے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

تب جوزیفائن سمجھ جاتی ہے کہ یہی اس کا وقت ہے۔ وہ کھڑی ہو جاتی ہے، ایک نفیس ترین مخلوق، بالخصوص چھاتی سے نچلے دھڑ سے اٹھتی ارتعاش سے جھولتی ہوئی، کہ آپ اس کے لیے بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ کہ جیسے اس نے اپنی تمام قوت اپنی گنگناہٹ پر مرکوز کر دی ہو، جیسے اس کے جسم میں موجود ہر اس شے سے بھی جو اس کی گلوکاری میں براہ راست معاونت نہیں کرتی، تمام قوت کشید کر لی گئی ہو، زندگی کی تقریباً ساری قوت۔ جیسے وہ برہنہ اور تنہا لیٹی ہو، صرف اچھے فرشتوں کے لیے ہی فکر مند، جیسے وہ اپنے نغمے میں یوں گم اور صرف اسی میں جی رہی ہے کہ اس پر گرنے پر ایک ٹھنڈا سانس ہی اسے مار دینے کے لیے کافی ہو۔

لیکن جب وہ یوں سامنے آتی ہے تو ہم جو اس کے مخالف سمجھے جاتے ہیں، عادتاً پکار اٹھتے ہیں، ''یہ تو گنگنا بھی نہیں سکتی۔ یہ اپنے آپ پر اتنا زور ڈالتی ہے تاکہ باہر نکال سکے، ایک نغمہ نہیں، کہ ہم اسے نغمہ تو نہیں کہہ سکتے، بلکہ ہماری عمومی روایتی گنگناہٹ سے ملتی جلتی کوئی شے۔'' ہمیں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے لیکن

جیسا کہ میں نے پہلے کہا یہ تاثر اگرچہ ناگزیر ہے مگر عارضی اور سرسری ثابت ہوتا ہے۔ ہم بھی جلد ہی ہجوم کے جذبات کا حصہ بن جاتے ہیں جو گرم جوشی سے جسم سے جسم ملائے ٹھہرے ہوئے سانسوں کے ساتھ اسے سنتا ہے۔

اور اپنے گرد ہم لوگوں کا ہجوم اکٹھا کرنے کے لیے، جو تقریباً ہمیشہ عجلت میں ہوتے ہیں اور ایسی وجوہات کی بناء پر، جو عموماً ہم پر واضح نہیں ہوتی ہیں، ادھر ادھر حرکت کرتے رہتے ہیں، جوزیفائن کو سوائے اس کے کچھ اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ اپنی جگہ کھڑی ہو جائے، سر کو پیچھے گرا لے، منہ کے دہانے کو نصف وا کرے، آنکھیں اوپر چڑھا لے، یعنی ایسا کچھ کر لے جس سے یہ تاثر ملے کہ وہ گنگنانے پر آمادہ ہے۔ وہ جہاں کہیں چاہے ایسا کر سکتی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ جگہ دور سے دکھائی دینے والی ہو، کوئی کونہ، جسے وہ لمحہ بھر میں ہی منتخب کر لیتی ہے، اس مقصد کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ یہ خبر کہ وہ گانے لگی ہے، فی الفور ہر طرف پھیل جاتی ہے اور جلد ہی لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اکٹھا ہونے لگتے ہیں۔

اب بھی کبھار اچانک ہی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جوزیفائن کے لیے گانے کا بہترین وقت وہی ہے جب ہر طرف انتشار کا عالم ہو۔ مختلف پریشانیاں اور خدشات ہمیں پیچدار طریقے اپنانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اپنے بہترین ارادوں کے باوجود ہم خود کو اس تیزی سے باہم یکجا نہیں کر سکتے، جیسا جوزیفائن خواہش کرتی ہے۔ کبھی کبھار وہ ناکافی سامعین کی موجودگی میں وہ سٹیج پر دیر تک اپنے روایتی انداز میں کھڑی رہتی ہے۔ تب وہ غصے میں بپھر جاتی ہے۔ اپنے پیروں کو فرش پر مارتی ہے۔ غیر نسوانی انداز میں بک بک کرتی ہے۔ صریحاً خود کو نوچتی کھسوٹتی ہے۔ لیکن ایسا رویہ بھی اس کی ساکھ مجروح نہیں کرتا بلکہ لوگ اس کے بے جا مطالبات کو دبانے کے بجائے انھیں پورا کرنے میں زیادہ شدومد سے جٹ جاتے ہیں۔ منادی کرنے والوں کو نئے سامعین کی تلاش میں باہر بھیجا جاتا ہے۔ اسے اس بات سے بے خبر رکھا جاتا ہے کہ اس کے لیے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ سڑکوں پر سپاہی متعین کر دیے جاتے ہیں جو ہاتھ ہلا کر نو واردوں کو بلاتے اور انھیں تیز تیز قدم اٹھانے پر قائل کرتے ہیں۔ یہ کارروائی جاری رہتی ہے حتیٰ کہ تماشائیوں کا ایک بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے۔

آخر لوگوں کو کیا بات جوزیفائن کے لیے اتنا درد سر مول لینے پر مجبور کرتی ہے؟ اس سوال کا جواب،

جوزیفائن کی گلوکاری سے متعلق سوال کے جواب سے زیادہ آسان نہیں ہے جس سے جڑا ہوتا ہے۔ تاہم اسے ختم کیا جا سکتا اور انھیں ایک دوسرے سوال میں مدغم کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہمارے لیے یہ کہنا ممکن ہو کہ لوگ اس کی موسیقی کی وجہ سے اس سے غیر مشروط عقیدت رکھتے ہیں۔ لیکن معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کسی سے غیر مشروط عقیدت کا ہمارے ہاں دور دور تک امکان نہیں ہے۔ ہم اس طرح کے لوگ ہیں کہ بغض وعناد کے بغیر شوخی وشرارت کو ہر شے سے بڑھ کر پسند کرتے ہیں اور بچگانہ سرگوشیوں اور گپ شپ کو، معصوم اور سطحی گپ شپ کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن ہم جیسے لوگ کسی سے غیر مشروط عقیدت نہیں رکھ سکتے۔ اور اس بات سے جوزیفائن بخوبی آگاہ ہے اور اسی کے خلاف وہ اپنے کمزور گلے کی تمام طاقت سے برسرِ پیکار ہے۔

ایسے عمومی اعلانات کرتے ہوئے ہمیں بے شک بے پر کی بھی نہیں اڑانی چاہئے۔ ہم لوگ بہر طور جوزیفائن کے گرویدہ ہیں، صرف غیر مشروط طور پر نہیں۔ مثال کے طور پر وہ جوزیفائن کا ٹھٹھہ اڑانے کی اہلیت سے محروم ہیں۔ ہمیں اعتراف ہے کہ جوزیفائن میں بے شمار ایسی باتیں ہیں جو لوگوں کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیں۔ اور ہنسی برائے ہنسی تو ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔ ہماری زندگیوں کی تمام تر خستہ حالی کے باوجود، یہ کہا جا سکتا ہے کہ خاموش ہنسی ہمیشہ ہماری کہنیوں میں چھپی رہتی ہے۔ لیکن ہم جوزیفائن پر نہیں ہنستے۔ بسا اوقات مجھے احساس ہوتا ہے کہ ہم لوگ جوزیفائن سے اپنے تعلق کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ وہ، ایک کمزور مخلوق، ہمارے تحفظ کی متقاضی اور ایک لحاظ سے غیر معمولی، بلکہ خود اپنے تئیں گلوکاری کے غیر معمولی جوہر کی حامل، ہماری توجہ کی مستحق ہے اور اور ہمیں اس کی دیکھ بھال کرنی بھی چاہیے۔ یہ بات کسی پر واضح نہیں ہے بس یہ ایک حقیقت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ بس جو شے کسی کی ذمہ داری ہو، اس پر ہنسا نہیں جا سکتا۔ ہنسنا اس فرض کا ٹھٹھہ اڑانے کے مترادف ہوگا۔ جوزیفائن سے شدید عناد رکھنے والے بھی اپنے انتہائی کینہ کا اظہار اکثر و بیشتر ان الفاظ میں کرتے ہیں ''جوزیفائن کو دیکھنا ہی کسی کی ہنسی روک دینے کے لیے کافی ہے۔''

لوگ جوزیفائن کی اس طرح دیکھ ریکھ کرتے ہیں جیسے باپ اپنے بچے کی کرتا ہے جس کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہوا ہو، جو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ درخواست کے لیے پھیلا ہے یا حکم دینے کے انداز میں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم لوگ ان پدرانہ ذمہ داریوں کے اہل نہیں ہیں۔ لیکن حقیقتاً کم از کم اس معاملے میں ہم ان

سے باحسن وخوبی وعہدہ برآ ہوتے ہیں۔ کوئی ایک بھی فرد ویسا نہیں کر سکتا جیسا اس معاملے میں ہم لوگ مجموعی طور پر کرنے کے اہل ہیں۔ حقیقتاً ایک فرد اور مجموعی طور پر لوگوں کے درمیان فرق اتنا زیادہ ہے کہ ایک بچے کے لیے ممکن ہے کہ وہ ان کی قربت کی حدت میں گم ہوجائے اور یوں اس کا مناسب انداز میں تحفظ ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کسی میں اتنی جرات نہیں ہے کہ وہ جوزیفائن سے ان باتوں کا تذکرہ کرے۔

تب وہ کہتی ہے کہ ''تمھاری دیکھ ریکھ ایک پرانے گانے سے بھی زیادہ اہم نہیں ہے۔''

بے شک بے شک ایک پرانا گانا، ہم سوچتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس کا احتجاج کوئی حقیقی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ یہ احتجاج کا ایک انتہائی بچگانہ انداز ہے اور بچگانہ شکر گزاری بھی۔ جب کہ باپ کا کردار یہ ہے کہ وہ ایسی باتوں پر بالکل کان نہ دھرے۔

لیکن اس سارے معاملے میں کچھ ایسی بات بھی ہے جسے لوگوں کے جوزیفائن کے ساتھ تعلق کے توسط سے بیان کرنا سہل نہیں ہے۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ جوزیفائن اس سے مختلف انداز میں سوچتی ہے۔ اسے یقین ہے کہ دراصل وہ لوگوں کا تحفظ کرتی ہے۔ جب ہم سیاسی یا معاشی ابتری میں گھرے ہوتے ہیں تو اس کی گلوکاری سے فرض کیا جاتا ہے کہ وہ ہمیں اس ابتلاء سے نکالے، اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور اگر وہ ابتلا کو دور نہ کر پائے تو کم از ہمیں اتنی طاقت ضرور دیتی ہے کہ اسے برداشت کر سکیں۔

لیکن وہ اس بات کو ان الفاظ میں بیان نہیں کرتی۔ بلکہ وہ بہت کم بولتی ہے۔ بہت باتونی لوگوں کے درمیان چپ رہتی ہے۔ لیکن یہ بات اس کی آنکھوں سے اور اس کے بند ہونٹوں سے چھلکتی ہے۔ ہم میں سے کم ہی لوگ اپنے ہونٹ بھینچے رہ سکتے ہیں لیکن وہ ایسا کر لیتی ہے۔ یہ بات صاف پڑھی جا سکتی ہے۔ جب کبھی ہم کسی بری خبر سے دوچار ہوتے ہیں اور کبھی ایسی خبروں کی بھرمار ہوجاتی ہے، جن میں سچی جھوٹی سبھی خبریں شامل ہوتی ہیں تو وہ اپنی جگہ سے بلند ہوتی ہے جب کہ عام طور پر وہ بے حرکت زمین پر بیٹھی رہتی ہے۔ وہ کھڑی ہوتی اور اپنی گردن کو بلند کر کے اکڑا لیتی اور اپنے سامنے تماشائیوں کے دور تک پھیلے ہوئے سروں کو دیکھتی ہے جیسے طوفان برگ و باراں سے قبل گڈریا اپنے بھیڑوں کے گلّے کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ بلاشبہ بچوں کی عام عادت ہے کہ وہ اپنے حیوانی اور جبلی جذبے کے تحت ایسے دعوے کرتے ہیں، لیکن جوزیفائن کے دعوے بچوں کے دعووں کی مانند بے بنیاد نہیں ہوتے۔

یہ سچ ہے کہ وہ ہماری حفاظت نہیں کرتی اور نہ ہی ہمیں حوصلہ دیتی ہے۔ ہم لوگوں کا نجات دہندہ بننا بہت آسان ہے۔ جیسا کہ ہم لوگ مشکلات کے عادی ہیں۔ احتیاط پسندی سے دور کا واسطہ نہیں، فیصلوں میں جلد باز، موت سے خوب آگاہ، اور اندھا دھند جرات مندی، جس کے وہ عادی ہیں، کی فضا میں دیکھنے والوں کے لیے جلد پریشان ہو جانے والے، اور اتنے ہی زیادہ تعداد میں جتنے ہم برے ہیں، تو یہ بہت آسان ہے کہ واقعہ ہو جانے کے بعد ہم لوگوں، جو خود کو بچانے کا چاہے ایسی قربانیوں کی قیمت پر ہی کوئی راستہ ڈھونڈ نکالتے ہیں جو مؤرخین کو کہ ہم تاریخ تحقیق کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہیں، دہشت زدہ کر دیتی ہیں

پھر بھی یہ درست ہے کہ عام حالات کی نسبت صرف ہنگامی حالات ہی میں ہم جوزیفائن کی آواز کو صحیح طور پر سن پاتے ہیں۔ ہمارے سروں پر سوار ناگہانی آفات کا خوف ہمیں جوزیفائن کی حاکمیت کے سامنے زیادہ خاموش، زیادہ منکسر المزاج اور زیادہ اطاعت کیش بنا دیتا ہے۔ ہم اکٹھے رہنا پسند کرتے ہیں۔ ایک دوسروں کے ہاتھ پکڑے رہنا پسند کرتے ہیں خاص طور پر ایسے موقعوں پر جو ہمیں درپیش مشکلات سے جدا ہو۔ یہ ایسی بات ہے جیسے ہم کسی جنگ سے پہلے نہایت عجلت کے ساتھ کہ عجلت ضروری بھی ہے جسے جوزیفائن بھی اکثر بھول جاتی ہے، مشترکہ طور پر کسی امن کے پیالے سے جام پئیں۔ یہ محض نغموں کی ادائیگی نہیں جیسے لوگوں کا اجتماع ادا کرتا ہے اور ایسا اجتماع جہاں سامنے گونجتی مختصر گنگناہٹ کی آواز کے سوا مکمل خاموشی ہوتی ہے۔ یہ لمحہ ہمارے لیے اتنا قیمتی ہوتا ہے کہ ہم اسے گپ بازی میں ضائع نہیں کرتے۔

لوگوں کا جوزیفائن سے ایسا تعلق اسے کبھی مطمئن نہیں کر پاتا۔ تمام تر اعصابی اضطراب کے باوجود جو جوزیفائن کو اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے کیوں کہ اس کی حیثیت کبھی واضح نہیں کی گئی، بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اسے دکھائی ہی نہیں دیتی ہیں۔ خود فریبی نے اسے اندھا کر رکھا ہے۔ اور اسے بہت آسانی سے بہت کچھ نظر انداز کرنے پر مائل کیا جا سکتا ہے کہ اس کے گرد ہمیشہ خوشامدیوں کا ایک جمگھٹ اس کام میں مصروف رہتا ہے، اور ایک طرح سے عوامی خدمت ہی انجام دیتا ہے۔ پھر بھی لوگوں کے اجتماع کے ایک گوشے میں ایک حادثاتی اور نظر انداز شدہ گائیک ہونا بھی، اگرچہ اپنے طور پر ایک چھوٹی بات نہیں ہے، لیکن وہ یقیناً ہمیں اپنے گانے کی قربانی نہیں دینے دے گی۔

لیکن اس کے لیے اسے کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ اس کے فن سے بے توجہی برتنا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ ہم اصلاً بہت سی دوسری مصروفیات میں الجھے رہتے ہیں اور یہ بلاشبہ صرف اس کی گنگناہٹ کے سبب نہیں ہے کہ خاموشی چھا جاتی ہے اور بہت سے سامعین اوپر دیکھنے کے بجائے اپنے برابر بیٹھے ہوؤں کے لباس میں سمور میں چھپا لیتے ہیں کیوں کہ اس کے باوجود کہ وہ سامنے بلامقصد ہی خود کو ہلکان کرتی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ بات ناقابل تردید ہے کہ اس کی گنگناہٹ میں کوئی ایسی بات ہے جو ہم پر اثرانداز ہو رہی ہوتی ہے۔

یہ گنگناہٹ، جو وہاں نمودار ہوتی ہے جہاں خاموشی چھا جائے، ہر فرد کو سارے مجمع کی طرف سے ایک پیغام کی صورت میں وصول ہوتی ہے۔ گھمبیر فیصلوں کے درمیان جوزیفائن کی کمزور گنگناہٹ ایسے ہی ہے جیسے اس بداندیش دنیا کے ہنگامے میں ہم لوگوں کا ڈانواڈول وجود۔ جوزیفائن خود پر اصرار کرتی ہے، نہ اس کی آواز میں کوئی دم ہے۔ نہ اس کی موسیقی میں کوئی کمال ہے۔ لیکن وہ اپنے بارے میں دعوے کرتی نہیں تھکتی اور ہمارے قریب آ جاتی ہے۔ اس بارے میں سوچنا ہمیں اچھا لگتا ہے۔ ایک واقعتاً تربیت یافتہ گلوکارہ، اگر واقعی ایسی کوئی گلوکارہ ہمارے درمیان ہوتی تو ہم ایسے وقت میں اسے بلاشبہ برداشت نہ کر پاتے اور فن کے ایسے ناپختہ مظاہرے سے مشترکہ طور پر اُوب جاتے۔ کیا جوزیفائن کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی ہوگی کہ ہمارا اسے غور سے سننا ہی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ گلوکارہ نہیں ہے۔ ضرور اس حقیقت کا اسے وجدان ہوگا، ورنہ کیوں وہ اتنی شدت سے اس بات کو رد کرتی کہ ہم اسے سنتے ہیں۔ صرف وہ اپنے وجدان سے صرف نظر کرنے کے لیے گاتی اور گنگناتی چلی جاتی ہے۔

تاہم چند امور ایسے ہیں جو اس کی تشفی اور طمانیت کا سبب ہو سکتے ہیں مثلاً یہ کہ ایک اعتبار سے ہم واقعی اسے سنتے ہیں، شاید یونہی جیسے کسی تربیت یافتہ گلوکارہ کو سنا جاتا ہے۔ وہ ہم سے اتنی داد وصول کرتی ہے جسے کوئی تربیت یافتہ گلوکار بے سود ہی ہم سے حاصل کرنے کے لیے سر مارتا ہے۔ لیکن یہ داد محض اسی لیے دی جاتی ہے کیوں کہ اس کا فن ناقص ہے۔ لیکن اس کی وجہ بلاشبہ ہمارا طرز معاشرت ہے۔

ہماری قوم میں جوانی کی عمر نہیں آتی۔ مختصر سا بچپن آتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ باقاعدگی سے ایسے مطالبات کیے جاتے ہیں کہ بچوں کو خاص آزادی اور خاص تحفظ دیا جائے۔ کہ انھیں قدرے غیر محتاط اور

غیر ذمہ دار ہونے، معمولی شرارت، کچھ کھیل کود کرنے کا حق حاصل ہے۔ کہ اس حق کا احترام کرنا اور اس کے استعمال کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ یہ مطالبات پیش کیے جاتے ہیں اور جنھیں تقریباً سبھی جائز بھی قرار دیتے ہیں، اتنا کہ شاید ہم کسی بھی دوسری شے کو اس سے زیادہ جائز نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری روزمرہ زندگی میں شاید ہی کوئی دوسری شے ایسی ہو جس کی اجازت دینا اس سے کم ممکن ہو۔ ان مطالبات کو مان لیا جاتا ہے۔ انھیں پورا کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے لیکن جلد ہی ہم اپنے پرانے وطیرے پر لوٹ آتے ہیں۔ ہمارا طرز زندگی اس نوعیت کا ہے کہ جیسے ہی ایک بچہ کچھ چلنے پھرنے اور مختلف اشیاء کو ایک دوسرے سے جدا شناخت کرنے کے قابل ہوتا ہے، وہ ایک بالغ شخص ہی کی مانند اپنی دیکھ بھال کی ذمہ داری اٹھا لیتا ہے۔ مختلف معاشی وجوہات کی بناء پر ہم جن خطوں میں رہنے پر مجبور ہیں، وہ بہت کشادہ ہیں۔ ہمارے دشمن ان گنت ہیں۔ ہماری گھات میں موجود خطرات کا بھی کوئی شمار نہیں۔ ہم زندہ رہنے کی جدوجہد سے اپنے بچوں کو بچا نہیں سکتے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو وہ چھوٹی عمر ہی میں موت کا شکار ہو جائیں گے۔

ایسے مایوس کن خیالات کو ایک دوسری طرح کے خیال سے تقویت ملتی ہے جو اپنے طور پر مایوس کن نہیں ہے یعنی ہماری نسل کی بارآوری کا خیال۔ ہماری نسل، کہ ہر نسل ہی ان گنت ہوتی ہے، سابقہ نسل کے نقش قدم پر چلتی ہے۔ لہٰذا ہمارے بچوں کو بچپن گزارنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ ہوسکتا ہے دیگر اقوام اپنے بچوں کی محتاط نگہداشت کرتی ہوں۔ ان کے لیے مدرسے تعمیر کرتی ہوں جن میں یہ، اس قوم کے مستقبل کے معمار، ہر روز تعلیم حاصل کرنے جاتے ہوں۔ اور ان میں ایک سے ہی بچے طویل عرصے تک روز سکول میں آتے ہوں۔ ہمارے ہاں تعلیم گاہیں نہیں ہیں۔ ہماری ہر نسل سے ہر مختصر وقفہ کے بعد بچوں کے جھنڈ کے جھنڈ برآمد ہوتے ہیں۔ تھتھلاتے یا خوشی سے چوں چوں کرتے ہوئے، جب تک کہ وہ گنگنانے کے قابل نہیں ہوتے۔ اپنے ہی زور میں ادھر ادھر لڑھکتے پھرتے ہیں جب تک کہ بھاگنے کے قابل نہیں ہوتے۔ مختلف حجم کی اشیاء کو اناڑی پن سے لڑھکاتے ہیں جب تک کہ وہ انھیں دیکھنے کے قابل نہیں ہوتے۔

لیکن ہمیشہ وہ ایک جیسے ہی نہیں ہوتے، جیسا کہ سکولوں میں ہوتا ہے۔ نہیں، ہمیشہ ہر بار نئے بچے برآمد ہوتے ہیں، بلا اختتام، بلا توقف۔ ایک بچہ جنم لیتا ہی ہے کہ اگلے لمحے وہ بچپن کی حدود پھلانگ جاتا

ہے۔ جب کہ اس کے پیچھے نئے بچوں کے چہرے اس تیزی اور شدت سے ہجوم کر آتے ہیں کہ وہ ناقابل شناخت ہوتے ہیں۔ بس جوش مسرت سے سرخ رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بات چاہے کتنی ہی خوش گوار ہو، دوسرے کتنا ہی اس بات پر ہم سے حسد کریں اور یہ درست بھی ہوگا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو حقیقی بچپن نہیں دے پاتے اور اس کے منفی نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔

ایک طرح کا بے وقعت اور ناقابل علاج بچگانہ پن ہم لوگوں کی شخصیت میں عود کر آتا ہے۔ ہماری ذات میں موجود سب سے اہم شے یعنی اپنے مثالی عملی فہم عامہ کے قطعی برعکس ہم اکثر احمقانہ حرکتیں کرتے ہیں۔ ویسی ہی بیوقوفی کے ساتھ جیسی بچوں میں ہوتی ہے، قطعی ناسمجھی، بے احتیاطی، بظاہر دھوم دھام سے، غیر ذمہ داری اور سب سے بڑھ کر اکثر محض سطحی تفریح کی خاطر۔ اور اگرچہ اس سے حاصل شدہ ہماری تفریح ایک بچے کی تفریح کی طرح مکمل نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ اس بچگانہ تفریح کا بیج ہی رہتا ہے۔ ہم لوگوں کے بچگانہ پن سے جوزیفائن نے کمال عیاری سے شروع ہی سے فائدہ اٹھایا۔

لیکن ہم لوگ صرف بچے نہیں ہیں۔ عجیب طور پر بیک وقت غیر پختہ بوڑھے بھی ہیں۔ بچپن اور بڑھاپا ہم پر ویسے نہیں آتا جیسے یہ دوسروں کا تجربہ بنتا ہے۔ ہم جوان نہیں ہوتے بلکہ ایک دم سے بوڑھے ہو جاتے ہیں اور پھر طویل عرصہ اسی عمر میں ٹکے رہتے ہیں۔ ایک خاص نا اُمیدی اور پژمردگی جو اس سے پیدا ہوتی ہے، ہم لوگوں کی فطرت میں کشادہ خلاء چھوڑ جاتی ہے کہ ہم عمومی طور پر مضبوط اور شدید امید کرنے والے ہوتے ہیں جس میں موسیقی کی حس کے فقدان کا بھی کچھ دخل ہے۔

ہم اتنے عمر رسیدہ ہوتے ہیں کہ موسیقی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اس کا جوش، اس کا تلذذ ہمارے خشک مزاج سے لگا نہیں کھاتا، بے زاری سے ہم اسے جھٹک دیتے ہیں۔ گنگناہٹ پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھار کچھ دیر گنگنا لینا ہمارے لیے کافی ہوتا ہے۔ کیا پتہ، ہم میں بھی موسیقی کا جوہر موجود ہو؟ لیکن اگر ایسا ہو بھی تو ہم لوگوں کی ایسی فطرت ہے کہ اسے ثمر آور ہونے سے پیشتر ہی کچل دیں گے۔ البتہ جوزیفائن اپنی منشا کے مطابق جب تک چاہے گنگنا سکتی ہے۔ یا گا سکتی ہے یا پھر جو بھی وہ اس فن کو نام دے، اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ ہمارے مزاج کے موافق ہے۔ ہم اس کے ساتھ گزارا کر سکتے ہیں۔ اس کے فن میں موسیقی کی جس قدر گنجائش ہونی چاہیے، وہ اتنی ہی کم ہے۔ موسیقی کی ایک مخصوص روایت تاحال محفوظ ہے، ہم سے کچھ بھی تقاضا کیے بغیر۔

لیکن جیسی کہ ہم لوگوں کی فطرت ہے، ہم جوزیفائن سے اس سے بھی بڑھ کر کچھ حاصل کرتے ہیں۔اس کے پروگراموں میں، خاص طور پر ہمارے مایوسیوں کے دورانیوں میں، ہم میں سے چھوٹی عمر والے ہی اس کی گلوکاری میں بطور فن دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ اکیلے ہی اسے اپنے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے، اپنے سامنے کے خوبصورت دانتوں کے درمیان میں سے ہوا نکالتے ہوئے، اپنی ہی آواز پر انتہائی حیرت کے ساتھ نیم مردہ ہوتے ہوئے اور پھر ایسی نیم بے ہوشی کے بعد اپنے مظاہرے کو نئی اور غیر معمولی رفعتوں سے آراستہ کرتے ہوئے حیرت سے تکتے ہیں۔ جب کہ لوگوں کا حقیقی مجمع، صاف دکھائی دیتا ہے کہ اپنی سوچوں میں گم ہوتا ہے۔

یہاں اپنی مشقتوں کے درمیان مختصر وقفوں میں ہمارے لوگ خواب دیکھتے ہیں، جیسے ہر فرد کے اعصاب کو سکون ملا ہو، جیسے کوئی پریشان حال انسان کبھی کبھار برادری کے عظیم گرم بستر میں سہولت کے ساتھ آرام کرنے اور لیٹ جانے کا موقع پائے۔ جب کہ ان خوابوں میں جوزیفائن کی گنگناہٹ سُر بہ سُر اترتی ہے۔ وہ ان سروں کو موتیوں جیسے کہتی ہے۔ ہم انھیں بے لطف آوازیں پکارتے ہیں۔ لیکن بہرطور یہ اپنی درست جگہ پر موجود ہوتی ہے، جیسے کسی بھی دوسری جگہ مہلت پائے بغیر اس کا انتظار کرتی ہے جیسا موسیقی کبھی نہیں کرتی۔ ہمارے مختصر لاچار بچپن کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ اس میں ہوتا ہے، اس گم شدہ مسرت کا کچھ حصہ جسے دوبارہ کبھی نہیں پایا جا سکتا، لیکن ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کا بھی کچھ حصہ، اس کی مختصر خوشیاں، جو ان گنت ہوتی ہیں، لیکن پھوٹتی چلی آتی ہیں اور ختم نہیں ہوتیں۔

اور بلاشبہ اس سب کچھ کا اظہار مکمل گول سروں میں نہیں بلکہ نرمی سے، سرگوشی کے انداز میں، رازداری کے ساتھ، بعض اوقات کچھ کھردراہٹ کے ساتھ ہوتا ہے۔ بے شک یہ ایک طرح کی گنگناہٹ ہی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو؟ گنگناہٹ ہماری روزمرہ گفتگو ہے۔ ہم میں سے بعض تو ساری عمر گنگناتے ہیں لیکن کبھی جان ہی نہیں پاتے۔ لیکن یہاں گنگناہٹ روزمرہ زندگی کی بندشوں سے آزاد ہو جاتی ہے اور یہ ہمیں بھی کچھ دیر کے لیے آزادی عطا ہے۔ ان مظاہروں کے بغیر ہم یقیناً ایسا نہیں کرنا چاہیں گے۔

لیکن اس نقطہ نظر سے جوزیفائن کا یہ دعویٰ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے فن سے ہم میں زندگی کی بجھتی ہوئی شمع کی لو کو تیز یا ایسا ہی کچھ اور کرتی ہے۔ عام لوگوں کے لیے، کم از کم اس کے خوشامدیوں کے جتھے کے لیے نہیں۔ اس کے خوشامدی شوخ ڈھٹائی کے ساتھ کہتے ہیں ''تو اس کی اور کیا

وجہ ہوسکتی ہے؟''

''تماشائیوں کے عظیم ہجوم کی بھلا اور کیا توضیح ہوسکتی ہے خاص طور پر جب کہ خطرہ سر پر منڈلا رہا ہو اور جوان احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنے کی راہ میں حائل ہوئے ہوں جو خطرے کو ٹالنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں؟''

یہ آخری بیان بدقسمتی سے درست ہے۔ لیکن اسے جوزیفائن کی ان خوبیوں میں سے ایک شمار نہیں کیا جاسکتا جو اس کی شہرت کا سبب ہیں۔ خاص طور پر اس خطرے کے پیش نظر کہ جب ایسا عظیم اجتماع غیر متوقع طور پر کسی دشمن کی کارستانی سے مشتعل ہوجاتا ہے اور ہمارے کئی ایک لوگ مارے جاتے ہیں تو جوزیفائن، جو اس سارے ہنگامے کی واحد ذمہ دار ہوتی ہے اور غالباً اسی نے اپنی گنگناہٹ سے دشمن کو بھی ادھر راغب کیا ہوتا ہے، محفوظ ترین مقام پر چلی جاتی ہے اور وہ مجمع میں سے کھسکنے اور محافظین کے حصار میں جانے ولا پہلا فرد ہوتی ہے۔ ہر شخص اس بات سے آگاہ ہے لیکن پھر بھی اگلی مرتبہ وہاں بھاگے جاتے ہیں جہاں جوزیفائن اپنے مظاہرے کا فیصلہ کرتی اور کسی بھی وقت وہ کھڑی ہوکر گانے لگتی ہے۔

اس پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ جوزیفائن ہر قانون سے ماورا ہے۔ وہ اپنی خواہش کے مطابق ہر کام کر سکتی ہے۔ چاہے اس سے پوری برادری کیسے ہی سنگین خطرے کا شکار ہوجائے، اور یہ کہ اسے ہر بات کی معافی بھی مل جائے گی۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر جوزیفائن کے تمام دعوے قابل فہم ہیں۔ ہاں، اس آزادی سے، جو اسے دی گئی ہے، اور قانون کی براہ راست خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی اور کو نہیں بلکہ صرف اسے حاصل غیر معمولی جوہر سے، یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ لوگ جوزیفائن کو سمجھ ہی نہیں پائے۔ جیسا کہ وہ خود بھی الزام لگاتی ہے کہ ہم اپنی بے بسی کی وجہ سے اس کے فن کو سراہتے ہیں۔ خود کو اس کے اہل محسوس نہیں کرتے اور اس کے لیے مایوس کن قربانیاں دے کر اس تاسف کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں جو وہ ہم میں پیدا کرتی ہے۔ اور جس حد تک اس کا فن ان کے فہم سے بالاتر ہے، اسی حد تک اس کی شخصیت اور اس کی خواہشات کو بھی اپنے دائرہ اختیار سے باہر تصور کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات مکمل طور پر درست نہیں ہے۔ شاید ہم لوگ انفرادی طور پر تو خود کو آسانی سے جوزیفائن کے سامنے جھکا سکتے ہیں لیکن من حیث القوم خود کو غیر مشروط طور پر کسی کی اطاعت میں نہیں دے سکتے، جوزیفائن کی بھی نہیں۔

ایک طویل عرصے سے، غالباً اپنی فنی زندگی کے آغاز سے ہی جوزیفائن اپنی گلوکاری کے لیے

روزمرہ کی دیگر ذمہ داریوں سے استثنا حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ یہ کہ اسے روزگار کمانے کی ذمہ داری اور بقاء کی عمومی جدوجہد میں شمولیت سے مستثنیٰ قرار دینا چاہیے، یعنی دوسرے لفظوں میں یہ ذمہ داری مجموعی طور پر عوام کو اپنے سر لینی چاہیے۔

ایک سہل پسند جوشیلا جوان، اور ہماری قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں، اس مطالبے کے انتہائی انوکھے پن اور ایسا مطالبہ پیش کرنے کے پس منظر میں کارفرما روحانی رویے کے پیش نظر یہ دلیل دے سکتا ہے کہ یہ مطالبے اپنے جواز کا حامل ہے۔ لیکن ہمارے لوگ اس بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں اور اسے خاموشی سے رد کر دیتے ہیں۔ نہ ہی وہ ان مفروضات کی تردید کی زحمت کرتے جن پر یہ مبنی ہوتا ہے۔ جوزیفائن مثال کے طور پر یہ دلیل دیتی ہے کہ کام کا تناؤ اس کی آواز کے لیے مضر ہے۔ کام کے تناؤ گلوکاری کے آگے کیا حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ اسے گلوکاری کے بعد مناسب حد تک آرام کرنے اور مزید گلوکاری کے لیے خود کو تیار کرنے کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی توانائی کو مکمل طور پر اپنے فن پر صرف کرے اور موجودہ حالات میں وہ کبھی اپنے جوہر کے کمال کو نہیں چھو پائے گی۔ لوگ اس کے دلائل کو سنتے ہیں لیکن اس پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ یہ لوگ، جنھیں کوئی بات منوانا کتنا آسان ہے، کبھی کسی بات پر بالکل ہی اڑ جاتے ہیں۔ ان کا انکار بعض اوقات اس قدر حتمی ہوتا ہے کہ جوزیفائن کو پسپا ہونا پڑتا ہے۔ وہ ان کی بات مان لیتی اور اپنے حصے کا کام کرتی ہے اور اپنے بہترین جوہر کے ساتھ گاتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ مختصر وقت کے لیے ایسا رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر سے نئی قوت کے ساتھ کہ معلوم ہوتا ہے اس میں اس حوالے سے بے پناہ قوت موجود ہے، اس جنگ کو شروع کر دیتی ہے۔

اب یہ بالکل واضح ہے کہ جوزیفائن جو کچھ لفظوں میں کہتی ہے، وہ اس کی خواہشات سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ قابل احترام ہے۔ وہ محنت سے جھجکتی نہیں ہے۔ محنت سے جی چرانا ہمارا شیوہ نہیں ہے۔ اگر اس کی درخواست قبول کر لی جائے تو وہ پھر بھی ویسی ہی زندگی گزارے گی جیسے وہ اب گزار رہی ہے۔ نہ اس کا کام اس کی گلوکاری پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ نہ ہی اس آزادی سے اس کی گلوکاری میں کوئی بہتری پیدا ہو گی، جو کچھ وہ چاہتی ہے، وہ عوام سے اپنے فن کی مستقل اور غیر مبہم ستائش کے سوا اور کچھ نہیں ہے، ایسی ستائش جو آج تک کسی کو نہ ملی ہو۔ لیکن چوں کہ باقی ہر شے اس کی دسترس میں معلوم ہوتی ہے، اس لیے یہ بات اس کے لیے قابل فہم نہیں ہے۔ شاید اسے شروع ہی سے اپنی جدوجہد کے لیے ایک مختلف راستہ

اختیار کرنا چاہیے تھا۔شاید وہ خود محسوس کرتی ہے کہ اس کا طریقہ واردات غلط تھا۔لیکن اب واپسی ممکن نہیں ہے۔پسپائی خود سے غداری کے مترادف ہوگی۔یا تو اسے اپنی بات پر اڑے رہنا یا اس سے دست بردار ہو جانا ہوگا۔

اگر واقعی اس کے کچھ دشمن ہیں، جیسا وہ اصرار بھی کرتی ہے تو وہ یقیناً اس کی جدوجہد سے محظوظ ہو رہے ہوں گے، بغیر اس پر انگلی اٹھائے۔لیکن اس کا کوئی دشمن نہیں ہے۔اور اگر چہ اسے کہیں کہیں تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے لیکن اس کی جدوجہد کسی کے لیے باعث تفریح نہیں ہے۔صرف اسی معاملے میں لوگوں نے اپنا سرد اور عدالتی پہلو ظاہر کیا، ورنہ یہ رویہ ہمارے درمیان تقریباً ناپید ہے۔اور بہر حال اس معاملے میں ایسے رویے کو باجواز قرار دیا جاسکتا ہے، کیوں کہ یہ بنیادی خیال کہ ایسی صورت حال سے کوئی بھی دوچار ہوسکتا ہے، ہنسی ٹھٹھے کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔اہم بات، جوزیفائن کی درخواست اور لوگوں کے انکار میں ان کا عمل نہیں ہے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ لوگوں میں اپنے ہی ساتھیوں کے سامنے کسی معاملے میں مضبوط اور بے لچک رویہ ظاہر کرنے کی اہلیت موجود ہے۔اور یہ کہ یہ بات سرے سے ناقابل فہم ہے کیوں کہ دوسرے معاملات میں وہ نہایت پدرانہ شفقت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے درمیان موجود اس فرد کے لیے تو ان کا رویہ پدرانہ شفقت سے بڑھ کر ہے۔

فرض کیجیے کہ عوام کی بجائے آپ کا معاملہ ایک فرد سے ہے۔یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ یہ فرد ہمہ وقت جوزیفائن کے سحر میں رہا اس حیوانی خواہش کو پالتا ہوا کہ کسی خوشگوار دن وہ اپنی اطاعت کیشی کا خاتمہ کر دے گا۔اور یہ کہ اس نے اس یقین کیساتھ جوزیفائن کے لیے فوق الانسانی قربانیاں دیں کہ اس میں قربانی دینے کی ایک حد تک ہی فطری اہلیت موجود ہے۔ہاں، یہ کہ اس نے اس عمل کو سریع بنانے کے لیے ضرورت سے کہیں زیادہ قربانیاں دیں، صرف اس لیے کہ جوزیفائن کا خیال رکھا جائے اور اس کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کا مطالبہ کرے حتی کہ وہ اپنے آخری مطالبے کے ساتھ آخری حد تک پہنچ جائے، اور یہ کہ وہ شخص اپنے آخری انکار سے اسے رد کر دے جو کھرا ہوگا کیوں کہ مدت سے جو سنبھال کر رکھا گیا تھا۔لیکن معاملات حقیقتاً ایسے نہیں ہیں۔لوگوں کو ایسی حیلہ بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ جوزیفائن سے ان کی عقیدت آزمائشی طور پر سچی اور حقیقی ہے۔اور جوزیفائن کے مطالبات اس قدر ناقابل قبول ہیں کہ ایک عام بچہ بھی اسے یہ بتا سکتا ہے کہ ان کے جواب میں کیا کہا جائے گا۔لیکن ایسا ہوسکتا ہے

کہ ایسے خیالات جوزیفائن کو معاملے کے ناقص فہم کی جانب مائل کریں اور رد کیے جانے کے درد میں ایک خاص تلخی کا اضافہ ہو جائے۔

لیکن اس موضوع پر اس کے جو بھی خیالات ہوں، وہ انھیں اپنی مہم کو جاری رکھنے میں حائل نہیں ہونے دیتی۔ حال ہی میں اس نے اپنے مطالبات کی شدت میں اضافہ کیا ہے۔ ابھی تک وہ اپنے الفاظ ہی کو ہتھیاروں کے طور پر استعمال کرتی رہی تھی لیکن اب وہ دوسرے ذرائع کی طرف راغب ہو رہی ہے جو اس کے خیال میں زیادہ مؤثر ثابت ہوں گے لیکن جو ہمارے خیال میں اسے زیادہ سنگین خطرات میں مبتلا کر دیں گے۔

بہت سوں کو یقین ہے کہ جوزیفائن اپنے مطالبات پر اس لیے بضد ہے کیوں کہ وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ بوڑھی ہو رہی اور اس کی آواز آمادۂ زوال ہے۔ اس لیے وہ سوچتی ہے کہ اپنے فن کے اعتراف کے لیے آخری جنگ کا یہی بہترین وقت ہے۔ لیکن مجھے اس بات پر یقین نہیں ہے۔ اگر یہ بات درست مان لی جائے تو جوزیفائن، جوزیفائن نہیں رہے گی۔ جوزیفائن کی آواز اور عمر زوال سے نا آشنا ہے۔ اگر وہ مطالبات پر اصرار کر رہی ہے تو اس کی وجہ مخصوص خارجی حالات نہیں ہیں بلکہ ایک داخلی منطق ہے۔ وہ اگر بلندترین پھولوں کے کسی گجرے تک پہنچی ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ کچھ نیچے ٹنگا ہوا ہے بلکہ اس لیے کہ وہی سب سے اونچا ہے۔

خارجی مشکلات کے لیے اس کی نفرت بھی حقیقتاً اسے انتہائی بے وقعت ہتھکنڈے استعمال کرنے سے باز نہیں رکھ پاتی۔ اس کے لیے اس کے حقوق پر ہر بحث سے بالاتر ہیں۔ لہٰذا یہ سوال اہم نہیں رہتا کہ وہ ان کا کس انداز میں تحفظ کرتی ہے، خاص طور پر جب کہ وہ دیکھتی ہے کہ اس دنیا میں صالح تدابیر ہمیشہ ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں۔ غالباً یہی وجہ کہ اس نے اپنے حقوق کی جنگ کا رخ موسیقی کے میدان سے ایک ایسی سمت میں پھیر لیا ہے جو اس کے لیے کم اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے حمائتیوں نے اس بات کو مشہور کیا ہے کہ اس کے خیال میں وہ اس انداز میں گانے کے خود کو اہل تصور کرتی ہے کہ عوام کی ہر سطح حتی کہ مخالفین کے دور دراز علیحدہ گوشوں میں بھی اس سے حقیقی مسرت حاصل کی جائے۔ حقیقی مسرت عوامی معیارات کے مطابق نہیں، کہ عوام تو اس کے فن کے ہر روپ سے حظ اٹھانے کا اقرار کرتے ہیں، بلکہ اس کے اپنے معیارات کے مطابق مسرت۔

چوں کہ وہ نہ اپنے اعلیٰ ترین معیارات کا ابطال کر سکتی ہے اور نہ ہی کمتر معیارات اس کے لیے کچھ اہمیت رکھتے ہیں لہٰذا وہ کہتی ہے کہ اس کا فن موجودہ سطح پر ہی قائم رہے گا۔ لیکن جب بات معاشی ذمہ داریوں سے اس کے استثنا کی مہم کی ہو تو ہمیں ایک مختلف کہانی سننے کو ملتی ہے۔ بلاشبہ یہ مہم اس کی گلوکاری کے حوالے سے بھی ہے لیکن وہ اسے براہ راست اپنے نغمے کے گراں مایہ ہتھیار سے نہیں لڑ رہی ہے۔ بلکہ وہ جو کوئی ہتھیار استعمال کرے، وہ اپنی جگہ اہم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مثال کے طور پر یہ افواہ پھیلی کہ اگر اس کی درخواست قبول نہ کی گئی تو وہ اپنے گریس سُروں کو مختصر کر دے گی۔ میں اس کے گریس سروں کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی جوزیفائن کی آواز میں کبھی انھیں محسوس کیا لیکن جوزیفائن انھیں مختصر کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ نہیں، فی الوقت وہ انھیں مکمل ختم نہیں کر رہی، بلکہ صرف کم کر رہی ہے۔ خیال ہے کہ اس نے اپنی دھمکی پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے۔ حالاں کہ مجھے اس کی موجودہ آواز میں ایسی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ لوگ من حیث المجموع گریس سروں کی فرمائش کیے بغیر عمومی انداز میں اسے سنتے ہیں، نہ ہی اس کی درخواست سے متعلق ان کے ردعمل میں معمولی سا بھی فرق ظاہر ہوا ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ جوزیفائن کا اندازِ فکر اس کے جسم کی طرح اکثر مسحور کن ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے فن کے مظاہرے کے بعد، یہ ظاہر کرتے ہوئے جیسے گریس سروں کے بارے میں اس کا فیصلہ اتنا کٹھور یا عوامی خواہشات کے خلاف فوری مہم ہے کہ اس نے اعلان کیا کہ اگلی بار وہ یہ تمام گریس سُر پھر سے استعمال کرے گی۔ لیکن اگلے کنسرٹ کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنا ارادہ تبدیل کیا۔ گریس سروں کے ساتھ اس بھونڈے مذاق کا لازماً خاتمہ ہونا چاہیے اور جب تک اس کی درخواست مکمل طور پر منظور نہیں کی جاتی، وہ ان سُروں کا قطعاً استعمال نہیں کرے گی۔ لوگوں نے اس کے تمام اعلانوں، فیصلوں اور ذیلی فیصلوں کو ایک کان سے سنا اور دوسرے سے باہر نکال دیا۔ جیسے کوئی پختہ عمر شخص کسی اعلیٰ سوچ میں کھوئے ہونے کی وجہ سے کسی بچے کی بڑ کو سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ جو بظاہر خوبصورت ہوتی ہے لیکن ناقابل حصول۔

جوزیفائن ہار نہیں مانتی۔ مثلاً ایک روز اس نے اعلان کیا کہ کام کے دوران اس کا پیر زخمی ہو گیا ہے۔ اس لیے گانے کے لیے کھڑے ہونا اس کے لیے مشکل ہے اور چوں کہ وہ کھڑے ہوئے بغیر گا بھی نہیں سکتی، اس لیے اب اس کے گانے بھی مختصر ہو جائیں گے۔ اگرچہ وہ اپنے چاہنے والوں کے سہارے جھک کر اور لنگڑا کر چلتی ہے۔ لیکن پھر بھی کسی کو یقین نہیں آتا کہ وہ واقعی زخمی ہے۔ یہ مانا کہ اس کا نحیف جسم

انتہائی حساس ہے لیکن وہ ہم میں سے ہی ایک ہے اور ہم محنت کرنے والی قوم ہیں۔ اگر ہم ہر خراش پر لنگڑا کر چلنے لگیں تو ہم سبھی لنگڑے ہو چکے ہوں۔ اگرچہ یونہی لنگڑی عورت کی طرح دوسروں کے سہارے چلتی ہے اور اگرچہ وہ معمول کی نسبت کہیں زیادہ مرتبہ ہم سے اپنی قابل رحم حالت کا اظہار کر چکی ہے لیکن لوگ پہلے کی طرح ویسے ہی شکر گزاری کے احساس کے ساتھ اس کے نغموں کو سنتے اور داد دیتے ہیں لیکن اس کے نغموں کے مختصر ہو جانے کو یکسر خاطر میں نہیں لاتے۔

چوں کہ وہ ہمیشہ یونہی لنگڑا کر چلنا جاری نہیں رکھ سکتی، اس لیے وہ کوئی دوسرا حربہ آزمانے کا سوچتی ہے۔ وہ التجا کرتی ہے کہ وہ تھک چکی، گانے کی خواہش نہیں رکھتی اور نیم غشی کا شکار ہے۔ یوں ہمیں موسیقی کے اجتماع میں اس کی اداکاری کے جوہر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سٹیج کے پیچھے جوزیفائن کے چاہنے والے کھڑے اس سے منت سماجت کرتے اور گانے درخواست کرتے ہیں۔ وہ اس منت سماجت سے مسرور دکھائی دیتی ہے لیکن وہ گانے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ وہ اپنی خوشامد سے اسے خوش کرنے اور آرام پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے وہاں تک لے ہی آتے ہیں جہاں اس نے گانا ہوتا ہے۔ آخرکار زاروقطار روتے ہوئے وہ ارادہ بدل لیتی ہے۔ لیکن جب گانے کے لیے کھڑی ہوتی ہے، ظاہر ہے اپنی قوتوں کے اختتام پر کوشش کرتے ہوئے، تھکن زدہ، بازو معمول کے برعکس پھیلائے ہوئے نہیں، بلکہ بے جان سے نیچے لٹکائے ہوئے، جس سے دیکھنے والوں کو یہ گمان ہو جیسے وہ کچھ چھوٹے ہوں، جیسے وہ آواز اٹھانے کی کوشش کرتی ہے، لیکن ایسا کر نہیں پاتی تو سر کے ایک غیر ارادی جھٹکے سے ہمیں احساس دلاتی ہے لیکن ہماری آنکھوں کے سامنے پیچھے گر جاتی ہے۔ پھر حتمی ارادے کے ساتھ وہ خود کو دوبارہ سنبھالتی اور میں تصور کرتا ہوں کہ وہ گاتی ہے۔ اگر کسی میں اظہار کے عمدہ صوتی جوہر کی شناخت کی اہلیت ہے تو شاید وہ سن سکتا ہے کہ وہ غیر معمولی احساس کے ساتھ گا رہی ہے جو کہ بہتر بات ہے۔ اور آخر میں وہ معمول کی نسبت کم تھکی ہوئی لگتی ہے۔ پر اعتماد انداز میں چلتی ہوئی کہ اگر اس کی خوب صورت چال کے لیے یہ ترکیب استعمال کی جا سکے تو وہ چلتی ہے، اپنے چاہنے والوں کی مدد لینے سے انکار کرتی ہوئی، اور مجمع کو سرد نگاہوں سے تکتی ہوئی جو احترام کے ساتھ اسے گزرنے کا راستہ دیتا ہے۔

ایسا ایک دو روز پہلے ہوا لیکن حالیہ ترین واقعہ یہ ہے کہ وہ منظر سے غائب ہو گئی ہے، عین اس وقت جب اسے گانے کے لیے سٹیج پر آنا تھا۔ نہ صرف اس کے حامی اس کو تلاش کر رہے ہیں بلکہ بہت سوں نے

خود کو اس کام کے لیے وقف کر لیا ہے۔ لیکن سب بے سود ہے۔ جوزیفائن غائب ہو چکی ہے۔ وہ اب نہیں گائے گی۔ نہ وہ مزید گانے کے لیے کسی جھانسے میں آئے گی۔ اس بار وہ ہمیں مکمل طور پر چھوڑ گئی ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے اندازوں میں چاہے کتنی ہی شدید غلط فہمی کا شکار ہو، ایک عیار عورت، وہ اتنی کج فہم ہے کہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے سرے سے کوئی اندازے لگائے ہی نہیں بلکہ صرف اپنی منزل کی طرف بہتی چلی گئی جو ہماری دنیا میں افسوس ناک انجام کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس نے اپنے مطابق گلوکاری سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اپنے ہی مطابق وہ اس اختیار کو کھو چکی ہے جو اس نے لوگوں کے دلوں پر حاصل کیا تھا۔ کیسے وہ اس اختیار کو برقرار رکھ سکتی تھی کہ ہمارے دلوں کے بارے میں وہ جانتی ہی کیا ہے۔ وہ خود کو چھپائے رکھتی ہے اور بالکل نہیں گاتی۔ لیکن ہم لوگ خاموشی سے کسی واضح مایوسی کے بغیر، مثالی توازن کا حامل خود اعتماد مجمع جو بہت منظم ہے کہ ظاہری حالتیں گمراہ کن ہوتی ہیں۔ کہ وہ لوگوں کو جو ہر عطا کرتے ہیں اور بدلے میں ان سے کچھ نہیں لیتے۔ حتیٰ کے جوزیفائن سے بھی نہیں، اور اپنے حساب سے زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں۔

جوزیفائن کا زوال ہونا ہی چاہئے تھا۔ جلد ہی وہ وقت آئے گا جب اس کے آخری سُر بلند ہوں گے اور خاموشی کی نذر ہو جائیں گے۔ وہ ہم لوگوں کی ازلی تاریخ کا ایک بہت مختصر حصہ ہے اور لوگ اس کے جانے کے نقصان کی تلافی کر لیں گے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ ہمارے لیے آسان ہو گا۔ کیسے ہمارے اجتماعات خاموشی میں رونما ہو سکتے ہیں؟ پھر بھی کیا وہ تب بھی خاموش نہیں ہوتے تھے جب جوزیفائن موجود تھی؟ کیا اس کی گنگناہٹ اس سے کہیں زیادہ بلند اور زیادہ زندہ ہو گی جتنی اس کی یاد؟ کیا یہ اس کی زندگی میں بھی محض ایک یاد سے بڑھ کر کچھ تھی؟ کیا ایسا نہیں تھا کہ جوزیفائن کی گنگناہٹ پہلے ہی اس انداز سے ختم ہو رہی تھی، کہ ہم لوگوں نے اپنی دانش مندی سے اسے اتنا زیادہ رتبہ دیا؟

اس لیے غالباً ہم اسے بہت زیادہ یاد نہیں کریں گے اور اب جب کہ جوزیفائن ان تمام زمینی آلام سے نجات حاصل کر چکی ہے جو اس کے خیال میں سبھی منتخب شدہ افراد کا مقدر ہوتے ہیں، وہ بخوشی خود کو ہمارے ہیروؤں کی ان گنت بھیڑ میں گم کر دے گی اور جلد ہی کہ ہم مورخین نہیں ہیں، نجات کی رفعتوں کو چھو لے گی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح فراموش کر دی جائے گی۔

فاقہ کش فن کار

گزشتہ دہائیوں میں پیشہ وارانہ فاقہ کشی میں لوگوں کی دلچسپی غیر معمولی تیزی سے اختتام پذیر ہوئی۔ کبھی ایسے فاقہ کش فنکار کو اپنے فن کے اپنے طور پر کیے گئے عظیم مظاہروں سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ لیکن آج ایسا بالکل ممکن نہیں ہے۔ ہم ایک مختلف دنیا میں رہ رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جب فاقہ کش فن کار سارے قصبے کی دلچسپی کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ اس کی فاقہ کشی کا ہر اگلا دن ان کی آتش شوق کو ہوا دیتا۔ ہر کسی کی اسے دن میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور دیکھنے کی خواہش ہوتی تھی۔ ایسے شوقین مزاج لوگ ہوتے تھے جو مظاہرے کے آخری دنوں کے لیے رعایتی ٹکٹ خرید لیتے تھے اور صبح سے رات تک اس کے سلاخ دار چھوٹے پنجرے کے سامنے بیٹھے رہتے۔ حتیٰ کہ رات کو بھی لوگ اس مظاہرے کو

دیکھنے آتے جب اس کے تاثر کو ٹارچ کی روشنی سے گہرا کیا جاتا۔ خوش گوار دنوں میں پنجرے کو اٹھا کر باہر کھلی فضا میں رکھ دیا جاتا اور تب بچوں کے لیے فاقہ کش فنکار کو دیکھنا خاص بات ہوتی تھی۔ ان کے بڑوں کے لیے یہ سب روایت کے مطابق ہونے والے ایک بھونڈے مذاق سے بڑھ کر کچھ نہ تھا لیکن بچے حیرت سے کھلے ہوئے منہ کے ساتھ، حفاظت کے لیے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھامے تحسین کے انداز میں اسے دیکھتے جو سیاہ لباس میں ملبوس، نمایاں طور پر باہر کو نکلی ہوئی پسلیوں کے ساتھ کسی گدے پر نہیں بلکہ زمین پر بچھے تنکوں کے درمیان بیٹھا ہوتا۔ کبھی خوش اخلاقی سے سر ہلاتا، محدود مسکراہٹ کے ساتھ تماشائیوں کے سوالوں کے جواب دیتا۔ یا غالباً سلاخوں میں سے بازو باہر پھیلاتا تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ وہ کتنا نحیف تھا لیکن پھر گہری سوچوں میں غرق ہو جاتا، کسی بات یا تماشائی پر توجہ نہ دیتا، حتیٰ کہ کلاک کے گھنٹے اہم آواز پر بھی نہیں، جو اس کے پنجرے کا واحد فرنیچر تھا۔ بس اپنی نیم واہ آنکھوں سے خلا میں گھورتا اور پھر ہونٹوں کو تر کرنے کے لیے ایک چھوٹے گلاس سے پانی کا گھونٹ بھر لیتا۔

عام تماشائیوں کے ساتھ ساتھ وہاں عوام کے منتخب مستقل تماشائی بھی ہوتے جو حیران کن انداز میں عام طور پر قصائیوں پر مشتمل ہوتے اور ہر وقت ان میں سے تین قصاب وہاں، رات دن مسلسل فنکار کی نگرانی کرتے کہیں وہ خفیہ طور پر کچھ کھا پی نہ لے۔ یہ محض ایک تکلف ہی ہوتا جسے متعارف کرانے کا مقصد عوام کو یقین دلانے کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔ کیوں کہ یہ اہتمام کرنے والے جانتے تھے کہ فنکار فاقہ کشی کے دوران کسی بھی حالت میں کسی بھی مجبوری کے تحت خوراک کا ایک چھوٹا نوالہ بھی نہیں لے گا۔ یہ بات اس کے پیشے کے تقدس کے خلاف تھی۔ لیکن نگرانوں میں سے ہر کوئی اس بات کو سمجھنے کے اہل نہیں ہوتا تھا۔ اکثر رات کے لیے نگرانوں کا ایک گروہ ایسا ہوتا جو اپنے فرائض سے عموماً غفلت برتتا۔ وہ جان بوجھ کر دور کسی گوشے میں بیٹھ کر دل جمعی سے تاش کھیلتے اور فنکار کو موقع دیتے کہ وہ کچھ شے کھا پی لے، جو ان کے خیال میں اس نے کسی خفیہ خانے میں چھپا کر رکھی ہوگی۔ ایسے نگرانوں سے بڑھ کر فنکار کے لیے شاید ہی کوئی دوسری بات اذیت دہ ہو۔ وہ اسے مایوسی کا شکار کرتے۔ اس کے لیے فاقہ کشی کو ناقابل برداشت بنا دیتے۔

بعض اوقات وہ ان کی نگرانی کے دوران گنگنا کر اپنی کمزوری پر قابو پانے کی کوشش کرتا یعنی جب

تک کہ اس کے لیے ممکن ہوتا، تا کہ انھیں یہ احساس دلا سکے کہ اس کے بارے میں ان کے شکوک کتنے بے بنیاد تھے۔لیکن اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوتا۔ وہ اس کی اس اہلیت پر حیران ہوتے کہ کیسے ہوشیاری سے وہ گنگناتے ہوئے کچھ نہ کچھ کھالیتا ہے۔

البتہ ایسے تماشائی اس کی پسند کے ہوتے جو پنجرے کی سلاخوں سے لگ کر بیٹھتے۔ وہ کمرے میں پھیلی مدھم روشنی پر اکتفانہ کرتے بلکہ جیبی ٹارچوں سے، جو نمائش کے منتظم سے انھیں ملتی تھیں، اس پر روشنی ڈال ڈال کر دیکھتے۔ یہ تیز روشنی اسے بالکل پریشان نہیں کرتی تھی۔ عام طور پر وہ مناسب نیند نہیں لے پاتا تھا۔ وہ ہمیشہ کسی بھی طرح کی روشنی میں، کسی بھی وقت، حتیٰ کہ ہال میں بھرے پرشور تماشائیوں کی موجودگی میں بھی کچھ اونگھ لیتا تھا۔ وہ ان سے ہنسی مذاق کرنے، اپنی خانہ بدوش زندگی کے واقعات سنانے پر آمادہ رہتا جو انھیں جاگتے رہنے میں مددگار ہوتے اور ان پر ایک بار پھر ثابت کرتا کہ اس کے پنجرے میں کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے اور یہ کہ جیسی فاقہ کشی وہ کر رہا ہے، ایسی ان میں سے کسی اور کے لیے ممکن نہیں۔

تاہم اس کے لیے خوشگوار ترین لمحہ وہ ہوتا جب صبح ہونے پر وہ اپنے پیسوں سے انھیں ناشتہ منگوا کر دیتا جس پر وہ تھکا دینے والی شب بیداری کے بعد ایک صحت مند انسان کی شدید بھوک کے ساتھ ٹوٹ پڑتے۔ یہ سچ ہے کہ چند وہمی لوگ یوں سوچتے کہ یہ ناشتہ دراصل فنکار کی نگرانوں کو رشوت دینے کی ایک بھونڈی کوشش تھی۔لیکن یہ بات حقیقت کے بالکل برعکس تھی۔ جب انھیں ناشتے کے بغیر محض اس مقصد کے لیے شب بیداری کی دعوت دی جاتی تو وہ فوراً اپنی مصروفیات کا دکھڑا رونے لگتے۔لیکن اپنے شکوک پر ہٹ دھرمی سے قائم رکھتے۔

ایسے شکوک وشبہات کا فاقہ کشی کے پیشے سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کسی کے لیے نمائشی پیشہ ور فاقہ کش پر دن رات مستقل طور پر نگاہ رکھنا ممکن نہیں ہے اور اسی لیے کوئی شخص اس بات کا کوئی حتمی ثبوت پیش نہیں کرسکتا کہ فاقہ کشی بالکل حقیقی اور مسلسل رہی۔ صرف فنکار ہی اس حقیقت سے باخبر ہوتا ہے کہ وہی لازمی طور پر اپنی فاقہ کشی کا مکمل تسلی بخش واحد تماشائی ہے۔لیکن کئی وجوہات کی بنا پر وہ کبھی مطمئن نہ ہو پاتا۔شاید یہ صرف فاقہ کشی ہی نہیں تھی جس نے اسے اتنا لاغر بنا دیا تھا کہ بہت سے لوگ اس کے مظاہرے کو دیکھنے سے گریز کرتے کیوں کہ وہ اسے اس حالت میں دیکھنا گوارہ نہ کر پاتے۔شاید یہ اس کا

اپنے آپ پر عدم اطمینان تھا کہ جس نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ کیوں کہ صرف وہی یہ بات جانتا تھا جس سے کوئی دوسرا آگاہ نہیں تھا کہ فاقہ کشی کس قدر آسان کام تھا۔ یہ دنیا کا سہل ترین مشغلہ تھا۔ اس حوالے سے اس نے کچھ چھپایا نہیں لیکن لوگ اس کا یقین نہیں کرتے تھے۔ اپنے طور پر سب سے بہتر تو وہ یہ سوچتے کہ وہ انکساری سے کام لے رہا تھا۔ زیادہ تر کا خیال یہ تھا کہ وہ شہرت کا بھوکا تھا یا نرا دھوکے باز تھا جسے فاقہ کشی آسان لگی کیوں کہ اس نے فاقہ کشی کو آسان بنانے کا گر سیکھ لیا تھا لیکن جس میں اتنی جرات تھی کہ وہ اس بات کا کم وبیش اعتراف کرلے۔ وہ ان باتوں کو خاموشی سے سنتا اور اتنے برسوں میں وہ ان سب کا عادی ہو گیا تھا۔ لیکن داخلی بے چینی اسے ہر وقت اندر ہی اندر سے کھاتی۔ کبھی فاقہ کشی کے کسی دور کے بعد ایسا نہیں ہوا تھا، اور یہ بات واقعی قابل تحسین بھی تھی کہ وہ کبھی اپنی مرضی سے پنجرے سے باہر نہیں آیا۔ فاقہ کشی کی طویل ترین مدت منتظم نے چالیس روز طے کر رکھی تھی۔ اس حد سے زیادہ فاقہ کشی کی اسے اجازت نہیں تھی، بڑے شہروں میں بھی نہیں۔ اور اس کی خاص وجوہات تھیں۔

تجربے سے ثابت ہوا تھا کہ مسلسل اشتہار بازی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے نتیجے میں چالیس روز تک شہر کے عوام کی دلچسپی مظاہرے میں برقرار رکھی جا سکتی تھی۔ لیکن اس کے بعد ان کی دلچسپی کم ہونے لگتی۔ فنکار سے ان کی ہمدردی میں بھی فرق آجاتا۔ اس حوالے سے مختلف قصبوں اور شہروں میں معمولی مقامی فرق بھی تھا لیکن ایک عمومی اصول کے طور پر چالیس دن کے وقفے کو ہی آخری حد مان لیا گیا تھا۔

چالیسویں روز پھولوں سے ڈھکے ہوئے پنجرے کا دروازہ کھولا۔ پُر جوش تماشائیوں سے ہال کھچا کھچ بھر جاتا۔ فوجی بینڈ بجایا جاتا۔ دو ڈاکٹر فنکار پر فاقہ کشی کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے پنجرے میں جاتے۔ طبی معائنے کے نتائج کا اعلان میگا فون کے ذریعے کیا جاتا۔ آخر دو نوخیز دوشیزائیں نمودار ہوتیں، اپنے اس اعزاز پر مسرور کہ انھیں فنکار کو سہارا دے کر مختصر سیڑھیوں تک لانے کے لیے منتخب کیا گیا جو ایک چھوٹے میز تک جاتی تھیں جس پر مختلف انواع کے لذیز کھانے احتیاط سے چنے جاتے۔ اس موقع پر فنکار ہمیشہ عجب اکھڑپن کا مظاہرہ کرتا۔ یہ سچ ہے کہ اپنے اوپر جھکی ہوئی دوشیزاؤں کے پھیلے ہوئے مددگار ہاتھوں میں اپنے ڈھانچہ نما بازو تھما دیتا تھا۔ لیکن کھڑے ہونے پر آمادہ نہ ہوتا۔

کیوں وہ چالیس دن گزر جانے کے بعد فاقہ کشی ختم کردے؟ اب جب کہ وہ زیادہ عرصے کے لیے ،حتیٰ کہ لامحدود وقت کے لیے فاقہ کشی کے قابل ہوا تھا تو کیوں وہ اسے روک دے جب کہ وہ فاقہ کشی کے

لیے بہترین صورت میں تھا یا پھر ابھی فاقہ کشی کی بہتر حالت میں نہیں آیا تھا تو اسے کیوں ایسی شہرت سے محروم کیا جا رہا تھا جو اسے طویل ترین فاقہ کشی سے حاصل ہو سکتی تھی، نہ صرف دنیا کا عظیم ترین فاقہ کش بننے کی شہرت جو شاید وہ پہلے سے ہی تھا بلکہ انسانی سوچ سے ماورا مظاہرہ کر کے فاقہ کشی کے اپنے ہی ریکارڈ توڑنے کی شہرت بھی۔ کیوں کہ اسے محسوس ہوتا تھا کہ فاقہ کشی کرنے کی اس کی اہلیت کسی بھی حد تک ورا تھی۔ یہ مجمع جو اس کا بہت معترف ہونے کا ڈھونگ رچائے ہوئے تھا، اس کے لیے اتنے بھی صبر کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا؟ اگر وہ زیادہ دیر کے لیے فاقہ کشی کر سکتا تھا، تو وہ اسے کیوں برداشت نہیں کر پا سکتے تھے؟

علاوہ ازیں وہ تھک چکا تھا، تنکوں پر بیٹھنے میں اسے تسکین ملتی تھی۔ لیکن اس سے اصرار کیا جاتا کہ وہ اپنے پورے قد پر کھڑا ہو اور نیچے جا کر کچھ کھائے جس کے خیال ہی سے اسے متلی ہونے لگتی تھی۔ صرف خواتین کی موجودگی اسے اپنے احساسات کے واضح اظہار سے باز رکھتی اور وہ پھر بہت کوشش کے بعد۔ وہ دوشیزاؤں کی آنکھوں میں جھانکتا جو بظاہر بہت دوستانہ لیکن درحقیقت نہایت سفاک ہوتیں اور اپنا سر ہلاتا جو اس کی بے طاقت گردن پر بھاری بوجھ کی صورت ہوتا۔ لیکن پھر وہی کچھ ہوتا جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہوتا تھا۔

نمائش کا منتظم آگے بڑھتا اور کوئی لفظ کہے بغیر، کہ موسیقی کا شور کسی قسم کی گفتگو کو خارج از امکان بنا دیتا تھا، اپنے بازوؤں کو فن کار کے اوپر فضا میں بلند کرتا جیسے خدا سے نیچے تنکوں پر بیٹھی اس کمزور مخلوق، اس بدقسمت شہید کی طرف نگاہ کرنے کی التجا کر رہا ہو جو کہ وہ فن کار تھا بھی، گو کسی اور حوالے سے۔ پھر اس کی مریل کمر میں اپنا بازو حمایل کر کے غیر معمولی احتیاط سے اسے یوں اوپر اٹھاتا کہ لوگوں کو فن کار کے نحیف جسم کا ادراک ہو سکے۔ لیکن اسے خوف سے زرد دوشیزاؤں کے زیر نگرانی دیتے ہوئے چوری چھپے اسے جھٹکا بھی دیتا جس سے فن کار کی ٹانگیں اور اوپر کا حصہ آگے پیچھے جھولتا۔ فن کار مکمل طور پر دوسروں کے رحم و کرم پر ہوتا۔ اس کا سر چھاتی پر ٹکا ہوتا جیسے اتفاق سے وہاں آ گرا ہو۔ جسم پیچھے گرا ہوتا۔ اور ٹانگیں خود کو بچانے کی کوشش میں گھٹنوں سے ایک دوسرے سے چمٹی ہوئیں اور برابر زمین سے رگڑ کھاتی ہوئیں جیسے کسی فرش پر نہ ہوں بلکہ ٹھوس زمین کی تلاش میں ہوں جب کہ اس کے جسم کا بوجھ، جب کہ یہ بوجھ ہی کتنا تھا، دونوں خواتین میں سے کسی ایک کے بازوؤں پر تکیہ کیے ہوئے تھا جو اپنے اردگرد ملتجی نگاہوں سے دیکھ اور ہانپ رہی ہوتی تھی کہ یہ وہ اعزاز نہیں تھا جس کا وہ تصور کر رہی تھی۔ وہ پہلے اپنی گردن کو ممکنہ حد تک

پرے ہٹانے کی کوشش کرتی تا کہ اسے فن کار سے چھوجانے سے بچا سکے۔ لیکن یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ایسا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی اس کی خوش قسمت ساتھی اس کی مدد کے لیے آگے بڑھتی تھی بلکہ آگے کھڑی فن کار کا ایک ہاتھ یعنی ہڈیوں کی پوٹلی کو پکڑنے پر ہی اکتفا کیے ہوئے تھی، وہ تماشائیوں میں جوش وخروش پیدا کرتے ہوئے زاروقطار رودی اور تب ایک معاون نے اس سے بوجھ لے لیا جو دیر سے وہیں تیار کھڑا تھا۔ پھر خوراک لائی جاتی جس میں سے کچھ خوراک منتظم کسی طور کچھ فنکار کے منہ میں گھسیڑتا جو نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اونگھ رہا ہوتا۔ ساتھ ہی چرب زبانی جاری رکھتا جس کا مقصد عوام کی توجہ کو فنکار کی صورت حال سے ہٹائے رکھنا تھا۔ بعد ازاں لوگوں کے لیے جام پیا جاتا جو منتظم کے کان میں فن کار کی سرگوشی کے بعد ہوتا ہے۔ فوجی بینڈ اپنی موسیقی سے اس کی تصدیق کرتا ہے۔ پھر مجمع چھٹ جاتا۔ کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا جو وہاں سے غیر مطمئن لوٹا ہو، کوئی بھی نہیں سوائے بھوکے فن کار کے، جو ہمیشہ اکیلا ہی ہوتا ہے۔

وہ بہت برسوں تک اسی انداز میں زندہ رہا، چھوٹے چھوٹے وقفوں سے سامنے آتے ہوئے، غیر محسوس شہرت اور دنیا بھر میں تعظیم کے ساتھ، لیکن اس سب کے باوجود اس کی روحانی اذیت برقرار ہی اور زیادہ اذیت اس باعث رہی کہ کوئی اس کی اذیت کو سنجیدگی سے لینے پر آمادہ نہیں تھا۔ آخر اسے کس آسائش کی ضرورت تھی؟ اس سے بڑھ کر وہ اور کیا خواہش کر سکتا تھا؟ اور اگر کوئی نیک فطرت شخص اس کے لیے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اسے تسلی دیتے ہوئے کہتا کہ اس کا حزن و یاس فاقہ کشی کی بدولت ہے تو ایسا ممکن تھا خاص طور پر اس وقت جب اسے فاقہ کشی کرتے ہوئے کچھ وقت ہو چکا ہو کہ غصے سے پھٹ پڑے اور خوف و ہراس پیدا کرتے ہوئے اپنے پنجرے کی سلاخوں کو جنگلی جانوروں کی طرح جھنجوڑنا شروع کر دے۔

منتظم کے پاس البتہ ایسی شورش کی سزا دینے کا ایک عمدہ حربہ موجود تھا جسے وہ بخوشی استعمال کرتا۔ وہ تماشائیوں سے فنکار کے رویے کی معافی مانگتا اس بنیاد پر کہ یہ ترش روی فاقہ کشی کے سبب تھی جسے شکم سیر لوگ آسانی سے نہیں سمجھ سکتے۔ تب وہ ایک فطری انداز میں گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے فنکار کی اس ناقابل فہم شیخی کا تذکرہ کرتا کہ وہ چالیس دن سے کہیں زیادہ عرصہ تک فاقہ کر سکتا تھا۔ وہ فنکار کے اعلیٰ جذبہ، نیک ارادے اور اس دعوے میں موجود نفی ذات کی عظیم خواہش کی توصیف کرتا لیکن پھر فن کار کی

ایسی تصویریں، جو عام فروخت کے لیے بھی موجود ہوتی تھیں، عوام کو دکھا کر فن کار کے دعوے کی تردید کرتا جس میں وہ اپنی فاقہ کشی کے چالیسویں روز نزاری سے نیم مردہ حالات میں لیٹا ہوا تھا۔ سچائی کو آلودہ کرنے کی یہ کوشش، جس سے اگر چہ فن کار کا پالا پڑتا، اس کے زخم پھر سے تازہ کر دیتی اور اس کی برداشت سے باہر ہو جاتی۔ جو کچھ کہ فاقہ کشی کے غیر پختہ اختتام کی وجہ سے ہوتا تھا، لوگ اسے اس کی وجہ قرار دیتے۔ اس کم فہمی کے خلاف، اس نافہمی کی تمام دنیا کے خلاف جنگ کرنا ممکن نہیں تھا۔ کبھی کبھار مصلحت اندیشی کے ساتھ وہ منتظم کو سننے کے لیے پنجرے کی سلاخوں سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ لیکن جونہی تصویریں سامنے لائی جاتیں، تو وہ یہ سب کچھ ہونے دیتا اور سرد آہ بھر کر اپنے تنکوں کے بستر میں غرق ہو جاتا اور اس بات کو یقینی ہونے دیتا کہ عوام ایک بار پھر اس کے قریب آئے اور اسے دیکھے۔

چند برسوں کے بعد ایسے مناظر کا مشاہدہ کرنے والے جب انھیں یادداشت میں تازہ کرتے تو خود بھی انھیں سمجھنے سے قاصر رہتے۔ کیوں کہ اس دوران اوپر بیان کی گئی عوامی رویے کی تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ بس پلک جھپکتے ہی ہوا۔ اس کی اہم وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن کسی کو کیا پڑی تھی کہ ان پر مغز ماری کرے۔ بہر کیف اچانک ایک خوش گوار دن فاقہ کش فن کار نے خود کو تفریح کے متلاشیوں سے محروم پایا جن کی دلچسپی اب دوسری زیادہ قابل ترجیح اشیاء کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔ آخری مرتبہ منتظم نے اس کے ساتھ آدھے سے زیادہ یورپ کا تیز رفتار دورہ کیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ شاید کہیں اس فن میں پرانی دلچسپی باقی بچی ہو۔ لیکن اسے شدید مایوسی ہوئی ہر جگہ لوگوں نے گویا ایک مشترکہ خفیہ معاہدے کے تحت پیشہ وارانہ فاقہ کشی سے تنفر اور بیزاری کا اظہار کیا۔

ظاہر ہے یہ تبدیلی یک لخت رونما نہیں ہوئی ہو گی اور بہت سی پیش بینی کی حائل نشانیاں جنھیں اس فن کے عروج کی گہما گہمی میں درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا یا دبا دیا گیا، اب بالترتیب ذہن میں وارد ہوئیں، لیکن اب ان کے سدباب کا وقت گزر چکا تھا۔ بے شک مستقبل میں نمائشی فاقہ کشی پھر سے رواج پالے گی۔ لیکن یہ بات ان کے لیے تشفی کا کوئی پہلو نہیں رکھتی جو لمحہ موجود میں زندہ ہیں۔ تو پھر فاقہ کش فنکار کیا کرے؟ عروج کے دور میں لاکھوں افراد کے مجمع سے وہ داد و تحسین حاصل کرتا تھا اور دیہاتی میلوں ٹھیلوں میں گلیوں میں آ کر مظاہرے کرنا یا پھر کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنا اس کے لیے دشوار تھا کیوں کہ وہ نہ صرف بوڑھا تھا بلکہ فاقہ کشی کے لیے خود کو وقف کر چکا تھا۔ چناں چہ اس نے اپنے لابدل زمانہ عروج کے

شریک کار منتظم کو الوداع کہا اور وہ خود ایک بڑی سرکس میں ملازم ہو گیا۔ اپنے جذبات سے فرار حاصل کرنے کے لیے اس نے معاہدے کی شقیں پڑھنے سے بھی احتراز کیا۔

ایک ایسی بڑی سرکس نئے بھرتی ہونے والے اور تبدیل ہونے والے افراد، جانوروں اور ساز و سامان کی بہتات کے ساتھ ہمیشہ کسی بھی وقت کسی شے کو استعمال کرنے کی اہلیت رکھتی ہے حتی کہ فاقہ کش فن کار کو بھی، بشرطیکہ وہ کڑی شرائط پیش نہ کرے۔ جب کہ خاص طور پر اس معاملے میں نہ صرف فنکار کو لیا گیا تھا بلکہ اس کی شہرت اور عظمت کو بھی۔ تاہم اس کے فن کی عجیب ہیئت کے پیش نظر جو اس کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ گھٹی نہیں تھی، کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ خستہ حال فنکار اپنا عروج گزار چکا تھا، اب مزید اپنی پیشہ وارانہ مہارت میں یکتا نہیں رہا تھا، ایک سرکس کے خاموش کونے میں جائے پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے برعکس اس نے دعوی کیا کہ وہ پرانے زمانے کی طرح اب بھی طویل فاقہ کشی کر سکتا تھا جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس نے تو یہ دعوی بھی کیا تھا کہ اگر اسے اس کی حسب خواہش مدت تک فاقہ کشی کی اجازت دی جائے کہ اس بات کی اسے بلا توقف فوراً ہی اجازت مل بھی گئی، تو وہ فاقہ کشی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر کے دنیا کو ششدر کر سکتا تھا۔ ایک دعوی جس نے دوسرے پیشہ وروں کے چہروں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھیری، کیوں کہ یہاں عوامی رویے میں تبدیلی کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا جسے بھوکے فن کار نے اپنے جوش و خروش میں فراموش کر دیا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ فن کار کو اصل صورت حال کا اندازہ نہیں تھا۔ یہ بات اس نے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لی تھی کہ اسے اور اس کے پنجرے کو دلچسپی کی مرکزی جگہ یعنی پنڈال کے وسط میں نہیں، بلکہ باہر جانوروں کے پنجروں کے قریب ایسی جگہ رکھا جائے گا جہاں تک سبھی پہنچ سکیں۔ بڑے اور رنگدار اشتہاروں نے اس پنجرے کا ڈھانچہ تشکیل دیا اور ان میں اسی بارے میں اعلان موجود تھا جو پنجرے کے اندر موجود تھا۔ جب اندر سٹیج پر ہونے والے مظاہرے کے وقفے کے دوران تماشائیوں کا ہجوم جانوروں کو دیکھنے آتا تو فاقہ کش کے پنجرے کے قریب سے گزرنے اور اس کے قریب رکنے سے خود کو روک نہ پاتے۔ اور شاید وہ کچھ دیر مزید وہاں رکتے اگر اس تنگ راستے میں پیچھے سے آنے والوں، جن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جانوروں کو دیکھنے کی مسرت کی راہ میں وہ کیوں تاخیر کریں، کی دھکم پیل انھیں آگے بڑھنے پر مجبور نہ کرتی۔ اس سے ہر کسی کے لیے ناممکن ہو جاتا تھا کہ وہ کچھ دیر اپنے پیروں پر ٹک کر اس کا مشاہدہ

کرے۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ نمائشی فاقہ کش جو کبھی بے چینی سے ان وقفوں اور تماشائیوں کے ہجوم کا اپنی زندگی کی اہم کامیابی کے طور پر انتظار کرتا تھا، اب ان سے جھینپنے لگا تھا۔ شروع میں اس کے لیے وقفے کا انتظار بہت کٹھن ہوتا تھا۔ اپنے گرد جمع ہونے والے ہجوم کو دیکھنا نہایت خوش کن ہوتا۔ لیکن جلد ہی اس کی شدید خودفریبی بھی جو تقریباً شعوری طور پر اس سے جڑی ہوئی تھی، اس ننگی حقیقت کو اس سے پوشیدہ نہ رکھ پائی کہ ان لوگوں کی اکثریت، جیسا ان کی حرکات سے مترشح تھا، بار بار کسی استثناء کے بغیر فقط جانوروں کو دیکھنے آتی تھی۔ یوں دور سے ان کی اولین جھلک ہی سب سے بہتر منظر تھی۔ کیوں کہ جونہی وہ اس کے پنجرے کے قریب پہنچتے، وہ ان کے شوروغوغا اور لعن طعن سے جو دو طرح کے ہجوم سے بلند ہوتا تھا، جو خود کو مسلسل نئے سرے سے متشکل کرتا رہتا۔ یعنی ایک تو ایسے لوگ جو رکنا اور فاقہ کش فن کار کو دیکھنا چاہتے تھے اور جنھیں فن کار جلد ہی دوسرے گروہ کی نسبت زیادہ ناپسند کرنے لگا تھا، کہ وہ کسی طرح کی حقیقی دلچسپی کے ساتھ نہیں بلکہ ایک طرح کی ہٹیلی خوداعتمادی کے ساتھ۔ جب کہ دوسری طرح کے ایسے تماشائی تھے جو سیدھے جانوروں تک پہنچنے کے خواہاں ہوتے تھے۔ جب پہلا بڑا ہجوم گزر جاتا، تو بعد میں آنے والے وہاں پہنچتے اور اگرچہ ان کے لیے وہاں اپنی مرضی سے دیر تک کھڑے رہنے میں کوئی بھی شے مانع نہیں تھی، وہ ایک نگاہ اپنے اردگرد دوڑائے بغیر جانوروں کے پنجروں تک بروقت پہنچنے کی عجلت میں لمبے ڈگ بھرتے آگے گزر جاتے۔ یہ تو کبھی کبھار ہی ہوتا، خوش قسمتی سے ہی کہ جب کوئی باپ اپنے بچوں کے ساتھ آتا، فاقہ کش فنکار کی طرف انگلی سے اشارہ کرتا اور بچوں کو تفصیل سے بتاتا کہ یہاں کیا ہو رہا تھا اور گزرے ہوئے سالوں کے قصے سناتا جب خود اس نے ایسے ہی لیکن کہیں زیادہ شان دار مظاہروں کا دیکھا ہوتا۔ جب کہ بچے شاید بات کو نہ سمجھ پاتے ہوئے، کہ نہ سکول میں اور نہ سکول سے باہر کی زندگی میں ہی وہ ان اسباق کے لیے پوری طرح تیار ہوئے ہوتے تھے، تو انھیں بھلا فاقہ کشی کی اہمیت کا کیا اندازہ ہو پاتا۔ لیکن ان کی پرشوق آنکھوں کی چمک بتاتی کہ نئے اور اچھے زمانے آنے والے تھے۔

شاید فنکار نے کتنی ہی بار یہ بات خود سے کہی ہوگی کہ صورت حال ضرور کچھ بہتر ہوتی اگر اس کا پنجرہ چڑیا گھر سے اس قدر قریب نہ ہوتا۔ اس صورت میں لوگوں کو انتخاب میں زیادہ سہولت مل جاتی۔ اس مسلسل بے چینی اور مایوسی کا تو ذکر ہی کیا جو چڑیا گھر سے اٹھنے والی سرانڈ، رات کو جانوروں کے اضطرابی شور، گوشت

خوردرندوں کے لیے اس کے پنجرے کے آگے سے لے جائے جانے والے گوشت کے بڑے ٹکڑوں کے کریہہ منظر اور کھانے کے اوقات میں جانوروں کی کان پھاڑ دینے والی چنگھاڑوں سے اس میں پیدا ہوتی تھی۔لیکن اس میں انتظامیہ سے درخواست کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ کچھ بھی ہو، اسے اس بات کے لیے تو جانوروں کا مرہون منت ہونا چاہئے تھا کہ ان کے باعث لوگوں کے جتھے اس کے پنجرے کے آگے سے گزرتے تھے جن میں ہمیشہ ایک شخص ایسا بھی ہوتا جو اس میں دلچسپی ظاہر کرتا اور جو بتا سکتا تھا کہ منتظمین اسے کہاں گوشہ تنہائی میں لے جا کر پھینکیں گے اگر فن کار ان کی توجہ اپنی اور اس حقیقت کی جانب مبذول کرانے کی کوشش کرے کہ ذرا تلخ ہی سہی مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ اصل میں جانوروں کے پنجروں تک جانے والے راستے میں بس ایک رکاوٹ ہی تھا۔

بے شک ایک مختصر رکاوٹ، جو آہستگی سے کم ہوتی جا رہی تھی۔لوگ اس عجیب خیال کے عادی ہو چلے تھے کہ اس دور میں ان سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ایک فاقہ کش فن کار میں دلچسپی لیں گے اور اس عادی ہو جانے سے صورت حال اس کے خلاف ہی ہوئی تھی۔وہ حسب منشا طویل فاقہ کشی کر سکتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔لیکن اب کوئی بات اسے بچا نہیں سکتی تھی، لوگ بے اعتنائی سے اس کے قریب سے گزر جاتے۔کس سے فاقہ کشی کے فن کی وضاحت کرنے کی کوشش کی جائے؟ جو اس کی قدر ہی نہیں کرتا، وہ اسے کیا خاک سمجھے گا۔عمدہ اشتہارات میلے اور ناقابل فہم ہو گئے۔وہ پھٹ گئے۔وہ چھوٹا نوٹس بورڈ جہاں اس کی فاقہ کشی کے ایام کی تعداد لکھی جاتی تھی اور جس پر ابتداء میں ہر اگلے روز احتیاط سے ایام کی تعداد میں اضافہ کیا جاتا تھا، اب عرصہ سے ایک ہی نمبر کو ظاہر کر رہا تھا۔کیوں کہ پہلے چند ہفتوں کے بعد سے نوٹس بورڈ کی نگرانی کرنے والے عملہ کے لیے بھی اس معمولی کام میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔یوں وہ مسلسل فاقہ کشی کرتا چلا گیا جس کا اس نے کبھی خواب دیکھا تھا اور کوئی دشواری اسے اس کام میں نہیں ہوئی، جیسا کہ اس نے ہمیشہ پیشین گوئی کی تھی۔لیکن اب دنوں کو شمار کرنے والا کوئی نہیں تھا۔کوئی بھی نہیں، حتیٰ کہ خود اس کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ اب تک اپنے کس کس ریکارڈ کو توڑ چکا تھا۔بس آہستہ آہستہ اس کا دل بھاری ہو رہا تھا۔اور جب کچھ دیر بعد کوئی راہ گیر بے دھیانی میں وہاں رکتا، فرش پر پڑے بوڑھے جسم کو سلام کرتا، اور اس فریب کاری کی بات کرتا جو اپنے طور پر احمقانہ ترین جھوٹ تھا جو بے اعتنائی اور خلقی نفرت کے تحت پیدا ہوا تھا کیوں کہ یہ فاقہ کش فن کار نہیں تھا جو دھوکہ دے رہا تھا۔وہ تو ایمان داری کے ساتھ اپنا کام کر رہا تھ، بلکہ دنیا اس کے فن کے اعتراف میں بخل سے

کام لے رہی تھی۔

یوں بہت سے دن گزر گئے اور آخر یہ معاملہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

ایک دن اچانک سرکس کے ایک نگران کی نظر فاقہ کش کے پنجرے پر پڑی اور اس نے معاونین سے پوچھا کہ ایک مکمل طور پر کارآمد پنجرے کو کیوں اندر پڑے میلے تنکوں کے انبار کے ساتھ بغیر کسی استعمال کے رکھا ہوا تھا۔ کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک شخص نے نوٹس بورڈ کو دیکھتے ہوئے فاقہ کش فن کار کو یاد کیا۔ انھوں نے چھڑیوں سے تنکوں کو کھنگالا۔ اندر فنکار پڑا ہوا تھا۔

''کیا تم اب بھی فاقہ کشی کر رہے ہو۔ آخر کب تک ایسا کرنے کا ارادہ ہے؟'' نگران نے پوچھا۔

''آپ سب مجھے معاف کر دیجیے'' فاقہ کش فن کار نے سرگوشی میں کہا جسے صرف نگران نے سنا کیوں کہ وہ سلاخوں سے کان لگائے کھڑا تھا۔

''بے شک'' نگران نے جواب دیا اور ایک انگلی پیشانی پر بجائی وہاں موجود عملے کو یہ دکھانے کے لیے کہ وہ کس کیفیت سے دوچار تھا۔

''ہم نے تمھیں معاف کیا''۔

''میری ہمیشہ خواہش رہی کہ تم میرے فن کا اعتراف کرو۔'' فنکار نے کہا۔

''ہم تمھارے فن کے معترف ہیں'' نگران برجستہ جواب دیا۔

''لیکن تمھیں میرے فن کے اعتراف کی ضرورت نہیں ہے۔'' فنکار نے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے ہم تمھاری تعریف نہیں کریں گے۔ لیکن ہم ایسا کیوں نہ کریں؟'' نگران نے حیرت سے کہا۔

''کیوں کہ مجھے فاقہ کشی کرنی ہی ہے، اور کوئی کام مجھ سے ہو بھی نہیں سکتا۔'' فنکار بولا۔

''ذرا اپنے آپ کو دیکھو۔ کیوں کوئی اور کام نہیں کر سکتے؟'' نگران نے تبصرہ کیا۔

''کیوں کہ'' فنکار نے یوں معمولی سا اپنا سر اوپر اٹھایا اور ہونٹ سکوڑتے ہوئے جیسے کسی شے کو چومنا چاہتا ہو، نگران کے کان کے قریب منہ لے کر کہا کہ کوئی ایک لفظ بھی اس کی سماعت میں آنے سے نہ رہ جائے، ''کیوں کہ مجھے کبھی میری پسند کی خوراک نہیں ملی۔ اگر مجھے وہ مل جائے، تو یقین جانو کبھی اپنے جسم کو اذیت نہ دوں اور تمھاری یا کسی بھی دوسرے شخص کی طرح جی بھر کر کھاؤں۔'' یہ اس کے آخری

الفاظ تھے۔ لیکن اس کی ماند پڑتی ہوئی آنکھوں میں پر افتخار تو نہیں بلکہ پُرعزم تحریک باقی رہی کہ وہ اب تک فاقہ کشی کر رہا تھا۔

"خیر۔۔۔۔۔۔۔اب اسے صاف کرو" نگران نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ انھوں نے فاقہ کش فن کار کو اس کے تنکوں کے ساتھ دفن کر دیا اور اس کے پنجرے میں ایک جواں سال چیتے کو رکھ لیا۔ ایک انتہائی بے حس شخص بھی پنجرے میں، جو اتنے لمبے عرصے تک خوف کی تصویر بنا رہا، ہر طرف پھلانگتی اس جنگلی مخلوق کو دیکھ کر لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ چیتا بہت مطمئن تھا۔ جو خوراک اسے پسند تھی، وہ اس کے متولی بلا تردد اس کے لیے لاتے۔ لگتا تھا اسے اپنی آزادی کھو دینے کا ذرا بھی رنج نہیں تھا۔ اس کا بہترین جسم ضرورت کی ہر شے سے آراستہ جیسے پھٹنے کے قریب ہو، اپنے گرد آزادی کا ہالہ بھی رکھتا تھا۔ جیسے یہ آزادی اس کے جبڑوں میں کہیں چھپی ہوئی ہو، اور زندہ ہونے کی مسرت ایسے پر جوش جذبے کے ساتھ اس کے گلے سے باہر بہتی کہ اسے دیکھنے والے تماشائیوں کے لیے اس جھٹکے کو سہارنا آسان نہ ہوتا۔ لیکن وہ خود پر قابو پاتے، پنجرے کے گرد ہجوم کر آتے اور جیسے وہاں سے کبھی نہ ہٹنے پر تلے ہوتے تھے۔

فکر کی اولین لکیریں

جھولوں پر کرتب دکھانے والے فن کارنے، کہ یہ فن جس کا مظاہرہ بڑے ورائٹی تھیٹروں کی محرابی گنبد والی چھتوں میں دکھایا جاتا ہے، ان مشکل ترین فنون میں سے ایک ہے جو انسان نے اب تک سیکھے، اپنی زندگی کو اس انداز میں ڈھالا کہ وہ جب تک وہ ایک ہی تھیٹر میں رہتا، دن اور رات کے کسی لمحے میں اپنے جھولوں سے نیچے نہ اترتا، پہلے پہل تو اپنے فن میں یکتا ہونے کی خاطر لیکن پھر اس لیے کہ یہ عادت اس کی فطرت ثانیہ بن گئی۔

اس کی تمام ضروریات، جو نہایت عاجزانہ تھیں، خدمت گاروں کے جتھے پوری کر دیتے جو نیچے سٹیج سے اسے دیکھتے اور خصوصی طور پر تیار کئے گئے کنٹینروں کو اوپر بھجوا کر اور نیچے کھینچ کر اس کی ضرورت کی ہر

شے اسے فراہم کرتے۔ اس طرز زندگی سے تھیٹر کی انتظامیہ کو کوئی خاص دشواری نہیں تھی سوائے اس کے کہ جب کبھی نیچے سٹیج پر کوئی دوسرا پروگرام منعقد ہوتا جسے تو وہ اوپر اکیلا ہی اپنے جھولوں پر بیٹھا رہتا اور اسے چھپایا نہیں جا سکتا تھا، تو وہ تماشائیوں کی توجہ منتشر کرنے کا باعث بنتا، اور اگرچہ وہ اس دوران ساکت بیٹھا رہتا لیکن تماشائیوں میں سے یہاں وہاں کوئی نظر اس پر پڑ ہی جاتی۔ لیکن انتظامیہ اس معاملے سے صرف نظر کرتی۔ کیوں کہ وہ ایک غیر معمولی اور انوکھا فنکار تھا۔ اور بلاشبہ وہ جانتی تھی کہ یہ مخصوص طرز بود و باش محض ایک مشغلہ نہیں تھا اور یہ کہ صرف اسی طور وہ خود کو ہمہ وقت اپنے فن کی ریاضت میں مشغول رکھتا اور اس کا فن اپنے کمال کی سطح کو چھوتا۔

علاوہ ازیں بلندی پر رہنا صحت کے لیے بھی بہتر تھا اور جب سال کے گرم موسم میں تھیٹر کے گنبد میں ہر طرف کی کھڑکیاں کھول دی جاتیں اور سورج کی روشنی اور تازہ ہوا اس نیم تاریک محراب میں بلا رکاوٹ داخل ہوتی تو فضا خوب صورت ہو جاتی۔ یہ سچ ہے کہ اس کی سماجی زندگی البتہ محدود تھی۔ صرف کبھی کبھار کوئی فنکار کرتب باز سیڑھی لگا کر اس تک پہنچتا پھر وہ دونوں جھولوں پر بیٹھ جاتے، معاون رسیوں کی مدد سے دائیں بائیں جھولتے اور گپ شپ کرتے یا چھت کی مرمت کرنے والے معمار کھلی کھڑکی سے اس سے دو ایک باتیں کر لیتے، یا بالائی گیلری کی ہنگامی روشنیوں کی جانچ کرنے والا کاریگر بھی اس سے علیک سلیک کرتا۔ اس کے علاوہ اس کی تنہائی میں کوئی مخل ہونے کی کوشش نہ کرتا۔ کبھی کبھار تھیٹر کی انتظامیہ کا کوئی کارکن کسی سہ پہر کو خالی تھیٹر میں ٹہلتے ہوئے فکر مندی کے ساتھ اوپر چھت کی بلندیوں میں غالباً نظر کی حد سے پرے تکتا جہاں فنکار خود کے دیکھے جانے سے بے خبر اپنے فن کی ریاضت میں مصروف یا آرام کر رہا ہوتا۔

جھولوں پر کرتب دکھانے والا فنکار ایک پر امن زندگی یونہی گزار سکتا تھا اگر اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ ناگزیر سفر نہ کرنے پڑتے، جو اسے انتہائی ناگوار معلوم ہوتے۔ حالاں کہ اس کا منیجر حتی الوسع کوشش کرتا کہ اس کی یہ دشواری ضرورت سے ایک لمحہ بھی زیادہ نہ ہو۔ قصبوں کے سفر کے لیے تیز رفتار گاڑی استعمال کی جاتی جو اگر ممکن ہوتا تو راتوں رات ہی یا صبح کے جھٹپٹے تک خالی گلیوں میں سے خطرناک رفتار کیساتھ بھاگتی ہوئی اسے منزل مقصود پر پہنچا دیتی لیکن یہ رفتار بھی فنکار کی داخلی بے چینی کا مداوا کرنے کو کافی نہ ہوتی۔ ریل گاڑی کے سفر کے لیے پورا ایک کمپارٹمنٹ ریزرو کرایا جاتا جس میں فنکار اپنی طرز

معاشرت کے ایک ممکنہ مگر گھٹیا متبادل کے طور پر اپنا وقت اوپر سامان والے خانے میں بیٹھ کر گزارتا۔ اپنے دورے میں اگلے قصبے میں اس کی آمد سے پہلے ہی تھیٹر کی چھت میں جھولے لگوا دیے جاتے اور سٹیج کی طرف کھلتے تمام دروازے کھول دیئے جاتے، تمام راہداریوں سے سامان اٹھوا لیا جاتا۔ پھر بھی منیجر تب تک سکون کا سانس نہ لیتا جب تک فنکار رسّی کی سیڑھی پر قدم نہ رکھتا اور آخر کار پلک جھپکتے ہی جھولے سے اکیلا لٹک جاتا۔

اتنے بہت سے کامیاب سفروں کا انتظام کرنے کے باوجود، منیجر ہر نئے سفر پر پھر سے پریشان ہوتا، کیوں کہ سفر باقی سبھی باتوں کے علاوہ فن کار کے اعصاب پر بری طرح سوار ہو جاتے تھے۔

ایک مرتبہ پھر سے دونوں اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ فنکار اوپر سامان کے خانے میں لیٹا سو رہا تھا۔ منیجر اس کے سامنے کی نشست پر کھڑکی کے نزدیک بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ فنکار نے مدہم آواز میں اُسے مخاطب کیا۔ وہ فوراً ہی اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ فنکار نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا، ''وہ آئندہ اپنے فن کے مظاہرے کے لیے ایک کے بجائے دو جھولے استعمال کرے گا جو آمنے سامنے لٹکے ہوں گے۔''

منیجر فوراً متفق ہو گیا۔ لیکن فنکار نے ایسے ظاہر کرتے ہوئے جیسے منیجر کی تائید اس کے لیے اتنی ہی غیر اہم ہے جتنا اس کا انکار، مزید کہا کہ وہ آئندہ کبھی ایک جھولے پر کرتب نہیں دکھائے گا، کسی بھی صورت میں نہیں۔ اس خیال نے کہ ایسا واقعی ہو سکتا ہے، اسے تھرتھرا دیا۔ منیجر نے صورتحال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے پھر سے اس کی بات سے اپنے اتفاق کا پرزور اظہار کیا اور کہا ایک کے بجائے دو جھولے واقعی بہتر ہیں۔ نیز اس سے پکڑنے کو ایک اور سہارے کا بھی فائدہ ہو گا جس سے مظاہرے میں زیادہ جدت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس پر جھولے پر کرتب دکھانے والا فنکار زاروقطار رو پڑا۔ شدید پریشانی کے عالم میں منیجر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور اس سے پوچھا کہ کیا بات اسے پریشان کر رہی تھی۔ لیکن کوئی جواب نہ پانے پر وہ بھی اُچک کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اسے اپنے گلے سے لگا کر اپنے رخسار اس کے رخسار سے رگڑنے لگا۔ حتیٰ کہ اس کا چہرہ فنکار کے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ بہت اصرار اور اسے تشفی دینے کی مسلسل کوشش کے بعد ہی کہیں فن کار آہ بھرتے ہوئے بولا ''صرف ایک جھولا ہاتھ میں پکڑے پکڑے میں کیسے زندہ رہ سکتا ہوں؟''

اس سے منیجر کو اسے تشفی دینا مزید سہل ہو گیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگلے سٹیشن سے وہ تھیٹر کی انتظامیہ کو ٹیلی گرام بھیج دے گا کہ ان کے دورے کے اگلے ہی قصبے میں فی الفور ایک دوسرے جھولے کا انتظام کر دیا

جائے۔ پھر خود کو لعنت ملامت کی کہ اتنے عرصے تک فنکار کو ایک جھولے تک پابند رکھا۔ اور فنکار کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی وجہ سے آج اس پر اپنی بیوقوفی عیاں ہوئی۔ یوں وہ آہستہ آہستہ اپنی چرب زبانی سے فنکار کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا اور اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔

لیکن وہ خود اندر سے مطمئن نہیں تھا۔ اپنی کتاب کے اوپر سے وہ گہرے اضطراب کے ساتھ چور نظروں سے فنکار کو دیکھنے لگا۔ ایک بار ایسے اذیت دہ خیالات فنکار کو اذیت دینے لگیں تو کیا کبھی وہ اس کا پیچھا چھوڑ پائیں گے؟ کیا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تلخی میں مزید اضافہ نہیں ہو گا؟ کیا یہ اس کی زندگی کے لیے مضر نہیں ہوں گے؟ اور بلاشبہ وہ صاف دیکھ سکتا تھا کہ اس درجہ اشک افشانی کے بعد گہری نیند میں بھی فکر کی اولین لکیریں فنکار کی ہموار اور بچوں جیسی معصوم پیشانی پر کبھی جا رہی تھیں۔

چھوٹی عورت

وہ چھوٹی سی عورت ہے، قدرتی طور پر دبلی پتلی۔ عموماً ایک ہی طرح کا چست لباس پہنے رہتی ہے۔ جب بھی اسے دیکھتا ہوں وہ ہمیشہ ایک ہی لباس پہنے ہوتی ہے، جو لکڑی جیسے بھورے زرد رنگ کے کپڑے سے بنا ہوتا اور اس پر اسی رنگ کی چھوٹی گیندوں اور بٹنوں جیسی جھالریں نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ کبھی ٹوپی نہیں پہنتی۔ اس کے ماند پڑے رنگ والے بال ہموار اور سلیقے سے سنورے ہوتے مگر

ڈھیلے بندھے ہوتے ہیں۔

اگرچہ وہ چست لباس پہنتی ہے مگر اپنی حرکات میں چست اور ہلکی پھلکی ہے بلکہ حد سے زیادہ چست واقع ہوئی۔ اپنے ہاتھوں کو کولہوں پر جمانے اور ایسی تیزی سے جسم کے اوپری حصے کو ادھر اُدھر گھمانے میں جو دیکھنے کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر دے، اسے مزہ آتا ہے۔ اس کے ہاتھ مجھ پر جو عجیب تاثر چھوڑتے ہیں، اسے میں یوں بیان کر سکتا ہوں کہ ایسا ہاتھ میں نے اپنی تمام زندگی نہیں دیکھا جس کی انگلیاں اتنے واضح انداز میں ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ اس کے باوجود کہ اس ہاتھوں میں عضویاتی پیچیدگیاں بالکل نہیں ہیں، وہ مکمل طور پر سادہ ہاتھ ہیں۔

وہ چھوٹی عورت مجھ سے بہت ناخوش رہتی ہے۔ میری ذات میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی قابل اعتراض پہلو ڈھونڈ نکالتی ہے۔ مجھ سے ہمیشہ اس کے حوالے سے کوئی غلط بات سرزد ہو جاتی ہے جو اس کے مزاج کے خلاف ہو۔ میں اسے ہر معاملے میں ناراض کر دیتا ہوں۔ اگر زندگی کو مختصر سے مختصر ترین حصوں میں تقسیم کرنا ممکن ہو اور پھر اس کے ہر حصے کا الگ جائزہ لیا جا سکے تو میری زندگی کا ہر حصہ اس کے لیے دل شکنی کا ایک واقعہ ہوگا۔ مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے کہ آخر میں اس کے لیے اس قدر مضر کیوں ہوں؟ ہوسکتا ہے کہ میری ہر ایک بات اس کی جمالیاتی حس، اس کی حس انصاف، اس کی عادتوں، اُس کی روایات، اس کی اُمیدوں کو مجروح کرنے کا باعث بنتی ہو۔ ایک دوسرے سے انتہائی غیر موافق طبیعتیں ہوتی ہیں لیکن وہ مجھ سے اس قدر بے زار کیوں رہتی ہے؟ ہمارے درمیان کوئی ایسا خاص تعلق بھی نہیں ہے جو اسے میری وجہ سے کسی پریشانی میں مبتلا ہونے پر مجبور کرے۔ اسے بس اتنا سوچنا ہوگا کہ میں ایک اجنبی ہوں، جو کہ میں ہوں بھی اور جیسا ہونے پر مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں ہے اور بے شک میں اس بات کا خیر مقدم بھی کرتا ہوں۔ اسے صرف میرے وجود کو نظر انداز کرنے کی ضرورت ہے جسے میں نے کبھی اس پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی، نہ کبھی کروں گا اور یوں اس کی اذیت اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی۔

میں اپنی ذات کے حصار میں قید نہیں رہوں۔ اس بات کو تو زیر بحث ہی نہیں لا رہا کہ اس کا رویہ میرے لیے بھی ناگوار خاطر ہے بلکہ میں اپنی ذہنی کوفت پر تو بات ہی نہیں کر رہا کیوں کہ میں مانتا ہوں کہ یہ کوفت اس اذیت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو وہ میری وجہ سے محسوس کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ اس کی میرے بارے میں اس کی فکر مندی کے باعث ہرگز نہیں ہے۔

اس کے لیے میری ذات کی اصلاح کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بلکہ اسے میری ذات میں جو باتیں قابل اعتراض لگتی ہیں، وہ ایسی نہیں ہیں جو میری اصلاح میں حائل ہوں۔ پھر بھی اسے میری فلاح سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے صرف ذاتی مطلب ہی عزیز ہے جو مجھ سے اسے ملنے والی اذیتوں کے انتقام اور مستقبل میں اسے پہنچنے والی متوقع اذیتوں سے بچاؤ کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں نے ایک مرتبہ اسے اپنی اس مستقل نفرت سے نجات پانے کا سہل طریقہ بتانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میرے مشورے سے نے جلتی پر تیل جیسا کام کیا اور وہ اس قدر بپھر گئی کہ میں اس مشورے کو دہرانے کی کبھی کوشش نہیں کروں گا۔

میں بھی اپنے کندھوں پر ایک خاص ذمہ داری کا بوجھ محسوس کرتا ہوں۔ اگر آپ اسے اس انداز سے سمجھنا پسند کریں کہ جیسے اجنبی ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہیں، میں اور چھوٹی عورت، اور یہ سچ ہے کہ ہمارے درمیان واحد تعلق اسی ذہنی کوفت و کرب کا ہے جو میری وجہ سے اسے پہنچتا ہے یا وہ مجھ سے اخذ کر لیتی ہے تو میں اس کی واضح جسمانی اذیت سے صرف نظر نہیں کر سکتا جو مجھ سے اس میں پیدا ہوتی ہے۔ کبھی کبھار، اور اکثر دیر سے مجھے ایسی اطلاع ملتی ہے کہ وہ ایک صبح بیدار ہوئی تو اس کا چہرہ زرد تھا، وہ بے خوابی کا شکار اور سر درد سے پریشان، کسی کام کے اہل نہیں تھی۔ اس کا خاندان اس کے بارے میں بہت فکر مند رہتا ہے۔ انھیں حیرت ہے کہ آخر اس کی اس کیفیت کا کیا سبب ہے اور انھیں اپنے اس سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ میں واحد شخص ہوں جو یہ جانتا ہے کہ یہ اس کی میری وجہ سے ہر روز نئے سرے سے پیدا ہونے والی معمول کی رنجیدگی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں اس کے بارے میں اتنا پریشان نہیں ہوں جتنا اس کا خاندان ہے۔ وہ مضبوط اعصاب کی سخت جان عورت ہے۔ جو ایسے مضبوط اعصاب کی مالک ہو، وہ اپنی جذباتی کیفیت کے اثرات برداشت کرنے کے بھی اہل ہوگی۔ مجھے تو شک ہے کہ اس کی یہ پریشانیاں یا ان میں سے چند ایک محض فریب ہیں، لوگوں میں میرے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے۔ وہ اتنی مغرور ہے کہ صاف لفظوں میں یہ تسلیم کرنے کی جرات نہیں رکھتی کہ میرا وجود اس کے لیے کس قدر اذیت کا باعث ہے۔ کسی سے میرے خلاف شکایت کرنے کو وہ اپنی حیثیت سے کم تر محسوس کرتی ہے۔ یہ محض اس کی نفرت، مستقل اور فعال نفرت ہے جو اسے میرے خلاف مصروف جنگ رکھتی ہے۔ اس غیر واضح ابتلا پر کھلے عام بات کرنا اس کے لیے شرم ناک ہوگا۔ لیکن کسی ایسی شے کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کرنا بھی، جو آپ کے لیے مستقل اذیت کا سامان ہو، بذات خود تکلیف دہ بات

ہے۔لہذا نسوانی مکروفریب کا وہ ایک اور حربہ آزماتی ہے۔ وہ خاموش رہتی ہے لیکن اپنے داخلی کرب کی تمام ظاہری علامات کی نمائش کرتی ہے، عوامی توجہ اس معاملے میں اپنی جانب موڑنے کے لیے۔

غالباً اسے اُمید ہے کہ ایک مرتبہ عوام میری جانب متوجہ ہوئی تو اس سے میرے خلاف ایک عوامی نفرت جنم لے گی اور یہ میری مذمت کے لیے یقیناً اس سے زیادہ مؤثر اور فعال انداز میں اپنی قوتوں کو میرے خلاف استعمال کرے گی، جتنی وہ اپنے نسبتاً کم طاقتور ذاتی عناد سے کر سکتی ہے۔ تب وہ پس منظر میں کہیں غائب ہو جائے گی، سکون کا سانس لے گی اور مجھے فراموش کر دے گی۔ اگر واقعی اس کی توقعات یہی ہیں تو وہ خود فریبی کا شکار ہے۔ عوامی رائے کبھی اس کا من چاہا کردار ادا نہیں کرے گی۔ عوامی رائے مجھے یوں بے انتہا قابل مذمت نہیں پائے گی، حتیٰ کہ اپنی اصل قد سے بڑھا چڑھا کر دیکھنے والی آنکھ سے بھی نہیں۔

میں اتنا بھی بے کار شخص نہیں ہوں جتنا وہ تصور کرتی ہے۔ میں اپنے بارے میں کوئی شیخی نہیں بگھارنا چاہتا، خاص طور پر اس معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔ بالفرض اگر میں کارآمد خصوصیات کی وجہ سے قابل ذکر نہیں ہوں تو ان کا نہ ہونا بھی مجھے نمایاں نہیں کرتا۔ صرف اسے، اس کی ماند پڑی آنکھوں کو ہی میں ایسا دکھائی دیتا ہوں، جس کے بارے میں وہ کسی کو متفق کرنے میں کامیاب نہیں ہوگی۔ لہذا اس حوالے سے میں خاصا پر یقین ہوں لیکن کیا مجھے ہونا چاہیے؟ نہیں، بالکل نہیں۔ کیوں کہ اگر سب کو معلوم ہو جائے کہ میرے رویے سے وہ واقعی بیمار ہو رہی ہے، جیسا کہ چند لوگ دیکھتے بھی ہیں جو بہت محنت سے مجھے اس کے بارے میں خبریں پہنچاتے ہیں، تو مثال کے طور پر وہ بھی ایسا نہیں سوچتے یا کم از کم اس معاملے کو یوں دیکھتے ہیں جیسا انھوں نے سمجھا، تو پھر سبھی مجھ سے سوال کریں گے۔ میں اپنے کڈھب پن سے اس مظلوم چھوٹی عورت کو اذیت کیوں دے رہا ہوں اور کیا میں اس طور اسے موت کی جانب دھکیلنا چاہتا ہوں؟ مجھے کب عقل آئے گی اور کب مجھ میں ایسے مہذبانہ انسانی احساسات پیدا ہوں گے کہ میں اس لغو رویے کو ترک کروں؟ اگر دنیا مجھ سے ایسے سوال کرے تو ان کا جواب دینا میرے لیے مشکل ہوگا۔

کیا میں فراخ دلی سے یہ تسلیم کر لوں کہ میں اس کی بیماری کی علامات پر یقین نہیں رکھتا اور یوں لوگوں پر ایسے انسان کا غلط تاثر ڈالوں جو دوسروں کو الزام دیتا ہے تاکہ کوئی اسے الزام نہ دے سکے، اور وہ بھی ایسے غیر شائستہ انداز میں۔ اور کیسے میں یہ بات کھلے عام کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں واقعی اس کی بیماری پر

یقین کرلوں تب بھی میرے دل میں اس کے لیے معمولی سی ہمدردی پیدا نہیں ہوگی کیوں کہ وہ میرے لیے یکسر اجنبی ہے اور ہمارے درمیان کوئی تعلق محض اس کی ذہنی اختراع اور یک طرفہ سوچ کا نتیجہ ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ لوگ میرا یقین نہیں کریں گے۔ وہ مجھ میں اتنی دلچسپی ہی نہیں لیں گے کہ اعتماد کرنا ان کا مسئلہ بنے۔ وہ محض اس جواب کو سنیں گے جو میں ایسی لاغر اور بیمار عورت کے بارے میں دوں گا اور یہ کچھ زیادہ میرے حق میں نہیں ہوگا۔ جو جواب میں نے دیا، ناگزیر طور پر وہ لوگوں کی اس شک میں مبتلا نہ ہونے کی نااہلی کے خلاف ثابت ہوا کہ اس معاملے کے پس منظر میں محبت وغیرہ کا کوئی چکر ہے۔ حالاں کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ایسے کسی معاملے کا سرے سے کوئی وجود نہیں اور یہ کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ میری طرف سے ہوتا نہ کہ اس کی طرف سے۔ کیوں کہ یہ میں ہی اس اہل ہوتا کہ اس چھوٹی عورت کی فیصلہ کرنے کی نتیجہ خیز پھرتی اور نتائج تک پہنچنے کی مستقل اہلیت کو سراہتا اگر یہ خوبیاں میرے خلاف بطور ہتھیار استعمال نہ ہو رہی ہوتیں۔

بہر طور اُس نے کبھی مجھ سے دوستی کا معمولی سا اظہار بھی نہیں کیا۔ اس معاملے میں وہ مخلص اور سچی ہے۔ یہی میری آخری اُمید بھی ہے۔ لیکن عوامی رائے، جو ایسے معاملات میں مکمل نافہمی پر مبنی ہوتی ہیں، اس کے تعصبات سے موافق ہوگی اور ہمیشہ میری مذمت پر مائل۔

میرے لیے آخری چارہ یہی ہے کہ اس سے پہلے کہ لوگ اس معاملے میں دخل دیں، میں وقت پر ہی اپنے رویے کو تبدیل کرلوں، چھوٹی عورت کا غصہ کم کرنے کے لیے، کہ اسے مکمل ختم نہیں کیا جا سکتا، ایسا سوچنا بھی محال ہے۔ اور بلا شبہ میں نے اکثر خود سے پوچھا کہ کیا میں خود سے اتنا آسودہ ہوں کہ خود کو کسی تبدیلی پر آمادہ نہ کر پاؤں اور کیا میں خود میں کوئی تبدیلی نہیں لا پایا، حالاں کہ میں ایسا کسی ضرورت کے تحت نہیں، بلکہ اس چھوٹی عورت کو راضی کرنے کے لیے کرتا۔ میں نے ایمانداری کے ساتھ ایسا کیا بھی، پوری احتیاط اور محنت کے ساتھ، اور اس میں مجھے کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ یہ تقریباً ایک انحراف تھا۔ چند تبدیلیاں بھی ہوئیں جو آئندہ طویل عرصے میں ظاہر ہوئیں۔ نہ ہی مجھے ان کی طرف اس کی توجہ مبذول کرانے کی ضرورت پڑی۔ وہ ایسی باتوں کا ادراک مجھ سے کہیں پہلے کر لیتی ہے۔ بلکہ وہ تو قبل از وقت میرے تاثرات سے جان لیتی ہے کہ میرے ذہن میں کھچڑی پک رہی ہے۔ لیکن میری کوششیں بار آور نہیں ہوئیں۔ ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ کیوں کہ جیسا مجھے اب معلوم ہوا کہ اس کا مجھ پر اعتراض

بنیادی نوعیت کا تھا جسے کسی طور دور نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی ذات میں مکمل تبدیلی کی صورت میں بھی نہیں۔ اگر وہ یہ سن لے کہ میں نے خودکشی کی کوشش کی تھی تو وہ غیض و غضب سے چلا اٹھے۔

میں تصور نہیں کر سکتا کہ ایسی تیز فہم و فراست کی عورت جیسی کہ وہ ہے، میری طرح ہی اپنی کوششوں کی ناکامی اور میری لاچارگی، اور میری تمام تر بہترین خواہش کے باوجود میری اس نااہلی کو نہیں سمجھ سکتی، کہ میں اس کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ بے شک وہ اسے سمجھتی ہے۔ لیکن فطرتاً ایک جنگجو ہونے کے باعث وہ جنگ کے خمار میں اسے فراموش کر دیتی ہے۔ اور میرا بد بخت مزاج، جو فطرتاً موجود ہونے کے باعث میرے اختیار سے باہر ہے، مجھے مجبور کرتا ہے کہ ہر اس شخص کو نرمی سے متنبہ کروں جو شدید جوش و جذبہ سے مملو رہتا ہو۔ یوں قدرتی طور پر ہم میں مفاہمت نہیں ہو گی۔ میں یونہی ہر روز صبح سویرے خوش گوار مزاج کے ساتھ گھر سے نکلا کروں گا کہ اس سے ملوں، اور مجھے دیکھ کر اس کے چہرہ جھکا لینا، اس کے ہونٹوں کی بغض بھری سلوٹیں، اس کی مردم شناس نگاہیں، اس کا قبل از وقت اس بات سے باخبر ہونا کہ آگے کیا ہونے والا ہے، مجھے تباہ کر دے گا، اور چاہے وہ کیسی ہی سرسری ہی کیوں نہ ہو لیکن صاف دکھائی دیتی ہے: اس کے لڑکیوں کے سے رخساروں پر شکن ڈالتی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ، آسمان کی طرف شکایت کے انداز میں بلند ہوتی اس کی آنکھیں، کولھوں پر ٹکے اس کے ہاتھ، خود کو کسی حملے سے بھڑ جانے پر تیار کرتے ہوئے اور پھر شدید غصہ جو اپنے ساتھ پیلاہٹ اور کپکپاہٹ لاتا۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ایک ایسا واقعہ ہوا، جب پہلی مرتبہ میں نے کچھ تحیّر کے ساتھ محسوس کیا کہ میں نے اپنے ایک قریبی دوست کو یہ احوال بتایا، بس ایسے ہی سرسری انداز میں غیر رسمی الفاظ میں، اسے اصل سے بہت کم تفصیل کے ساتھ، اسے معمولی ظاہر کرتے ہوئے جیسا معروضی طور پر اصل میں یہ ہے۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ میرے دوست نے اس کے باوجود اسے نظر انداز نہیں کیا۔ بلکہ اپنے مطابق اس نے اس سے زیادہ اسے وقعت دی جتنی میں نے اسے دی تھی۔ کوئی یک طرفہ رائے قائم نہیں کی بلکہ اصرار کے ساتھ اس پر مزید بات کی۔ لیکن اس سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ ایک خاص پہلو سے اس نے جائز اہمیت نہیں دی، کہ نہایت سنجیدگی سے مجھے مشورہ دیا کہ میں کچھ عرصہ کے لیے کہیں دور چلا جاؤں۔ کوئی مشورہ اس سے زیادہ ناقابل فہم نہیں ہوگا۔ یہ معاملہ بہت سادہ تھا۔ اس پر معمولی غور و فکر سے ہی اس کو مکمل طور پر سمجھا جا سکتا تھا کہ بہر حال یہ مسئلہ اتنا سادہ نہیں تھا کہ محض میری یہاں سے رخصت

اسے مکمل طور پر یا اس کے بڑے حصے کو حل کر دے۔

اس کے برعکس ایسی ہی کسی رخصت سے تو مجھے احتراز کرنا چاہئے۔ اگر میں اپنے ذاتی منصوبے پر عمل کرنا چاہوں تو وہ یہی ہونا چاہئے کہ میں اس معاملے کو اس کی موجودہ تنگ حدود میں ہی رکھوں جو باہر کی دنیا کا احاطہ نہیں کرتی اور اپنے روّیے میں کوئی ایسی تبدیلی رونما نہ ہونے دوں جو محسوس ہو سکے اور یہ بھی اس منصوبے کا ایک حصہ ہے کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کروں، بلکہ اس موضوع پر بات ہی نہ کروں، اس لیے نہیں کہ یہ کوئی خطرناک بھید ہے بلکہ محض اس لیے کہ یہ ایک ادنیٰ اور خالصتاً ذاتی نوعیت کا مسئلہ ہے اور اسے معمولی ہی سمجھنا اور اس حد سے زیادہ اسے سنجیدگی سے نہیں لینا چاہئے۔ چناں چہ میرے دوست کی رائے بہر طور بے کار نہیں تھی۔ اس سے مجھے کوئی نئی بات حاصل نہیں ہوئی بلکہ میرے حقیقی فیصلے کو زیادہ تقویت ملی۔

بغور دیکھا جائے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جو بہتری دکھائی دیتی ہے، وہ بجائے خود اس معاملے میں ہونے والی بہتری نہیں ہے بلکہ میرے رویے کی بہتری ہے یعنی جہاں تک یہ ایک طرف زیادہ مربوط اور زیادہ مردانہ، اصل معاملے کے زیادہ قریب ہوا ہے، تو دوسری طرف مسلسل اعصابی تناؤ کے باعث، جس پر میں قابو نہیں پا سکا، اور جو اگرچہ شدید بھی نہیں تھا، یہ اس کے چڑچڑاہٹ میں اضافے کا باعث بنا ہے۔

یہ معاملہ میرے لیے اب زیادہ پریشانی پیدا نہیں کرتا کیوں کہ میرے خیال میں، میں سمجھ گیا کہ اس کا کسی ویسے فیصلہ کن بحران کی صورت میں منتج ہونا غیر متوقع ہے جیسا یہ کبھی کبھار ظاہر ہوتا ہے۔ خاص طور پر نوجوانی میں انسان بہت آسانی سے اس رفتار کے بارے میں مبالغہ کرنے پر مائل ہو جاتا ہے، جو ان فیصلہ کن لمحات کے ظاہر ہونے کی ہو سکتی ہے۔ جب کبھی میری چھوٹی نقاد مجھے دیکھتے ہی تقریباً نیم بے ہوش ہوتے ہوئے کرسی میں ایک طرف ڈھے جاتی ہے، ایک ہاتھ سے کرسی کی پشت کو پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی قمیص کی ڈوریوں کو نوچتے ہوئے، جب کہ غصے اور مایوسی کے آنسو اس کے رخساروں پر بہ رہے ہوتے ہیں، تو میں سوچا کرتا ہوں کہ شاید وقت آ گیا ہے اور اب ایسا ہونے ہی والا ہے کہ مجھ سے میرے بارے میں سوال کیا جائے۔ لیکن کوئی فیصلہ کن لمحہ نہیں آیا۔ کوئی جواب دہی نہ ہوئی۔ عورتیں معمولی باتوں پر بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ دنیا کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ان کی حرکات پر

مغز ماری کرے۔

اور بھلا ان تمام سالوں میں ہوا ہی کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں سوائے اس کے کہ ایسے مواقع بار بار آئے، کبھی زیادہ اور کبھی کم شدت سے، اور یہ کہ ان کی مجموعی شرح بڑھتی ہی رہی۔ اور یہ کہ لوگ ان مواقع کے انتظار میں رہتے ہیں اور جب موقع ملتا ہے، دخل اندازی ضرور کرتے ہیں۔ لیکن اب تک ان کے ہاتھ کوئی ایسی بات نہیں لگی جس پر اعتبار کر کے وہ معاملے کا کچھ اندازہ لگا سکیں، اور یہ اگرچہ افواہوں پر یقین رکھنے والوں کو مصروف رکھنے کا مسالہ فراہم کرتا ہے لیکن اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

لیکن صورت حال بنیادی طور پر ہمیشہ یونہی رہی، سطحی تماشائیوں اور افواہوں پر یقین کرنے والوں سے بھری ہوئی، جو ہمیشہ اپنی موجودگی کا کوئی مکارانہ جواز تلاش کر لیتے، ترجیحی طور پر خود کو رشتہ دار قرار دیتے ہیں، ہمیشہ اپنی گردنیں آگے بڑھائے چونکا دینے والی خبر کی سُو لیتے ہوئے۔ لیکن جو کچھ وہ حاصل کر پاتے، وہ محض کھڑے رہنے کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں انھیں بتدریج پہچاننے لگا ہوں اور ہر ایک کو الگ الگ شناخت کر لیتا ہوں۔ کبھی مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ بتدریج کہیں باہر سے یہاں جمع ہوتے تھے، یعنی اس معاملے کی خبر ہر سُو پھیل گئی تھی، جو بجائے خود ایک نئے بحران کو جنم دے گی۔ آج میں سوچتا ہوں کہ مجھے علم ہے کہ یہ تماشائی وہاں ابتداء سے موجود تھے اور اس بحران کی پیدائش میں ان کا بہت کم یا سرے سے کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

جب کہ بحران تو خود ہی۔۔۔ لیکن میں اس معاملے کو بحران جیسا باوقار نام کیوں دوں؟ اگر واقعی کبھی ایسا ہوتا، اور یقینا کل یا پرسوں نہیں، بلکہ شاید کبھی ایسا نہیں ہوگا کہ عوام اس معاملے سے متعلق تشویش ظاہر کرتی، جو مجھے یہ بات دہرانے دیں کہ عوامی فہم سے ماورا ہے، تو بغیر چوٹ کھائے اس سے فرار نہیں ہو سکتا تھا، لیکن دوسری طرف عوام یہ بات مدنظر رکھنے پر مجبور ہیں کہ میں عوام کے لیے ایک غیر معروف آدمی نہیں ہوں۔ کہ میں نے ایک طویل عرصہ ان کے درمیان مقبولیت، اعتماد اور بھروسے کے ساتھ گزارہ ہے۔ اور یہ کہ یہ پریشان حال چھوٹی عورت، میری زندگی میں بہت بعد سے داخل ہونے والے اس فرد کو، جو مجھے سرسری طور پر کہنے دیجئے کہ جسے کوئی دوسرا فرد ایک دھبے کی طرح جھاڑ دیتا اور کوئی آواز پیدا کیے بغیر اپنے پیروں تلے کچل دیتا۔ لیکن یہ عورت اپنی بدترین صورت میں اس اعتماد پر محض ایک بدصورت معمولی داغ ہی ڈال سکتی تھی جو عوام نے بہت پہلے مجھ پر معاشرے کے ایک معزز رکن کے طور

پر کیا تھا۔ تو آج یہ صورت حال یوں ہے یعنی ایسی کہ جو شاذ ہی میرے لیے کوئی دشواری پیدا کر سکے۔

اس بات کا کہ ان برسوں میں میری بے چینی میں اضافہ ہوا ہے، اس معاملے کی اہمیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آخر کوئی انسان کیسے کسی کی نفرت کا مسلسل نشانہ بننا برداشت کر سکتا ہے چاہے اسے اچھی طرح سے یہ علم ہو کہ یہ نفرت بدخصلت کے اور کچھ نہیں۔ وہ بے چین ہو جاتا ہے، ایک طرح کے جسمانی انداز میں وہ حتمی فیصلوں کی توقع کرتا ہے چاہے ایک ہوش مند انسان کے طور پر وہ اس بات پر زیادہ یقین نہ بھی رکھے کہ وہ واقعی رونما ہونے والے ہیں۔ کچھ تو اس لیے بھی کہ یہ ڈھلتی عمر کی نشانی ہے، جوانی ہر شے پر تازگی کا سایہ کیے رکھتی ہے، جوانی کے نامختتم طور پر بڑھتے ہوئے جوش میں عجیب خصائص نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اگر ایک نوجوان کے طور پر کسی فرد میں محتاط رویہ موجود ہو تو وہ اس کا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اسے سرے سے خاطر ہی میں نہیں لایا جاتا، حتیٰ کہ خود اس کی طرف سے بھی نہیں۔ لیکن بڑھاپے میں جو کچھ بچ رہتا ہے، وہ سب کچھ ضروری ہوتا ہے۔ کچھ بھی تبدیل نہیں ہوتا۔ ہر بات زیر تحقیق ہوتی ہے۔ اور ایک بوڑھے شخص کا محتاط رویہ واضح طور پر ایک احتیاط کے طور پر مانا جاتا ہے اور شناخت کرنا دشوار نہیں ہوتا۔ اور جیسا کہ اس معاملے میں بھی ہے، یہ اس کی صورت حال کا حقیقی انحطاط نہیں ہوتا۔

سو اس معمولی معاملے کو چاہے میں کسی بھی زاویہ سے دیکھوں، اور میں اس کے ساتھ وابستہ رہوں گا، کہ اگر میں چاہے ہلکے سے ہی اس معاملہ پر ہاتھ رکھوں تو عورتوں کی تمام تر آہ و بکا کے باوجود، خاموشی سے ایک طویل عرصہ جی سکتا ہوں، دنیا کی زد سے بچ کر۔

مشاہدات

قدموں کی چاپ، جنھیں واضح کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی جاتی، اور مستقل طور پر گلی کے دوسرے سرے سے بہتی ہوئی ہوا، اور کسی کمرے کی بندھ کھڑکیوں سے آتی گراموفون سے گانے کی آواز۔۔ان سب نے اس خاموشی میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔ جیسے یہ ان کی اپنی ملکیت ہو، گزرے ہوئے وقت سے لے کر آنے والے وقت تک۔

میرے رفیق نے اسے اپنے نام سے منسوب کیا، ایک مسکراہٹ کے ساتھ، میرے نام بھی، اور اپنا دایاں ہاتھ دیوار کے ساتھ پھیلایا اور اپنا رخسار اس پر جما دیا، آنکھیں بند کرتے ہوئے۔

لیکن میں اس مسکراہٹ کے ختم ہونے کا انتظار نہیں کر سکا کیوں کہ شرمندگی نے فوراً مجھ پر غلبہ پایا۔اس مسکراہٹ سے مجھ پر منکشف ہوا کہ وہ شخص ایک پر اعتماد چالباز تھا اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ میں اس قصبے میں مہینوں سے موجود تھا اور سوچتا تھا کہ سب جانتا تھا یہ چالباز کس خصلت کے ہوتے ہیں، کیسے ریسٹورنٹ کے مالکوں کی طرح پھیلے ہوئے بازوؤں کے ساتھ ہم سے ملنے کے لیے رات کو بغلی گلیوں میں آن کھڑے ہوتے ہیں اور کیسے یہ اشتہاروں سے ڈھکے ہوئے ستونوں کے عقب سے جن کے برابر ہم کھڑے ہوتے ہیں، چھپ جاتے ہیں اور پھر ان کے گرد یوں چکر لگاتے ہیں جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں اور کم از کم ایک آنکھ سے تو ہماری جاسوسی کرتے ہیں، اور کیسے جب ہم میں سے کوئی جھجھک کر چل رہا ہو تو یہ باہم متصل گلیوں کے فٹ پاتھ کے کنارے سے یکبارگی نمودار ہوتے ہیں۔ میں ان کو اچھی طرح جانتا تھا۔اس قصبے کے چھوٹے شراب خانوں میں یہی میرے اولین واقف کار بنے۔اور انھی سے مجھے سفاکانہ کھردراہٹ کا پہلا اشارہ ملا تھا جس کے بارے میں مجھے اب احساس ہے کہ یہ دنیا میں ہر جگہ موجود ہے، حتیٰ کہ مجھے اپنے آپ میں بھی یہ محسوس ہوتی ہے۔ کیسے مستقل مزاجی سے یہ تب بھی ہمارا راستہ روکتے تھے حتیٰ کہ جب ہم نے بہت پہلے سے خود کو آزاد کرا لیا ہوا تھا اور حتیٰ کہ جب ان میں امید کی رمق بھی باقی نہیں رہی تھی۔ کیسے انھوں نے ہمارا پیچھا چھوڑنے، شکست تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا بلکہ ہم پر اپنی تیز نظریں گاڑھے رکھتے جو فاصلے سے بھی ہمیں اپنے اندر کھبتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔اور ہتھکنڈے جو وہ استعمال کرتے، ہمیشہ ایک سے ہوتے۔ انھوں نے خود کو ہمارے سامنے کھڑا کر لیا، اتنے بڑے دکھائی دیتے جتنا ممکن تھا، ہمیں ہر اس جگہ جانے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے جہاں جانے کی ہم خواہش کرتے۔ بلکہ اس کے بجائے ہمیں اپنی سرپرستی میں آنے کی دعوت دیتے۔اور آخر کار جب ہمارے

پیشہ ور چالباز

آخر کار رات تقریباً رات دس بجے میں اس شاندار گھر کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں مجھے شام کی دعوت پر مدعو کیا گیا تھا جب کہ میرے برابر وہی شخص کھڑا تھا جس سے میری سرسری سی جان پہچان بھی نہیں تھی لیکن وہ پھر سے بن بلائے مہمان کی طرح مجھ سے چمٹا ہوا تھا اور پچھلے دو گھنٹوں سے میرے ساتھ مختلف گلیوں میں پھر رہا تھا۔

''پہنچ گئے'' میں نے کہا اور ہاتھوں کو آپس میں بجایا تاکہ اس پر ظاہر کر سکوں کہ اب اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ میں پہلے بھی اس سے نجات حاصل کرنے کی چند ایک ایسی غیر واضح کوششیں کر چکا تھا۔ میں تھک چکا تھا۔

''کیا تم گھر کے اندر جاؤ گے'' اس نے پوچھا۔ میں اس کے منہ سے دانت چٹخانے جیسی آواز سنی۔

''ہاں''

اس سے ملنے پر ہی میں نے بتایا تھا کہ میں اس گھر میں مدعو ہوں۔ لیکن اس کا مطلب اس گھر میں داخل ہونا تھا جہاں چاہتا تھا کہ مجھے یہاں مدعو کیا گیا تھا، نہ کہ یہاں گلی والے دروازے پر کھڑا میرے پیچھے لگے شخص کے کانوں کے پیچھے تکتے رہنا تھا۔ نہ ہی اس کے ساتھ خاموش کھڑے رہنا میرا مقصد تھا جیسے ہمیں سزا کے طور پر طویل عرصہ تک یہاں کھڑا کیا گیا ہو۔ اور تب ہمارے اردگرد ایستادہ مکان فوراً ہی ہماری خاموشی اور اس کے اوپر ستاروں تک پھیلی تاریکی میں شامل ہو گئے۔ اور اجنبی راہ گیروں کے

ایک تاجر

ایسا ممکن ہے کہ چند لوگوں کو مجھ سے ہمدردی ہو۔ لیکن میں اس سے لاعلم ہوں۔ میرا مختصر کاروبار مجھے ایسی پریشانیوں میں مبتلا رکھتا ہے جو میری پیشانی اور کنپٹیوں میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والا درد بھر دیتے ہیں کیوں کہ میرا کاروبار ابھی بہت محدود ہے۔

مجھے اپنے کاروبار میں ہر کام کی تیاری کے لیے پہلے گھنٹوں سر کھپائی کرنا پڑتی ہے۔ بار بار منشی کو ہر بات یاد دلانا پڑتی ہے، اسے ان غلطیوں سے متعلق تنبیہ کرنا پڑتی ہے جو اس سے متوقع ہوتی ہیں، اور ہر سال ہر موسم میں مغزماری کرنا پڑتی ہے کہ اگلے موسم کا فیشن کس قسم کا ہوگا؟ ایسا فیشن نہیں جو میری جان پہچان کے لوگ پسند کرتے ہیں، بلکہ ایسا جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہنے والے ناقابل رسائی کسانوں کو بھی متوجہ کرے۔

میری دولت اجنبیوں کے رحم و کرم پر ہے۔ ان کے معاملات میرے لیے سربستہ راز ہیں۔ بدبختی جو انھیں پیش آسکتی ہے، میں اس کے بارے میں کوئی پیشین گوئی نہیں کرسکتا۔ تو کیسے میں اسے روک سکتا ہوں۔ شاید وہ نہایت فضول خرچ واقع ہوئے ہیں اور کسی ہوٹل کے باغ میں شاہانہ ضیافتیں اڑاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک امریکہ جانے سے پہلے عارضی سکون کے لیے مہنگی الوداعی دعوتیں کرتے ہیں۔

جب دن کے اختتام پر میں اپنے دفتر کو تالا لگاتا ہوں تو اور اچانک اس وقت کا سوچتا ہوں جس میں میں اس کے لامختتم تقاضے پورے کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کرسکوں گا، تو وہ جوش و خروش جسے

تر دیدی احساسات آمادہ بغاوت ہو گئے تو انھوں نے ہمیں خوش آمدید کہا کہ ایسی آغوش جس میں انھوں نے اپنے ہی چہرے سب سے پہلے چھپائے۔

اور اب اس شخص کی صحبت میں مجھے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ میں وہی پرانی چالبازی کو شناخت کر پایا۔

میں اپنی انگلیوں کی پوروں کو آپس میں رگڑا تا کہ نفرت کا احساس ذہن سے دھل جائے۔

میرا رفیق تا حال ویسے ہی جھکا ہوا کھڑا تھا، خود کو ایک کامیاب چالباز تصور کرتے ہوئے اور اس کی یہ خود اطمینانی اس کے رخسار پر سرخی کی صورت تمتما رہی تھی۔

"رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو" میں نے اس کے کندھوں کو ہلکے سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

پھر میں بھاگ کر سیڑھیاں چڑھا اور ہال میں ملازمین کے چہروں پر غیر دلچسپ لگاوٹ مجھے باغ باغ کر گئی جیسے یہ کوئی غیر متوقع عزت افزائی ہو۔ میں نے ایک ایک کر کے ان سب کے چہروں پر نگاہ کی، جب وہ میرا کوٹ اتار رہے اور میرے جوتے صاف کر رہے تھے۔

گہرا اطمینان بھرا سانس لیتے اور تن کر خود کو اپنے پورے قد پر کھڑا کرتے ہوئے میں ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

بڑے جلوسوں کو دیکھو۔ ایک دوسرے کو راستہ دیے بغیر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر چلتے اور ان کی آخری قطاریں گزرنے کے بعد پھر سے اپنے پیچھے خالی جگہ چھوڑتے ہوئے۔ اپنا رومال لہراؤ، ناراض ہو جاؤ، غصے میں چیخو اور اس خوبصورت عورت پر اپنا حق جتاؤ جو ابھی تمھارے سامنے سے گزری ہے۔ لکڑی کے پل سے ہو کر ندی کو پار کرو، اس میں نہاتے بچوں کو سر کے اشارے سے سلام کرو اور دور جنگی بحری جہازوں میں سوار ہزاروں سپاہیوں سے بلند ہوتے خوشی کے نعرے سنو۔

چھوٹے قد کے گمنام آدمی کا تعاقب کرو اور جب تم اسے ڈیوڑھی کے اندر دھکیل دو، تو اسے لوٹ لو اور اپنی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے اسے دیکھو کہ کیسے وہ مایوسی سے بائیں ہاتھ کی گلی میں مڑ جائے گا۔

پولیس اپنے برق رفتار گھوڑوں پر سوار اپنے گشت پر نکلتی اور تمھیں واپس دھکیلتی ہے۔ انھیں ایسا کرنے دو۔ میں جانتا ہوں خالی گلیاں ان کی ہمت کو پست کر دیں گی۔ کیا میں نے تمھیں نہیں بتایا کہ وہ جوڑوں کی صورت میں دور جا رہے ہیں، آہستگی سے گلیوں کی نکڑوں میں اور سرپٹ بھاگتے ہوئے چوکوں میں۔''

تب میں لفٹ سے باہر نکل آتا ہوں، اسے واپس نیچے بھیج دیتا ہوں اور گھنٹی بجاتا ہوں اور ملازمہ دروازہ کھولتی ہے تو میں کہتا ہوں ''شب بخیر''۔

میں نے صبح ہی خود میں سے نکال پھینکا تھا، لوٹ آنے والی لہروں کی طرح پھر سے عود کر آتا ہے، لیکن مجھ میں ٹھہر نہیں پاتا اور بے مقصد ہی اپنے ساتھ بہائے لے جاتا ہے۔

اور میں پھر بھی اس جوش و خروش سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتا۔ میں صرف گھر لوٹ سکتا ہوں کیوں کہ میرا چہرہ اور ہاتھ گرد آلود اور پسینے میں شرابور ہیں، میرا لباس داغ دار اور مٹی سے ڈھکا ہوا ہے، میری کام کی ٹوپی میرے سر پر ہوتی ہے اور میرے جوتے ٹوکروں کی کیلوں سے ادھڑ چکے ہیں۔ میں جیسے کسی غیر محسوس لہر پر تیرتا ہوا دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چٹخاتا ہوں اور جو بچہ مجھے ملتا ہے، اس کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرتا ہوں۔

لیکن راستہ مختصر ہے۔ جلد ہی میں گھر پہنچ جاتا ہوں، لفٹ کا دروازہ کھولتا ہوں اور اندر داخل ہو جاتا ہوں۔

میں دیکھتا ہوں کہ اچانک میں اکیلا ہوں۔ دوسرے لوگ جو سیڑھیاں چڑھتے ہیں، وہ اس دوران کچھ تھک جاتے ہیں، انھیں ہانپتے ہوئے کچھ انتظار کرنا پڑتا ہے حتیٰ کہ کوئی فلیٹ کا دروازہ کھولے۔ جس سے انھیں کچھ بے چین اور چڑچڑا ہونے کا جواز مل جاتا ہے، وہ بڑے ہال میں سے گزرتے ہیں جہاں جہاں ٹوپیاں ٹنگی ہوتی ہیں، اور جب تک وہ بہت سے کانچ کے دروازوں سے پرے لابی سے نہیں گزرتے اور اپنے کمرے میں نہیں آتے، وہ اکیلے نہیں ہوتے۔

لیکن میں لفٹ میں داخل ہوتے ہی فوراً تنہا ہو جاتا ہوں اور اپنے گھٹنوں پر بیٹھے تنگ آئینے میں تکتا ہوں۔ جونہی لفٹ اوپر اٹھتی ہے، میں کہتا ہوں۔ ''اب خاموش رہو اور اپنے آپ میں آجاؤ، کیا یہ وہی درختوں کا سایہ ہے جس کے لیے تم بنانا چاہتے ہو، یا کھڑکی کے پردوں کے پیچھے یا باغ میں اُگے درختوں کے کنج میں۔''

میں یہ سب اپنے دانتوں کے عقب میں آواز پیدا کیے بغیر کہتا ہوں اور سیڑھیاں دھندلے شیشے کے ٹکڑے میں بہتے پانیوں کی طرح نیچے ڈوبتی جاتی ہیں۔

''اب اڑو اور اپنے پروں کو، جنھیں میں نے کبھی نہیں دیکھا، تمھیں اڑاتے ہوئے گاؤں کی غار یا پیرس تک لے جانے دو۔ بشرطیکہ تم وہاں جانے کی خواہش رکھتے ہو۔

لیکن کھڑکی سے باہر کے منظر سے حظ اٹھاؤ۔ تین مختلف گلیوں سے بیک وقت برآمد ہوتے ہوئے

گلے اور کنپٹیوں سے لپٹنے دیا۔

میں نے اس پر مختصر نگاہ ڈالی اور کہا ''صبح بخیر''، پھر چولہے کے سرے پر سے اپنی جیکٹ اٹھائی کیوں کہ میں نیم برہنہ کھڑا رہنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دیر میں نے اپنا منہ کھلا رہنے دیا، تا کہ میرے اندر کی نفرت اظہار کی راہ پائے۔ میرا منہ کڑواہٹ سے بھرا ہوا تھا۔ میری پلکیں میرے گالوں پر پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ مختصر یہ کہ یہ آمد جو میرے لیے متوقع بھی تھی، بہت ضروری تھی۔

وہ اسی جگہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس نے اپنا داہنا ہاتھ دیوار کے پلستر پر جما رکھا تھا اور اپنی اس دریافت میں محو تھی کہ اس کے رخسار گلابی تھے۔ سفید قلعی والی دیواروں کی سطح کھردری تھی اور اس کی انگلیوں کے پپوٹوں کو چھیل رہی تھی۔ میں نے کہا ''کیا تم واقعی مجھے ڈھونڈھ رہی تھی؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہو؟ اس بڑی عمارت میں ایسا مغالطہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔ میرا نام فلاں فلاں ہے اور میں تیسری منزل میں رہتا ہوں۔ کیا میں ہی وہ شخص ہوں جس سے تم ملنا چاہ رہی تھی؟''

''اونہہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' بچی نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا، ''ہاں یہ ٹھیک ہے۔''

''تو پھر کمرے میں آجاؤ۔ میں دروازہ بند کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں اسے ابھی بند کر چکی ہوں۔ پریشان مت ہو۔ خود کو پر سکون رکھنے کی کوشش کرو۔''

''میں فکر مند نہیں ہوں، لیکن یہاں راہداری میں بہت سے لوگ رہتے ہیں اور میں بلاشبہ سب کو جانتا ہوں۔ ان میں سے اکثر دفتروں سے لوٹ رہے ہوں گے۔ اگر وہ ہماری آواز سنیں گے تو دروزہ کھول کر باہر جھانکنے اور یہ دیکھنے کا حق جتائیں گے کہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ سب ایسے ہی ہیں۔ وہ سب اپنے دفتروں سے وپس آئے ہیں اور اپنی عارضی آزاد شاموں میں وہ کسی کی ہدایات لینے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ پھر یہ بھی ہے کہ میری طرح تم بھی یہ جانتی ہو۔ مجھے یہ دروازہ بند کر دینا چاہیے۔''

''کیوں؟۔۔۔۔۔ تمھیں کیا پریشانی ہے؟ چاہے سب لوگ باہر آجائیں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہر حال جیسا میں نے بتایا ہے کہ میں پہلے ہی دروازہ بند کر چکی ہوں۔ کیا تم کیا سمجھتے ہو اسے بس تم ہی بند کر سکتے ہو؟ میں نے تو اسے تالا بھی لگا دیا ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ اس سے زیادہ میں کیا چاہ سکتا ہوں۔ تمھیں تالا لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب جبکہ تم یہاں ہو، تو آرام سے رہو۔ تم میری مہمان ہو۔ مجھ پر مکمل اعتماد کر سکتی ہو۔ اسے اپنا ہی

دیوار۔ یا ور یہ بھی کہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، وہ مضحکہ خیز اور غیر مناسب ہے۔ تم نے کہا کہ تمھاری فطرت تمھیں مجبور کرتی ہے کہ مجھ سے یوں کلام کرو۔ کیا ایسا ہی ہے؟ کیا تمھاری فطرت مجبور کرتی ہے؟ تو ایسی ہے تمھاری فطرت؟ تمھاری فطرت میری فطرت ہے اور اگر میں تمھیں اپنا دوست محسوس کرتا ہوں تو پھر تمھیں بھی مجھ سے مختلف رویہ نہیں برتنا چاہیے۔''

''کیا یہ دوستانہ رویہ ہے؟''

''میں اپنے پہلے رویئے کی بات کر رہا ہوں۔''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ آئندہ میرا رویہ کیا ہوگا؟''

''میں کچھ نہیں جانتا''

میں بستر کے ساتھ پڑے میز تک گیا اور موم بتی جلائی۔ اس وقت میری کمرے میں نہ کوئی بلب تھا، نہ بجلی کا قمقمہ۔ تب کچھ دیر میں میز کے سامنے بیٹھا حتی کہ میرا جی اوبنے لگا۔ اپنا بڑا کوٹ پہنا۔ صوفے پر سے اپنی ٹوپی اٹھائی اور موم بتی کو گل کر دیا۔ باہر جاتے ہوئے میں کرسی سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑایا۔

سیڑھیوں پر ہماری منزل میں رہنے والے کرایہ داروں میں سے ایک سے میری مڈبھیڑ ہوئی۔

''اوہ آوارہ گرد! پھر سے باہر جا رہے ہو'' اس نے زینے کی دو سیڑھیوں پر مضبوطی سے پیر جماتے ہوئے کہا۔

''اور کر بھی کیا سکتا ہوں؟'' میں نے کہا ''میرے کمرے میں بھوت ہے۔''

''تم نے ایسی ہی بات کی جیسے کوئی کہے کہ اسے شوربے میں سے بال ملا ہو۔''

''تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں بھوت واقعی بھوت ہوتا ہے۔''

''سچ کیسے مانوں؟ اچھا فرض کرو کوئی بھوتوں پر یقین نہ رکھتا ہو تو۔''

''خیر، کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے بھوتوں پر یقین ہے؟ تو میرا یقین نہ رکھنا کیسے میرے کچھ کام آ سکتا ہے؟''

''سادہ سا معاملہ ہے۔ تمھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اگر کوئی بھوت تمھارے سامنے آجائے۔''

''اوہ، یہ تو محض ثانوی خوف ہے۔ اصل خوف تو یہ ہے کہ یہ سایہ کرے گا کیا؟ اور یہ خوف جان نہیں

ٹرام کا سفر

میں ٹرام کے آخری پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں اور اس بارے میں قطعی بے یقینی کا شکار ہوں کہ میرے پاؤں اس دنیا، اس قصبے، میرے خاندان میں جمے ہوئے ہیں۔ نہ ہی بے تکلفانہ انداز میں کوئی ایسا دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میں صحیح سمت میں سفر کر رہا ہوں۔ حتیٰ کہ یہاں کھڑے ہونے، حفاظتی پٹی کو پکڑے رکھنے، خود کو ٹرام کے ساتھ آگے بڑھنے دینے کا کوئی جواز نہیں رکھتا تھا۔ نہ ہی ان لوگوں کا کوئی جواز پیش کرسکتا ہوں جو ٹرام کو گزرنے کا راستہ دیتے، یا خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں یا دکانوں کی کھڑکیوں سے باہر جھانکتے ہیں۔ کوئی مجھ سے یہ تقاضا نہیں کرتا کہ میں دفاع کروں۔ لیکن یہ ایک غیر متعلقہ معاملہ ہے۔

ٹرام رکنے کی جگہ پر پہنچتی ہے اور ایک لڑکی نیچے اترنے کے لیے سیڑھیوں کے نزدیک آن کھڑی ہوتی ہے۔ وہ میرے اتنے نزدیک ہے کہ میں اسے آسانی سے چھو سکتا ہوں۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس ہے۔ اس کے سکرٹ کی شکنیں تقریباً ساکت لٹکی ہوئی ہیں۔ اس کی مختصر کرتی چست ہے اور اس کے کالر عمدہ سفید جھالر سے بنے ہوئے ہیں۔ اس کا بایاں ہاتھ ٹرام کی سطح پر مضبوطی سے جما ہوا ہے۔ اس کے داہنی ہاتھ میں چھتری ہے جس کی نوک دروازے کی سیڑھی کے دوسرے ڈنڈے پر ٹکی ہے۔ اس کی جلد سانولی ہے۔ اس کے ناک کی چونچ چوڑی اور گول، اور اطراف سے معمولی پچکی ہوئی ہے۔ اس کے بہت سے بال بھورے ہیں اور داہنی کنپٹی پر ان کے چند گچھے جھول رہے ہیں۔ اس کے چھوٹے کان چھپے ہوئے

گھر واپسی کا راستہ

دیکھو طوفان برق و باراں کے بعد ہوا کیسی دل پذیر ہو گئی ہے۔ میری شخصیت نکھر آتی اور مجھ پر غلبہ پا لیتی ہے۔ حالاں کہ میں کوئی مدافعت نہیں کرتا، میں تمھیں اجازت دیتا ہوں۔

میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوں اور میری چال وہی ہے جو گلی کے میری طرف کے حصے، تمام گلی اور تمام علاقہ کی ہے۔ یہ میری ذمہ داری ہے اور ایسا بجا ہے، میں درازوں اور میز کی چکنی سطح پر دی گئی دستکوں کی، امن و آشتی کے لیے پئے گئے سبھی جاموں کی، اپنے بستروں میں پڑے محبت کرنے والوں کی، نئی عمارتوں کے تھڑے پر اندھیری گلیوں میں گھر کی دیواروں کے سامنے یا قحبہ خانے کے دیوان خانوں میں ایک دوسرے سے جڑے کھڑے ہوئے۔

میں اپنے ماضی کو اپنے مستقبل پر فوقیت دیتا ہوں لیکن یہ دونوں میرے لیے قابل قدر ہیں۔ کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا، اور نہ ہی خدا کی ناانصافی کے سوا کوئی بات لائق شکایت ہے جو کہ واضح طور پر میرے ہی حق میں ہے۔

جونہی میں اپنے کمرے میں آتا ہوں تو خود کو غور و فکر پر مائل پاتا ہوں حالاں کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بظاہر کوئی ایسی بات دکھائی نہیں ہوتی جو لائق غور و فکر ہو۔ اس سے بھی مجھے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا کہ کھڑکی کھول لوں اور باہر باغ میں مسلسل بجتی موسیقی سنوں۔

استرداد

جب میں کسی خوبصورت لڑکی سے ملتا ہوں اور اس سے درخواست کرتا ہوں کہ ''اتنی مہربانی کرو کہ میرے ساتھ چلو'' اور وہ کوئی لفظ کہے بنا آگے بڑھ جاتی ہے تو دراصل وہ یہ کہہ رہی ہوتی ہے:

''تم شہرت کے حامل مشہور ڈیوک نہیں ہو۔ نہ ریڈ انڈین لوگوں جیسے جسم، قد، مغموم آنکھوں اور سبزے کے بڑے میدانوں اور ان میں بہنے والے دریاؤں کی ہوا کے عادی چمڑی والے چوڑے چکلے امریکی نہیں ہو۔ تم نے کبھی سات سمندروں کا سفر نہیں کیا اور نہ وہاں تک گئے جہاں کہیں بھی یہ ہو سکتے ہیں، جو میں بھی نہیں جانتا کہ کہاں ہیں۔ تو پھر کیوں دعا کرتے ہو کہ مجھ جیسی خوبصورت لڑکی تمھارے ساتھ جائے گی۔''

''لیکن تم بھول رہی ہو کہ گلی کی نکڑ پر کوئی گاڑی تمھارے گرد تیز چکر نہیں کاٹتی۔ میں نے نہیں دیکھا کہ رئیس زادے تمھارے گرد نیم دائرے میں اکٹھے ہوں اور تمھاری پشت پر سکرٹ پر ہاتھ سے دبائے ہوئے تمھارے کان میں میٹھی سرگوشی کر رہے ہوں۔ تمھاری چھاتیاں تمھارے کُرتے میں بہت سجی ہوئی ہیں لیکن تمھاری رانیں اور کولھے اس بندش کو نہیں مانتے۔ تم نے ایک ریشمی لباس پہن رکھا ہے، شکنوں والے سکرٹ کے ساتھ، جس نے پچھلے موسم خزاں میں ہم سب کو کیسا مسحور کیا تھا۔ اور پھر وقفے وقفے سے نمودار ہوتی تمھاری مسکراہٹ فانی خطرے کو دعوت دیتی ہوئی۔''

''ہاں، ہم دونوں ہی درست ہیں اور خود کو آگاہی سے بچانے کے لیے، کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم جدا راستوں سے اپنے گھروں کو چل دیں۔''

ہیں۔لیکن چوں کہ میں نزدیک کھڑا ہوں، میں اس کے کان کے اندرونی حلقوم اور اس کی جڑوں کے
سائے تک کو دیکھ سکتا ہوں۔

اس موقع پر میں خود سے پوچھتا ہوں ''کیا وجہ ہے کہ یہ لڑکی خود اپنی جسمانی ساخت پر متحیر نہیں
ہے، خاموشی سے ہونٹوں کو بھینچے رہتی اور ایسی کوئی رائے نہیں دیتی۔''

اچانک سیر کو نکلنے پر

جب یوں معلوم ہو کہ آخر کار آپ نے یہ شام گھر پر گزارنے کا تہیہ کر لیا ہے، آپ گھر کا ہلکا پھلکا لباس زیب تن کر لیں اور رات کے کھانے کے بعد میز پر جلتی لالٹین کی مدہم روشنی میں بیٹھ کر کوئی معمولی کام کرنے لگیں یا کوئی کھیل کھیلیں جو آپ کے بستر پر جانے تک جاری رہے۔ جب باہر موسم ناخوشگوار ہو کہ گھر پر رہنا قدرتی امر لگے اور جب آپ خاموشی سے کتنی ہی دیر سے کرسی پر بیٹھے ہوں کہ آپ کی روانگی ہر کسی کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر دے۔ جب پاس ہی سیڑھیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہوں اور گھر کا صدر دروازہ مقفل ہو اور اس سب کے باوجود آپ بے چینی کے فوری دورے کے تحت چل پڑیں، اپنی جیکٹ تبدیل کریں، فوری طور پر باہر جانے کا لباس پہنیں اور یہ وضاحت کریں کہ آپ کو باہر جانا ہے اور پھر چند مزید الوداعی فقرے کہتے ہوئے روانہ ہو جائیں، فلیٹ کے دروازے کو کم و بیش عجلت میں اس سطح کی ناگواری کے ساتھ دھڑاک سے بند کریں جو آپ کے خیال میں آپ کے جانے سے گھر والوں میں پیدا ہوئی ہے اور جب آپ خود کو پھر سے گلی میں پاتے ہیں، اس غیر متوقع آزادی کے ردعمل میں جو آپ نے حاصل کی ہے، بے تکلفی سے جھولتے اعضا کے ساتھ، جب اس فیصلہ کن عمل کے نتیجے میں آپ خود میں کسی بھی فیصلہ کن اقدام کے تمام امکانات کو مجتمع محسوس کرتے ہیں، جب آپ معمول سے کہیں زیادہ اہمیت کے ساتھ یہ ادراک کرتے ہیں کہ آپ کی قوت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی آپ کو تیز ترین تبدیلیاں کرنے اور پھر ان سے موافق رہنے کے لیے ضرورت ہے، جب اس ذہنی پس منظر کے ساتھ آپ لمبی گلی میں آگے بڑھتے جاتے ہیں۔۔۔ تب اس شام کے لیے آپ اپنے اہل خانہ سے دور ہو چکے ہوتے ہیں، جو غیر اہم ہو کر مبہم ہو جاتا ہے، جب آپ، ایک پختہ، نمایاں سیاہ ہیولا، اپنے ران پر ہاتھ مارتے ہوئے، اپنے حقیقی روپ میں آتے ہیں۔

گلی میں کھلنے والی کھڑکی

جو شخص ایک تنہا زندگی گزارتا ہے اور گاہے بگاہے کسی جگہ خود کو کسی سے وابستہ کرنے کی خواہش بھی کرتا ہے، دن کے اوقات کار، موسم، کاروبار کی صورتحال اور ایسی ہی دوسری باتوں میں تبدیلیوں کے مطابق، کہ اچانک ایسے بازو کی خواہش کرتا ہے جس سے وہ چمٹ سکے، تو وہ گلی میں کھلنے والی کھڑکی سے باہر دیکھے بغیر زیادہ دیر چل نہیں پائے گا۔ اور اگر وہ کسی بھی شے کی خواہش کرنے کے موڈ میں نہیں ہے اور اور محض ایک پژمردہ شخص کی مانند کھڑکی کی منڈیر تک جاتا ہے، نظروں کو لوگوں سے ہٹا کر آسمان کی طرف اور پھر سے واپس لاتا ہوا، باہر دیکھنے کی خواہش سے عاری اور سر کو کچھ اوپر اٹھائے ہوئے، حتیٰ کہ نیچے گلی میں کھڑے گھوڑے اسے چھکڑوں کی قطار اور لوگوں کے ہجوم کی طرف متوجہ کرلیں گے اور اس طور آخر کار انسانی ہم آہنگی کی طرف۔

غائب الدماغی سے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے

ہم ان بہار کے دنوں کے لیے کیا اہتمام کریں جو تیزی سے قریب آرہے ہیں؟ آج صبح آسمان بھورا تھا۔ لیکن اگر ابھی آپ کھڑکی تک جائیں تو حیران ہو جائیں گے اور کھڑکی کے پھرکی دار بیلن پر اپنا رخسار جمالیں گے۔

سورج غروب ہو رہا ہے لیکن نیچے آپ اسے ایک ننھی بچی کے چہرے کو روشن کرتے دیکھتے ہیں جو اپنے دھیان میں گم چہل قدمی کر رہی ہے اور ساتھ ہی آپ اسے ایک آدمی کے سائے سے گرہن زدہ ہوتے دیکھتے ہیں جو پیچھے سے اس پر چھا رہا ہے۔

اور تب وہ شخص آگے گزر جاتا ہے اور بچی کا چہرہ چمکنے لگتا ہے۔

یہ بات بے انتہا شاندار ہو، اگر رات کے اس پہر تم اپنے کسی دوست سے ملنے جاؤ یہ جاننے کے لیے کہ اس کی کیسی گزر رہی ہے۔

درخت

کیوں کہ ہم سب برف سے ڈھکے ہوئے تنوں کی مانند ہیں۔ بظاہر وہ نقاہت سے پڑے دکھائی دیتے ہیں اور لگتا ہے معمولی جھٹکا انہیں لڑھکنے پر مجبور کر دے گا۔نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔کیوں کہ وہ مضبوطی سے زمین میں گڑے ہوتے ہیں لیکن غور کرو، یہ بات بھی ایک ظاہری حقیقت ہی تو ہے؟

تحریکات

خود کو ناخوش گوار مزاج سے باہر نکالنا چاہے اس کے لیے ارادے کی قوت ہی استعمال کیوں نہ کرنی پڑے، آسان ہونا چاہیے۔ میں جھٹکے سے خود کو کرسی سے اُٹھاتا ہوں، میز کے گرد لمبے ڈگ بھرتا ہوں، گردن اور سر کو دائیں بائیں جھلاتا ہوں، آنکھوں کو جھپکاتا ہوں اور ان کے گرد اعصاب کو سکیڑتا ہوں۔ اپنے داخلی احساسات کے برعکس ''اے'' کو تپاک سے خوش آمدید کہتا ہوں سے تپاک سے ملتا ہوں، یہ فرض کرتے ہوئے کہ وہ مجھ سے ملنے آیا ہے، انکساری سے ''بی'' کو اپنے کمرے میں برداشت کرتا ہوں، جو کچھ ''سی'' میں کہا گیا، اسے تحمل کے ساتھ سہتا ہوں چاہے اس سے مجھے کتنی ہی اذیت اور دشواری کا سامنا ہو۔

لیکن اگر میں یہ سب کچھ کرلوں، تو پھر بھی ایک معمولی غلطی، اور ایک معمولی غلطی سے کتنا صرف نظر کیا جاسکتا ہے، سارے عمل کو منقطع کردے گی، چاہے وہ ایک ساتھ آسان اور تکلیف دہ ہو اور مجھے واپس اپنے دائرے میں سمٹنا پڑے گا۔

اس لیے غالباً بہترین رویہ یہی ہے کہ ہر بات کو منفصل انداز میں لیا جائے، تاکہ خود کو ایک بے حرکت وجود بنالو اور اگر ایسا محسوس کرو کہ تمھیں ورغلایا جارہا ہے تو خود کو ایک بھی غیر ضروری قدم اٹھانے، دوسروں کو ایک حیوان کی نگاہ سے دیکھنے، ندامت محسوس نہ کرنے پر مائل مت ہونے دو، مختصر یہ کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے اندر موجود زندگی کی آخری رمق ختم کرڈالو یعنی یہ کہ قبر کے حتمی سکون کو بڑھاؤ اور اس کے سوا کوئی شے باقی نہ بچے۔

ایسی صورت حال میں واضح حرکت یہی ہوسکتی ہے کہ اپنی چھوٹی انگلی کو اپنی ابروؤں کے کناروں پر پھیرو۔

لباس

اکثر میں ایسے ملبوسات دیکھتا ہوں جن پر بہت سی پٹیاں، جھالریں اور حاشیے ہوں جو حسین جسموں پر خوب پھبتے ہیں تو سوچتا ہوں یہ اپنی نفاست زیادہ دن برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ ان پر ایسی چرسیں پڑ جائیں گی جو استری سے بھی دور نہیں ہوں گی۔ اتنی کثیف گرد کی تہہ کشیدہ کاری پر جم جائے گی جو کبھی دھل نہیں سکے گی۔ تب کوئی بھی اتنا ناخوش یا احمق نہیں ہوگا کہ یہی قیمتی لباس ہر روز صبح سے رات تک پہنے رکھے۔

پھر بھی میں دوشیزاؤں کو دیکھتا ہوں جو بہت خوبرو ہیں اور اپنے دلکش اعصاب، چھوٹی ہڈیوں، اور ہموار جلد، ملائم بالوں کے گچھوں کی نمائش کرتی ہیں، اور ہر روز اسی دلنشین فطری جامے میں دکھائی دیتی ہیں، ہمیشہ اسی چہرے کو انھی ہتھیلیوں پر ٹکاتی اور اسے آئینے میں منعکس ہونے دیتی ہے۔

صرف کبھی کبھار رات کو، کسی دعوت سے دیر سے گھر لوٹتے ہوئے آئینے میں چہرہ شکستہ، بھدا اور گرد آلود دکھائی دیتا ہے، جسے بہت سے لوگ دیکھ چکے ہیں اور جو اب مزید پہننے کے قابل نہیں رہا۔

ہجوم کا خواب

میں نے گھر کا صدر دروازہ کھولا اور باہر جھانکا یہ معلوم کرنے کے لیے کہ موسم باہر چہل قدمی کے لیے موافق ہے یا نہیں۔ آسمان بہت روشن تھا۔ بڑے بڑے بھورے بادل ہر طرف تیر رہے تھے جن کے بیچ میں سے آسمان کی نیلاہٹ چھلکتی تھی۔ یہ بادل مختلف شکلوں اور مڑے ہوئے کناروں والے تھے اور بہت نیچے تک گشت کر رہے تھے۔ گلی میں چہل قدمی کو نکلے ہوئے لوگوں کی بھرمار تھی۔ مائیں بچہ گاڑیوں کو مضبوطی سے پکڑے دھکیل رہی تھیں۔ یہاں وہاں کوئی گھوڑا گاڑی بھیڑ میں پھنس کر رکی ہوئی تھی۔ کوچوان کپکپاتی ہوئی لگاموں کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے خاموشی سے اپنے سامنے اور ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ پھر منظر کی ہر تفصیل کا بغور مشاہدہ کرتا اور پھر جگہ ملنے پر سر جھٹک کر گاڑی آگے بڑھا دیتا۔

بچے بھیڑ میں ادھر اُدھر پھدکتے تھے۔ نوجوان لڑکیاں ہلکے پھلکے لباس اور ڈاک کی ٹکٹوں جیسی شوخ رنگوں والی ٹوپیاں پہنے نوجوان مردوں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے چل رہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر تھرکتا نغمہ ان کی البیلی چال سے مترشح تھا۔ مختلف جگہوں پر ایک ہی خاندان کے افراد ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بھیڑ میں دھکم پیل شروع ہوتی تو وہ اپنے پیچھے ہاتھ پھیلائے ایک قطار میں چلنے لگتے اور اپنے عزیزوں کو، جو بھیڑ میں گم ہو جاتے تھے، ان کے گھریلو ناموں سے پکارتے۔ جن مردوں کا اس تمام بھیڑ میں کوئی کردار نہیں تھا، اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس ہنگامے سے بے نیاز چل رہے تھے۔ میں پہلے اپنے دروازے میں کھڑا تھا۔ پھر دہلیز سے باہر جھک آیا تاکہ زیادہ تفصیل سے دیکھ سکوں۔ راہ گیروں کے کپڑے مجھ سے مس ہو رہے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ربن کی پٹی میرے جسم سے لپٹ گئی۔ وہ ایک لڑکی کے سکرٹ کی پشت پر بندھی ہوئی تھی۔ میں نے ایسے ہی ایک لڑکی کے کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے مرد نے تیزی سے میرے ہاتھ پر دھپہ مارا۔ میں نے غصے میں اسے دروازے کے بند

دنیاہائے خواب

میں نے گدھے کا خواب دیکھا

میں نے خواب میں ایک گدھا دیکھا جو بھورے شکاری کتے سے مشابہہ تھا۔ وہ بہت احتیاط پسند جانور تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی مظہر فطرت تھا۔ میں نے اسے انتہائی قریب سے دیکھا۔ اس کے پیر چھوٹے اور انسانی پیروں سے ملتے جلتے تھے۔ میں نے اسے سرو کے تازہ اور گہرے سبز پتوں کا گچھا پیش کیا جسے میں نے ایک بوڑھی زیورچ عورت سے لیا تھا۔ یہ واقعہ بھی زیورچ میں پیش آیا تھا۔ گدھے کو ان کی کوئی ضرورت نہیں تھی چناں چہ اس نے پتوں کو حقارت سے سونگھا اور چھوڑ دیا۔ میں نے گچھے کو میز پر ڈال دیا۔ تب وہ اشتیاق سے آگے بڑھا اور انھیں کھا گیا حتیٰ کہ میز پر شاہ بلوط کے پھل سے ملتے جلتے چند ننھے ٹکڑے باقی رہ گئے۔ بعدازاں مجھے بتایا گیا کہ یہ گدھا اپنی چار ٹانگوں پر نہیں چلتا ہے بلکہ انسانوں کی طرح پچھلے دو پیروں پر تن کر کھڑا ہو جاتا اور چلتا ہے۔ یوں آنے جانیوالوں کو اپنی چاندی کی طرح چمکتی ہوئی چھاتی اور مختصر پیٹ دکھاتا ہے۔ مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا۔

قحبہ خانے والی گلی

میں جان بوجھ کر ان گلیوں میں سے گزرتا ہوں جہاں فاحشائیں رہتی ہیں۔ مجھے ان کے قریب سے گزرنے کے خیال سے جنسی ترغیب ملتی ہے۔ بظاہر یہ بعید از قیاس ہے لیکن بہر طور اس بات کا امکان موجود ہے کہ میں ان میں سے کسی سے جاملوں۔ اسے بے ہودگی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میں اس سے بہتر صورت حال کا ادراک نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی یہ خواہش بہت معصوم محسوس ہوتی ہے۔ نہ مجھے اس پر کوئی تاسف ہے۔

مجھے کسی فربہ اور عمر رسیدہ فاحشہ کی ضرورت ہے جس نے عام وضع کا لباس زیب تن کر رکھا ہو۔ جس کے زیورات سے اس کی مخصوص تعیش پسندی کا اظہار ہو رہا ہو۔ ایسی ہی ایک عورت سے غالباً میری کچھ شناسائی ہے بھی۔ آج سہ پہر کو میں اس سے ملا تھا۔ وہ اپنے خاص لباس میں نہیں تھی۔ اس کے بال سر سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ بہت غلیظ معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے خانساماؤں کی طرح کا ایک لمبا کرتا پہن اور بغل میں میلے کپڑوں کا گٹھر داب رکھا تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے کسی کو کچھ ترغیب ملے۔ لیکن میں اس پر فریفتہ تھا۔ ہم نے عجلت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

شام کو موسم کچھ سرد ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک چست زردی مائل بھورا کوٹ پہنے ہوئے ہے۔ وہ اس تنگ گلی کے دوسری طرف کھڑی تھی۔ زالٹرسٹراس کو جو راستہ جاتا تھا، وہاں وہ چہل قدمی کر رہی تھی۔ میں نے کچھ آگے جا کر پیچھے مڑ کر دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔ اس نے نظروں سے مجھے بھر پور جواب دیا۔ لیکن میں اس سے دور بھاگ گیا۔

پھر ٹرالی میں وائلن نوازی پر کوئی اعتراض معقول نہیں ہے، البتہ اگر اس کے بعد انعام کے لیے ٹوپی کو سب کے آگے پھیلایا جائے تو یہ ایک ہتک آمیز بات ہوگی۔ ابتدا میں رقاصہ کے اس وطیرے پر خاصی لے دے ہوئی اور کچھ عرصہ تک سبھی نے اس پر ناک بھوں چڑھائی۔ لیکن جب ٹرالی اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہی ہو تو تیز و تند ہوا اور خالی گلیوں میں وائلن کی آواز کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔

رقاصہ ایڈورڈوا سٹیج پر جتنی خوبصورت دکھائی دیتی ہے، اصل میں وہ اتنی حسین نہیں ہے۔ اس کی جلد کا رنگ ماند پڑ چکا ہے۔ اس کے رخسار کی ہڈیوں نے اس کی جلد کو یوں کسا ہوا ہے کہ چہرے پر کسی نرم احساس کی پیدائش کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے حقیقی چہرے کا اظہار کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے؟ اس کی بڑی ناک اس کے چہرے کے کسی گہرے خلا سے ابھرتی محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے کوئی شخص اس سے زیادہ دیر بے تکلف نہیں رہتا، بلکہ کسی وقت بے زار ہو کر کہتا ہے ''مجھے اب اجازت دیجیے۔''

اس کا لمبا تڑنگا جسم اور سکرٹ میں بہت زیادہ شکنوں کے ساتھ ابھری ہوئی اس کی کمر بھلا کس کو لبھا سکتی ہے؟ وہ میری خالہ کی طرح ایک بڑی عمر کی عورت دکھائی دیتی ہے۔ عموماً لوگوں کی خالائیں اسی طرح کی ہوتی ہیں۔ ایڈورڈوا کے جسم میں کوئی ایسی خوبی نہیں ہے جو اس کی ان خامیوں کی تلافی کر سکے۔ البتہ اس کے پیر بہت خوبصورت ہیں اور غالباً یہ اس کے پورے جسم میں واحد خوبصورت عضو ہیں، جنھیں دیکھ کر دل میں ہیجان اور احترام پیدا ہوتا ہے۔ میں نے خود اکثر لوگوں کو، جو معززین شہر ہیں، اور عام حالت میں خاصے باشعور اور معقول تصور کیے جاتے ہیں، رقاصہ ایڈورڈوا کے ساتھ بے اعتنائی سے پیش آتے دیکھا ہے۔ وہ تب اپنی اس ناپسندیدگی کو اس کی موجودگی میں چھپائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن عموماً اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

پٹ کے پیچھے کھینچ لیا اور اپنے بازوؤں کو فضا میں لہرا لہرا کر اور اپنی آنکھوں کے گوشوں سے اسے گھورتے ہوئے اسے لعن طعن کی۔ میں طیش میں کبھی اس کی طرف بڑھتا اور کبھی ایک قدم پیچھے ہٹ آتا۔ پھر میں نے دھکا دے کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً بھاگ گیا۔ ظاہر تھا اس واقعہ کے بعد سے میں لوگوں کو بلانے کے لیے انھیں انگلی سے اشارہ کرتا ہوں اور پھر بے باک اور تیز نگاہوں سے انھیں تکتا ہوں۔

ان کے قریب سے گزرتے ہوئے میں خاص طور پر اپنی رفتار تیز کر لیتا تاکہ مجھے وہاں سے گزرنے کے بعد محض اتنا ہی یاد رہے کہ وہاں کوئی قحبہ خانہ تھا۔ ان تمام گھروں کا آخری کمرہ بھی البتہ ایک قحبہ خانہ تھا۔ میں وہاں رک گیا۔ میں جس دروزے سے کمرے میں داخل ہوا تھا، اس کے سامنے موجود دیوار گھروں کی قطار کی سب سے آخری دیوار تھی۔ وہ یا شیشے کی تھی یا اسے خود ہی توڑ دیا گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر مزید آگے بڑھتا تو یقینا باہر گر جاتا۔ یہ زیادہ اغلب ہے کہ اسے توڑ دیا گیا تھا کیوں کہ وہاں عصمت فروش عورتیں فرش کے کنارے کنارے لیٹی ہوئی تھیں۔ دو کو تو میں نے خود وہاں لیٹے ہوئے دیکھا۔ ایک فاحشہ کا سر فرش کے کنارے سے ادھر کھلی فضا میں ڈھلکا ہوا تھا۔

بائیں جانب ایک ٹھوس دیوار تھی۔ اس کے برعکس دائیں جانب کی دیوار ابھی نامکمل تھی۔ اس کے پار صحن دکھائی دیتا تھا جس کا فرش آگے جھکنے پر ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک کمزور زینہ اس دیوار سے نیچے فرش تک چلا گیا تھا۔ روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے پر مجھے علم ہوا کہ اس کی چھت دوسرے کمروں کی چھتوں سے بالکل مختلف نہیں تھی۔ میں اس فاحشہ کے پاس بیٹھ گیا جس کا سر فرش کے کنارے سے باہر ڈھلکا ہوا تھا جب کہ میکس دوسری فاحشہ سے جا ملا۔ میں نے اس کی ٹانگوں پر اپنی انگلیاں پھیریں اور پھر دیر تک اس رانوں کے بالائی حصے کو ایک تسلسل کے ساتھ دباتا رہا۔ ایسا کرنے سے مجھے اتنا حظ ملا کہ تب یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ اس تفریح کے لیے جو حقیقتاً اس قدر مسحور کر دینے ولی تھی، کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا جاتا۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں اس دنیا کو دھوکہ دے رہا تھا۔ فاحشہ نے ٹانگ کو حرکت دیے بغیر جسم کے بالائی حصے کو اوپر اٹھایا اور میری طرف اپنی پشت پھیر دی جس پر زرد کناروں والے موم کی مہروں کے بڑے بڑے سرخ نشانات ثبت تھے۔ ان نشانات کے درمیان بے شمار سرخ دھبے بھی تھے۔ میں نے غور سے دیکھا کہ اس کا پورا جسم نشانات سے بھرا ہوا تھا۔ میں اس کی رانوں پر اپنا انگوٹھا پھیرتے ہوئے دراصل انھی سرخ دھبوں کو دباتا رہا تھا اور اب یہ غلیظ مڑی ہوئی مہر سے بنے ننھے سرخ نشانات میری انگلیوں پر بھی ابھر آئے تھے۔

میں پیچھے قدم ہٹاتا ہوا ان آدمیوں میں آ گیا جو زینے کے شروع میں دیوار کے ساتھ لگے غالباً انتظار میں کھڑے تھے۔ وہاں کچھ خاص کاروبار بھی ہو رہا تھا۔ ان لوگوں کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا جیسے اتوار کی صبح قصبے کے کسی بازار میں لوگ بیکار کھڑے ہوں۔ اس طور یہ ثابت ہوا کہ یہ اتوار ہی تھی۔

رقاصہ ایڈ ورڈ وا

میں نے ایک خواب میں رقاصہ ایڈ ورڈ وا سے فرمائش کی کہ وہ مجھے ایک مرتبہ پھر (Czardas) زارداس رقص کر کے دکھائے۔ وہ ایک مشہور رقاصہ ہے، ان کے چہرے پر پیشانی کے زیریں حصہ سے ٹھوڑی کے گڑھے تک ایک بالکل سیدھی روشن دھاری موجود ہے۔ ایک شخص اس کے پاس آیا۔ وہ چہرے سے بدطینت سازشی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے رقاصہ سے کہا کہ اس کی گاڑی چھوٹنے والی ہے۔ اسے فوراً روانہ ہونا چاہئے۔ رقاصہ نے اس کی بات کو ایسے انداز سے سنا جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دوبارہ نہیں ناچے گی۔

وہ بولی ''میں ایک مکار، بدکار عورت ہوں، کیا میں ایسی نہیں ہوں؟''

''اوہ۔۔۔۔۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔۔۔۔۔ آپ ایسی نہیں ہیں'' میں نے جواب دیا اور پھر بے مقصد ہی وہاں سے چل دیا۔

اس سے کچھ دیر پہلے تک میں اس سے مختلف سوالات کرتا رہا تھا۔ میں نے اس سے ان پھولوں کے بارے میں پوچھا جو اس کی کمر پر بندھی پٹی میں سجے تھے۔

''یہ مجھے یورپ کے تمام شہزادوں نے تحفے میں دیے ہیں'' وہ اٹھلا کر بولی۔ میں نے غور کیا کہ اس کی اس بات کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ یورپ کے تمام شہزادوں نے ایک رقاصہ ایڈ ورڈ وا کو یہ پھول جو اس کی کمر بند میں ٹنکے ہوئے ہیں، تحفتاً دیے ہیں۔

رقاصہ ایڈ ورڈ وا موسیقی کی دلدادہ ہے۔ وہ ایک بڑی ٹرالی میں سفر کرتی ہے اور اپنے ہر سفر میں دو اعلیٰ وائلن نوازوں کو بھی اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ وہ ان سے وائلن سنتی ہے۔ ٹرالی میں بیٹھ کر وائلن سننا قابل اعتراض بات نہیں ہے، اگر وائلن عمدہ بجایا جائے تو۔ اس تفریح میں کچھ پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا۔ تو

اس نے ایک لڑکی کی آبروریزی کی

اس نے آئسر کی پہاڑیوں میں، جہاں وہ اپنے بیمار پھیپھڑوں کی صحت یابی کے لیے گیا ہوا تھا، ایک چھوٹے سے تنہا مقام پر ایک لڑکی کی آبروریزی کی۔ وہ اس کے مالک مکان کی بیٹی تھی اور روزانہ شام کو گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اس کے ساتھ مختصر چہل قدمی کے لیے باہر نکل آتی تھی۔ اس روز پہلے اس نے لڑکی کو ترغیب دینے کی ناقابل فہم لیکن مختصر کوشش کی، جیسا عموماً بیمار پھیپھڑوں کے مریض کبھی کبھار کرتے ہیں۔ پھر دریا کے کنارے ایک جگہ نرم گھاس پر اسے پچھاڑ لیا اور خود بھی اس پر لیٹ گیا۔ لڑکی خوف کے مارے بے ہوش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں دریا سے پانی لایا اور اس کے منہ پر چھڑک کر اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کی۔

''جولیا، جولیا'' اس نے لڑکی پر جھکتے ہوئے کتنی ہی بار اس کا نام پکارا۔ وہ بہت فکر مند اور اس کے ہر احتجاج کی مکمل ذمہ داری اپنے سر لینے پر آمادہ تھا۔ وہ اس فکر مندی سے صرف خود کو یہ احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی ذمہ داری کس قدر اہم تھی۔ اس کے سامنے لیٹی معصوم لڑکی اب پھر سے باقاعدہ سانس لینے لگی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں خوف اور گھبراہٹ سے تاحال بند تھیں۔ وہ اتنی بے ضرر تھی کہ اس کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک بڑا اور مضبوط شخص تھا۔ وہ اپنے پنجوں کی نوک پر کھڑا ہو کر آسانی کے ساتھ لڑکی کو ایک جانب لڑھکا سکتا تھا۔ لیکن ان دونوں کے موازنے کے بعد کیا کوئی اس نتیجہ تک پہنچ سکتا تھا کہ یہ واقعہ اتنا اہم تھا کہ اس کا اثر اس لڑکی کے ذہن پر کل بھی باقی رہے گا۔ اس نے معاملے پر اس پہلو سے غور نہیں کیا۔

گھروں کی ایک طویل قطار میں سفر

گزشتہ رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ صبح بیدار ہونے پر مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک بالکل واہیات خواب تھا۔ البتہ ایک مختصر مزاحیہ منظر نے، جو دو ضمنی مناظر پر مشتمل تھا، اس خواب کو حیرت انگیز طور پر میرے لیے دلچسپ بنا دیا لیکن وہ منظر اب میرے ذہن سے محو ہو چکا ہے۔

میں پہلی یا دوسری منزل میں سے ہوتا ہوا گھروں کی ایک طویل قطار میں سے گزرا۔ مجھے صحیح طور پر یاد نہیں ہے کہ میکس میرے ساتھ تھا یا نہیں۔ میرا یہ سفر ایسے ہی تھا جیسے کوئی زیر زمین سرنگ کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جاتا ہے۔ میں اس سفر میں اس لیے بھی تیز رفتاری سے چلا کہ تمام گھر بہت خستہ تھے اور ان میں سے تیز گزرنا ناگزیر تھا۔ میں نے گھروں کے درمیان دروازوں پر غور نہیں کیا۔ یہ دراصل کمروں کی ایک عظیم الشان قطار تھی۔ جن کمروں میں سے گزرا غالباً ان سب میں بستر موجود تھے۔ البتہ ایک مخصوص بستر میری یادداشت میں محفوظ رہ گیا۔ وہ میرے بائیں جانب ایک کونے میں ایک اندھیری اور غلیظ دیوار کے ساتھ بچھا ہوا تھا۔ اس کی بالائی سطح ڈھلوانی تھی۔ اس پر بچھا کھردرا کمبل وہاں لیٹے آدمی کے پیروں میں چڑمڑ ہو گیا تھا اور ایک جانب سے نیچے ڈھلک رہا تھا۔ مجھے ان کمروں میں سے گزرتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی کیوں کہ زیادہ تر لوگ ابھی اپنے بستروں میں ہی لیٹے ہوئے تھے۔ میں پنجوں کے بل چلتے ہوئے ان کے قریب سے گزر جاتا۔ اس طور میں ان پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں یہاں سے کسی مجبوری کے تحت گزر رہا ہوں۔ ممکنہ حد تک احتیاط سے کام لیتے ہوئے نرمی سے پیر اٹھا رہا تھا کہ وہ میرے وہاں سے گزرنے کا برا نہ مانیں۔ میں نے کسی کمرے سے گزرتے ہوئے اپنی گردن بھی نہیں پھیری۔ بس دائیں جانب گلی میں دیکھا یا اپنے بائیں جانب عقبی دیوار پر نگاہ کی۔

گھروں کی قطار میں اکثر کوئی قحبہ خانہ بھی حائل ہوتا۔ میں بظاہر انھی کے لیے یہ سفر کر رہا تھا لیکن

میں اپنا مطالعہ جاری رکھنے کے لیے چند رسمی الفاظ میں ان سے معذرت کرتا ہوں اور دوبارہ خط پر جھک جاتا ہوں۔ پھر میں دفعتاً بیدار ہوتا ہوں جیسے خود اپنی چیخ سے میری آنکھ کھل گئی ہو۔ مجھے اپنا خواب اچھی طرح یاد ہے۔ میں خود کو دوبارہ سونے پر مجبور کرتا ہوں۔ مجھے نیند میں پھر سے خواب دکھائی دیتا ہے۔ پچھلے خواب کا منظر ذہن میں بیدار ہوتا ہے۔ میں عجلت میں خط کی مزید دو یا تین دھندلی سطریں پڑھتا ہوں لیکن پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ یہ منظر میرے اگلے خواب میں کھو جاتا ہے۔

تبھی وہ عجیب واقعہ ہوا۔ ایک آدمی سیڑھیوں سے اوپر چڑھ آیا اور میری طرف بڑھا۔ میں اور میکس بے تابی سے اس سے کسی خوفناک دھمکی کی توقع کر رہے تھے لیکن اس نے مجھ سے ایک نہایت آسان اور مضحکہ خیز سوال پوچھا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے غور سے میکس کو دیکھا۔ وہ پرے بلا تکلف بائیں جانب ایک کونے میں بیٹھا آلوؤں کا شوربہ پی رہا تھا جس میں موجود بڑی گیندوں سے مشابہ آلو باہر جھانکتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے انھیں اپنے چمچ سے شوربے میں واپس دھکیلا یا غالباً اس مقصد کے لیے دو چمچ استعمال کیے یا انھیں ویسے ہی ہاتھ سے پرے کر دیا۔

ہر گز اس لیے ملنے نہیں گیا تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر تھا بلکہ اس لیے کہ وہ ایک معروف شخص تھا۔ مجھے یہ خدشہ لاحق ہوا کہ شاید اب مجھے بھی اس ڈاکٹر سے ملنا پڑے گا لیکن ایسا نہیں کہا گیا۔ میں نے اپنے عقب میں بائیں جانب شیشے کی دیواروں کے حصار والے کمرے میں قید ایک شخص کو دیکھا۔ وہ میری طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ پروفیسر کا سیکرٹری تھا۔ میرے باپ نے درحقیقت اس سیکرٹری سے ملاقات کی تھی اور اس کے توسط سے وہ پروفیسر کی خوبیوں سے اس درجہ آگاہ ہوا کہ اس کا مداح ہو گیا اور اس کے بارے میں ایسی حتمی رائے قائم کر لی جیسے وہ اس سے بالمشافہ ملا ہو حالاں کہ ایسا نہیں ہوا تھا۔

ایک سینی ٹوریم کا خواب

ایک رات میں نے بیدار ہونے سے کچھ ہی دیر قبل خواب دیکھا کہ میں ایک سینی ٹوریم کے باغ میں ایک بڑے میز کے پاس بیٹھا ہوں۔ خواب میں مجھے اپنی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ یہ ایک اداس دن تھا۔ مجھے ایک سفر پر روانہ ہونا تھا۔ پھر میں ایک موٹر کار میں بیٹھ گیا جو تھوڑی ہی دیر پہلے یہاں پہنچی تھی۔ میں نے گاڑی کو گول دائرے میں موڑ کر آگے بڑھایا۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ میں ایک ہال میں بیٹھا ہوں۔ ہمارے لیے خوراک لائے جانے کا وقت ہو چلا ہے۔ ایک ویٹرس میری جانب بڑھتی ہے۔ وہ ایک نوجوان خوبرو دوشیزہ ہے۔ اس نے خزاں کے پتوں کے رنگ کا لباس پہن رکھا ہے۔ وہ اس بڑے ہال میں، جو سینی ٹوریم کا برآمدہ بھی ہے، نہایت نپے تلے مختصر قدم اٹھاتے ہوئے نیچے باغ میں جا رہی ہے۔ مجھے علم نہیں ہے کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ پھر میں خود ہی سوچتا ہوں کہ کہیں وہ مجھ سے ملنے تو نہیں آ رہی ہے۔ اور پھر واقعی وہ میری طرف بڑھتی ہے۔ وہ مجھے ایک خط دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا یہی تو وہ خط نہیں ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔ یہ ایک ہلکا پھلکا خط ہے۔ اس پر ایک کمزور، اجنبی اور شکستہ تحریر لکھی ہے۔ میں اسے کھولتا ہوں۔ اس میں سے بہت سے پتلے کاغذ برآمد ہوتے ہیں جن پر وہی اجنبی تحریر لکھی ہے۔ میں خط پڑھتا ہوں۔ تمام صفحات پر ایک سرسری نگاہ دوڑاتا ہوں۔ مجھے فوراً محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک اہم خط ہے۔ اسے میری منگیتر ایف کی چھوٹی بہن نے لکھا ہے۔ میں گہرے اشتیاق سے اس کا لفظ لفظ پڑھتا ہوں۔ اس دوران میرا ایک ہمسایہ، جس کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے کہ وہ مرد ہے، عورت یا بچہ ہے، میرے برابر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ میرے داہنی طرف کھڑا ہے اور خط پر رکھے میرے بازو کی طرف دیکھتا ہے۔ اچانک ہی میں چیختا ہوں ''نہیں'' ایک جانب گول میز پر بیٹھے کمزور اعصاب کے مریض میری چیخ سے کانپنے لگتے ہیں۔

میں مزید کچھ یاد نہیں ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ ایک قابل اعتماد شخص تھا جو بعدازاں خود کو سیاہ پردے کے عقب میں چھپانے لگا اور مجھے اس کی پوشیدگی محترم تھی۔

باپ کے ساتھ ایک سفر

میں اپنے باپ کے ساتھ ایک ٹرالی میں بیٹھا برلن سے گزر رہا تھا۔ راستے میں ہر دو جانب مختلف فاصلوں پر بہت سی سیدھی کھڑی ہوئی محصول چونگیاں تھیں۔ یہ ایک بڑے جنگل کی صورت میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ وہاں باقی ہر شے بے وقعت تھی۔ ہم ایک بڑے پھاٹک کے نزدیک پہنچے۔ تب یہ جانے بغیر کہ ہمیں اس میں سے کیسے گزرنا تھا، ہم اس ٹرالی سے نیچے اتر آئے اور پھاٹک کی جانب بڑھے۔ وہاں پھاٹک کی پرلی طرف ایک اونچی دیوار تھی۔ میرا باپ ایک ہی جست میں اسے پھلانگ گیا۔ اس کے لیے یہ بہت آسان تھا۔ اس نے جونہی چھلانگ لگائی، اس کی ٹانگیں پرندے کے پروں کی مانند فضا میں پھیل گئیں۔ میں اسے اس کی عاقبت نااندیشی ہی کہوں گا کہ اس نے دیوار پھلانگنے میں میری مدد نہیں کی۔ یہ مرحلہ میں نے انتہائی کوشش سے ہی طے کیا۔ میں اس پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو فوراً ہی پھسل کر پھر سے نیچے گر جاتا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ دیوار اب ڈھلوان بن گئی تھی۔ میرے لیے یہ بات بھی تکلیف دہ تھی کہ وہ دیوار انسانی فضلے میں نچڑی ہوئی تھی۔ اس فضلے کی پپڑیاں میرے جسم سے چپک گئیں۔ خاص طور پر میری چھاتی ان میں لتھڑ گئی تھی۔ میں نے سر جھکا کر ان پپڑیوں کو دیکھا اور ان پر اپنا ہاتھ پھیرا۔

آخر جب میں دیوار کے دوسری طرف پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میرا باپ سامنے ایک بڑی عمارت سے برآمد ہو رہا تھا۔ وہ میرے قریب آیا۔ اپنی شدید پدرانہ محبت کے اظہار کے طور پر اس نے میری گردن میں باز و حمائل کیے۔ مجھے چوما اور اپنے گلے سے لگا لیا۔ اس نے ایک پرانی وضع کا چھوٹا اوورکوٹ پہن رکھا تھا جس کی اندرونی سطح میں روئی بھری ہوئی تھی۔

''یہ ڈاکٹر دانلیڈن! بہت باکمال انسان ہے'' وہ بار بار چلا کر مجھے بتا رہا تھا۔ لیکن وہ ڈاکٹر سے

"Comparationl" جیسے الفاظ سننے کی توقع ہے۔ دوسری قطار سے پیچھے بالکونی کے داہنی طرف ایک کونے میں واقعی ایک باکس میں، جو دوسرے باکسوں سے منسلک ہے، کش خاندان کا تیسرا بیٹا خوبصورت کوٹ اور پتلون پہنے اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس کے لباس کا دامن نیچے ڈھلکا ہوا ہے۔ اس کی ماں ایک نمایاں کرسی پر بیٹھی تماشائیوں سے خطاب کر رہی ہے۔ لووی کی تقریروں کا تعلق انھی تقریروں سے ہے۔ اسی دوران میں کش تھیٹر کے پردے پر ایک طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے ''وہاں جرمن کش بیٹھا ہوا ہے''

اس کا اشارہ میرے ایک ہم مکتب کی جانب ہے جو "Germanics" پڑھ رہا ہے۔ پردہ اٹھتا ہے تو تھیٹر سیاہ ہونے لگتا ہے۔ کش یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ خود ہی منظر سے غائب ہو جائے گا، آگے بڑھتا ہے اور اپنی ماں کے ساتھ سٹیج سے دور چلا جاتا ہے۔ اس کے بازو اور ٹانگیں خوب پھیلی ہوئی ہیں۔ سٹیج ہال کی نسبت خاصا نشیب میں ہے۔ تم اپنی نشست کی پشت پر اپنی ٹھوڑی جما کر نیچے دیکھتے ہو، سٹیج کا منظر دو پستہ اور گہرے ستونوں پر مشتمل ہے جو سٹیج کے وسط میں نصب ہیں۔ یہ ایک امیرانہ ضیافت کا منظر ہے جس مین نوجوان لڑکیاں اور لڑکے حصہ لیں گے۔ ناٹک شروع ہوتے ہی پہلی قطار سے متعدد تماشائی عقبی سٹیج کی طرف چلے گئے، لیکن اس کے باوجود میں کچھ کچھ دیکھ سکتا ہوں کہ وہاں کھڑی لڑکیوں نے اپنی بڑی اور اونچی ٹوپیوں سے جن میں سے اکثر نیلے رنگ کی ہیں، منظر کو چھپا لیا ہے۔ میں سٹیج پر ایک دس پندرہ برس کے لڑکے کو کھڑے آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔ اس کے بال خشک اور سیدھے کٹے ہوئے ہیں۔ وہ اتنا چھوٹا ہے کہ اپنا نیپکن بھی صحیح طرح سے نہیں باندھ سکتا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے بہت احتیاط برتنا پڑ رہی ہے۔ وہ اس کھیل میں لندن کے ایک بے فکرے لڑکے کا کردار ادا کر رہا ہے۔ مجھے اس تھیٹر پر کچھ خاص اعتماد نہیں رہا۔ سٹیج پر موجود انتظامیہ اب مختلف نو واردوں کو خوش آمدید کہتی ہے جو ہال میں نشستوں کی اولین رو تک آن پہنچے ہیں۔ سٹیج پر اداکاروں کی آمد ہوتی ہے۔ انھوں نے صحیح طرح سے ریہرسل نہیں کی۔ ہیکل برگ نامی اداکارہ سٹیج پر آتی ہے۔ ایک اداکار ایک رئیس زادے کی مانند جھک کر اسے ہیکل پکارتا ہے لیکن فوراً ہی اپنی غلطی محسوس کر کے تصحیح کرتا ہے۔ اب ایک لڑکی آتی ہے جسے میں جانتا ہوں۔ غالباً اس کا نام فرینکل ہے۔ وہ فوراً نشست کی پشت پر چڑھ جاتی ہے۔ اس کے دائیں کولہے پر ہتھیلی کے برابر کھرچا گیا سرخ دھبہ ہے۔ البتہ جب وہ واپس سٹیج کی جانب مڑتی ہے تو وہاں پرسکون

ڈھلوانی راستے کا سفر

اس ڈھلوانی راستے کو اگر نیچے سے دیکھا جائے تو یہ بائیں موڑ سے شروع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ڈھلوان کے تقریباً درمیان میں کوڑا کرکٹ یا مضبوطی سے گندھی ہوئی چکنی مٹی کا ڈھیر پڑا ہوا ہے جو داہنی طرف سے آہستہ آہستہ بھُر رہا تھا۔ بائیں طرف سے وہ بالکل لوہے کے جنگلے کی طرح سیدھا کھڑا تھا۔ میں بائیں طرف چلنے لگا جدھر راستہ نسبتاً صاف تھا۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ ایک تین پہیوں والی سائیکل پر سوار نیچے اترائی سے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کا رخ اس تودے کی طرف تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی آنکھیں نہیں تھیں۔ ان کی جگہ دو گہرے سوارخ دکھائی دیتے جنھیں بہت رگڑا گیا ہو اور وہ گھس کر معدوم ہو چکے ہوں۔ وہ سائیکل بھی بہت خستہ تھی اور ایک جھنجھلائے ہوئے انداز میں لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔

میں نے اس شخص کو یوں پکڑا جیسے اس نے سائیکل کے ہینڈل کو پکڑ رکھا تھا۔ پھر میں نے اس کی صحیح راستے کی سمت رہنمائی کی۔ وہ میری جانب لڑھک گیا۔ میں اس کے مقابلے میں بہت جسیم تھا۔ وہ میری سخت گرفت میں تھا۔ تبھی سائیکل بے قابو انداز میں الٹے رخ پر چلنے لگی۔ اس کی رفتار دھیمی تھی۔ لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ کھینچ رہی تھی۔ ہم ایک کھلی جگہ پر آئے جہاں بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ سب نے سیاہ لباس پہن رکھے تھے۔ ان کے درمیان ایک سکاؤٹ لڑکا کھڑا تھا جس نے اٹھے ہوئے کناروں والی ہلکے بھورے رنگ کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ یہ لڑکا، جس نے بہت فاصلے سے مجھے دیکھ لیا تھا، میری کچھ مدد کرے گا۔ لیکن وہ پرے مڑ گیا اور لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ سائیکل لڑھکتی ہوئی اس کھلی جگہ سے آگے نکل گئی۔ میں آگے جھکا ہوا اس کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ میری ٹانگیں یوں کھلی تھیں جیسے میں گھوڑے پر سوار ہوں۔ جبھی ایک شخص میری جانب بڑھا۔ اس نے میری مدد کی۔ لیکن مجھے اس بارے

جنگ کا خواب

ایک رات میں نے جنگ کا خواب دیکھا۔ ایک میدان تھا۔ دریا وہاں موجود نہیں تھا۔ پر جوش تماشائیوں کا ہجوم کسی بھی لمحہ بدلتی صورت حال کے ساتھ آگے پیچھے بھاگنے پر تیار کھڑا تھا۔ ہمارے سامنے مٹی کا بڑا تودا تھا جس کے واضح اور ہموار کنارے جھاڑیوں سے اٹے ہوئے تھے۔ تودے کے اوپر ''آسٹریا'' کے لوگ لڑ رہے تھے۔ ہر فرد متوحش تھا۔ نا معلوم کیا نتیجہ نکلے۔ منظر میں تبدیلی کے لیے ہم گاہے بگاہے تاریک ڈھلوان پر مٹی کے تنہا ٹیلوں کی طرف دیکھ لیتے ہیں جن کے عقب میں ایک یا زائد اطالوی آگ کا الاؤ بھڑکائے بیٹھے ہیں۔ یہ منظر بالکل اہم نہیں ہے۔ ہم چند قدم پیچھے ہٹتے ہیں اور پھر سے تودے کی طرف تکنے لگتے ہیں۔ آسٹریا کے مرد تودے کے کناروں پر بھاگتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے لمبی جھاڑیوں کے پیچھے چھپ جاتے ہیں اور پھر سے بھاگنے لگتے ہیں۔ صورت حال بہت ابتر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی بہتری کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ آخر ایک انسان کس طرح دوسرے انسان پر غالب آسکتا ہے جو اپنے کلی دفاع کے ارادے میں مبتلا ہو۔ عمومی سطح پر مایوسی پھیل چکی ہے۔ شاید بڑی سطح پر پیش قدمی ہو۔ پیروشیا کا ایک میجر، جو اب تک ہمارے ساتھ کھڑا اس جنگ کا نظارہ کر رہا تھا، آگے بڑھتا ہے۔

وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیاں اپنے منہ میں ڈالتا ہے اور سیٹی بجاتا ہے جیسے کسی کتے کو بلانے کے لیے سیٹی بجائی جاتی ہے۔ یہ اس کا فوجی دستے کے لیے اشارہ ہے۔ وہ اب تک ہمارے قریب اپنے سپہ سالار کے اشارے کا منتظر کھڑا تھا۔ وہ پروشیا کے محافظین ہیں۔ وہ خاموش جوان ہیں۔ زیادہ تعداد میں نہیں ہیں۔ وہ سب افسر معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے بھی تلواریں تھام رکھی ہیں۔ ان کی وردیاں گہرے رنگ کی ہیں۔ وہ مختصر قدم اٹھاتے آہستگی سے اور گہرے نظم کے ساتھ ہمارے قریب سے

تھیٹر کا خواب

میں نے دیکھا کہ میں ایک تھیٹر میں ہوں۔ وہاں مشزلر کا لکھا ہوا ایک ناٹک کھیلا جا رہا تھا۔ اسے میرا اہم مکتب یوٹز پیش کر رہا تھا۔ میں ہال میں سب سے آگے بیٹھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں پہلی رو میں بیٹھا تھا لیکن یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دوسری تھی۔

میری والی قطار کی پشت اس طور سٹیج کی جانب مڑی ہوئی تھی کہ پورا ہال آسانی سے دکھائی دیتی تھی اور کچھ پیچھے مڑنے سے سٹیج بھی۔ ناٹک کا مصنف میرے برابر ہی بیٹھا تھا۔ میں ناٹک کے بارے میں اپنی ناخوشگوار رائے کو اس سے چھپا نہیں پایا۔ لیکن میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ ایسا اغلب ہے کہ ناٹک کا تیسرا حصہ زیادہ پر لطف ہو۔ میں اس سے یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ چوں کہ میں ناٹک کی ٹیکنیک سے غیر آگاہ تھا، اس لیے اگر کوئی ناٹک کے آئندہ بہتر حصے کے متعلق بات کرے تو میں اس کی رائے سے فوراً متفق ہو جاؤں گا۔ میرے گرد تماشائیوں کا جم غفیر تھا۔ یوں لگتا کہ ہر تماشائی سردیوں کے کپڑے پہن کر آیا ہوا تھا کیوں کہ جو بھی کوئی اپنی جگہ بیٹھتا، پوری نشست بھر دیتا ہے۔ میرے پہلو اور عقب میں موجود لوگ، جنھیں میں نہیں جانتا، مجھے پریشان کرتے ہیں۔ مجھے نو واردوں کی طرف متوجہ کرواتے ہیں۔ مجھے ان کے نام بتاتے ہیں۔ پھر میری توجہ کو خاص طور پر ایک شادی شدہ جوڑے کی جانب منعطف کراتے جو نشستوں کے بیچ راستہ بناتا ہوا چل رہا ہے۔ عورت کا چہرہ زرد ہے۔ اس کی ناک لمبی اور مردانہ ہے۔ اس بھیڑ میں اس کا بلند سر ادھر اُدھر حرکت کرتا ہے۔ واضح اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے مردانہ کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اسی لمحے مجھ پر منکشف ہوتا ہے کہ اداکار لووی میرے پہلو میں موجود ہے۔ لیکن وہ ایک غیر مانوس بہروپ میں ہے۔ وہ کھڑا ہوا ہے اور پر جوش لہجہ میں لوگوں سے خطاب کر رہا ہے۔ اس کی تقریر میں "Principium" کا لفظ بار بار آتا ہے۔ جب کہ مجھے اس سے "Tertium"

کھڑی ہو جاتی ہے اور بہت عمدہ اداکاری کرتی ہے۔ گیت گاتا ہوا ایک گھڑ سوار دور سے سرپٹ گھوڑا دوڑاتا یہاں آئے گا۔ پیانو کے ذریعے گھوڑے کے سموں کی کھڑکھڑاہٹ پیدا کی جاتی ہے۔ پھر گانے کی بھاری بھرکم آواز سنائی دیتی ہے آخر میں گلوکار بھی دکھائی دیتا ہے۔ اپنے گیت میں فطری رنگ پیدا کرنے کی خاطر، جو گھوڑا سرپٹ دوڑنے کے باعث کسی گیت میں در آتا ہے، گلوکار اوپر بالکونی میں سٹیج کی سمت بھاگتا ہے۔ وہ سٹیج تک نہیں پہنچتا۔ البتہ وہ تیز تیز چنگھاڑتے ہوئے نغمے کے کلائمکس تک پہنچ چکا ہے۔ اب پیانو بھی پتھروں پر بجتے گھوڑے کے سموں کی مزید آواز پیدا کرنے کے اہل نہیں رہا۔ لہٰذا پیانو اور گلوکار دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ گلوکار جھک جاتا ہے۔ بس اس کا سر بالکونی کے جنگلے سے باہر نکلا ہوا ہے۔ اب وہ صاف دکھائی نہیں دیتا۔

اس کے ساتھ ہی کھیل کا پہلا حصہ ختم ہو جاتا ہے لیکن پردہ نیچے نہیں گرتا، تھیٹر پر البتہ اندھیرا طاری ہے۔ سٹیج پر دو نقاد فرش پر بیٹھے ہیں۔ وہ ایک بڑی تصویر سے پشت لگائے کچھ لکھتے ہیں۔ سٹیج کا مہتمم لمبی داڑھی کے ساتھ سٹیج پر آتا ہے۔ اپنے ایک ہاتھ کو کسی کو ہدایات دینے کے انداز میں ہوا میں جھلاتا ہے۔ دوسرے ہاتھ میں انگوروں کا ایک خوشہ اٹھا رکھا ہے جو پہلے ضیافتی میز پر ایک پھلوں کی طشتری میں پڑا تھا اور اب وہ اسے کھا رہا ہے۔

میں ہال کی طرف نگاہ کرتا ہوں۔ اس میں پٹرول کی لالٹینوں سے، جو شیشے کے جھاڑوں میں لگی ہوئی ہیں، اجالا کیا گیا ہے۔ ایسے جھاڑ گلیوں میں نصب ہوتے ہیں۔ ان میں سے مدہم روشنی ماحول میں پھیل رہی ہے جبھی نخالص پٹرول یا ناکارہ فتیلہ کے باعث شعلہ بھڑکتا ہے۔ شراروں کا ایک مختصر فوارہ ہال میں تماشائیوں پر گرتا ہے جو ایک چھتے کی صورت میں مل بیٹھے ہیں۔ ایک شخص اس چھتے میں سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ لالٹین کی طرف بڑھتا ہے اور ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لالٹین کو درست کرے گا، لیکن وہ خاموشی سے وہاں کھڑا اسے تکتا ہے۔ لالٹین میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ وہ اپنی جگہ واپس آ جاتا ہے۔ میں اس میں اپنی ذات کا عکس محسوس کرتا ہوں اور اندھیرے میں اپنا چہرہ جھکا لیتا ہوں۔

گزرتے ہیں تو ہماری جانب دیکھتے ہیں۔ موت کی طرف اٹھتے ان کے قدم ہمیں چونکا دیتے ہیں۔ وہ پر عزم ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ فتح کا عزم رکھتے ہیں۔ ان مردوں کی مناجات پر اطمینان کے گہرے احساس کے ساتھ میں بیدار ہو جاتا ہوں۔

مقبرے کا نگران

دفتر کی طرز کا ایک چھوٹا کمرہ، بڑی کھڑکی، اور اس کے باہر ایک خزاں رسیدہ درخت۔ (لکھنے کی میز کے سامنے کرسی پر پیچھے جھکا بیٹھا ہوا شہزادہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے۔) چیمبرلین (گھٹے ہوئے جسم کا باریش انسان، چُست جیکٹ میں ملبوس، صدر دروازے کے ساتھ دیوار سے لگا کھڑا ہے۔)

وقفہ

شہزادہ: (کھڑکی سے مڑتے ہوئے) ہاں تو پھر؟

چیمبرلین: جناب والا میں یہ مشورہ نہیں دے سکتا۔

شہزادہ: کیوں؟

چیمبرلین: فی الوقت اپنے ذہن میں تمام اعتراضات کو سمیٹ نہیں پا رہا ہوں۔ یہ کائناتی مقولہ بیان کرتے ہوئے کہ ''مُردوں کو آشتی سے رہنے کا حق دو'' میں اپنے ذہن میں موجود بات کا بس ایک جزو ہی سامنے لا پا رہا ہوں۔

شہزادہ: میرا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔

چیمبرلین: اس صورت میں، میں ہی آپ کی بات صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔

شہزادہ: ہاں غالباً ایسا ہی ہے۔

وقفہ

شہزادہ: شاید واحد بات جو تمھارے لیے پریشان کن ہے، وہ یہ ہے کہ باقاعدہ انتظامات کرنے سے

ناٹک

آتا ہے۔ قلعے کے باغات کی حفاظت فوج کے جوان کرتے ہیں۔ اور کیا چاہئے۔ اس لیے مقبرے کی نگرانی کے لیے خصوصی محافظ کیوں؟ کیا یہ محض رسمی کارروائی نہیں ہے؟ ایک بستر مرگ ایک بدحال بوڑھے کے لیے جو وہاں نگرانی کر رہا ہے؟

چیمبرلین: رسمی کارروائی تو ہے لیکن ایک ضروری کارروائی۔ عالی مرتبت مردے کے لیے عقیدت کا ایک معمولی اظہار۔

شہزادہ: اور جو نگران مقبرے کے اندر ہے، اس کا کیا؟

چیمبرلین: میری رائے میں تو یہ پولیس کا معاملہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسانی حلقے سے ورا غیر حقیقی اشیاء کی حقیقی حفاظت۔

شہزادہ: میرے خاندان کے لیے یہ مقبرہ انسانی اور غیر انسانی دنیاؤں کے درمیان ایک سرحد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسی سرحد پر ایک نگران مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ جیسا تم نے کہا کہ اس معاملے کا پولیس کوئی حل نکالے گی۔ ہم مقبرے کے موجودہ نگران سے بات کر سکتے ہیں۔ میں نے اسے بلا بھیجا ہے (گھنٹی بجتی ہے۔)

چیمبرلین: وہ ایک منتشر الخیال بوڑھا ہے۔ مجھے کچھ کہنے کی اجازت دی جائے تو وہ ہمارے کسی کام کا نہیں۔

شہزادہ: اگر ایسی بات ہے تو مقبرے میں نگرانی کو مضبوط بنانا زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے تجویز دی۔

نوکر: (نوکر اندر داخل ہوتا ہے)

شہزادہ: مقبرے کا نگران۔

(ملازم نگران کو نیچے گرنے سے بچانے کے لیے اس کی کمر میں بازو ڈالے اسے اندر لاتا ہے۔ نگران ڈھیلی قدیم سرخ وردی میں ملبوس ہے جو چمکتے ہوئے چاندی کے بٹنوں اور متعدد تمغوں سے آراستہ ہے۔ وہ اپنی ٹوپی کو ہاتھ میں تھامے چیمبرلین کو دیکھ کر کانپتا ہے۔)

شہزادہ: اسے دیوان پر بیٹھا دو۔

(نوکر اسے نیچے بٹھاتا اور چلا جاتا ہے۔ (وقفہ) نگران کے حلق سے مدھم غرغرہ بلند ہوتا

کردار

شہزادہ	
چیمبرلین:	شہزادے کا مشیر خاص
محافظ:	مقبرے کا محافظ
شہزادی:	
لارڈ سٹیورڈ:	شہزادی کا مشیر خاص

شہزادہ: تو پھر مجھے اس بارے میں بتاؤ۔۔ان کشتیوں کے بارے میں۔

نگران: (خاموش رہتا ہے)

شہزادہ: (چیمبرلین سے) یہ کیوں نہیں بولتا؟

چیمبرلین: (محافظ کی طرف بڑھتے ہوئے) یہ کسی بھی وقت مر سکتا ہے۔

(شہزادہ کھڑا ہو جاتا ہے)

نگران: (چیمبرلین کے چھونے پر) مت چھوؤ۔ مت چھوؤ۔ مت چھوؤ (چیمبرلین کے ہاتھوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، پھر زاروقطار رونے لگتا ہے)

شہزادہ: ہم اسے تکلیف دے رہے ہیں۔

چیمبرلین: کیسے؟

شہزادہ: میں نہیں جانتا۔

چیمبرلین: اس کا قلعے میں آنا، خود کو حضور کی خدمت میں پیش کرنا، آپ کے روبرو کھڑے ہونا۔ یہ جواب دہی۔ یہ اس تمام صورت حال کا سامنا کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔

شہزادہ: (ابھی تک محافظ کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے ہے) یہ بات ایسے نہیں ہے (دیوان کے قریب جاتا ہے۔ محافظ پر جھکتا ہے۔ اس کی مختصر کھوپڑی اپنے ہاتھوں میں لیتا ہے۔) مت روؤ۔ کیوں رو رہے ہو؟ ہم چاہتے ہیں تم صحت یاب ہو جاؤ۔ مجھے احساس ہے کہ تمھارا کام آسان نہیں ہے۔ تم میرے خاندان سے صلے کے حق دار ہو۔ اس لیے رونا چھوڑو اور ہمیں اس بارے میں بتاؤ؟

نگران: لیکن میں اس معزز شخص سے خوفزدہ ہوں (چیمبرلین کی طرف دیکھتا ہے۔ نگاہوں میں خوف سے زیادہ نفرت ہے۔)

شہزادہ: (چیمبرلین سے) اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ بولے، تو مجھے افسوس ہے تمھیں یہاں سے جانا ہو گا۔

چیمبرلین: لیکن حضور والا اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا ہے۔ یہ بہت بیمار ہے۔

شہزادہ: (غائب الدماغی سے) براہ کرم تشریف لے جایئے۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔

پہلے ہی میں نے اسے تمھیں بیان کر دیا۔

چیمبرلین: یہ اعلان بلاشبہ میرے کاندھوں پر ایک بڑی ذمہ داری کا بوجھ ڈالتا ہے جسے پورا کرنے کی میں حتی الوسع کوشش کروں گا۔

شہزادہ: ذمہ داری کوئی ایسی بڑی بھی نہیں۔

وقفہ

شہزادہ: معاملے کو یوں دیکھو۔ فریڈرک پارک میں مقبرے کی نگرانی اب تک ایک ایسے شخص کے ذمے تھی جو پارک کے شروع میں ایک کوٹھڑی میں رہتا ہے۔ کیا اس معاملے میں کوئی بات قابل اعتراض ہے؟

چیمبرلین: بالکل نہیں۔ مقبرہ چار سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے اور اس کی نگرانی ہمیشہ اسی انداز میں کی جاتی رہی۔

شہزادہ: اسے بے حرمتی بھی کہا جا سکتا تھا؟ لیکن اس میں بے حرمتی کی کوئی بات نہیں، کیا ایسا نہیں ہے؟

چیمبرلین: یہ تو ضروری انتظام ہے۔

شہزادہ تو پھر ٹھیک ہے، ایک ضروری انتظام۔ میں تھوڑے عرصے سے ہی قلعے میں ہوں۔ لیکن ان معاملات میں کچھ سمجھ بوجھ حاصل کی ہے جو اب تک اجنبیوں کے ہاتھ میں رہے۔ انھوں نے انھیں عُمدہ انداز میں نپٹایا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہاں پارک میں ایک نگران کافی نہیں ہے۔ یہاں نیچے مقبرے میں بھی ایک محافظ ہونا چاہیے۔ یہ غالباً کوئی خوشگوار کام نہیں ہوگا لیکن تجربہ شاہد ہے کہ کسی بھی کام کے لیے با ارادہ اور با حوصلہ لوگ تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

چیمبرلین: یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ کے احکامات پر پوری طرح سے عمل درآمد کیا جائے گا۔ بھلے ہی ہمیں کسی حکم کی ضرورت پوری طرح سمجھ میں نہ آئے۔

شہزادہ: (چلاتے ہوئے) ضرورت! کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ پارک کے دروازے پر نگران ضروری ہے؟ فریڈرک پارک قلعہ کے باغات سے منسلک ہے اور ہر طرف سے اس کے احاطے میں

نگران: ہر رات ایک جیسا ہی۔ ہر رات دل ایسے دھڑکتا ہے جیسے یہ ابھی پھٹ جائے گا۔

شہزادہ: کیا یہ صرف رات کی ڈیوٹی ہے؟ رات کی ڈیوٹی، تم جیسے بوڑھے آدمی کے لیے۔

نگران: حضور والا کچھ ایسی ہی بات ہے۔ یہ اصل میں دن کی ڈیوٹی ہے۔ ایک نکما کام۔ آدمی وہاں صدر دروازے کے سامنے بیٹھا رہتا ہے، سورج کی روشنی میں منہ کھولے ہوئے۔ کبھی محافظ کتا اپنے پنجے سے اس کے گھٹنے پر تھپتھپاتا اور پھر سے لیٹ رہتا ہے۔ بس ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

شہزادہ: اچھا؟

نگران: (سر ہلاتے ہوئے) لیکن اسے رات کی ڈیوٹی میں بدل دیا گیا۔

شہزادہ: کس نے کیا؟

نگران: مقبرے کے آقاؤں نے۔

شہزادہ: تم انھیں جانتے ہو؟

نگران: ہاں۔

شہزادہ: کیا وہ تمھیں ملنے آتے ہیں؟

نگران: ہاں۔

شہزادہ: کیا پچھلی رات بھی آئے تھے؟

نگران: ہاں پچھلی رات بھی۔

شہزادہ: تمھیں یہ سب کیسا لگتا ہے؟

نگران: (سیدھا بیٹھتے ہوئے) بالکل معمول کے مطابق (شہزدہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے) سب کچھ معمول کے مطابق۔ آدھی رات تک خاموشی رہتی ہے۔ میں بستر میں لیٹا ہوتا ہوں۔ معاف کیجیے گا اپنا پائپ پیتا ہوں۔ میری پوتی میرے برابر ہی اپنے بستر پر سو رہی ہوتی ہے۔ آدھی رات کو کھڑکی پر پہلی دستک ہوتی ہے۔ میں گھڑیال کی طرف دیکھتا ہوں۔ ہمیشہ ایک ہی وقت۔ دو مزید دستکیں جو مینار کے گھڑیال کی آواز میں رل مل جاتی ہیں۔ لیکن مجھے وہ سنائی دیتی ہیں۔ یہ انسانی ہاتھ کی دستکیں نہیں ہوتیں۔ میں یہ سب جانتا ہوں۔ اپنی جگہ ساکت رہتا

ہے۔)

شہزادہ: (دوبارہ آرام کرسی میں بیٹھتے ہوئے) کیا تم سن سکتے ہو؟

نگران: (جواب دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔ دوبارہ پیچھے گر جاتا ہے۔)

شہزادہ: خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ ہم منتظر ہیں۔

چیمبرلین: (شہزادے پر جھکتے ہوئے) یہ شخص کیا اطلاع دے سکتا ہے؟ اور کوئی ضروری اور اہم اطلاع؟ اسے تو سیدھا بستر پر لے جانا چاہیے۔

نگران: بستر پر نہیں جناب۔ ابھی طاقت ہے۔ بالکل ٹھیک۔ اپنے آپ کو سنبھال سکتا ہوں۔

شہزادہ: تمھیں ایسے ہی ہونا چاہیے۔ تم ابھی صرف ساٹھ کے ہوئے ہو۔ مان لیا، لیکن بہت کمزور دکھائی دیتے ہو۔

نگران: ابھی اٹھ کھڑا ہوں گا۔ بس تھوڑی دیر میں بھلا چنگا ہو جاؤں گا۔

شہزادہ: میرا مقصد تمھیں ملامت کرنا نہیں تھا۔ مجھے تو افسوس ہے کہ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ کیا تم کوئی شکایت کرنا چاہتے ہو؟

نگران: سخت محنت کرتا ہوں۔ سخت محنت۔ شکایت نہیں کر رہا۔ لیکن کمزور ہوں۔ ہر رات کشتی لڑتا ہوں۔

شہزادہ: تم نے کیا کہا؟

نگران: سخت محنت۔

شہزادہ: تم نے کچھ اور بھی کہا تھا؟

نگران: کشتی لڑتا ہوں۔

شہزادہ: کشتی؟ کیسی کشتی؟

نگران: محترم آباؤ اجداد سے۔

شہزادہ: میں نہیں سمجھا۔ کیا تم ڈراؤنے خواب دیکھتے ہو؟

نگران: خواب نہیں، میں سوتا ہی نہیں۔

سالوں تک تقویت دے گی۔

شہزادہ: (محافظ کو واپس دیوان پر بٹھاتے ہوئے) کوئی تم سے تمھاری نوکری نہیں چھینے گا۔ تمھارے تجربے کے بغیر کیسے سرخرو ہو سکوں گا۔ لیکن میں ایک دوسرے محافظ کا بھی بندوبست کروں گا۔ تم اس کے افسر ہو گے۔

نگران: کیا میں اپنا کام صحیح طور پر نہیں کر رہا؟ کیا میں نے کبھی کسی کو گزرنے دیا۔

شہزادہ: کیا فریڈرک پارک میں آنے سے؟

نگران: نہیں، پارک سے باہر۔ بھلا اندر کون آنا چاہے گا؟ اگر کوئی جنگلے کے پاس آئے تو میں کھڑکی سے ہی اسے ہشکار دیتا ہوں۔ وہ بھاگ جاتا ہے۔ لیکن باہر۔ ہر کوئی باہر جانا چاہتا ہے۔ آدھی رات کے بعد آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ قبرستان کی سبھی آوازیں میرے گھر کے گرد اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ میرے خیال میں صرف اس لیے کہ وہ بہت مضبوطی سے آپس میں جڑے ہوتے ہیں، اس لیے میری کھڑکی سے اندر نہیں آپاتے۔ اگر صورت حال بگڑ جائے تو میں اپنے بستر کے نیچے سے لالٹین نکالتا ہوں اور اسے بلند کرتا ہوں اور روحیں قہقہہ لگاتی اور چیختی ہوئی ادھر اُدھر بکھر جاتی ہیں۔ تب مجھے وہ سرسراتی سنائی دیتی ہی، کسی دور دراز جھاڑی میں، پارک کے اختتام پر۔ لیکن جلد ہی وہ پھر سے اکٹھا ہو جاتی ہیں۔

شہزادہ: کیا انھوں نے کبھی بتایا کہ وہ کیا چاہتی ہیں؟

نگران: پہلے وہ احکامات جاری کرتی ہیں۔ خاص طور پر ڈیوک فریڈرک۔ کوئی زندہ انسان اتنا پراعتماد نہیں ہو سکتا۔ تیس سالوں سے ہر رات وہ مجھ سے یہی توقع کرتا ہے کہ میں اسے اندر کمرے میں آنے دوں گا۔

شہزادہ: اگر وہ تیس سالوں سے تمھارے پاس آ رہا ہے تو وہ ڈیوک فریڈرک نہیں ہو سکتا۔ اسے مرے ہوئے ابھی صرف پندرہ سال ہوئے ہیں اور پھر یہ کہ اس مقبرے میں فریڈرک تو بس وہی ایک ہے۔

نگران: (اپنی کہانی سے تھک جاتا ہے) جناب والا میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ میں کبھی سکول نہیں گیا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ کیسے یہ سب کچھ شروع ہوتا ہے؟ وہ کھڑکی پر آ کر کہتا ہے ''بوڑھے

(چیمبرلین چلا جاتا ہے۔شہزادہ دیوان کے ایک سرے پر بیٹھ جاتا ہے)

(وقفہ)

شہزادہ: تم اس سے خوفزدہ کیوں ہو؟

نگران: (حیران کن تحمل کے ساتھ) میں خوفزدہ نہیں تھا۔ میں کیوں ایک نوکر سے خوفزدہ ہوں گا؟

شہزادہ: وہ نوکر نہیں ہے۔ وہ ایک کاؤنٹ، آزاد اور امیر انسان ہے۔

نگران: بہر حال ایک نوکر ہے اور آپ مالک۔

شہزادہ: جیسا تم پسند کرو۔لیکن تم نے خود کہا کہ تم اس سے خوفزدہ تھے؟

نگران: میں وہ باتیں اس کے سامنے نہیں کہنا چاہتا جن کا تعلق صرف آپ کی ذات سے ہے۔کیا میں نے پہلے ہی اس کے سامنے کچھ زیادہ تو نہیں کہہ دیا؟

شہزادہ: سو ہم ایک دوسرے پر اعتبار کر سکتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔

نگران: آپ نے مجھے پہلی بار دیکھا ہے لیکن آپ کو ہمیشہ یہ علم رہا کہ (شہادت کی انگلی بلند کرتا ہے) میرے پاس دربار کا سب سے اہم عہدہ ہے۔آپ نے مجھے یہ "آگ جیسا سرخ" تمغہ دے کر سب کے سامنے میری خدمات کا اعتراف کیا (اپنے کوٹ پر سجے تمغے پر ہاتھ رکھتا ہے)

شہزادہ: نہیں، یہ تمغہ دربار میں تمھاری پچیس سالہ خدمت کا اعتراف ہے۔میرے دادا نے تمھیں یہ دیا۔ میں بھی تمھیں ایسا ہی تمغہ دوں گا۔

نگران: جیسے آپ کی منشا ہو اور جس کے آپ مجھے مستحق سمجھتے ہیں، وہ دیجیے۔ میں تیس سال سے اس مقبرے کے محافظ کے طور پر آپ کی خدمات بجا لا رہا ہوں۔

شہزادہ: میری نہیں۔ میرا دورِ اقتدار شروع ہوئے تو ایک سال بھی نہیں ہوا۔

نگران: (خیالات میں غرق ہے) تیس سال۔

(وقفہ)

نگران: (شہزادے کی بس آدھی بات یاد رہتی ہے) پچھلے سالوں کی راتیں۔

شہزادہ: مجھے تمھارے دفتر سے تا حال کوئی رپورٹ نہیں ملی۔ تمھارا کام کس قسم کا ہے؟

نگران: ہاں اتنی ہی۔ میری اصل خدمت تو اب شروع ہوتی ہے۔ میں بھاگتا ہوا دروازے سے باہر جاتا ہوں۔ گھر کے گرد چکر کاٹتا ہوں اور فوراً ڈیوک سے جا ٹکراتا ہوں، اور یہاں ہم دونوں ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے گتھم گتھا۔ وہ اتنا جسیم، میں اتنا چھوٹا۔ وہ اتنا چوڑا، میں اتنا دبلا۔ میں اس کی ٹانگوں سے الجھ جاتا ہوں۔ لیکن بار بار وہ مجھے اٹھا کر ہوا میں معلق کرتا ہے اور میں اسی بلندی سے لڑتا ہوں۔ اس کے تمام ساتھی ایک دائرے میں کھڑے ٹھٹھہ اڑاتے ہیں۔ مثلاً ان میں سے ایک پیچھے سے میرے پاجامے کو پھاڑ دیتا ہے اور میرے لڑنے کے دوران وہ میری قمیص کھینچتے ہیں۔ میں کبھی سمجھ نہیں سکا کہ کیوں ہنستے ہیں؟ حتیٰ کہ آخر میں ہمیشہ جیت جاتا ہوں۔

شہزادہ: یہ کیسے ممکن ہوتا ہے کہ جیت جاتے ہو۔ کیا تمھارے پاس کوئی ہتھیار ہوتا ہے؟

نگران: شروع کے سالوں میں اپنے پاس ہتھیار رکھتا تھا لیکن وہ اس کا بھلا کیا بگاڑ سکتے تھے؟ بلکہ الٹا لڑنے میں حائل ہوتے تھے۔ ہم صرف اپنے مکوں سے لڑتے ہیں یا اپنے سانس کی طاقت سے، لیکن آپ ہمیشہ میرے خیالوں میں موجود رہتے ہیں۔

(وقفہ)

میں ہمیشہ اپنی فتح کے بارے میں پر یقین رہتا ہوں۔ ہاں کبھی کبھار یہ سوچ کر خوفزدہ ہو جاتا ہوں کہ ڈیوک مجھے اپنے ہاتھوں میں سے نیچے گرا دے گا اور یہ بھول جائے گا کہ وہ مجھ سے لڑ رہا ہے۔

شہزادہ: پھر تم کب جیتتے ہو؟

نگران: طلوع آفتاب کے وقت۔ وہ مجھے نیچے گرا دیتا ہے اور میرے منہ پر تھوکتا ہے۔ یہ اس کا اپنی شکست کا اعتراف ہوتا ہے۔ لیکن اپنا سانس پھر سے بحال کرنے کے لیے میں اس جگہ گھنٹہ بھر لیٹا رہتا ہوں۔

(وقفہ)

شہزادہ: (کھڑے ہوتے ہوئے) لیکن یہ بتاؤ کیا تم واقعی نہیں جانتے وہ کیا چاہتے ہیں؟

ہوں۔ تب وہ کھنگار کر اپنا گلا صاف کرتا ہے۔ اسے حیرت ہے کہ دستکوں کے باوجود میں نے کھڑکی نہیں کھولی۔ حضور والا آپ حیران ہو رہے ہوں گے۔ یہ بوڑھا محافظ ابھی وہاں ہے۔ (گھونسہ لہراتا ہے۔)

شہزادہ: کیا تم مجھے خوفزدہ کر رہے ہو؟

نگران: (فوری طور پر اس کی بات نہیں سمجھتا) آپ کو تو نہیں۔ اسے جو کھڑکی میں کھڑا ہوتا ہے۔

شہزادہ: کون؟

نگران: وہ فوراً ہی خود کو ظاہر کرتا ہے۔ فوراً کھڑکی کے پٹ کھل جاتے ہیں۔ میں جلدی سے اپنی پوتی کے چہرے پر کمبل اوڑھا دیتا ہوں۔ طوفان اندر کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ فوراً روشنی گل کر دیتا ہوں۔ ڈیو فریڈرک۔ اس کا داڑھی اور بالوں سے اٹا ہوا چہرہ کھڑکی میں ساری جگہ گھیر لیتا ہے۔ ان صدیوں میں وہ کتنا بدل گیا ہے۔ وہ بولنے کے لیے منہ کھولتا ہے تو ہوا سے اس کی داڑھی اڑ کر اس کے دانتوں میں اٹک جاتی ہے۔ وہ اسے چبا تا ہے۔

شہزداہ: بس ایک منٹ رکو۔ تم نے کہا ڈیو فریڈرک۔ کون سا فریڈرک۔

و ڈیو فریڈرک، وہی ڈیو فریڈرک۔

شہزادہ: کیا وہ یہی نام بتاتا ہے؟

نگران: (مضطرب ہوتے ہوئے) نہیں، اس نے نہیں بتایا۔

شہزادہ: اور پھر بھی تم جانتے ہو (رکتے ہوئے) کہتے رہو۔

نگران: کیا میں اپنی بات جاری رکھوں۔

شہزادہ: بے شک اس تمام بات کا تعلق میری ذات سے ہے۔ کام کی تقسیم میں کچھ خامی رہ گئی ہے۔ تم پر کام کا بوجھ ہے۔

نگران: (جھکتے ہوئے) حضور والا، مجھ سے میرا کام مت چھینیے۔ اتنے سال آپ کی خدمت کی ہے، بس یونہی مجھے مر جانے دیجیے۔ جس قبر کی طرف بڑھ رہا ہوں، اس کے آگے دیوار مت کھینچیے۔ میں اپنی مرضی سے یہ کام کرتا ہوں اور اب بھی مجھ میں خدمت کی طاقت ہے۔ آپ نے مجھے سننے کا شرف بخشا، اپنے آقا کے حضور کچھ وقت گزارنا۔ یہ بات مجھے آئندہ دس

لیتی اور انتظار کرتی ہے کہ میں خود اپنے پیروں پر چل سکوں۔ وہ بہت ہی اچھی لڑکی۔

شہزادہ: آئزابیلا؟ یہ نام میرے لیے بالکل اجنبی ہے (وقفہ) مجھے شادی کی پیشکش کرنے۔ (کھڑکی تک جاتا اور باہر دیکھتا ہے)

(صدر دروازے سے ملازم اندر داخل ہوتا ہے۔)

ملازم: عزت مآب شہزدی صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔

شہزادہ: (بے خیالی سے نوکر کو دیکھتا ہے۔ نگران کی طرف مڑتا ہے) میرے واپس آنے تک انتظار کرو (بائیں راستے سے باہر چلا جاتا ہے)

(فوراً ہی چیمبرلین صدر دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی لارڈ ہائی سٹیورڈ (افسرانہ وردی میں ملبوس نوجوان۔) داہنی دروازے سے داخل ہوتا ہے۔)

نگران: (چیخ مار کر دیوان کے پیچھے لڑھک جاتا ہے۔ اپنے ہاتھوں کو فضا میں بلند کرتا ہے جیسے اسے اپنے سامنے بھوت کھڑے دکھائی دے رہے ہوں)

سٹیورڈ: شہزادہ چلا گیا؟

چیمبرلین: آپ کی ہدایت کے مطابق، شہزادی نے انھیں بلا بھیجا ہے۔

سٹیورڈ: خوب (اچانک مڑتا ہے اور دیوان پر جھک جاتا ہے) اور تم بد بخت بھوت، تم نے شہزادے کے قلعے میں آنے کی جرأت کیسے کی۔ یہ خوف نہیں ہے کہ تمھیں دھکے دے کر دروازے سے باہر نکال دیا جائے گا۔

نگران: میں۔۔ میں۔

سٹیورڈ: خاموش رہو۔ سب سے پہلے تو خاموش رہو۔ ایک لفظ نہیں بولنا۔ یہاں اس کونے میں بیٹھ جاؤ (چیمبرلین سے) میں تمھارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے شہزادے کے تازہ ترین خبط کی اطلاع دی۔

چیمبرلین: آپ نے خود ہی پوچھا تھا۔

سٹیورڈ: پھر بھی۔۔۔۔۔۔۔ اور اب ذرا خفیہ بات۔ اس کریہہ وجود کے سامنے جان بوجھ کر۔ تم کاؤنٹ حزب اختلاف سے چھیڑ چھاڑ کر رہے ہو۔

کتے معزز لوگ دستک دے رہے ہیں اور تم اپنے غلیظ بستر میں لیٹے ہو۔'' خیر، انھیں بستروں سے خاص نفرت ہے۔ ہر رات ہمارے درمیان یہی گفتگو ہوتی ہے۔ وہ باہر ہوتا ہے اور میں اس کے سامنے، دروازے کی طرف پشت کیے۔ میں کہتا ہوں ''میں صرف دن کے وقت کام کرتا ہوں'' ڈیوک مڑتا ہے اور پارک کی طرف منہ کر کے چلاتا ہے۔ ''یہ صرف دن کو کام کرتا ہے'' وہاں جمع شاہی امراء کا گروہ بے تحاشہ قہقہے لگاتا ہے۔ ڈیوک دوبارہ مجھ سے کہتا ہے ''لیکن یہ دن ہی تو ہے۔'' میں اکھڑ پن سے جواب دیتا ہوں۔ ''آپ غلط کہہ رہے ہیں۔'' ڈیوک کہتا ہے، ''دن ہو یا رات۔ تم دروازہ کھولو۔'' میں جواب دیتا ہوں، ''اس کے لیے مجھے احکامات نہیں ملے۔'' اور اپنے پائپ سے دروازے پر لگے ہوئے نوٹس کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ ڈیوک کہتا ہے، ''تم ہمارے نگران ہو۔'' میں کہتا ہوں ''تمھارا نگران، لیکن ملازم موجودہ شہزادے کا۔'' وہ کہتا ہے، ''ہمارا نگران، بس یہی اصل بات ہے۔ اس لیے دروازہ کھولو اور یہ کام جلدی کرو۔'' میں جواب دیتا ہوں، ''نہیں۔'' وہ کہتا ہے، ''تم نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ پرنس لیو نے آج ہمیں دعوت پر مدعو کیا ہے۔''

شہزادہ: (تیزی سے) میں نے؟

نگران: ہاں آپ نے۔ (وقفہ) آپ کا نام سنتا ہوں تو مزاحمت ختم کر دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے ہمیشہ احتیاط سے دروازے پر جھکا رہتا ہوں کیوں کہ یہی بات مجھے کھڑا رکھتی ہے۔ باہر ہر کوئی آپ کا نام گاتا ہے۔ ''دعوت نامہ کہاں ہے'' میں نقاہت سے پوچھتا ہوں ''خبیث پسو'' وہ چیختا ہے، ''تم ایک ڈیوک کی بات پر شک کرتے ہو'' میں کہتا ہوں ''مجھے ایسے کوئی احکامات نہیں ملے۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔ نہیں کھولوں گا''۔ ''یہ نہیں کھولے گا۔'' ڈیوک چیختا ہے ''اس لیے آؤ، تم سب، سارا شاہی خاندان۔ دروازے پر۔ ہم خود اسے کھولیں گے۔'' اگلے لمحے میری کھڑکی سے وہ سب غائب ہو جاتے ہیں۔

(وقفہ)

شہزادہ: کیا بس اتنی بات ہے؟

سٹیورڈ: اسے سمجھ پایا ہوں یا نہیں، لیکن موجودہ صوت حال نا قابل برداشت ہے۔

چیمبرلین: ہوسکتا ہے یہ نا قابل برداشت ہو لیکن یہ صورت حال یہاں موجود عوامل کی نوعیت کے مطابق ہے، اور ہم اسے آخر تک برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔

سٹیورڈ: لیکن نہ شہزادی، نہ میں نہ ہی ان میں سے کوئی جو ہمارے طرف دار ہیں۔

چیمبرلین: آپ کو ایسی کون سی بات نا قابل برداشت لگی؟

سٹیورڈ: چوں کہ فیصلہ سامنے آنے ہی والا ہے، اس لیے اس پر بے تکلفی سے بات کرنا چاہوں گا۔ شہزادہ دوہری فطرت کا مالک ہے۔ پہلی کا تعلق ریاست سے ہے، وہ عوام میں غیر حاضر دماغی سے گھومتا ہے۔ اپنے استحقاقات سے بے نیاز۔ دوسری فطرت اس کی بنیادوں کی مضبوطی تلاش کرنے کے لیے ان تھک جستجو کرتی ہے۔ وہ انھیں ماضی میں تلاش کرتا ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ اندر اترتے ہوئے۔ صورت حال کی کیسی کم فہمی ہے۔ ایسی کم فہمی جس میں عظمت کا فقدان نہیں ہے۔ حالاں کہ اس کا نقص اس کی ظاہری ہیئت سے کہیں عظیم ہے۔ کیا تمھیں یہ سب دکھائی نہیں دیتا؟

چیمبرلین: یہ اس بات کا بیان نہیں ہے جس پر مجھے اعتراض ہے، بلکہ یہ اس کی وضاحت ہے۔

سٹیورڈ: وضاحت؟ اور یہ سوچنا کہ تمھیں قائل کرنے کی امید میں، میں نے صورت حال کو اس سے زیادہ آسان انداز میں بیان کیا ہے، جتنا میں اسے سمجھتا ہوں۔ میں اب بھی اپنی رائے پر قائم ہوں۔ لیکن بس ایک بات۔ حقیقت میں شہزادے کو اپنی بنیادوں کی مضبوطی کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ اپنی تمام تر قوت کو استعمال کرے تو اسے کافی معلوم ہوگا وہ سب کچھ کرنے کے لیے جو خدا اور انسان کی طرف سے عائد کردہ انتہائی ضروری ذمہ داری کا تقاضا ہوسکتا ہے۔ لیکن وہ زندگی کے توازن سے دور بھاگتا ہے اور ایک آمر بننے کے قریب ہے۔

چیمبرلین: وہ انتہائی منکسر المزاج۔

سٹیورڈ: یہ منکسر المزاجی اس کی آدھی شخصیت سے متعلق ہے۔ اسے اپنی تمام توانائی دوسرے حصے کے لیے چاہیئے جو برج بابل جیسی کسی تعمیر کے لیے ضروری بنیاد کو اکٹھا کرتا ہے۔ شہزادے

نگران: وہ پارک سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔

شہزادہ: آخر کیوں؟

نگران: یہ میں نہیں جانتا۔

شہزادہ: کیا تم نے کبھی نہیں پوچھا؟

نگران: نہیں۔

شہزادہ: کیوں نہیں؟

نگران: اس سے مجھے ذہنی طور پر اذیت ہوتی ہے لیکن اگر آپ چاہتے ہیں تو میں آج ان سے پوچھوں گا۔

شہزادہ: (چونکتے ہوئے بلند آواز سے) آج!

نگران: (باخبر انداز میں) جی ہاں۔

شہزادہ: کیا تمھیں کچھ اندازہ بھی نہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟

نگران: نہیں۔

(وقفہ)

شاید مجھے یہ بھی بتانا چاہیے کہ بعض اوقات صبح سویرے جب میں وہاں لیٹے ہوئے اپنا سانس درست کر رہا ہوتا ہوں اور اتنی نقاہت محسوس کرتا ہوں آنکھیں بھی نہیں کھول پاتا تو وہاں ایک بہت نازک غم ناک سراپا ظاہر ہوتا ہے۔ چھونے پر روئیں دار محسوس ہوتا ہے۔ ہمیشہ بعد میں آنے والی، شہزادی آئزابیلا۔ وہ میرے جسم پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ میری داڑھی پکڑ لیتی ہے۔ اس کا جسم میری ٹھوڑی کے نیچے میری گردن سے چھوتا ہوا گزرتا ہے پھر وہ ہمیشہ یہی کہتی ہے ''دوسروں کو رہنے دو۔ لیکن مجھے، مجھے باہر جانے دو'' میں جتنا ممکن ہوسکتا ہے، سر ہلا کر انکار کرتا ہوں۔ 'میں شہزادہ لیو کے پاس جانا چاہتی ہوں اسے شادی کی پیشکش کرنے کے لیے'' میں اپنا سر انکار میں ہلاتا رہتا ہوں ''لیکن مجھے، مجھے'' مجھے اس کے رونے کی آواز آتی ہے۔ پھر وہ چلی جاتی ہے۔ میری پوتی کمبل لے کر آتی ہے۔ مجھے ان میں لپیٹ

سٹیورڈ: شک؟ نہیں۔ یہ اس قابل نہیں ہے کہ اس پر شک کیا جائے۔ لیکن میں اس پر نظر رکھنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ میرے خیال میں ۔۔ آپ اسے میرا وہم سمجھیں یا خبط، جیسا آپ چاہیں، کہ یہ محض بدقوتوں کا آلہ کار نہیں ہے بلکہ بدی کا ستون، اس کا کارکن ہے۔

چیمبرلین: یہ تیس سالوں سے خاموشی سے دربار کی خدمت کر رہا ہے۔ شاید کبھی قلعے میں دکھائی دیئے بغیر۔

سٹیورڈ: اوہ۔۔ اس طرح کی چھچھوندریں ظاہر ہونے سے پہلے لمبا سوراخ کھودتی ہیں (دفعتاً نگران کی طرف مڑتا ہے) لیکن سب سے پہلے، اسے یہاں سے دفعان کیا جائے (ملازم سے) اسے فریڈرک پارک لے جاؤ، اس کے ساتھ ٹھہرو اور اگلا حکم ملنے تک اسے کہیں بھی مت جانے دو۔

نگران: (بہت خوفزدہ ہے) میں عزت ماب شہزادہ صاحب کا انتظار کرنے کو کہا گیا ہے۔

سٹیورڈ: تمھاری بھول ہے۔ دفعان ہو جاؤ۔

چیمبرلین: اس سے محتاط سلوک کرنا چاہئے۔ یہ ایک بوڑھا اور بیمار انسان ہے اور کسی وجہ سے شہزادہ اسے بہت عزت دیتا ہے۔

(نگران چیمبرلین کے سامنے آکر جھکتا ہے۔)

سٹیورڈ: خیر! (ملازم سے) اس کے ساتھ محتاط رویہ رکھنا۔ لیکن خدا کے لیے اسے یہاں سے لے جاؤ۔ جلدی۔

نوکر: (اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔)

چیمبرلین: (ان دونوں کے درمیان آتے ہوئے) نہیں ہمیں پالکی کا انتظام کرنا چاہیے۔

سٹیورڈ: یہ تو اس دربار کی حالت ہے۔ ٹھیک ہے، تو ایک پالکی۔ اس خزانے کو پالکی میں لے جاؤ۔ لیکن اب دونوں کمرے سے چلے جاؤ۔ (چیمبرلین سے) تمھارے رویئے سے لگتا ہے کہ۔

نگران: (دروازے کی طرف جاتے ہوئے مختصر چیخ مار کر دھڑام سے نیچے گرتا ہے۔)

سٹیورڈ: (پیر پٹختے ہوئے) اس سے نجات حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اگر اور کوئی چارہ نہیں ہے تو اسے بازروں میں اٹھالو۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ تمھیں کیا کرنا چاہئے۔

چیمبرلین: کیا یہ الزام ہے؟

سٹیورڈ: ایک تشویش ہے بس۔

چیمبرلین: ایسی بات ہے تو میں جواب دے سکتا ہوں۔ میں حزب اختلاف سے چھیڑ چھاڑ نہیں کر رہا۔ کیوں کہ میں اسے جانتا بھی نہیں۔ مجھے رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے لیکن میں ان سے کنی کترا کر نکل جاتا ہوں۔ میں اب بھی اسی واضح پالیسی کی حمایت کرتا ہوں جو ڈیوک فریڈرک کے دور میں نافذ العمل تھی۔ اس وقت دربار میں صرف یہی پالیسی رائج تھی کہ شہزادے کی خدمت کی جائے۔ ان کے کنوارے ہونے سے یہ بات اور بھی آسان ہوگئی۔ لیکن یہ مشکل کبھی نہیں تھی۔

سٹیورڈ: پر حکمت بات۔۔۔۔سوائے اس بات کے کہ انسان کی حسیات ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ اس کی درست رہنمائی کریں۔ صحیح راستے کا حصول صرف عقل سے ہی ممکن ہے۔ عقل ہی کو فیصلے کرنے چاہیں۔ ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ شہزادہ غلط سمت میں جا رہا ہے تو کیا اس صورت میں اس کی صحیح ترین خدمت یہ ہوگی کہ اس کے پیچھے تباہی کی طرف بڑھا جائے یا تمام تر احترام کے ساتھ انھیں واپس لایا جائے؟ بلاشبہ انھیں واپس لانا ہی درست ہے۔

چیمبرلین: آپ ایک بدیسی دربار سے شہزدی کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ چھ مہینے ہی یہاں گزارے ہیں اور آپ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ اس دربار کی پیچیدہ صورت حال میں صحیح اور غلط کا امتیاز کر سکتے ہیں۔

سٹیورڈ: جو شخص اپنی آنکھیں موند لیتا ہے، اسے صرف پیچیدگیاں ہی نظر آئیں گی لیکن جو اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے، وہ سچائی کو شروع ہی میں اسی صراحت سے دیکھ لے گا جس طرح وہ ایک سو سال بعد اسے دیکھے گا۔ بجا طور پر اس معاملے میں ایک تلخ سچائی آئندہ چند دنوں میں بہتری کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔

چیمبرلین: مجھے یقین نہیں ہے کہ جس فیصلے کو آپ کرنا چاہتے ہیں، اور جس کی خبر مجھے آپ کے اعلان سے ہوئی ہے، کوئی عمدہ فیصلہ ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ آپ شہزادے کو، دربار کو اور کسی بھی شے کو سمجھ ہی نہیں پائے۔

اٹھاؤ۔ اور سب سے ضروری ایسے ہی مستقل مزاجی سے چلو۔(دروازے میں شہزادی کی طرف مڑتے ہوئے) یہ مقبرے کا نگران ہے۔

(شہزادی سر ہلاتی ہے۔)

شہزادہ: میں اسے تم سے ایک مختلف صورت حال میں ملانا چاہتا تھا (ایک اور قدم اٹھانے کے بعد) کیا آپ نہیں آئیں گی؟

شہزادی: میں تھک چکی ہوں۔

شہزادہ: ڈاکٹر سے ملنے کے بعد میں واپس آ جاؤں گا۔ اور آپ، معزز احباب! آپ میں سے جو مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے، یہاں میرا انتظار کرے۔(باہر نکل جاتا ہے)

سٹیورڈ: (شہزادی سے) کیا عزت مآب شہزادی کو میری خدمات کی ضرورت ہے؟

شہزادی: ہمیشہ! میں تمھاری بیدار مغزی سے بہت خوش ہوں۔ اپنی چوکسی کو برقرار رکھنا۔ چاہے آج یہ بے کار لگے۔ ہر شے خطرے میں ہے۔ تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ میں تو ہمیشہ اپنے کمرے میں رہتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ یہاں اداسی کے سائے اور بھی گہرے ہوں گے۔ یہ موسم خزاں ہماری توقعات سے کہیں زیادہ افسردہ ہے۔

کے ان مذموم ارادوں کے خلاف احتجاج کرنا، ہر اس شخص کا فرض ہے جو اپنے ذاتی وجود میں، اصولوں میں، شہزادی میں اور ممکنہ حد تک حتیٰ کہ شہزادے میں دلچسپی رکھتا ہے۔

چیمبرلین: 'حتیٰ کہ ممکنہ حد تک'۔۔۔آپ بہت صاف گو ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آپ کی صاف گوئی مجھے آپ کے آئندہ فیصلے سے متعلق بے یقین کرتی ہے۔ مجھے افسوس ہے، جیسا میں زیادہ سے زیادہ اس بات پر افسوس کرتا ہوں کہ شہزادے سے میرا اخلاص میرے اختیار سے باہر ہے۔

سٹیورڈ: ہر بات واضح ہے۔ آپ حزب اختلاف سے دکھاوے کی ہمدردی نہیں جتا رہے۔ حقیقت میں آپ صرف اس کی معاونت کر رہے ہو۔ صرف ایک فرد، جو ایک درباری مصاحب کے حوالے سے قابل ستائش ہے۔ اور پھر آپ کی واحد امید یہ ہے کہ ہماری عظیم مثال آپ کے ساتھ ہے۔

چیمبرلین: جو کچھ بھی مجھ سے ہو سکا، میں اسے روکنے کے لیے کروں گا۔

سٹیورڈ: اب مجھے اس کا کچھ خوف نہیں رہا (مقبرے کے نگران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اور تم جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھے ہو، کیا تمھیں ہماری باتیں سمجھ میں آتی ہیں؟

چیمبرلین: مقبرے کا نگران۔

سٹیورڈ: مقبرے کا نگران۔ اس کو جانچنے کے لیے بھی انسان کو عجیب ہونا پڑتا ہے۔ کیوں ایسا نہیں، بوڑھے کھوسٹ، چیخنے والے بوڑھے الو۔ کیا تم نے اسے کبھی شام کو جنگل میں اڑتے ہوئے دیکھا ہے، بندوق کی گولی کی زد سے باہر۔ لیکن دن کو یہ معمولی حرکت پر بھی غوطہ مار جاتا ہے۔

چیمبرلین: میں نہیں سمجھا۔

نگران: (تقریباً روتے ہوئے) آپ مجھے ملامت کر رہے ہیں جناب، اور میں میں نہیں جانتا کہ کیوں؟ مہربانی کر کے مجھے گھر جانے دیجیے۔ میں برا شخص نہیں ہوں۔ میں تو بس مقبرے کا نگران ہوں۔

چیمبرلین: آپ اس پر شک کر رہے ہیں۔

چیمبرلین: شہزادہ۔

(نوکر بائیں جانب کا دروازہ کھولتا ہے۔)

سٹیورڈ: آہ (نگران کی طرف دیکھتے ہوئے) مجھے معلوم ہونا چاہئے تھا کہ بھوتوں کو کہیں نہیں لے جایا جاسکتا۔

شہزادہ: (تیز قدموں سے داخل ہوتا ہے۔ اس کے عقب میں شہزادی ہے۔ سیاہ بالوں والی نوجوان عورت بھنچے ہوئے دانتوں کے ساتھ۔ وہ دروازے میں ٹھہر جاتی ہے) کیا ہوا؟

سٹیورڈ: نگران کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں اسے باہر بھجوا رہا تھا۔

شہزادہ: مجھے اطلاع دینی چاہیے تھی۔ کیا ڈاکٹر کو بلوایا ہے؟

چیمبرلین: میں اسے بلوا لیتا ہوں (تیزی سے صدر دروازے سے باہر جاتا ہے لیکن فوراً ہی واپس مڑتا ہے)

شہزادہ: (گھٹنوں کے بل نگران کے پہلو میں بیٹھتا ہے) اس کے لیے بستر تیار کیجئے۔ کوئی ڈولی لائیں۔ کیا ڈاکٹر آ رہا ہے؟ بہت دیر کر رہا ہے۔ نبض بہت دھیمی چل رہی ہے۔ مجھے تو دل کی دھڑکن بھی سنائی نہیں دے رہی۔ قابل رحم پسلیاں۔ کتنا کمزور ہے اس کا جسم (اچانک کھڑا ہو جاتا ہے۔ پانی کا گلاس اٹھاتا اور اس کی جانب دیکھتا ہے) یہ کتنا لاچار ہے (دوبارہ گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہے۔ نگران کے چہرے کو پانی سے بھگوتا ہے) اس کی سانس اب کچھ بہتر ہے۔ یہ اب بہت خراب نہیں ہوگی۔

(جب کہ وہ دروازے کی طرف دیکھتا ہے، نگران اپنا ہاتھ بلند کرتا ہے اور شہزادے کے رخسار پر پیار سے پھیرتا ہے۔ شہزادی اپنا سر پرے پھیر لیتی ہے، کھڑکی کی جانب۔ ملازم ڈولی کے ساتھ آتا ہے۔ شہزادہ نگران کو اٹھانے میں اس کی مدد کرتا ہے۔)

شہزادہ: احتیاط سے لے جانا۔ اوہ، یہ تمھارے بڑے ہاتھ۔ اس کے سر کو ذرا اٹھاؤ۔ ڈولی کے نزدیک۔ سرہانہ، اس کی کمر کے مزید نیچے۔ اس کا بازو۔ اس کا بازو۔ تم بہت برے، بہت برے خدمت گزار ہو۔ اس وقت سے ڈرو جب تمھیں بھی ہمیشہ اس بوڑھے شخص کی طرح بستر پر نڈھال لیٹنا پڑے۔ ہاں اب اٹھاؤ۔ اور اب آہستگی کے ساتھ۔ آہستہ آہستہ قدم